بہنوں کا اپنا ماہنامہ

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار کراچی

بانی و مدیر اعلیٰ محمود ریاض

مدیرہ —— رضیہ جمیل

مدیر منتظم —— آذر ریاض

مدیر اعزازی —— امت الصبور

قلمی معاون —— شاہین رشید

اشتہارات —— خالدہ جیلانی

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

MEMBER
APNS
CPNE

زر سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 6000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---- 7000 روپے

مستقل سلسلے

جون 2017
جلد 31 شمارہ 10
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: ۹۱ بی ڈی ری سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رخسانہ نگار عدنان

شعاع کا جون کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

رب کریم کا شکر اور احسان ہے کہ ایک بار پھر رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے۔ مہربان رب نے ہمیں نیکیاں بڑھانے اور جہنم سے آزادی حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔

رمضان وہ بابرکت، مقدس مہینہ ہے جب اللہ تعالیٰ کی رحمت عروج پر ہوتی ہے۔ اس کی بے پایاں نعمتوں کا نزول ہوتا ہے۔ اس کے دن بابرکت اور راتیں پُرنور ہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اس کی برکتوں سے مستفید ہوتے ہیں۔

روزہ اسی وقت کامل ہوتا ہے جب جھوٹ، غیبت، لڑائی جھگڑے اور فضول بے ہودہ گفتگو سے مکمل پرہیز کیا جائے۔ اس مہینے کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے اس لیے اسے فضول تماشوں میں ضائع نہ کیا جائے۔

رمضان المبارک میں ہر نیک عمل کا اجر بڑھ جاتا ہے۔ کوشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ وقت ذکر میں گزاریں۔ کاموں کے دوران چلتے پھرتے ——— استغفار اور درود شریف کا ورد کریں۔ اگر ممکن ہو تو تلاوت کے ساتھ ساتھ قرآن کو سمجھنے کی بھی کوشش کریں۔ رمضان المبارک میں ایک بار قرآن کو ترجمے کے ساتھ ضرور پڑھیں تاکہ سمجھ سکیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دنیا اور آخرت کی بھلائی کے لیے کیا ہدایات دی ہیں۔

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اس میں حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کچھ بندوں کا رزق دوسرے بندوں کے حوالے کر رکھا ہے۔ مالک ہیں تو اپنے ملازموں کا خیال کریں۔ خصوصاً خواتین اپنے گھر میں کام کرنے والی خواتین کا کام ہلکا کرنے کی کوشش کریں۔ اگر آپ ماتحت ہیں تو اپنی ذمہ داریاں اور فرائض پوری ذمہ داری سے ادا کرنے کی کوشش کریں۔

اس مہینے میں ہر نیک عمل کا ثواب بڑھا دیا جاتا ہے اس لیے فراخ دستی سے کام لیں۔ صدقہ و خیرات میں اضافہ کر دیں۔

یہی رمضان المبارک کا پیغام ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی برکتوں سے پوری طرح مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- امیل رضا کے ناول رقصِ کی آخری قسط،
- فرزانہ کھرل اور سلویٰ سیف اللہ بٹ کے مکمل ناول،
- تہمینہ چوہدری اور عابدہ احمد عابی کے ناولٹ،
- حنا بشریٰ، شازیہ الطاف ہاشمی، ام اقصیٰ، معصومہ اقبال اور ہاجرہ ریحان کے افسانے،
- عفت سحر طاہر کا ناول - خواب شیشے کا،
- جب مجھ سے ناتا جوڑا ہے - قارئین کے تجربات،
- دستک - معروف شخصیات سے گفتگو،
- بندھن - ماں اور حنا کا بندھن،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں - احادیث کا سلسلہ،
- خط آپ کے، آئینہ خانے میں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی رائے جاننے کے منتظر ہیں۔

شانِ اوجِ کمال تیری ذات
منبع ہر خیال تیری ذات

خالقِ بے مثال تیری ذات
رازقِ ذی کمال تیری ذات

ذرے ذرے پہ اختیار تیرا
ہے وسیع الکمال تیری ذات

مالک الملک تو رؤف و رحیم
مقتدر ذوالجلال تیری ذات

ہے ازل سے رہے گا تا بہ ابد
لم یزل لازوال تیری ذات

شکر ہم کیا ادا کریں گے گہر
رکھتی ہے جو خیال تیری ذات

گہر اعظمی

نعت رسول مقبول ﷺ

خدا کے بعد محمد کا نام کافی ہے
نبی کی سیرت و رب کا کلام کافی ہے

حضور آپ کی آنکھوں کو جس سے ٹھنڈک ہے
رکوع و سجدہ ہمیں وہ قیام کافی ہے

کرم ہو اتنا تو ربِ کریم کا مجھ پر
نبی کے شہر میں ہو جائے شام کافی ہے

حرا کے چاند نے ایمان کی روشنی کے لیے
زمانے کو جو دیا ہے پیام کافی ہے

جو آنسوؤں سے لکھی جائے نعت افضل ہے
جو ٹپکے آنکھ سے طاہر سلام کافی ہے

طاہر سلطانی

ادارہ

ماہ رمضان کی فضیلت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جو شخص ایمان رکھتے ہوئے اور ثواب کی نیت سے رمضان کے روزے رکھے ' اس کے سابقہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔" (بخاری)

فائدہ : اس سے مراد وہ صغیرہ گناہ ہیں جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے۔ کبیرہ گناہ توبہ سے معاف ہوتے ہیں اور حقوق العباد اس وقت تک معاف نہیں ہوتے جب تک انہیں ادا نہ کر دیا جائے ' الا یہ کہ صاحب حق معاف کر دے۔

شیطان کی قید

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب رمضان کی پہلی رات آتی ہے تو شیطانوں اور سرکش جنوں کو جکڑ دیا جاتا ہے۔ جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں ' ان میں سے کوئی دروازہ کھلا نہیں رہتا اور جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں ' ان میں سے کوئی دروازہ بند نہیں رہتا۔ اور ایک اعلان کرنے والا منادی کرتا ہے: "اے نیکی کے طلب گار ' آگے بڑھ اور اے برائی کے طلب گار ' رک جا۔"

اور اللہ تعالیٰ جہنم سے (بعض) لوگوں کو آزاد کرتا ہے۔ (رمضان میں) ہر رات اسی طرح ہوتا ہے۔" (ترمذی)

فوائد و مسائل :

1۔ ماہ رمضان نیکیوں کا مہینہ ہے ' اس مہینے میں اللہ کی طرف سے نیکیوں کے راستے میں حائل بڑی رکاوٹیں دور کر دی جاتی ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص نیکیوں سے محروم رہتا ہے یا برائیوں سے اجتناب کر کے اللہ کی رحمت حاصل نہیں کرتا تو یہ اس کا اپنا قصور ہے۔

2۔ شیطانوں اور سرکش جنوں کے قید ہو جانے کے باوجود ماہ رمضان میں انسانوں سے جو گناہ سرزد ہوتے ہیں ' اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انسان گیارہ مہینوں میں گناہوں کا مسلسل ارتکاب کرنے کی وجہ سے ان کے عادی ہو جاتے ہیں پھر رمضان میں نفس کی اصلاح کے لیے کوشش بھی نہیں کرتے ' یعنی روزے نہیں رکھتے کثرت سے تلاوت نہیں کرتے ' تراویح نہیں پڑھتے ' اس لیے نفس کی تربیت اور اصلاح نہ ہونے کی وجہ سے وہ گناہوں سے اجتناب نہیں کر سکتے۔

3۔ جنت کے دروازے کھل جانے اور جہنم کے دروازے بند ہو جانے سے حقیقتاً" ان دروازوں کا کھلنا اور بند ہونا بھی مراد ہے اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ مسلمان معاشرے میں ماہ رمضان کو خاص اہمیت دی جاتی ہے ' اس لیے نیکیوں کی طرف عام رجحان پیدا ہوتا ہے اور مسلمان ہر قسم کی نیکی کرنے پر مستعد ہو جاتے ہیں اور ہر قسم کے گناہ سے بچنے کی شعوری کوشش کرتے ہیں۔ گویا یہ نیکیاں جنت کے دروازے ہیں اور گناہ جہنم کے دروازے۔

4۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیکیوں میں آگے بڑھنے اور گناہوں سے باز آنے کا اعلان بھی اس لیے ہے کہ مسلمان نیکیاں کرنے اور گناہوں سے بچنے کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کریں۔

5۔ ہر رات بعض لوگوں کی جہنم سے آزادی بھی ماہ رمضان کا خصوصی شرف ہے۔ گناہوں سے توبہ کر

کے ہر مسلمان اس شرف کو حاصل کر سکتا ہے۔

جہنم سے آزادی

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اللہ تعالیٰ ہر افطار کے وقت کچھ لوگوں کو آزاد فرماتا ہے۔ اور یہ (رمضان کی) ہر رات میں ہوتا ہے۔"

فائدہ :
جہنم سے آزادی کا یہ شرف خلوص کے ساتھ سنت کے مطابق روزہ رکھ کر اور گناہوں سے توبہ کر کے حاصل ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

شب قدر

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا: رمضان کا مہینہ شروع ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"تمہارے پاس یہ مہینہ آگیا ہے' اس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینے سے افضل ہے' جو اس رات (کا ثواب حاصل کرنے) سے محروم رہا' وہ ہر بھلائی سے محروم رہا۔ اس کے خیر سے وہی محروم رہتا ہے جو واقعی محروم ہے۔" (طبرانی)

فوائد و مسائل :

1۔ اس مہینے کی افضل ترین رات لیلتہ القدر ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی سورۃ القدر میں ہے۔

2۔ شب قدر کی عبادت کا ثواب حاصل کرنے کے لیے رمضان کے آخری عشرے کا اعتکاف مسنون ہے' تاہم اگر کوئی شخص اعتکاف نہ کر سکے' تب بھی راتوں کی عبادت' خصوصاً" طاق راتوں کی عبادت میں سستی نہیں کرنی چاہیے۔

3۔ ایک رات عبادت میں گزارنے سے تیس ہزار سے زیادہ راتوں کی عبادت کا ثواب مل رہا ہو' پھر بھی کوئی شخص محض سستی کی وجہ سے یہ ثواب حاصل نہ کر سکے تو یہ واقعی بہت بڑی محرومی ہے۔

یہ روایت بعض حضرات کے نزدیک حسن صحیح ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جب شعبان آدھا ہو جائے تو رمضان آجانے تک کوئی روزہ نہیں۔" (ابوداؤد)

فائدہ :
مطلب یہ ہے کہ رمضان قریب آجانے پر نفلی روزوں سے اجتناب بہتر ہے تاکہ نفل اور فرض روزوں میں امتیاز ہو جائے اور کوئی شخص اس قدر کمزور نہ ہو جائے کہ رمضان کے روزوں میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہو۔

چاند دیکھنا

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جب تم چاند دیکھو تو روزے رکھو' اور جب چاند دیکھو تو روزے چھوڑ دو۔ اگر تم پر بادل چھا جائے تو اس کا اندازہ کر لو۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

1۔ چاند نظر آنے پر قمری مہینہ شروع ہو جاتا ہے۔ رات اپنے بعد والے دن کے ساتھ گنی جاتی ہے۔

2۔ چاند دیکھ کر روزہ رکھنے کا مطلب رات ہی کو روزہ رکھنا نہیں کیونکہ روزے کا وقت صبح صادق سے شروع ہوتا ہے۔

3۔ چاند دیکھ کر روزہ چھوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ جب شوال کا چاند نظر آجائے تو وہ رات شوال کی پہلی رات ہو گی۔ رمضان کے احکام ختم ہو جائیں گے۔ اگر سورج غروب ہونے سے پہلے چاند نظر آجائے' جیسے بعض اوقات تیس کا مہینہ ہونے کی صورت میں ہو جاتا ہے تو سورج غروب ہونے سے پہلے روزہ افطار نہ کیا جائے کیونکہ روزہ غروب آفتاب پر ختم ہوتا ہے۔

4۔ بادل ہونے کی صورت میں اندازہ کرنے کا

مطلب تیس روزے پورے کرنا ہے کیونکہ دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں۔ "اگر بادل ہو جائیں تو تیس کی گنتی پوری کر لو۔" (صحیح بخاری)

5۔ تیسواں روزہ رکھنے کو اندازہ اس لیے کہا گیا ہے کہ مذکورہ صورت میں چاند نہ ہونا یقینی نہیں لیکن چاند ہونے کا یقین نہ ہونے کی وجہ سے رمضان کے باقی رہنے کا حکم لگایا گیا ہے۔ اگر یقینی خبر سے چاند ہونا ثابت ہو جائے تو روزہ چھوڑ دیا جائے گا۔

انتیس روزے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تیس روزوں کی نسبت انتیس روزے زیادہ دفعہ رکھے۔ (ابو داؤد)

فوائد و مسائل :

1۔ روزے فرض ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں نو بار ماہ رمضان آیا کیونکہ روزے کی فرضیت ۲ھ میں ہوئی اور ۱۱ھ کا رمضان آنے سے پہلے ماہ ربیع الاول میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم رحلت فرما گئے۔ اس دوران میں کم از کم پانچ بار رمضان کے انتیس روزے ہوئے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تیس کا ہونا ضروری نہیں مہینہ' کبھی انتیس کا ہوتا ہے کبھی تیس دن کا۔

عید

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"عید الفطر اس دن ہے جس دن تم (رمضان مکمل کر کے) روزہ چھوڑتے ہو اور عید الاضحیٰ اس دن ہے جس دن تم قربانی کرتے ہو۔" (ابو داؤد)

فائدہ :

عید اجتماعی عبادت ہے' اس لیے اگر کسی شخص کو چاند ہونے یا نہ ہونے میں شک ہو' تب بھی اسے عام مسلمانوں کے ساتھ ہی عید منانی چاہیے' اسی لیے چاند کے ثبوت کے لیے کثیر تعداد کی شرط نہیں رکھی گئی بلکہ دو قابل اعتماد افراد کی گواہی پر اعتماد کیا گیا ہے۔

سفر میں روزہ رکھنا

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں (کبھی) روزہ رکھا اور (کبھی) چھوڑ دیا۔"

فائدہ :

جس سفر میں نماز قصر کرنا جائز ہے اس میں مسافر کے لیے روزہ چھوڑنا بھی جائز ہے' خواہ سفر پیدل ہو یا سواری پر اور سواری خواہ گاڑی ہو یا ہوائی جہاز وغیرہ اور خواہ تھکاوٹ لاحق ہوتی ہو جس میں روزہ مشکل ہو یا تھکاوٹ لاحق نہ ہوتی ہو' خواہ سفر میں بھوک پیاس لگتی ہو یا نہ لگتی ہو کیونکہ شریعت نے سفر میں نماز قصر کرنے اور روزہ چھوڑنے کی مطلق اجازت دی ہے اور اس میں سواری کی نوعیت یا تھکاوٹ اور بھوک پیاس وغیرہ کی کوئی قید نہیں لگائی۔

"تم میں سے جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ (رمضان کے علاوہ) دوسرے دنوں سے گنتی پوری کر لے۔" (البقرہ 2۔184)

علاوہ ازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے کہ اس کی عطا کردہ رخصتوں کو قبول کیا جائے جس طرح وہ اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ اس کی معصیت و نافرمانی کا ارتکاب کیا جائے۔ (مسند احمد ۲/۱۰۸)

البتہ اگر روزہ رکھنے میں کوئی تکلیف نہ ہو اور کوئی روزہ رکھ لے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور اگر تکلیف ہو تو پھر روزہ رکھنے سے احتراز کرنا چاہیے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت حمزہ بن عمرو اسلمی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا اور کہا۔

"میں (نفلی) روزے رکھا کرتا ہوں' کیا سفر میں بھی روزہ رکھ لیا کروں؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر تو چاہے تو روزہ رکھ لے' چاہے تو چھوڑ دے۔"

سفر میں روزہ چھوڑنا

حضرت کعب بن عاصم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں۔" (نسائی)

فائدہ: مطلب یہ ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ چاہے کتنی بھی مشقت ہو' سفر میں روزہ ضرور رکھنا ہے۔ یہ سمجھنا اور اس کے مطابق عمل کرنا کوئی نیکی نہیں ہے کیونکہ دین میں آسانی ہے' مشقت نہیں ہے' اس لیے شریعت کی عطا کردہ آسانی کو قبول کرنے کے بجائے مشقت ہی کو اختیار کرنا نیکی نہیں ہے۔ یہ حکم اس وقت ہے جب شدید مشقت ہو اور روزہ پورا کرنے کی صورت میں بیماری کا خوف ہو۔

حاملہ اور دودھ پلانے والی کا روزہ چھوڑنا

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھڑ سوار دستے نے ہمارے قبیلے پر حملہ کیا۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ کھانا کھا رہے تھے تو آپ نے فرمایا:

"آجاؤ' کھانا کھالو۔"

میں نے کہا: "میرا روزہ ہے۔"

فرمایا: "بیٹھ جاؤ! میں تمہیں روزے کی بات بتاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے مسافر کو آدھی نماز معاف کر دی ہے اور مسافر' حاملہ اور دودھ پلانے والی کو روزہ یا روزے معاف کر دیے ہیں۔"

اللہ کی قسم! نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دونوں لفظ فرمائے یا ان میں سے ایک لفظ فرمایا۔ مجھے اپنے آپ پر افسوس ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کھانے میں شریک نہ ہوا۔ (ابوداؤد)

فوائد و مسائل:

1۔ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا' اس وقت حضرت انس بن مالک کعبی رضی اللہ عنہ مسلمان ہو چکے تھے جب کہ ان کا قبیلہ ابھی مسلمان نہیں ہوا تھا۔

2۔ مسافر کو آدھی نماز معاف ہونے کا یہ مطلب ہے کہ جن نمازوں میں چار رکعت فرض ہیں' ان میں دو رکعت فرض نماز ادا کی جائے۔ فجر اور مغرب کی نماز سفر میں بھی پوری پڑھی جاتی ہے۔

3۔ روزے دار کو کھانے کی دعوت دی جائے تو وہ اپنے روزے کا اظہار کر سکتا ہے' یہ ریا میں شامل نہیں۔

مسافر' بچے کو دودھ پلانے والی اور حاملہ کے لیے رعایت ایک ہی سیاق میں بیان ہوئی ہے' مگر تفصیل میں فرق ہے کہ مسافر کو روزہ معاف ہے' مگر قضا ادا کرنا واجب ہے۔ اور مریض اور حاملہ کی بابت علماء کی چار آراء ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

1۔ ایک رائے تو یہ ہے کہ ان کے لیے فدیہ ہی کافی ہے' بعد میں قضا نہیں۔

2۔ دوسری رائے یہ ہے کہ ان پر قضا ہے نہ فدیہ۔ یہ رائے حافظ ابن حزم کی ہے

3۔ تیسری رائے یہ ہے کہ فدیہ طعام کے علاوہ بعد میں وہ قضا بھی دیں۔

4۔ چوتھی رائے یہ ہے کہ وہ مریض کے حکم میں ہیں وہ روزہ چھوڑ دیں' انہیں فدیہ دینے کی ضرورت نہیں اور بعد میں قضا دیں۔ مولانا محمد علی جانباز نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔

رمضان کے چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: میرے ذمے رمضان کے روزے ہوتے تھے تو میں ان کی قضا نہیں دیتی تھی حتیٰ کہ شعبان آجاتا۔ (بخاری)

فوائد و مسائل:

رمضان میں عذر شرعی کی بنا پر جو روزے چھوٹ جائیں' ان کی قضا سال بھر میں کسی وقت بھی دی جا سکتی ہے' ضروری نہیں کہ وہ روزے شوال ہی میں

رکھے جائیں۔

بھولے سے کچھ کھالینا؟

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے روزے کی حالت میں بھول کر کچھ کھالیا اسے چاہیے کہ اپنا روزہ پورا کرے' اسے اللہ نے کھلایا اور پلایا ہے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اسلام کے احکام میں انسانی فطرت کی کمزوریوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ بھول جانا انسان کی فطرت ہے' اس لیے اللہ تعالیٰ نے بھول کر کیے ہوئے کام کو گناہوں میں شمار نہیں کیا۔ روزے کے بارے میں مزید رحمت فرمائی کہ کھانے پینے کے باوجود روزے کو قائم قرار دیا۔ اللہ کے کھلانے پلانے کا یہی مطلب ہے۔

2۔ بھول کر کھانے پینے سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ گناہ ہوا یا نہ ہو' روزہ تو قائم نہیں رہا کیونکہ روزہ تو کھانے پینے سے پرہیز کا نام ہے' اور وہ پرہیز ٹوٹ گیا ہے۔ روزہ دار کو چاہیے کہ روزے کا باقی وقت اسی طرح گزارے جس طرح عام حالات میں روزے کی پابندیوں کے ساتھ گزارتا ہے۔ اس کا یہ روزہ شرعاً" صحیح ہوگا' لہٰذا اس کی قضا لازم نہیں ہوگی' نہ کوئی کفارہ ادا کرنا ہوگا۔

غلط فہمی

حضرت اسماء بنت ابو بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک ابر آلود دن میں ہم نے روزہ کھول دیا (یہ سمجھے کہ سورج غروب ہوچکا ہے) لیکن پھر (بادل ہٹ گئے اور سورج نکل آیا۔" (بخاری)

(ابو اسامہ رحمتہ اللہ کہتے ہیں:) میں نے ہشام بن عروہ رحمتہ اللہ سے کہا: کیا انہیں (روزے کی) قضا کا حکم دیا گیا تھا؟ انہوں نے کہا: یہ تو ضروری تھا۔

فائدہ : حدیث میں مذکور صورت بھول کر کھانے پینے سے مختلف ہے کیونکہ انہوں نے بھول کر نہیں کھایا پیا بلکہ ارادے سے اپنے خیال میں روزہ کھولا تھا۔ اگرچہ غلط فہمی کی بنا پر وقت سے پہلے کھول دیا تھا۔ اس غلط فہمی کی بنا پر وہ گناہ گار تو نہیں ہوئے لیکن روزہ یقیناً" ناقص ہوگیا۔ ایسے روزے کی قضا کی بابت علماء میں اختلاف ہے' تاہم جمہور علماء کے نزدیک ایسی صورت میں افطار کیے ہوئے روزے کی قضا واجب ہے۔

روزے کی حالت میں قے

حضرت فضالہ بن عبید انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے دن ان کے پاس تشریف لائے جس دن آپ روزہ رکھا کرتے تھے۔ آپ نے (پانی کا) برتن طلب فرمایا اور پی لیا۔ ہم نے کہا۔ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ تو وہ دن ہے جس دن آپ روزہ رکھا کرتے تھے۔" فرمایا:

"ہاں' لیکن مجھے قے آگئی تھی۔"

روزے میں مسواک کرنا اور سرمہ لگانا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"روزے دار کے بہترین اعمال میں سے ایک عمل مسواک بھی ہے۔"

فائدہ :

1۔ صحیح روایات سے روزے کی حالت میں مسواک کرنا ثابت ہے۔ اس سے روزے میں فرق نہیں آتا۔ حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ سے مذکور ہے' انہوں نے فرمایا "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روزے کی حالت میں مسواک کرتے اتنی بار دیکھا ہے کہ میں شمار نہیں کرسکتا۔" (صحیح البخاری)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے کی حالت

میں سرمہ لگایا۔

علاوہ ازیں روزے کی حالت میں سرمہ ڈالنے کی بابت حضرت انس رضی اللہ عنہ کا عمل سنن ابوداؤد میں مروی ہے کہ وہ روزے کی حالت میں سرمہ لگایا کرتے تھے۔ اسے شیخ البانی رحمتہ اللہ نے حسن موقوف قرار دیا ہے' اسی طرح سنن ابوداؤد ہی میں ہے کہ جناب اعمش کہتے ہیں (یہ صغار تابعین میں سے ہیں) کہ میں نے اپنے اہل علم دوستوں (فقہاء و محدثین) میں سے کسی کو نہیں پایا کہ روزے دار کے لیے سرمے کو مکروہ سمجھتے ہوں۔ اور ابراہیم نخعی اجازت دیتے تھے کہ روزے دار ایلوا کو بطور سرمہ استعمال کرے۔

ان دلائل کی روشنی میں روزے کی حالت میں آنکھوں میں سرمہ ڈالنے سے روزے کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

روزے دار کا سینگی لگوانا

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے۔ "سینگی لگانے والے اور لگوانے والے نے روزہ کھول دیا۔" (ابوداؤد)

فوائد و مسائل:

سینگی یا پچھنے لگانا ایک طریقہ علاج ہے جس میں ایک خاص طریقے سے جسم سے خون نکالا جاتا ہے۔ مریض کے جسم پر کسی تیز دھار آلے سے زخم لگا کر ایک دوسری چیز کے ذریعے سے خون چوسا جاتا ہے۔

اگر کوئی شخص روزہ رکھ کر کسی کو سینگی لگائے یا کوئی روزہ دار سینگی لگوائے تو کیا ان کا روزہ ٹوٹ جائے گا یا قائم رہے گا؟

اس بارے میں علمائے کرام میں دو مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔

جو لوگ روزہ ٹوٹنے کے قائل ہیں' ان کی دلیل یہی حدیث ہے جو حضرت ثوبان' حضرت شداد بن اوس' حضرت رافع بن خدیج اور حضرت ابوہریرہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ہے۔ امام ابن قیم رحمتہ اللہ کا بھی یہی موقف ہے۔

اس کے برعکس حضرت عبداللہ بن عباس' حضرت عائشہ اور خود حضرت ابوہریرہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ رکھ کر سینگی لگوائی اور ان کے نزدیک سینگی لگوانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا: کیا آپ لوگ (عہد نبوی میں) روزہ دار کے لیے سینگی لگوانا ناپسند کرتے تھے؟ انہوں نے فرمایا: "نہیں' صرف کمزوری کی وجہ سے مکروہ سمجھا جاتا تھا۔" (صحیح البخاری)۔

حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبداللہ بن عمر رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی روزے کی حالت میں سینگی لگوالیا کرتے تھے۔ امام مالک رحمتہ اللہ نے فرمایا: "روزے دار کو سینگی لگوانا صرف اس لیے مکروہ ہے کہ کمزوری کا اندیشہ ہوتا ہے۔"

وزیر کا کام

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جب اللہ تعالیٰ کسی حاکم کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے راست باز (خیر خواہ) وزیر عطا کردیتا ہے۔ وہ اگر بھولتا ہے تو وہ وزیر اسے یاد کرا دیتا ہے۔ اگر اسے یاد ہو تو اس کی مدد کرتا ہے اور جب بھلائی کے علاوہ کسی اور بات (برائی) کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کے لیے برا وزیر مقرر کر دیتا ہے۔ اگر وہ بھول جائے تو اسے یاد نہیں کراتا اور اگر اسے یاد ہو تو اس کی مدد نہیں کرتا۔" (اسے ابوداؤد نے جید سند کے ساتھ روایت کیا ہے جو کہ مسلم کی شرط پر ہے۔)

شاہین رشید

سائرہ شہروز

"کیا حال ہے سائرہ شہروز؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"فلم کا کیا رسپانس آیا؟"

"بہت اچھا... لوگوں نے پسند کی' اچھا بزنس ہوا اور ابھی مزید بزنس بھی دے گی۔"

"فلم غازی کے بارے میں کیا کہیں گی؟"

"غازی کی اسٹوری بہت بہترین ہے اور یہ بہت زیادہ بزنس کرے گی ان شاء اللہ... میں نے جس طرح کی فلم میں کام کرنے کا سوچا تھا۔ یہ فلم ویسی ہی ثابت ہوگی۔"

"پہلے "وی جے" پھر ڈرامے اور اب فلم... ترقی کے اس سفر میں کہاں ٹھہر جانے کو دل چاہا...؟"

"جب جب کامیابی ملی' شہرت ملی لگا یہی منزل ہے' یہیں رُک جاؤں مگر پھر اپنی ساتھیوں کو آگے اور بہت آگے جاتے دیکھا تو دل چاہا کہ میں بھی آگے جاؤں... بہت آگے... اور اللہ کا شکر ہے کہ میں آگے آگے بڑھتی گئی۔"

"اب فیوچر میں کیا کرنا ہے؟"

"دل چاہتا ہے کہ فیوچر میں ڈائریکشن کی طرف آؤں... بہت اچھا لگتا ہے یہ شعبہ... اور میری خواہش ہے کہ میں کسی فلم کی ڈائریکشن دوں... اور شہروز اس فلم میں ہوں... اور' اور فلم کے لیے کہانی بھی لکھنا چاہتی ہوں... جو کہ ایک "لو اسٹوری" ہوگی۔ خواب تو بہت دیکھتی ہوں۔ دیکھیں کہ کب تعبیر ملتی ہے۔"

"اور وہ شیف بننے کا خواب؟"

"وہ خواب تھا... اب بھی موقع ملا تو ضرور کچھ کروں گی۔ ویسے پکانے کا شوق گھر میں کبھی کبھار پکا کر پورا کر ہی لیتی ہوں۔"

"یہ تو گھر کی بات ہے... اور گھر میں تو ہر لڑکی پکاتی ہے خیر۔ ڈرامے اور فلم میں بنیادی فرق کیا ہے؟"

"بنیادی اور واضح فرق تو یہی ہے کہ ڈرامہ چلتا رہتا ہے' چلتا رہتا ہے اور فلم تین گھنٹوں میں ختم ہو جاتی ہے... ڈرامے اور فلم کی شوٹنگ میں بھی کافی فرق ہے۔"

"مشکل کہاں ہوتی ہے؟"

"مجھے تو نہیں بھی نہیں ہوتی۔۔۔ہاں یہ ضرور ہے کہ ڈرامے میں ایک دن میں ہم کئی سین مکمل کر لیتے ہیں جبکہ فلم میں ایک ہی سین مکمل ہوتا ہے۔اور ایک سین کی کئی کئی بار ریہرسل ہوتی ہے۔"

"فلم اور ڈرامے کے فنکار کیا الگ الگ نہیں ہونے چاہئیں؟"

"نہیں۔۔۔کیوں کہ سب کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ قدم بہ قدم آگے بڑھیں جو ڈراموں میں آتے ہیں ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ فلم کی اسکرین تک بھی آئیں یہ تو سب کا خواب ہے۔ہاں یہ صحیح ہے کہ سب فلم کے لیے نہیں ہوتے اور سب ڈراموں کے لیے نہیں ہوتے۔۔۔مگر یہ دیکھنا ڈائریکٹر کا کام ہے۔"

"ملک سے باہر سفر کرنے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے آپ کو' واپس آنے کو دل چاہتا ہے؟"

"کیوں نہیں۔۔۔جس نے ہمیں پہچان دی' عزت دی۔جہاں سب اپنے پیارے رہتے ہوں۔۔۔وہاں بھلا واپس آنے کو کیوں نہیں دل چاہے گا۔اور پھر ہم تو دوسرے ملکوں میں اپنے ملک کے سفیر ہوتے ہیں۔۔۔ ہمیں تو اپنے ملک کا اچھا امیج پیش کرنا ہے۔سچ میں مجھے تو پاکستان واپس آکر بہت اچھا لگتا ہے۔"

"فلم میں کام کرنا آرٹسٹوں کا خواب ہوتا ہے۔۔۔ انڈین فلموں میں کام کرنا بھی ہمارے فنکاروں کا خواب ہوتا ہے؟"

"انڈین فلموں میں اور ہالی ووڈ کی فلموں میں کام کرنا بھی خواب ہوتا ہے اور الحمد للہ مجھے دونوں جگہوں سے آفر آچکی ہے۔بھارتی فلم کے لیے اس لیے انکار کیا کہ فیملی کے کچھ مسائل تھے' فیملی میں شادی بھی تھی اور ہالی ووڈ میں اس لیے انکار کیا کہ رول تو اچھا تھا مگر کچھ سین قابل اعتراض تھے۔اس لیے۔۔۔بس۔۔۔ ویسے اب کوئی اچھی آفر آئی تو ضرور قبول کروں گی۔"

"شوبز میں مصروف رہنے کی وجہ سے گھریلو مسائل تو جنم نہیں لیتے؟"

"ارے نہیں۔۔۔ہماری تو پوری فیملی ہی اس فیلڈ

میں ہے تو بھلا مجھے مشکل کیوں پیش آئے گی۔ شہروز ... میرے سسر صاحب اور گھر کے سب لوگ بہت کوآپریٹو ہیں ... اس لیے کوئی مسائل کھڑے نہیں ہوتے۔"

"گڈ...!"

عدنان شاہ ٹیپو

"کیا حال ہے جی؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"آج کل کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟"

"آج کل کچھ فلموں میں مصروف ہوں۔ ایک فلم کا نام ہے "جیک پوٹ" "اے دل چل رے" جیک پوٹ کو شعیب خان ڈائریکٹ کر رہے ہیں۔ جبکہ دوسری فلم کے پروڈیوسر اویس ہیں۔ پہلی فلم میں جاوید شیخ' اسماعیل تارا' نور' صنم چودھری اور انڈیا سے ایک لڑکی ہے "سمتھنک ملہوترا" ٹی وی سے بھی کافی پروگرام آن ایئر ہیں۔ ان میں "دلّی والے دلارے ماموں" "اے آروائی سے آن ایئر ہے۔ "خدا میرا بھی ہے" ابھی حال ہی میں ختم ہوا ہے اور اے آر وائی کے ہی دوسرے چینل سے آن ایئر ہے۔ "بے بی" ایکسپریس ٹی وی سے چل رہا ہے "ڈگی میں چاند نکلا" ٹی وی ون سے آن ایئر ہے' اور ابھی حال ہی میں ختم ہوا ہے تو ماشاء اللہ کافی کام ہے' جو میں کر رہا ہوں۔"

"خدا میرا بھی ہے" میں آپ نے خواجہ سرا کا کردار کیا۔ سیریل بہت اچھا تھا... لوگوں نے کچھ سیکھا ہوگا۔"

"خدا میرا بھی ہے" ایک بہت ہی مختلف ڈرامہ تھا اور میرا کردار بھی بہت مختلف تھا... اس میں بہت باریک باریک ایموشن (جذبات) تھے جن سے ہر انسان گزرتا ہے... اور خواجہ سرا چونکہ بہت ہی نظر انداز کیے جانے والے لوگ ہوتے ہیں اور انہیں وہ عزت نہیں دی جاتی جو کہ ایک نارمل انسان کو دی جاتی ہے... اس لیے ان کی محرومی کی جو شدت ہے وہ ایک نارمل انسان سے بہت مختلف اور الگ ہوتی ہے۔ تو اسے پورٹریٹ کرنا یقیناً "بہت مشکل کام ہے... مجھے یاد ہے کہ جب میں فورتھ یا ففتھ کلاس میں پڑھتا تھا تو میں نے ایک کہانی پڑھی تھی "فالتو کوئی بھی نہیں" دنیا میں کوئی بھی چیز فالتو نہیں ہے آپ ایسے لوگوں کو ریجیکٹ نہیں کر سکتے' اگر کوئی ایسا ہے تو اس کی تربیت اس انداز میں کریں کہ وہ معاشرے کے لیے ایک کارآمد انسان بن سکے۔"

"جو سڑکوں پر خواجہ سرا پھر رہے ہوتے ہیں ان کے لیے کیا کہیں گے؟"

"ایسے لوگوں کو اگر حکومت کی سرپرستی مل جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی ہمارے معاشرے کا کارآمد پرزہ بن سکتے ہیں۔"

"جی بالکل... بہت سے ایسے لوگ فیشن ڈیزائنر ہیں' میک اپ آرٹسٹ ہیں... اور دیگر شعبوں میں بھی کام کر رہے ہیں... بس اچھی تعلیم اور تربیت کی ضرورت ہے۔"

"جی بالکل..."

"آپ کا ایک ڈرامہ آن ایئر ہے "مسٹر شمیم" اس میں آپ کے بالوں کا گیٹ اپ ویسا ہی ہے جیسا آپ نے خدا میرا بھی ہے کی چند اقساط میں کیا۔ کیا کہیں گے

آپ؟"

"میرا خیال ہے کہ آپ میرے ڈراموں کو مکس کر رہی ہیں۔ میں نے مسٹر قسیم میں کوئی ایسا گیٹ اپ نہیں کیا اور آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ کبھی کبھی ایسا ہو بھی جاتا ہے۔۔۔ پھر بھی ہم لوگ کوشش کرتے ہیں کہ کوئی کمی یا کسر رہ نہ جائے۔"

"ڈراموں پہ زیادہ فوکس کیا ہوا ہے یا فلم پہ زیادہ توجہ ہے؟"

"دونوں میڈیا پہ میرا فوکس ہے اور جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میں دو تین فلمیں بھی کر رہا ہوں۔۔۔ اور ماشاءاللہ سے ڈراموں میں بھی کافی مصروف ہوں۔ تو بس اللہ کا شکر ہے۔ کام بہت اچھا چل رہا ہے۔"

"عموماً فنکاروں سے پوچھا جاتا ہے کہ ڈراموں کے علاوہ آپ کیا کرتے ہیں۔۔۔ تو کیا یہ ابھی تک ہوائی روزی ہے؟"

"ہوائی روزی والی باتیں اب پرانے زمانے والی باتیں ہو گئی ہیں۔۔۔ یہ باقاعدہ ایک کام ہے۔ پروفیشن ہے اور اس میں ماشاءاللہ بہت ٹھیک ٹھاک پیسے ملتے ہیں۔۔۔ اور کوئی بھی کام ہو۔۔۔ اگر محنت کے ساتھ اور دل لگا کر کریں تو اللہ تعالیٰ بہت کامیابی دیتا ہے۔"

"بالکل۔۔۔ اور اب تو اتنے چینل کھل گئے ہیں۔ بڑی تعداد میں ڈرامے ہو رہے ہیں۔۔۔ تو واقعی یہ ایک انڈسٹری بن گئی ہے؟"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں' یہ اب انڈسٹری بن چکی ہے اور ہم فنکار بہت ایمانداری سے کماتے ہیں۔۔۔ کون سا ایسا کام ہے جس میں اتنی ایمانداری ہو گی' ایک ہفتے میں 70'70 سیریز بن رہے ہیں تو کام تو ماشاءاللہ بہت زیادہ ہے اور اب تو آرٹسٹوں کے پاس ڈیٹ نہیں ہوتیں۔۔۔ ہوائی روزی اس وقت ہوتی تھی جب ایک ہی چینل یعنی پی ٹی وی ہوتا تھا یا پھر ایس ٹی این ہوتا تھا۔ اب ماشاءاللہ ایسا کچھ نہیں ہے۔"

"آپ جیسے اچھے بااخلاق اور محنت سے اپنا مقام بنانے والوں کو کبھی زوال نہیں آتا۔۔۔ پھر بھی اپنے بچوں کے فیوچر سے ڈرتے ہیں؟"

"اس بات پہ تو کمپرومائز ہے ہی نہیں کہ بچوں کے فیوچر کے بارے میں کچھ نہیں سوچنا۔۔۔ یا انہیں اچھی ایجوکیشن دینی ہے یا نہیں۔ انہیں بہت اچھی تعلیم دینی ہے۔۔۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ آپ اچھے ماں باپ تو ہو سکتے ہیں مگر نعوذباللہ خدا نہیں۔۔۔ ہر والدین اپنے بچوں کو اچھے سے اچھا فیوچر دیتے ہیں اور ہم بھی اپنے بچوں کو ہر سہولت دے رہے ہیں اور اللہ کا شکر ہے کہ اس میں ہم کافی کامیاب ہیں اور میں اپنے آپ کو ایک بہت خوش قسمت انسان سمجھتا ہوں کہ میں ایک باپ ہوں' صاحب اولاد ہوں اور اپنے بچوں کے لیے کچھ کر رہا ہوں۔۔۔ ماں باپ تو بچوں کے لیے جتنا بھی کچھ کر لیں انہیں کم ہی لگتا ہے۔"

"اور گھر میں سب خیریت ہے؟۔۔۔ بیگم بچے ٹھیک ہیں؟"

"جی الحمد للہ سب خیریت ہے۔۔۔ اور بیگم بچے بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔۔۔ بس دعاؤں میں یاد رکھیں۔"

بندھن

مانی ہمراہ حرا

شاہین رشید

تقریباً" نو سال قبل معروف اداکار' ہوسٹ اور ورسٹائل فنکار "مانی" کی شادی ہوئی۔ ان کی اپنی پسند ہے۔ خوب چرچا ہوا اور شادی بھی دھوم دھام سے ہوئی۔ شوبز کی شادیوں کے بارے میں عموماً" یہی قیاس ہوتا ہے کہ کامیاب نہیں ہوں گی اور پھر اگر اپنی پسند سے ہو تو بس... مگر ماشاءاللہ مانی کو حرا سے شادی کیے نو سال ہو گئے ہیں۔ ماشاءاللہ دو پیارے پیارے بیٹے بھی ہیں اور زندگی انتہائی خوشگوار گزر رہی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ جب ان کی شادی ہوئی تھی تو سب سے پہلا انٹرویو میں نے کیا تھا... شروع شروع میں سب کچھ اچھا ہوتا ہے' وقت گزرنے پر میاں بیوی کا اصل روپ سامنے آتا ہے اور اگر دونوں کا تعلق شوبز سے ہو تو پھر شادی ایک سمجھوتا بن جاتی ہے... کیا حرا مانی کی زندگی بھی ایسی ہی ہو گئی ہے؟

"بندھن" کے لیے حرا اور مانی کا انٹرویو پڑھیے۔ آپ کو سب کچھ پتا چل جائے گا۔

"جی حرا؟ کیا حال ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے... آپ بتائیں۔"

"یہاں بھی۔ اللہ کا کرم ہے... زندگی کیسی گزر رہی ہے؟"

"الحمدللہ بہت اچھی۔"

"کتنے سال ہو گئے شادی کو؟ اور بچے تو اسکول جانے لگے ہوں گے؟"

"جی ماشاءاللہ شادی کو نو سال ہو گئے ہیں... ہماری شادی 17 اپریل 2008ء کو ہوئی اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہمارے دو بیٹے ہیں۔ مزمل بڑا بیٹا ہے اور ماشاءاللہ پہلے سال ہی دنیا میں آ گیا اور دوسرا بیٹا ابراہیم ہے۔"

"عموماً" جب گھر میں نئی دلہن آتی ہے تو خوب آؤ بھگت ہوتی ہے' پیار' محبت سب کچھ نچھاور ہو رہا ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ اصلی روپ سامنے آتا ہے... آپ کے ساتھ کیا ہوا؟"

"ایسا کچھ نہیں ہوا... محبتیں ابھی تک قائم ہیں اور مانی میں تو بالکل بھی چینج نہیں آیا... جیسا وہ پہلے دن تھا ویسا ہی اب بھی ہے۔ اس کے پیار میں کوئی کمی نہیں آئی۔ بلکہ اضافہ ہی ہوا ہو گا۔ اسی طرح سسرال بھی بہت اچھا ہے... اور خاص طور پر میری ساس۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں "امید" سے ہوئی تو میری ساس نے میرا بہت زیادہ خیال رکھا... اور مجھے کوئی کام نہیں کرنے دیتی تھیں اور ٹرے میں میرے لیے ناشتہ اور کھانا سجا کے لاتی تھیں۔

پھر کچھ عرصے کے بعد ہم لوگ علیحدہ ہو گئے... کیونکہ ہمارے گھر میں شوٹنگ وغیرہ ہوتی تھی تو امی (ساس) ڈسٹرب ہوتی تھیں... اور ہمارا یہ کام تھا... تو پھر ہم نے ڈی ایچ اے میں کرائے پہ گھر لے لیا۔ میرے سسر مانی کا بہت خیال رکھتے تھے اور ان کا ہر کام کر دیا کرتے تھے تو جب ہم علیحدہ ہوئے تو ہمیں سمجھاتے رہتے تھے کہ اپنی ذمہ داریاں کس طرح پوری کرنی ہیں۔

ابو کے (سسر) کے انتقال کو تقریباً" تین سال ہو گئے ہیں مگر وہ بہت یاد آتے ہیں۔ تو جب علیحدہ ہوئے تب بھی سسرال والوں نے بہت سپورٹ کیا۔ کیونکہ ہم دونوں میاں بیوی کم عمر تھے۔ تو میری نند ہمارے گھر آ کر کوکنگ وغیرہ کر کے جاتی تھیں اور ابھی تک میری

نند' میرے دیور سب بہت خیال رکھتے ہیں... لڑکیاں
سسرال والوں کی باتیں کرتی ہیں' مگر میرے سسرال
نے تو کبھی شکایت کا موقع ہی نہیں دیا... اور مزے کی
بات بتاؤں کہ گھر کے کام' کوکنگ یہ سب میری گھٹی
میں ہے تو میری ساس مجھے کام نہیں کرنے دیتی تھیں'
جبکہ مجھے کام کی بہت عادت تھی... اگرچہ نوکر تھے گھر
میں... مگر مجھے عادت تھی' اس طرح میرے سسر کو
میرے ہاتھ کے بنے ہوئے دال چاول بہت پسند تھے تو
خاص طور پر ان کے لیے بناتی تھی... تو میں کبھی کبھی
کسی بات پر موڈ خراب کرلیتی تھی یا غصہ دکھاتی تھی
... مگر وہ لوگ بہت پیار سے ہر مسئلہ کو سلجھا دیتے تھے
... اور چونکہ میری نند عائشہ باجی اس فیلڈ میں رہ چکی
ہیں تو اداکاری کے بارے میں میری بہت مدد کرتی ہیں۔
اسی طرح میرا دیور مجھے شوٹ پہ چھوڑ کر آتا ہے تو سب
ابھی تک بہت اچھے ہیں۔ حالانکہ ہماری پسند کی شادی
تھی۔

میری ساس' مانی کی سوتیلی امی ہیں اور بہت پڑھی
لکھی اور اردو میں ماسٹرز ہیں... اور انہیں سب بچوں
کی نفسیات پتا ہے کہ کس طرح سب بچوں کے ساتھ
ڈیل کرنا ہے۔ وہ ہم سب کو جوڑ کر رکھتی ہیں... عموماً"
لڑکیاں مبالغہ آرائی سے کام لے رہی ہوتی ہیں...
لیکن میرا سسرال واقعی بہت اچھا ہے۔"

"سب کچھ بہت اچھا تھا... مگر کبھی دشوار گزار
راستوں سے گزرنا ہوا؟ کوئی نشیب و فراز آئے؟ کہاں
تھک کے بیٹھ گئیں۔ کہاں اپنے آپ کو دوبارہ زندہ کیا؟"

"میری جب مانی سے شادی ہوئی تو اس وقت مانی
شہرت کی بلندیوں پہ تھا اور بہت کام کر رہا تھا... مانی
سیلف میڈ انسان ہے۔ اس نے باپ دادا کی جائیداد
سے کچھ نہیں بنایا بلکہ ہر چیز خود بنائی ہے۔ مانی اپنی والدہ
کی طرح سیلف میڈ انسان ہے... اور بالکل آپ نے
ٹھیک کہا کہ زندگی میں نشیب و فراز آئے اور ہم دونوں
نے ایک دوسرے کو سپورٹ کیا... کبھی میرے پاس
کام زیادہ ہوتا تھا' کبھی مانی کے پاس... تو کام کی وجہ سے
یا پیسے کی وجہ سے ہم دونوں نے کبھی ایک دوسرے کو
پریشان نہیں کیا... اور ہر فیلڈ میں اونچ نیچ آتی ہے۔
ہمارے درمیان بھی آئی مگر ہم دونوں نے نہ صرف
ایک دوسرے کو سپورٹ کیا بلکہ سر جوڑ کر بیٹھتے کہ
آئندہ کے لیے کیا کرنا ہے... اور سچ بتاؤں کہ مجھے مانی
نے کبھی کوئی تکلیف نہیں دی... میری ہر ضرورت کو

پورا کیا۔۔۔ مجھے مانی میں اپنے ابو کا عکس نظر آتا ہے اور میں بہت حیران ہوتی ہوں۔

ایک واقعہ آپ کو بتاؤں کہ ایک دفعہ ہم "استنبول" گئے ہوئے تھے تو مانی مجھے شاپنگ کروا رہا تھا تو اچانک سے میں دیکھتی ہوں کہ مانی کبھی ایک شاپ پہ جا رہا ہے۔ کبھی کسی شاپ پہ جا رہا ہے 'ارے یہاں دیکھو یہ کتنا اچھا ہے۔ یہ چیز کتنی اچھی ہے۔ تو مجھے ایک دم سے اپنے ابو کا خیال آیا کہ ارے مانی تو بالکل میرے ابو کی طرح مجھے چیزیں دلا رہا ہے اور دکھا رہا ہے' تو مانی کی بہت سی باتیں میرے ابو سے ملتی جلتی ہیں۔۔۔ اسی طرح مانی کے ابو بھی (اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے) بہت پیار کرتے تھے مجھ سے۔ تو اللہ کا شکر ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا کہ میں گھبرا گئی ہوں اور مجھے دوبارہ اپنے آپ کو زندہ کرنے کی ضرورت پیش آئی ہو۔"

"بچے چھوٹے تھے جب تم اس فیلڈ میں آ گئیں۔۔۔ تو گھر ڈسٹرب ہوا؟"

"جب بچے چھوٹے تھے تو بہت عرصہ میں نے کام نہیں کیا' مجھے بڑے بڑے سیریلز آفر ہوئے مومنہ درید کے اور میں نے کام بھی کیا' سلطانہ آپا ۔۔۔ نے مجھے مارننگ شو دیا۔۔۔ تو کبھی کبھی میں انکار کر دیتی تھی کہ میرے بچے بہت چھوٹے ہیں۔ میں کام نہیں کر سکتی' تو ایسے موقع پر مجھے مانی نے بہت سپورٹ کیا کہ میں ہوں' تم فکر نہ کرو۔۔۔ تو میں کر لیتی تھی۔ پھر بیچ بیچ میں چھوڑ بھی دیتی تھی۔۔۔ مجھے اچانک یہ خیال پریشان کرنے لگتا تھا کہ میرے۔ بچوں کو ماسیاں پالیں گی۔۔۔ تو مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہے کسی بات کا۔ میں یہ بھی سوچتی تھی کہ جو والدین جاب کرتے ہیں ان کے بچے بھی تو پل جاتے ہیں۔۔۔ مگر میں نے بچوں کو بہت ٹائم دیا اور آج میں اپنے بڑے بیٹے "مزمل" کو دیکھتی ہوں تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے یہ دیکھ کر کہ اسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے اور مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہوتا کہ میں نے کام چھوڑ کر بچوں کی پرورش کی۔ میرے پاس اب بہت ٹائم ہے اور ان شاء اللہ اس انڈسٹری میں اپنی ساری خواہشیں پوری کروں گی اور بہت کام کروں گی۔"

"فیلڈ میں شوقیہ آئیں یا مجبوراً؟"

"شوقیہ آئی۔۔۔ کوئی مجبوری نہیں تھی اور کس طرح آئی یہ آپ کو بتاتی ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ شاید شہزاد رائے کی شادی تھی اور میں مانی کے ساتھ ڈنر کر رہی تھی۔ مزمل دو تین ماہ کا ہماری گود میں تھا تو سلطانہ آپا میرے پاس آئیں اور کہنے لگیں کہ مجھے تم بہت پیاری لگتی ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم میرے چینل پہ کام کرو۔۔۔ میں تو پریشان ہو گئی۔۔۔ میں نے کہا کہ میں کیسے آ سکتی ہوں۔ میں نے تو آج تک کچھ بھی نہیں کیا۔۔۔ انہوں نے کہا کہ نہیں تم آؤ۔۔۔ تو وہ وقت ایسا تھا کہ مجھے بہت آفرز ہوئیں' بڑے بڑے سیریلز آفرز ہوئے۔۔۔ مگر میں نے ڈر کر کام نہیں کیا کہ میرا بچہ چھوٹا ہے۔۔۔ مجھے یاد ہے کہ ہم ٹی وی کے مارننگ شو کا پرومو شوٹ میں نے کروالیا اور جب گھر آئی اور مزمل کو امی کی گود میں دیکھا اور اس رات میں ساری رات روتی رہی۔۔۔ تو اگلے دن میں نے سلطانہ آپا سے جا کر کہا کہ میں نہیں کر پاؤں گی یہ مارننگ شو' کیونکہ میرا بچہ بہت چھوٹا ہے۔۔۔ میں بچوں کے معاملے میں بہت حساس ہوں۔۔۔ میں دوسروں کے بچوں کو روتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تو اپنے بچے کو کیسے دیکھتی۔ مجھے لگا جیسے مزمل پوچھ رہا ہو کہ مما آپ کہاں چلی گئی تھیں۔ تو خیر۔ سلطانہ آپا نے کہا کہ ٹھیک ہے کوئی مسئلہ نہیں۔ انہوں نے مجھے بہت اچھے انداز میں سمجھایا اور پھر اپنی اسٹوری بھی بتائی کہ جب "درید" چھوٹا تھا اور میں ڈائریکشن میں تھی تو مجھے کیا مشکلات پیش آئی تھیں۔۔۔

سلطانہ آپا نے کہا کہ اگر تم مارننگ شو نہیں کر سکتیں تو تم میرا "برنچ شو" ہفتہ اور اتوار کو کرو۔۔۔ اور وہ میں نے کیا' اور مانی کی وجہ سے مجھے اس فیلڈ میں بہت عزت ملی اور میں آج جو کچھ بھی ہوں مانی کی وجہ سے ہی ہوں۔"

”سسرال اور میاں کی سپورٹ تو تھی... خاندان والوں نے باتیں بنائیں؟“

”نہیں... گھر والے اچھے ہوں تو باہر والوں کو باتیں بنانے کی جرأت نہیں ہوتی... میری ساس نے ایک بار کہا کہ کچھ لوگ کہہ رہے تھے حرا تھوڑے بولڈ سین کرواتی ہے جیسے کہ آپ کو پتا ہے کہ ڈراموں میں ہاتھ بھی پکڑنا پڑتا ہے اور... تو میری ساس نے مجھے سمجھایا کہ تم کبھی بھی ان باتوں میں نہیں آنا کیونکہ ”تم ایک کردار پلے“ کر رہی ہو‘ تم اصل میں ایسا نہیں کر رہیں... ڈراما کر رہی ہو... تو اللہ کا شکر ہے کہ کسی نے کوئی بات نہیں کی اور جن باتوں کا ڈر تھا وہ میری ساس نے مجھے پہلے ہی سمجھا دیں کہ تم رول پلے کر رہی ہو... اصل میں کچھ نہیں ہے۔“

”شروع شروع میں لوگوں نے یہ بھی کہا کہ حرا نے اس فیلڈ میں آنے کے لیے مانی سے شادی کی... ایسا ہے؟“

”جی بالکل ہے... اور اس بات پہ میں نے کہا کہ اگر میں فیلڈ میں آنے کے لیے شادی کرتی تو پھر میں بچے پیدا نہ کرتی... میرے اندر کیا کمی ہے... میں تو آرام سے ہیروئین بن سکتی ہوں... مجھے مانی کی فل سپورٹ حاصل تھی‘ میرا تو پورا سسرال اس فیلڈ میں ہے۔ پی ٹی وی کے اسٹارٹ سے میرے سسر اس فیلڈ میں ہیں... پی ٹی وی کی جو پہلی خبر تھی‘ وہ میرے سسر نے چلائی تھی‘ پہلا موسم اپ ڈیٹ میرے سسر نے دیا تھا... میرا دیور پروڈیوسر ہے۔ میری نند نے تھیٹر کیا ہوا ہے ثانیہ سعید کے ساتھ‘ تو یہ سب منجھے ہوئے آرٹسٹ ہیں۔ اس فیلڈ کو سمجھتے ہیں۔ یہ ان کا پروفیشن ہے اور میں بھی اسکول کالج کے زمانے میں بہت ایکٹو تھی۔ تو سسرال والوں نے مجھے سمجھایا اور میں اس لیے باہر کے لوگوں کی باتوں کی پروا نہیں کرتی... میرا سسرال خاص طور پر مانی‘ میرے سسر اور عائشہ باجی (نند) میرے ساتھ کھڑے ہیں... ہاں... اگر میں مانی کے بغیر اس فیلڈ میں آتی تو شاید میرا دماغ خراب ہوتا کہ میں ڈراما کر رہی ہوں۔ اکڑ نخرے دکھاتی... تصاویر نہ بنواتی... مگر ایسا نہیں ہے... پروفیشنل لوگ کام کرتے ہیں اور رزلٹ اللہ پہ چھوڑ دیتے ہیں۔“

”گھر کو بنانے میں اور بگاڑنے میں عورت کا کتنا ہاتھ ہوتا ہے؟“

”عورت کا ہی ہاتھ ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں... اور لڑکی کی تربیت اس کے اپنے میکے سے ہوتی ہے۔ میں نے اپنے گھر میں دیکھا کہ امی نے ہر اچھے برے حالات میں ابو کا ہی ساتھ دیا... انہیں سپورٹ کیا... میری امی بھی اپنی جوانی میں بہت خوب صورت تھیں۔ ابھی بھی بہت فٹ ہیں۔ یوگا کرتی ہیں۔ وہ ایک مکمل عورت ہیں اور ان سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے اور میں نے یہ بھی سیکھا ہے کہ عورت ہی گھر کو سنبھالتی ہے‘ بناتی ہے‘ سنوارتی ہے۔ جن لوگوں کا گھر بگڑتا ہے‘ جن کی طلاقیں ہوتی ہیں‘ ان میں عورت کا قصور زیادہ ہوتا ہے۔ چلو مان لیا کہ مرد بھی برا ہوتا ہے‘ مگر وہ تیس فیصد برا ہوگا ستر فیصد عورت قصوروار ہوتی ہے... گھر کو سنبھالنا عورت کا ہی کام ہے‘ عورت ہی گھر کو جوڑ کر رکھتی ہے اور عورت ہی گھر کو ختم کرتی ہے... اگرچہ میں آج کل کی لڑکی ہوں مگر میری سوچ بہت پختہ ہے... میری پھوپھیوں نے ہمیشہ گھر کو بنا کے رکھا‘ میری امی نے ابو کا ہمیشہ ساتھ دیا۔

میں لڑکیوں سے کہوں گی کہ برے حالات میں بھی مرد کا ساتھ دینا نہ چھوڑیں... اگر وہ آپ کو صحیح طرح سے خرچا نہیں دے پا رہا تو اس سے ناراض نہ ہوں‘ بلکہ اس کا ساتھ دیں... آپ یقین کریں کہ میری وارڈ روب میں تین سو روپے والا سوٹ بھی ہوگا‘ تین ہزار والا بھی‘ اس سے زیادہ والا بھی ہوگا... اور کم والا بھی... اس لیے کہ میرے اندر جو میانہ روی ہے‘ جو حالات سے مقابلہ کرنے کی قوت ہے‘ وہ مجھے میری ماں نے دی ہے۔ انہوں نے مجھے کم قیمت، کالان کا سوٹ پہننے کی بھی عادت ڈالی ہے کہ کوئی بات نہیں‘ جب

حالات اچھے ہوں گے تو قیمتی سوٹ بھی پہن لیں گے ۔۔۔ میری امی نے میری بہت اچھی تربیت کی ہے۔ مجھے اچھے اور برے حالات کا مقابلہ کرنا سکھایا ہے۔"

"کبھی ایسا ہوا کہ مانی سے تمہاری لڑائی ہوئی اور تم روٹھ کر میکے چلی گئیں؟"

"کبھی نہیں ۔۔۔ میں آج تک روٹھ کر میکے نہیں گئی' لڑکیاں بیگ پیک کرتی ہیں اور میکے چلی جاتی ہیں' میں نے آج تک اس مقصد کے لیے گھر سے قدم نہیں نکالا کہ یہیں رہوں گی' یہیں لڑیں گے' یہیں مریں گے مگر روٹھ کر میکے نہیں جاؤں گی ۔۔۔ آپ بے شک مانی سے پوچھ لیں ۔۔۔ میں کبھی ناراض ہو کر' لڑ کر یا کسی بھی وجہ سے اپنا گھر چھوڑ کر نہیں گئی۔"

"شوبز کی فیلڈ خطرناک ہے' کبھی ڈر لگا؟"

"نہیں' کبھی بھی ڈر نہیں لگا ۔۔۔ یہ فیلڈ تو مجھے ڈراؤنی لگتی ہی نہیں ہے۔ یہ فیلڈ تو بہت اچھی ہے۔ آپ صبح اٹھیں' ناشتہ کریں' پرفارمنس دے کر آئیں' بچوں کے ساتھ ٹائم گزاریں' کھانا کھلائیں' ان کے اسکول کا کام دیکھیں ۔۔۔ اور اس کام کو کام کی طرح دیکھیں' کام کی طرح سرانجام دیں ۔۔۔ شادی سے اس فیلڈ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس فیلڈ کا ریلیشن شپ سے کوئی تعلق نہیں ہے' جنہوں نے ریلیشن شپ خراب کرنی ہوتی ہے وہ گھر بیٹھے بھی کر دیتے ہیں۔ سب جھوٹ بکواس ہے کہ یہ فیلڈ خطرناک ہے۔"

"جب دوسروں کی شادی میں شرکت کرتی ہو تو کیا احساسات ہوتے ہیں کہ شادی نہیں ہونی چاہیے کہ یہ ایک مشکل اور قربانی دینے والا بندھن ہے؟"

"نہیں مجھے ایسی سوچ کبھی آئی نہیں اور پھر میری شادی تو بہت کامیاب ہے ۔۔۔ اس لیے کہ مجھے جو کامیابیاں ملیں وہ شادی کے بعد ہی ملیں ۔۔۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ میری شادی میرے لیے بہت لکی ثابت ہوئی ہے ۔۔۔ اور آج بھی میں اپنے شروع کے دن' جب میں مایوں بیٹھی' جب میرا نکاح ہوا' میرا ولیمہ ہوا تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے کہ واہ کیا دن تھے ۔۔۔ اور شادی میرے لیے سب سے خوب صورت چیز ہے اور میرے پاس کسی کا بھی شادی کارڈ آئے میں ضرور جاتی ہوں تو مانی کہتا ہے کہ تمہیں کسی ایوارڈ شو میں نہیں جانا ہوتا' کسی فلم فیسٹیول میں نہیں جانا ہوتا' مگر شادی میں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہو' تو میں کہتی ہوں کہ میرے اندر جو ایک گھریلو لڑکی ہے' وہ مجھے اکساتی ہے شادیوں میں جانے کے لیے ۔۔۔ مجھے فیملی کا حصہ بننا

فیملی کا ایک جگہ جمع ہونا بہت پسند ہے۔۔۔ دعوت میں جانا مجھے اچھا لگتا ہے۔۔۔ جب میں کسی شادی شدہ جوڑے کو جاتے ہوئے دیکھتی ہوں تو ان پر پڑھ کر پھونکتی ہوں کہ ان کو نظر نہ لگے۔۔۔ چونکہ میری شادی

بہت کامیاب ہے تو میں کہتی ہوں کہ سب کی شادیاں ہوں اور اللہ انہیں ہمیشہ خوش و خرم اور آباد رکھے اور یہ آخری دم تک اپنی شادی کو نبھائیں۔"

"ماشاءاللہ دو بچے ہیں۔ اس کے باوجود اتنی اسمارٹ اور اتنی ایکٹو۔۔۔ کیا راز ہے؟"

"واقعی۔۔۔ مجھے بھی کبھی بہت ڈر لگتا ہے کہ کہیں نظر نہ لگ جائے اور اس کا سارا کریڈٹ مانی کو جاتا ہے۔۔۔ عورت گھر چلاتی ہے اور مرد عورت کو سنبھالتا ہے۔ اگر میاں محبت کرنے والا ہو تو عورت تو پتا نہیں کیا سے کیا کر گزرتی ہے۔۔۔ مانی کے علاوہ مجھے کوئی مرد' مرد نہیں لگتا۔۔۔ مجھے صرف مانی ہی مرد لگتا ہے۔ مانی نے جس طرح مجھے رکھا ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے میں اتنی خوب صورت ہوں اب تک' میرے اندر وہ چارم ہے جو ایک غیر شادہ شدہ لڑکی میں ہوتا ہے' اس کا سارا کریڈٹ مانی کو جاتا ہے' ہر شوہر کو مانی جیسا ہونا چاہیے۔ مرد کو عورت کو ہینڈل کرنا آنا چاہیے اور یہ ہنر مانی کو آتا ہے۔"

"باوجود اس کے کہ مانی ایک پرفیکٹ شوہر ہے۔ پھر بھی تمہیں کوئی شکایت ہے مانی سے؟"

"جی ہے تھوڑی شکایت۔۔۔ لوگ مجھے کہتے ہیں کہ شادی کے بعد مانی کا کام تھوڑا کم ہو گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے میرا اور بچوں کا اتنا زیادہ خیال رکھا کہ اپنے کام پہ توجہ دینا چھوڑ دی' تو میں مانی سے یہی کہتی ہوں کہ تم اپنے لیے بھی کچھ کرو' اپنے آپ کو' اپنے کام پر فوکس کرو۔۔۔ کیونکہ میں کہتی ہوں کہ مانی ہمارے ملک کا بہت بڑا ٹیلنٹ ہے۔۔۔ اور یہ ایسا ٹیلنٹ ہے کہ اس کو سمجھنے کے لیے بھی دماغ چاہیے اور جن کے پاس دماغ ہے' وہ واقعی مانی کو سمجھ سکتے ہیں اور جن کے پاس دماغ نہیں ہے وہ مانی کو کبھی نہیں سمجھ پائیں

گے۔ اور اب ان شاءاللہ مانی اور میں ہم مل کر ہوسٹنگ شروع کریں گے۔ ہمارے پاس کئی آئیڈیاز ہیں جن پہ ہم کام شروع کرنا چاہتے ہیں۔۔۔ بس اللہ ہمارا ساتھ دے۔"

"اور اب آخر میں اپنی ڈیلی روٹین بتاؤ۔۔۔ یا یہ کہ لوگ تم سے ملتے ہیں تو کیا پوچھتے ہیں؟"

"لوگ مجھ سے میری ڈائیٹ پوچھتے ہیں۔ میری روٹین پوچھتے ہیں تو آپ کو بتاؤں کہ میں صبح اٹھتی ہوں۔ بچوں کو تیار کرتی ہوں۔ ان کو ناشتہ کراتی ہوں' مانی بچوں کو اسکول ڈراپ کرتے ہیں اور میں "یوگا" کے لیے چلی جاتی ہوں "یوگا" سے واپس آکر اپنے بچوں کے کپڑے ریڈی کرتی ہوں۔۔۔ پھر اپنا بیگ تیار کرتی ہوں۔ شوٹ پہ جانے کے لیے' ساتھ ساتھ بچوں کے لیے کھانا بھی تیار کر رہی ہوتی ہوں۔ اصل میں مجھے یہ فیلڈ بہت ساری ذمہ داریوں کے ساتھ ملی ہے جبکہ اس فیلڈ میں زیادہ تر لڑکیاں غیر شادی شدہ ہیں' ان پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ وہ آتی ہیں' شوٹ کراتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔۔۔ جبکہ میرے پاس تو اپنے اوپر دھیان دینے کا ٹائم ہی نہیں ہوتا۔۔۔

خیر پھر جب میں گھر آتی ہوں تو اپنے بچوں کے لیے کھانا نکالتی ہوں۔ اپنے ہاتھوں سے ان کے لیے پراٹھا بناتی ہوں یا روٹی بناتی ہوں۔۔۔ پھر ان کے اسکول کا کام دیکھتی ہوں۔۔۔ اور سارے کام کر کے اپنے بیڈ پہ جاتی ہوں۔۔۔ اب اس فیلڈ کی جن لڑکیوں کی شادیاں ہوئی ہیں جب ان کی اولاد ہو گی تب انہیں پتا چلے گا کہ اس فیلڈ میں بچوں کے ساتھ کام کرنا کتنا مشکل ہے اور اپنی پہچان بنانا اور برقرار رکھنا کتنا مشکل ہوتا ہے اور عزت کے ساتھ رہنا بہت بڑی ذمہ داری ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے حرا مانی سے اجازت چاہی' اس شکریہ کے ساتھ کہ ہمیں مصروفیات میں سے ٹائم دیا۔

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

آمنہ زاہد

"تجھ سے ناتا جوڑا ہے" کیا زبردست جملہ ہے کیا کچھ چھپا ہے اس ایک جملے میں اور اس سلسلے کا یہ جو شعر ہے، مجھے پڑھ کے آنکھوں میں آنسو ہی آگئے۔ ہماری سستی آپ اس بات سے ملاحظہ کرسکتے ہیں کہ پورا ایک سال ہوگیا ہے یہ سوچتے ہوئے کہ اس سلسلے میں حصہ لینا ہے اور آج یہ عظیم معرکہ سر ہونے جارہا ہے۔ ویسے شعاع کا اور میرا ساتھ پچھلے نو سال ہے ایک تواتر کے ساتھ ہے، لیکن اس سے پہلے بھی کافی حد تک یہ ہمارے ساتھ رہا ہے۔ تو اب آتے ہیں سوالوں کے جوابات کی طرف۔

س۔ شادی کب ہوئی؟

ج۔ میری شادی 26 اکتوبر 2007ء میں ہوئی۔

س۔ شادی سے پہلے کیا مشاغل اور دلچسپیاں تھیں؟

ج۔ شادی سے پہلے اولین مصروفیت تو بس پڑھائی ہی تھی کیوں کہ بادولت کافی کتابی کیڑا تھے۔ اس کے علاوہ بھائیوں اور پھپھو کے ساتھ مستیاں، مووی دیکھنا، بارش انجوائے کرنا اور ہلا گلہ کرنا شامل ہیں۔ سب سرفہرست ادھر ادھر سے ڈائجسٹ منگوانا، پڑھنا اور پھر چھوٹی پھپھو کے ساتھ ——— تبصرے کرنا۔

س۔ اس رشتے میں آپ کی مرضی شامل تھی یا بزرگوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا؟

ج۔ چونکہ میں ایک کتابی کیڑا تھی تو شادی میری پلاننگ میں دور دور تک نہ تھی، لیکن میٹرک کرتے ہی جو اچانک ماموں کے گھر سے رشتہ آیا، میں تو گم صم ہی ہوگئی کیوں کہ جن موصوف کے لیے آیا تھا وہ کافی حد تک گم صم تھے یعنی کم گو اور میری اپنے ماموں کے گھر میں سب سے بہت بنتی تھی سوائے ان کے تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ کیا حالت ہوگی اور باتوں کا تو معلوم نہیں یعنی مرضی ہونا یا نہ ہونا، مگر پوری دنیا میں اگر کہیں میرا دل لگتا تھا تو وہ اپنے اکلوتے ماموں کے گھر۔ اس بات سے ددھیال اور ننھیال سب واقف تھے تو کسی نے پوچھا ہی نہیں کہ مرضی بتادو بلکہ بڑی نند نے جو کہ کزن ہے اور میری اس سے دوستی تھی، کہنے لگی۔ "تمہیں ہمارے گھر آنا اور رہنا پسند ہے نا تو دیکھو، ساری زندگی کے لیے لے جارہے ہیں۔"

س۔ ذہن میں جیون ساتھی کے حوالے سے کیا تصور تھا؟ اور وہ کیا خوبیاں تھیں، جو آپ اپنے جیون ساتھی میں دیکھنا چاہتی تھیں؟

ج۔ ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کیوں کہ ابھی بہت زیادہ کم عمر تھی۔ ہاں۔ یہ ضرور تھا کہ شوہر کو بیوی سے عمر میں کافی بڑا ہونا چاہیے جب کہ یہ صرف تین سال بڑے ہیں۔ میں بہت بولنے والی اور یہ انتہائی کم گو اور میری بالکل دوستی نہ تھی ان سے۔ مجھے یہ انتہائی آدم بیزار لگتے تھے اور انتہائی خشک مزاج، حالانکہ اتنے بڑے بھی نہ تھے مجھ سے، جب کہ ان سے بڑے بہن بھائیوں سے بھی میری کافی دوستی تھی۔

س۔ منگنی کتنا عرصہ رہی، شادی سے پہلے فون پر بات ہوئی یا ملاقات؟

ج۔ منگنی پورے تین سال رہی۔ میں اس عرصے میں کنفیوژ ہی رہی کہ جانے اس رشتے سے خوش بھی ہیں یا نہیں۔ منگنی والے دن بھی سب سے پوچھ رہی تھی کہ "ان سے پوچھا ہے نا۔ انہوں نے رضا مندی دی ہے، زبردستی تو نہیں ہو رہی۔" اب سوچتی ہوں تو ہنسی آتی ہے اپنی حرکتوں پر۔ فون پر بات بس

اتنی تھی کہ پی سی او پہ کال کرتے تھے ہم لوگ اگر انہوں نے فون اٹھایا تو حال چال دریافت کیا اور ریسیور امی کو دے دیا۔ ہمارے شہر کافی دور دور تھے تو ملاقات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ہمارے ہاں منگنی کے بعد یہ کچھ اچھا بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔

س۔ شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں کیا خیالات تھے آپ کے؟

ج۔ شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں کوئی شک و شبہات نہ تھے کیوں کہ بچپن سے جانتے تھے اور سب سے لاڈ اٹھواتے بچپن گزرا تھا۔ بس ہونے والے میاں کے بارے میں ہی شکوک تھے کہ ان جیسے ڈیسنٹ بندے کو میری جیسی لڑکی ڈیزرو نہیں کرتی۔ وہ تو اتنے مغرور ہیں خود پسند ہیں۔ یہ سب میری ذاتی آرا تھیں جو میں نے ان کے کم گو ہونے کے باعث اختراع کی تھیں۔

س۔ شادی سے پہلے آپ کو تعلیم چھوڑنی پڑی؟ یا کوئی اور قربانی دینا پڑی؟

ج۔ جی ہاں شادی کے لیے تعلیم کی قربانی تو دی ہے۔ میں پڑھنے کی بہت شوقین تھی، مگر بمشکل انٹر کیا۔ رزلٹ آیا تو شادی کی تاریخ بھی مقرر تھی۔ بہت روئی کسی نے نہ سنی حتیٰ کہ اپنے فیانسی کو بھی کہا کہ مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔ مجھے کوئی ذمہ داری نبھانی نہیں آتی بلکہ میں بہت بدتمیز ہوں۔ کوئی کام نہیں آتا یعنی اپنی سب برائیاں بیان کیں کزنز سے بھابھی (جٹھانی) سے سب سے کہا۔ کسی نے میری بات کو سنجیدگی سے نہ لیا۔ ماموں کہنے لگے۔ ”بعد میں پڑھ لینا۔“

س۔ شادی بخیر و خوبی انجام پائی یا رسموں کے دوران لین دین کے معاملے پر کوئی بدمزگی ہوئی؟

ج۔ اللہ کا شکر، شادی بخیر و خوبی انجام پائی تھی۔ یہاں میرے ننھیال میں سب نے کہا تھا بارات لے کر جاتے ہوئے کہ دھیان رہے، ایک بیٹی دی ہے اور ایک بیٹی لینے جارہے ہیں۔ ایک بات ضرور ہوئی کہ میرے ابو کے چچا وغیرہ نے مووی نہ بنوانے دی، جس پر میرے کزنز کو برا لگا کہ اتنی دور سے مووی میکر کو لائے تھے۔ ماموں نے انہیں بولنے نہ دیا کہ ہمیں معلوم تھا۔ انہیں یہ پسند نہیں۔ سب سے زیادہ میری امی کو غصہ آئے جارہا تھا کہ کیوں مووی کا منع کیا۔ ماموں نے امی کو ہینڈل کیا تھا۔ باقی سب ٹھیک تھا۔ میرے کپڑے زیور سب بہت اچھا تھا۔ میرا فرنیچر بھی ماموں نے بنوایا تھا، بالکل ویسا ہی جیسا اپنی بیٹی کا اس کی بھی ساتھ ہی شادی تھی۔

س۔ شادی کے بعد شوہر نے آپ کو دیکھ کر کیا کہا؟

ج۔ شادی کے بعد شوہر نے کہا شکر ہے تم اپنے اصلی حلیے میں آگئیں کہ میک اپ زدہ چہرہ دیکھ کر تو میں ڈر گیا تھا کہ یہ کون ہے۔ کچھ میک اپ تو رونے سے بہہ گیا تھا اور کچھ اتنا لمبا رستہ تھا تو سب ختم ہوگیا تھا۔ چوڑیاں اور جیولری میں ویسے ہی اتار کے بیٹھی تھی۔ راستے میں بڑی نند اور جٹھانی ایک پیٹرول پمپ پہ رکے تو میرا حال چال پوچھنے لگیں بھابھی کہنے لگیں۔ بٹھایا تو اچھا بھلا تھا۔ ایسا لگ رہا۔ جنگل سے آئی ہے۔ نند کے شوہر بھائی تنویر تو حیران ہی ہوگئے کہ یہ چوڑیاں اور جیولری گود میں کیوں رکھی ہے تو میں نے کہا بھائی میں بور ہو رہی تھی تو ایسے ہی اتار کے گننے لگ گئی۔ سب نے سر پکڑ لیا۔

س۔ شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟

ج۔ شادی کے بعد زندگی میں واقعی بہت تبدیلیاں آئیں اور یہ تبدیلیاں انتہائی خوشگوار تھیں۔ گھر والوں کی یاد تو ایک فطری عمل ہے، لیکن یہاں بھی بہت پیار دلار ملا۔ شادی سے اگلے دن ہی مجھے شوہر کی طرف سے موبائل گفٹ ملا تھا مگر رات تک، سب نے کہا۔ گھر فون کرلو۔ بڑے بھائی (جیٹھ) نے نمبر ملا کر دیا کہ پھپھو سے بات کرلو۔ شوہر کی طرف سے بھی سب غلط فہمیاں دور ہوگئیں بلکہ یہ انکشاف بھی ہوا کہ ان کی تو لو میرج ہے۔ میں تو بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تھی۔

نندیں قریب ہی رہتی تھیں' آجاتیں تو خوب آؤٹنگ کے پروگرام بنتے اور میں ہر لمحہ دعا کرتی کہ ان خوشیوں کو کسی کی نظر نہ لگے۔

س۔ شادی کے کتنے عرصے بعد کام کاج سنبھالا؟

ج۔ میرا میکہ دور تھا۔ تقریباً" دس دن بعد امی کی طرف گئے پھر پھپھو وغیرہ کی طرف سے دعوتیں انجوائے کرتے ایک ہفتے بعد گھر آئے اور آتے ہی کام سنبھال لیا کیونکہ گھر میں جٹھانی تھی اور میری ساس' دو نندیں شادی شدہ۔ اور ایک چھوٹی تھی نائنتھ میں پڑھتی تھی۔ گھر میں ان کے علاوہ میری نانی تھیں۔ میں نے گھر کا کام سنبھالا اور بہت شوق سے ہر کام کیا۔ کھانا بنانا تب ہی شروع کیا تھا اور دل سے بنایا۔ ہمیشہ تعریف ہوئی کیونکہ میری امی کے ہاتھ کا کھانا ددھیال ننھیال سب کا پسندیدہ تھا تو پھر بیٹی کا کیسے ناپسند ہو سکتا تھا۔

پہلی بار میٹھے چاول بنائے تھے۔ میری ساس نے کہا تھا' جو پسند ہو میٹھے میں بنالو۔ جو بنانا آتا ہے بنالو میں نے کہا۔ سب آتا ہے مگر اتنے زیادہ چاول وہ بھی میٹھے کبھی نہ بنائے تھے۔ بھابھی نے بہت مدد کی اور سب اچھے سے ہو گیا۔ جب کھانا بنتا پہلی روٹی اتار کر نانی کو بھاگ کر دے کر آتی ورنہ وہ ناراض ہو جاتیں۔ میرے ساتھ سبزی بناتیں میرے سر میں تیل کا اور کبھی دہی کا مساج کرتیں۔ بہت مزہ آتا مگر شادی کے صرف پانچ ماہ بعد وہ اس دار فانی سے رخصت ہو گئیں۔ میں انہیں بہت یاد کرتی تھی۔ انہیں میرے بچوں کو دیکھنے کی بہت خوشی تھی مگر دیکھ نہ پائیں۔ میں تب امید سے تھی جب ان کی وفات ہوئی۔

س۔ کیا میکے اور سسرال کے کھانے کے ذائقے اور انداز مختلف محسوس ہوئے؟

ج۔ جی نہیں۔ میں ہی کھانا بناتی تھی اور اپنی مرضی سے بناتی تھی۔ میری امی کے ہاتھ کا کھانا کبھی رد نہ ہوا تھا' میرا بھی نہ ہوا۔ بس ایک فرق تھا' یہاں دیسی گھی استعمال ہوتا تھا۔ آہستہ آہستہ عادت ہو گئی اور کھانا بنانے کی ذمہ داری آٹھ سال تک میرے پاس ہی رہی'

بہت سی تبدیلیاں آئیں' بچے بھی ہوئے۔ دو دیورانیاں بھی آئیں مگر اپنے کچن کی میں بے تاج بادشاہ رہی۔ ان کو اتنا انٹرسٹ نہ تھا اور کھانا بنانا میرا تو جنون ہے۔ کوئی دعوت ہو یا فنکشن جتنی بھی ڈشز بنانی ہوتیں ماہدولت ہمہ وقت تیار' سب مدد کرواتے تھے۔ کٹنگ وغیرہ بھی کرواتے تھے۔

س۔ میکے اور سسرال کے ماحول میں کیا فرق محسوس ہوا؟

ج۔ فرق یہ تھا کہ وہاں میں انتہائی غیر ذمہ دار اور لاپروا تھی جبکہ یہاں انتہائی ذمہ دار۔ اگر سب مجھ سے پیار کرتے تو میں بھی ہر ممکن سب کا خیال کرتی' ہر کام کرتی جبکہ پہلے کام کرنے کی عادت نہ تھی مگر مجھے اپنا مقام بنانا تھا۔ صرف پیار لینا ہی نہ تھا بلکہ دینا بھی تھا۔

سب بہت پیار کرتے۔ میری ساس جب سبزی لینے جاتیں تو کوئی نہ کوئی چیز نمکو' چپس وغیرہ ضرور لاتیں۔ جب بازار جاتیں' چوڑیاں ضرور لاتیں۔ میرا دیور جس سے بہت دوستی تھی۔ بچپن سے ہی کہتا اس کو اتنا سر پر نہ چڑھائیں اور خود قلفی لا کر دیتا۔ اسے پتا تھا' مجھے پسند ہے' بڑے بھائی سوئیٹر کی پاکٹ میں ڈرائی فروٹ چھپا کر لاتے میرے لیے' کبھی قلفی کبھی چاکلیٹ' کبھی آئس کریم' کہتے دونوں چاچی بھتیجی موجیں کرو۔ ان کی بیٹی تب آٹھ ماہ کی تھی۔ جب بھابھی میکے جاتیں' میں بھائی کا انتظار کرتی رہتی۔ کھانے کے لیے بھائی میرے لیے آئس کریم لاتے کہ یہ تمہارے انتظار کرنے کا انعام۔ بہت پیار کرتے تھے۔ عیدی دیتے۔ بھائیوں والے سارے مان پورے کیے مگر میری شادی کے تین سال بعد ایک ایکسیڈنٹ میں ان کی وفات ہو گئی۔

س۔ سسرال میں کن باتوں پر تعریف ہوئی اور کب تنقید کا سامنا کرنا پڑا؟

ج۔ نہ فالتو میں تعریف ہوتی نہ ہی خواہ مخواہ تنقید۔ وہ مجھ سے پیار کرتے تھے اور میری خواہش ہوتی کہ میں کسی کو بھی شکایت کا موقع نہ دوں۔ ہر کام وقت سے پہلے کرتی اور اگر رات کے دس بھی بج جاتے مگر کپڑے

استری کرکے سوتی تھی۔

س۔ سسرال والوں نے آپ کو وہ مقام دیا جو آپ کا حق تھا؟ سسرال میں گھریلو اور خاندانی معاملات میں آپ کی رائے کو کتنی اہمیت دی جاتی ہے؟

ج۔ اللہ کا شکر ہے' سب کچھ ملا۔ ماموں اور مامی کوئی بھی کام ہوتا کوئی بات کرتے تو ضرور مشورے دیتی تھی مگر کبھی انا کا مسئلہ نہیں بنایا کہ میری بات مانی جائے۔ میں نے پہلے بھی بتایا نا کہ میں تو خود کو بہت لاپروا سمجھتی تھی تو کیسے ایسے معاملات میں اپنی رائے کو بہتر سمجھتی۔ مگر آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اپنے دیور کا رشتہ میری پسند سے ہوا۔ ہوا کچھ یوں کہ پہلا رشتہ دیکھنے گئے اور میں بھی ساتھ تھی اور مجھے ان لڑکیوں کے دل کی حالت یاد آتی جن کے بارے میں ڈائجسٹ میں پڑھا تھا کہ رشتہ دیکھنے آنے والے جب ان کو

ریجیکٹ کرتے تو ان کے دل پہ کیا گزرتی تھی کیونکہ مابدولت تو ایسی نمائش سے بچ گئے تھے۔ بس جی میں نے تو شور ڈال دیا کہ دل نہیں توڑنا لڑکی کا۔ مجھے پسند ہے' پڑھی لکھی ہے جیسی میرے دیور کو چاہیے۔ سلجھی ہوئی ہے۔ ہمیں یہیں رشتہ کرنا ہے۔ سب نے کہا ایک دو اور رشتے دیکھ لیتے ہیں مگر میں نے کہا کہ نہیں میں نے یہیں کرنا ہے۔ حتی کہ انہیں کولڈ ڈرنکس تک نہ لانے دی کہ کہیں میں بھی ڈائجسٹ کی ہیروئنوں کے ظالم سسرال والوں میں شامل نہ ہوجاؤں اور پھر محترمہ بن گئیں دیورانی مگر وقت نے ثابت کیا کہ وہ فیصلہ جو سراسر جذباتی تھا' غلط نہ تھا۔

س۔ سسرال والوں سے توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟

ج۔ اللہ کا شکر ہے سب توقعات سے بڑھ کر ملا۔ ماموں مامی میرے لیے ساس سسر کبھی نہ بنے۔ ماموں نے ہمیشہ خیال رکھا۔ میں کبھی اپنے شوہر کی شکایت کرتی تو فوراً" ان کو ڈانٹتے کبھی ان کی سائیڈ نہ لی۔ بہت اچھے انسان تھے۔ کبھی مسکراہٹ ان کے لبوں سے جدا نہ ہوئی تھی۔ اللہ پاک ان کو جنت الفردوس میں

اعلا مقام عطا فرمائے۔ دو سال پہلے معمولی سا بخار ہوا اور ہم سب کو چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ان کے جانے کے بعد پہلی بار تسبیح کے دانوں کی طرح پرویا ہوا یہ آشیانہ بکھرتا ہوا محسوس ہوا۔

س۔ بچوں کی پیدائش عورت کی زندگی میں بہت امتحان بن کر آتی ہے؟ خصوصاً" پہلا بچہ؟

ج۔ جی بالکل یہ بہت کٹھن مرحلہ ہوتا ہے اور اپنی ماں کی صحیح معنوں میں قدر بھی تب ہی معلوم ہوتی ہے۔ میرے لیے تو اور بھی مشکل تھا جبکہ ابھی خود مجھ میں بچپنا بہت زیادہ تھا۔ سب نے بہت خیال رکھا۔ ساس بار بار چیک اپ کا کہتیں تو میں الجھتی کہ اتنی بار چیک اپ کون کرواتا ہے۔ اپنے ہاتھ سے بادام وغیرہ گرائنڈ کرکے دیتیں کہ رات میں دودھ میں ڈال کر پیا کرو۔ دوسرے نمبر والی نند نے میری بیٹی کا بہت خیال رکھا۔ راتوں کو اسے اٹھایا۔ تھوڑے دن تو ساس ہی سنبھالتی رہیں پھر باجی سیمرا۔ چار ماہ تک میں نے اپنی بیٹی کو نہلا کر کپڑے نہ بدلوائے تھے۔ یہ سب کام باجی نے کیے پھر ان کی بیٹی ہوئی تو میں نے اپنی بیٹی کو سنبھالا۔

س۔ آپ جوائنٹ فیملی سسٹم سے اتفاق کرتی ہے یا علیحدہ رہنا پسند ہے؟

ج۔ جوائنٹ فیملی سسٹم اسی وقت کامیاب ہوتا ہے جب وہاں رہنے والے دونوں فریق باہمی رضامندی اور پیار سے ساتھ نبھائیں۔ الحمد للہ' ہمیں یہ ماحول ملا۔ آٹھ سال بہت اچھے سے گزارے۔ ہماری ساس نے کبھی بے جا روک ٹوک نہیں کی جبکہ وہ ساری زندگی الگ رہیں کہ میرے ماموں اکلوتے بھائی تھے پھر بھی ان میں حکمرانی نہ تھی۔ بیٹیاں آتیں اور بہوئیں کام کررہی ہوتیں تو بیٹیوں کو ڈانٹ دیتیں کہ مدد کرواؤ۔ وہ اکیلے تھک جائیں گی۔ عید تہوار پر خود بھی شاپنگ کرواتیں اور تہوار پر کہتیں سب کام نبٹالو اور پھر کہیں گھومنے چلے جاؤ یا احباب کے ہاں عید مل آؤ۔

ماشاء اللہ بہت ایکٹو ہیں۔ میں نے آج تک کبھی انہیں فارغ بیٹھے نہیں دیکھا اور کوئی کام نہ ہو تو

چارپائیاں ادھیڑ کے بنانے لگ جاتی ہیں اور نٹنگ تو ہر وقت کا کام ہے ان کا 'سب پوتے' پوتیوں' نواسے' نواسیوں کو ایسے ایسے سویٹر اور جرسیاں بنا کر دی ہیں کہ لوگ دیکھ کر رشک کرتے ہیں اگر وہ کبھی لیٹ جائیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

تمام بچوں کی شادیاں کردی ہیں۔ چھوٹی بیٹی اور بیٹے کی شادی کو ایک سال ہوگیا ہے۔ میری چھوٹی نند ہی میری بھابھی بنی ہے۔ کوئی وٹہ سٹہ کا سین نہیں۔ میری امی کی خواہش تھی کہ اکلوتے بھائی کی بیٹی ان کی بہو بنے اور بھائی کی بھی خواہش تھی۔ امی اور ماموں کے بیچ بہت پیار تھا حالانکہ پانچ بہنیں ہیں امی لوگ مگر میری امی سے سب سے زیادہ پیار کرتے۔

اپنے سب بچوں کی شادیاں کرنے کے پانچ ماہ بعد انہوں نے کہا اب آپ لوگ اپنی ذمہ داریاں خود اٹھاؤ جبکہ تمہارے ابو بھی نہیں ہیں۔

ایک گھر میں الگ الگ کرنا مشکل تھا کیونکہ گھر چھوٹا تھا۔ بس محبتوں کے باعث پہلے کبھی چھوٹا نہ لگا تو ہم سب کی باہمی رضامندی سے اپنے دوسرے گھر شفٹ ہوگئے جو پانچ منٹ کی دوری پر سٹی سیکٹر میں ہے۔ مگر محبتوں کا وہی عالم ہے۔ ہر فرائی ڈے کو جاتے ہیں۔ عیدیں اور تہوار وہیں مناتے ہیں۔ میری نندیں جب وہاں آئیں 'یہاں بھی لازمی آتی ہیں' مجھے کبھی کوفت اور بیزاری نہیں ہوئی۔ کبھی نہیں لگا کہ شوہر کی بہنیں ہیں۔ ہمیشہ لگا میری بہنیں آئی ہیں۔ اللہ پاک میرے گھر کی محبتوں کو نظر بد سے بچائے۔

س۔ آپ نے سسرال کے ماحول کو بہتر بنانے کی کوشش کی؟ آپ کی کوشش کس حد تک کامیاب ہوئی؟

ج۔ شادی کے وقت میں بہت کم عمر تھی تو سب کچھ سسرال میں آکر ہی سیکھا۔ آج تین بچے ہیں۔ شادی کو نو سال ہوگئے ہیں۔ اگلے مہینے پورا ایک سال ہو جائے گا ہمیں الگ شفٹ ہوئے۔

سسرال میں گزارے آٹھ سال بہت خوشگوار تھے۔

گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ بچوں کو بھی سنبھالا اور پھر گریجویشن اور ایم اے بھی کیا۔ شوہر بھی بہت خیال کرنے والے ہیں۔ آج بھی وہی ایک شکایت ہے کہ کم گو ہیں مگر یہ بھی میرے حق میں بہتر ثابت ہوا ہے کہ میں بولتی رہتی ہوں اور یہ سنتے رہتے ہیں۔ ان نو سالوں میں میرا بولنے کا شوق ذرا کم نہیں ہوا۔ شادی کے بعد خواتین اور شعاع مسلسل پڑھنا شروع کیا جب بیوی کو خوش کرنا ہو تو شعاع لا دیتے ہیں۔ میں رات بارہ بجے تک بھی کمرے کی لائٹ آن رکھوں کبھی نہیں کہتے کہ میں ڈسٹرب ہو رہا ہوں جبکہ میں انتظار کرتی ہوں کہ کبھی تو روکیں' ٹوکیں لڑائی جھگڑا کریں۔

میری بہنیں کہتی ہیں ناشکری ہو تم۔ ہوگا ایسا کسی کا شوہر مگر میں بہت شکر گزار ہوں اپنے رب کی ایک اور مزے کی بات تو بتائی نہیں جب میری شادی ہوئی اور میں ڈائجسٹ پڑھتی تو امی کہتیں اس پر ٹائم ضائع کرنے سے بہتر ہے کورس کی کتابیں پڑھ لو۔ تو پھر میں نے ڈائجسٹ پہ اخبار چڑھا کہ پڑھنا شروع کردیا پھر بھی کچھ نہ کہا انہوں نے۔ میں نے اپنی زندگی کے نو سالوں کا خلاصہ یہاں لکھ دیا ہے' میری اللہ سے دعا ہے ہر بہن کو میرے جیسا گھر ملے خوشیاں ملیں۔ اللہ پاک میرے گھر کو ایسے ہی ہنستا بستا رکھے اور نظر بد سے بچائے (آمین)۔

اعتذار

صائمہ اکرم چودھری ناسازیٔ طبیعت کی وجہ سے اس ماہ ناول "شہرزاد" کی قسط نہیں لکھ سکیں۔ اس لیے "شہرزاد" آپ آئندہ ماہ پڑھ سکیں گی۔

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

نصرت بانو

عنوان بہترین لگا۔ عبرت و نصیحت حاصل کرنے کے اس موضوع کو پڑھ کر میرا بھی قلم اٹھانے کا حوصلہ بڑھا۔ میں کوثر خالد اور س۔ج۔ پ کی طرح مضبوط تو نہیں لیکن پھر بھی اپنی داستان بہنوں و بیٹیوں تک پہنچانا چاہتی ہوں۔ پلیز ضرور شامل کیجئے گا۔

س : "شادی کب ہوئی؟"

ج : "یہ معرکہ 19 اکتوبر 1990ء کو پیش آیا۔"

س : "شادی سے پہلے کے مشاغل؟"

ج : "کھیلنا کودنا، پڑھنا اور بس۔ بچپن میں والدین کے ساتھ ہنستی مسکراتی زندگی تھی۔ جب میں چھٹی جماعت میں تھی تو ابو جی کی ڈیتھ ہو گئی۔ ہم چار بہنیں اور چار بھائی تھے۔ میں چوتھے نمبر پہ تھی۔ ابو کی وفات کے بعد ہم تنگ دست ہو گئے۔ قرابت داروں نے ضرورت کے مطابق مدد کی مگر کب تک؟ سو آٹھویں کے بعد پڑھائی چھوڑ کر امی کے ساتھ سلائی شروع کر دی اور خوب ڈٹ کر کی کہ سب چھوٹے بہن بھائی پڑھ لکھ گئے۔"

س : "رشتے میں مرضی؟"

ج : "رشتے میں میری مرضی ہرگز شامل نہ تھی۔ رشتہ ہمارے دور کے رشتے دار اور گاؤں سے آیا تھا اور میں دیہاتوں کے رواجوں سے خوب واقف تھی۔ اس لیے ڈھٹائی سے انکار کر دیا۔ جب تین سالوں تک کہیں مناسب جگہ رشتہ طے نہ ہوا تو وہی گاؤں کے زمین داروں کا رشتہ پلٹ کر آیا تو بس پھر شادی شدہ بہنوں نے بہت زور لگایا کہ تین سالوں میں نہ انہیں کوئی مناسب رشتہ ملا اور نہ ہمیں۔ "تری قسمت میں یہی رشتہ ہے۔ یقیناً" اللہ کی اس رشتے میں کوئی مصلحت ہو گی۔" یہ سب سے بڑی بہن تھی۔ "زمین دار ہیں۔ عیش کرے گی عیش۔ کبھی موقع دیکھ کر شہر میں گھر لینے کی خواہش بھی ظاہر کر دینا اور تو گھبراتی کیوں ہے، ہم ہیں نا تیری بہنیں، ہر مہینے تیرے پاس چکر لگایا کریں گے۔" یہ دوسرے نمبر والی بہن تھی۔ تو بس پھر اللہ کی مرضی بہنوں کی زور زبردستی اور اپنے بعد ماں پر چار بچوں کی مزید ذمے داری دیکھتے ہوئے رشتہ پکا ہو گیا۔

س : "جیون ساتھی کے حوالے سے تصور؟"

ج : "ذہن میں صرف یہ تصور پال رکھا تھا کہ چاہے اعلا تعلیم یافتہ ہو نہ ہو مگر اعلا اخلاق و کردار، مزاج میں شگفتگی ضرور ہونی چاہیے۔ بہت پیار کرنے والا ہو اور غصہ تو ناک کو بھی نہ ہو۔ بالکل میرے ابو کی طرح کی خوبیاں ہوں۔ میرے ابو محبت و پیار کا پیکر تھے جن کے جانے سے ہم آٹھ بہن بھائی ان کی لامحدود شفقت سے محروم ہو گئے تھے۔ میں اپنے جیون ساتھی میں سو فی صد اپنے والد والی خوبیاں دیکھنے کی متمنی تھی لیکن سب الٹ نکلا۔"

س : "منگنی کتنا عرصہ قائم رہی؟ فون پہ بات یا ملاقات وغیرہ؟"

ج : "منگنی ڈھائی سال تک رہی۔ میں اپنے شوہر سے ایک دو سال بڑی تھی۔ ابو کو ہم سب بچوں کو پڑھانے کا بہت شوق تھا۔ میں نے ان کی خواہش پوری کی۔ خود نہ پڑھ سکی مگر اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو سلائی کر کے پڑھاتی رہی اور ان کی پڑھائی کی خاطر میری صحیح وقت پر شادی نہ ہو سکی اور یہی وجہ تھی کہ عمر کے لحاظ سے کوئی مناسب رشتہ نہ ملا اور تین سال بعد اسی رشتے کو غنیمت جانتے ہوئے ہاں کر دی گئی۔ نہ فون پہ بات نہ ملاقات، بس مشرقی عورتوں کی طرح سادہ

سی شادی طے پاگئی۔"

س : "شادی کے لیے قربانی؟"

ج : "میں اپنی محنتی ماں کے لیے ایک طرح سے بیٹا تھی جو ان کا گھر چلانے میں بڑے بھائی سے بھی زیادہ ساتھ دیتی تھی۔ میری شادی کے بعد ان کا ایک کمانے کا سہارا کم ہو گیا۔ اکثر سوچا کرتی تھی کہ کاش میں لڑکا ہی ہوتی اور مجھے شادی کر کے دوسرے گھر نہ جانا پڑتا تو میں اپنی ماں کا آخری دم تک ساتھ دیتی۔ جنہوں نے ہم بچوں کو پالنے کے لیے اپنی عزت تک کی قربانی بھی دے دی تھی (عدت پوری ہونے سے پہلے ہی کمانے کی خاطر باہر نکلنا پڑ گیا تھا)۔"

س : "رسموں کے لین دین پہ کوئی جھگڑا؟"

ج : "نہیں جی کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ سسرال والے جانتے تھے کہ ہم متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے نہ انہوں نے کوئی فرمائش کی اور نہ ہم نے۔ لیکن میری امی نے ہر وہ چیز مجھے جہیز میں دی جو اس دور میں مقبول تھی۔ ایک دلچسپ بات شیئر کروں۔ میرے گاؤں کے گھرانوں میں میرا وہ پہلا گھر تھا جہاں بہو جہیز میں پہلی بار صوفہ لائی تھی اور وہ صوفہ آج بھی اپنی پائیداری کی وجہ سے گاؤں کے لوگ شادیوں میں براتیوں کے استقبال کے لیے لے جاتے ہیں۔ اکثر میرے بچے ہنستے ہیں کہ امی اگر آپ کا یہ شاہی و برکتی صوفہ نہ ہوتا تو شاید کسی کی شادی ممکن ہی نہ ہوتی۔۔۔۔ ہاہاہا۔"

س : "شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا؟"

ج : "اپنی شخصیت و مزاج کے حساب سے معمولی سی تعریفیں۔"

س : "شادی کے بعد خاص تبدیلیاں؟"

ج : "بہت دکھ بھری تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ میرے شوہر اور ان کا بڑا بھائی اکٹھے رہتے تھے۔ جی ہاں جوائنٹ فیملی کی بات ہو رہی ہے۔ میری شادی سے پہلے ہی میرے ساس سسر وفات پا چکے تھے۔ جٹھانی کا کہنا تھا کہ۔ شکر کرو، تمہارے آنے سے پہلے تمہاری ساس مر گئی ورنہ ہمارے تو وہ حشر ہوئے تھے۔ بی بی کہ اللہ کی پناہ۔ اور میری پانچ شادی شدہ نندوں اور محلے والوں کا کہنا تھا کہ وہ ایک مخلص عورت تھیں اور سسر گاؤں کے لوگوں کے معاملات دیکھنے بھالنے والے ایک ایمان دار شخص تھے، پھر وہ کیسے تھے۔ اللہ بہتر جانے، بہرحال یہ دونوں شخصیات میرے آنے سے پہلے اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں اور ان کا یعنی ساس سسر کا کردار میرے جیٹھ و جٹھانی نے نبھانا شروع کیا جن کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ مجھے ان کا بات بہ بات ساس سسر کا کردار نبھانا بالکل پسند نہیں تھا۔ شوہر اپنی بھاوج اور بھائی کے خلاف ایک بات بھی سننے کے روادار نہ تھے۔ بقول ان کے۔ "ایک بات ذہن نشین کر لو تم، عورتوں کے معاملات و جھگڑے عورتوں میں ہی رکھا کرو۔ مجھے ذرا ذرا سی بات مت بتایا کرو۔ مجھے قطعاً" دلچسپی نہیں ہے اور نہ کبھی لوں گا۔" جب سننے والا ہی صاف انکار کر دے تو باقیوں سے کیسی امید۔ بس اس کے بعد میں خاموش ہوتی چلی گئی۔

س : "کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟ تعریف یا تنقید؟"

ج : "ایک ہفتے بعد میں نے زردہ پکایا۔ اللہ جنت نصیب کرے میرے جیٹھ صاحب کو انہیں بہت پسند آیا اور تعریف بھی کی۔ مجھے سب کچھ پکانا آتا تھا جبکہ گاؤں میں بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو میری جٹھانی اور اس کی بیٹیوں کو پکانی نہیں آتی تھیں اور میں نے سکھائیں انہیں۔ سسرال والوں کو پہلی دفعہ میں نے اروی کے پتے بنا کر کھلائے تو وہ حیران رہ گئے کہ پتے بھی سالن کے طور پر بنائے جاتے ہیں واہ۔۔۔ گھر کا صحن اتنا بڑا تھا کہ جھاڑو لگاتے لگاتے میں خود جھاڑو جیسی ہو گئی۔"

س : "شادی کے بعد شوہر کا رویہ کیسا تھا؟"

ج : "ان کا رویہ میرے خیالوں سے بالکل مختلف اور برعکس نکلا۔ شادی سے پہلے میری امی نے سسرال والوں سے وعدہ لیا تھا کہ میری بیٹی شادی کے کچھ عرصے

بعد شہر شفٹ ہو جائے گی اور اسی شرط و وعدہ کے تحت شادی طے پائی تھی لیکن جب کافی عرصے بعد بچوں کو تعلیم کی ضرورت پڑی تو میں نے شہر جانے کا وعدہ یاد دلایا مگر وہ صاف منکر ہو گئے، کہنے لگے۔ ”کون سا وعدہ؟ کیسا وعدہ جن سے لیا تھا انہیں پکڑو۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا اپنی زمینیں چھوڑ کے۔“

ایک بات مجھ پر شادی کے بعد اور کھلی وہ یہ کے یہ کوئی زمین دار نہیں تھے، تھوڑی سی زمین تھی جن پہ یہ لوگ سانپ بن کر بیٹھے اور اتراتے پھرتے تھے۔ جیٹھ صاحب خود سوئی گیس کے شعبے میں شہر چلے گئے۔ چھوٹے بھائی پہ زمینوں کی دیکھ بھال کی سخت ڈیوٹی لگا دی۔ کہا کہ میں پیسے بھیجتا رہوں گا مگر تو نے یہاں سے نہیں ہلنا۔“

جٹھانی کی بیٹیاں بھی ماں سے کم نہ تھیں۔ اکثر مجھے اپنے شوہر سے کچھ کہنا ہوتا یا مانگنا ہوتا تو فوراً ”ڈرا دیتیں۔

”چاچی! چاچو سے یہ نہ کہہ دینا‘ وہ نہ کہہ دینا۔ بہت سخت طبیعت کے ہیں چاچو۔ کسی کا لحاظ نہیں کرتے۔“ اور میں بے وقوف واقعی ڈر جاتی اور آج خود کو کوستی ہوں کہ کاش اتنی فرماں برداری نہ کرتی۔ اور وہ خود آج اپنے شوہروں پر خوب رعب جمائے بیٹھی ہیں۔

میرے شوہر کا زیادہ وقت باہر گزرتا تھا اور ابھی تک ایسا ہی ہے۔ گھر لوٹنے پہ نہ حال نہ چال بس کھانا لا دے یہ بات ختم......

س : ”پہلے بچے کی پیدائش؟“

ج : ”پہلے بچے کی پیدائش میرے میکے میں ہوئی۔ میرا شوہر بیٹے کی پیدائش پہ بے حد خوش ہوا۔ میں حیران تھی اور اللہ پاک کا صد شکر کیا۔ لیکن بیٹے کے بعد دو بیٹیوں کی آمد پر وہ اتنا خوش دکھائی نہ دیے تو میں بچیوں کے معاملے میں ڈری ڈری سی رہنے لگی۔ ان کا مستقبل جٹھانی کی ان پڑھ بیٹیوں جیسا دکھنے لگا جبکہ بیٹے خوب پڑھ رہے تھے۔ یہ تھی دیہاتیوں کی اصل

سوچ اولاد میں فرق و ناانصافی کرنا۔ دو بیٹیوں میں سے دوسرے نمبر والی بیٹی کی دفعہ میں بہت بیمار ہو گئی۔ اس کی پیدائش کے بعد میری ٹانگ میں کوئی اندرونی مسئلہ پیدا ہو گیا جو آج تک ٹھیک نہ ہوا اور میں پاؤں گھسیٹ کر چلنے لگی، جس پر مجھے سستی ماری، کاہل، نکمی جیسے طعنے سننے کو ملے۔ غلطی سے بھی ایک لفظ شکایت کا شوہر سے نہ کہتی اور سست رفتاری سے کام میں جتی رہتی۔"

س: "سسرال سے وابستہ توقعات؟"

ج: "سسرال سے کون توقعات رکھتا ہے جی.... توقعات تو شوہر سے وابستہ کی جاتی ہیں۔ جب وہ ہی ساتھ دینے سے انکاری ہو جائے تو پیچھے بچتا ہی کیا ہے۔ بڑے گھر و بڑے لوگوں کو کیا کرنا جب دل ہی بہت چھوٹے ہوں۔ ریاکاری نس نس میں سمائی ہو۔

سوچا تھا ایک ہی جٹھانی ہے مل جل کر رہیں گے۔

لیکن وہ مجھے ساتھ ملاتی تب نا.... محلے میں کسی کی عیادت کو جانا ہے یا شادی بیاہ یا مرگ پہ تو ڈپلیکٹ ساس صاحبہ چادر اوڑھتی اور اکیلے ہی یہ جا وہ جا۔ میں اکثر کہتی کہ مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ کہتی۔ "ہم کون سا وکھرے وکھرے ہیں بی بی! اکٹھے رہتے ہیں۔ گھر میں سے ایک بڑا ہی چلا جائے کافی ہے۔" اور اس طرح آگے رہ رہ کر اپنے نمبر میری نندوں اور شوہر کے سامنے بڑھاتی رہتی کہ مجھے ہی ملنا جلنا آتا ہے اور کسی میں یہ خوبی کہاں۔ آہستہ میں نے خود ہی لوگوں سے ملنا جلنا شروع کیا تو میرے باہر جانے کی خبریں میرے جیٹھ تک پہنچنا شروع ہو گئیں۔ میری جٹھانی ان سے لگائی بجھائی کرتی۔ انہوں نے آکر میری وہ کلاس لی کہ میرا کہیں آنا جانا بند کر دیا انہوں نے کہا گھر سے بس ایک بڑی ہی جائے گی اور کوئی نہیں۔" (یعنی کہ مجھے بہو ہی بن کر رہنا تھا بڑی بننے یا دیورانی بننے کی ضرورت نہیں ہے) اور اس رات میں خوب روئی۔ سسرال والوں پہ نہیں بلکہ اپنی قسمت پہ اور جب سارا ہنگامہ ہو چکا ہوتا تو جٹھانی صاحبہ اپنے شوہر سے کہنے لگتی۔

"رہنے دیں میاں جی! آپ کیوں ہلکان ہوتے ہیں۔ میں سمجھاؤں گی اسے۔"

اور پھر میٹھی چھری بن کے چلنے لگتی۔ جیٹھ صاحب برے آدمی نہ تھے مگر انہیں برا بنانے کی پوری پوری کوشش کی گئی تھی جو کسی حد تک کامیاب ہوئی۔

میں جو اپنے میکے میں مردوں کی طرح بھائیوں کے ساتھ مل کر عید کے بکرے تک ذبح کروا دیا کرتی تھی۔ سسرال میں ماں بھائیوں کی عزت کی خاطر ایک صابر مظلوم بکری بنی بیٹھی تھی۔ اپنا حق کس کے سہارے لیتی۔ مجازی خدا کے سہارے، جو سدا انجان بنے رہتے۔

پھر میں فارغ اوقات میں لوگوں کے کپڑے سلائی کرنے لگی تو ڈپلیکیٹ ساس صاحبہ میری محنت مجھے پکڑنے سے پہلے ہی ہتھیا لیتیں۔ جب چھ، سات بار ایسا ہی ہوا اور وہ باز نہ آئیں تو میں نے سلائی کرنا ہی چھوڑ دیا۔ ایسے تو ایسے ہی سہی۔

س: "سسرال والوں سے تعلقات؟"

ج: "میری شادی کو 27 سال ہو گئے ہیں۔ ماں بھی جہان فانی سے رخصت ہو گئی۔ بھائی وغیرہ شادی کے بعد ایک دو دفعہ ہی آئے ہیں۔ بہنیں جو ہر ماہ بعد آنے کا دعوا کرتی تھیں، 27 سالوں میں بس دو یا تین بار آئی ہیں۔ سب شہروں میں رہائش پذیر اور مصروف زندگی کا بہانہ کرتی ہیں۔ تمہارا گاؤں بہت دور ہے کا عذر بیان کرتی ہیں (بہن کو دور بیاہتے ہوئے کیوں نہ سوچا) بس یہی شکایت ذہن میں خون کی طرح کھولتی ہے لیکن اپنے نصیب کا ملا جو ملا، یہ سوچ کر اللہ کا شکر و صبر کرتی ہوں۔ جٹھانی گھر میں بہویں بھی لے آئی ہے اور میں اب بھی سسرالیوں میں سمجھوتے اور ثابت قدمی سے ہر تعلق نبھا رہی ہوں۔"

س: "جوائنٹ فیملی پسند ہے یا علیحدہ؟"

ج: "شوہر کا ساتھ رہنا ساتھ نہیں ہوتا بلکہ ساتھ دینا اور نبھانا ساتھ ہوتا ہے۔ جب شوہر ساتھ ہو تو جوائنٹ فیملی بھی بہاروں جیسی اور جب شوہر ہی ساتھ

چھوڑ دے تو جوائنٹ کیا اور علیحدہ کیا' ہر جگہ خزاں ہی خزاں دکھائی دیتی ہے دل مانند اجڑی بستی کے۔"

س : "کوئی حسرت یا خواہش؟"

ج : "اب تو خواہش کے نام سے بھی ڈر جاتی ہوں مگر ایک خواہش پہ میں سینہ سپر ہو گئی۔ ہمت و استقلال کا دامن تھامے رکھا اور وہ تھی گاؤں میں رہ کر بچیوں کی تعلیم۔ بیٹیوں کی تعلیم کے لیے مجھے شوہر سے ایسی ایسی باتیں سننے کو ملی تھیں کہ ناقابل برداشت۔ مگر کچھ پانے کے لیے کچھ کھونے کا اصول اپنانا پڑتا ہے اور میں نے بھی یہی کیا۔ بیٹا روز وین پہ جاتا اور پڑھتا رہا۔ لڑکیوں کا اسکول پانچ تک تھا۔ میں نے بڑی بیٹی کو ضد کر کے نانی کے پاس بھجوایا اور جب تک نانی زندہ رہی۔ وہ پڑھتی رہی پھر ایف اے کر کے واپس آ گئی۔

چھوٹی بیٹی کے لیے نندوں کی سفارش کا سہارا لیا۔ بیٹے نے ساتھ دیا اور شوہر سے اجازت دلوائی۔ آج وہ سیکنڈ ایئر میں ہے۔ بیٹا پی اے ایف میں جاب کرتا ہے۔ اللہ کی ذات کا شکر ہے میرے بچے میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔"

س : "شوہر سے تعلقات؟"

ج : "سب سے غم زدہ کرنے والا سوال مگر میں پھر بھی اس کا جواب دینا ضروری سمجھوں گی۔ میرے شوہر سے میرے تعلقات بس ضرورت پوری کرنے کی حد تک رہے۔ وہ صرف میرے ساتھ ہی روکھا پن روا نہیں رکھتے بلکہ اپنے تینوں بچوں کے ساتھ بھی ایسا رویہ ہے۔ بیٹا تو خیر لیکن بیٹیاں اب تک باپ سے کچھ مانگنے کے لیے سر نہیں اٹھاتیں۔ ضرورت سے زیادہ نہ وہ باپ سے بات کرتی ہیں نہ میں۔ بچوں کے لیے مزاج میں نرمی و شفقت بالکل بھی نہیں ہے۔ میری قدر نہیں کی نہ میری پسند کا کبھی پوچھا نہ خیال رکھا۔ مجھے ان باتوں کا شکوہ نہیں ہے لیکن بچوں کے ساتھ بھی روکھا پن' سخت مزاجی کا رویہ بہت دکھ دیتا ہے۔ ان کی آنکھوں میں باپ کے پیار کی بھوک بہت تکلیف دیتی ہے۔"

میرے شوہر نے میرا دل سب سے زیادہ اس وقت دکھایا جب میری 20 سالہ بیٹی کا رشتہ اپنے بھائی کے 35 سالہ بیٹے کے ساتھ دھمکیاں دے کر طے کر دیا۔

"اس رشتے کے لیے میں ہر صورت صرف ہاں سنوں ورنہ اپنا بوریا بستر تہ کر لو۔" ان جیسے لوگ لڑکیوں کو رحمت نہیں زحمت سمجھتے ہیں۔ میری بیٹی نے میرے لیے قربانی دے دی۔ میں نے حالات سے سمجھوتا کر لیا۔ اللہ بہتر جانے وہ اس رشتے میں کیا مصلحت پوشیدہ رکھتا ہے۔ میں بس اس لمحے آ کر بری طرح ٹوٹ گئی تھی۔ میرا اب بھی اللہ پہ پورا بھروسا ہے کہ جنہیں وہ زیادہ تکلیفیں دیتا ہے' وہی اللہ کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ نماز پڑھتی ہوں' شوہر کے لیے دعا کرتی ہوں کہ اللہ پاک میرے شوہر کا دل ہمارے لیے نرم کر دے۔ بچوں کے لیے دعا کرتی ہوں کہ میرے بچوں کے نصیب میرے جیسے بے رنگ نہ ہوں۔ انہیں مجھ سے ہمیشہ سمجھوتا کرتے رہنے کی وراثت نہ ملے۔ آمین

الجھ کر رہ گئی ہے زندگی
چار دنوں کی دو دنوں میں

س : "شادی شدہ بہنوں کے لیے پیغام؟"

ج : "کامیابیاں ہمیشہ جہد مسلسل اور ڈٹے رہنے سے ملتی ہیں۔ میری آپ سے التجا ہے کہ ہمت کر کے اپنا حق نکلواؤ ورنہ یہ دنیا کبھی بھی آپ کی ہتھیلی پہ آپ کا حق نہیں رکھے گی۔ کسی کی باتوں میں ہر گز مت آؤ۔ یہ دور خاموش رہنے یا دبے رہنے کا نہیں ہے۔ جن کا وقت گزر گیا سو گزر گیا۔ آگے اپنی نسلوں کو بچالو۔ کہنے والی بات ہر حال میں کہہ کر رہو تاکہ گزشتہ وقت کے لیے پچھتانا نہ پڑے کہ کاش یہ یا وہ بات وقت پہ کہہ دی ہوتی۔"

س : "غیر شادی شدہ بہنوں کے لیے پیغام؟"

ج : "یہی عمر ہے جینے کی خوب جیو۔ یہ لمحے پھر نہیں لوٹتے اور یہی عمر ہے سیکھنے کی بھی' جو سیکھو' دل لگا کے سیکھو۔ ماں باپ کا دل مت دکھاؤ۔ اچھے برے وقت میں بیٹوں سے بڑھ کر ان کا ساتھ دو۔ حوصلہ مت ہارو تعلیم مت چھوڑو یہ تمہارے برے وقت میں ایک مضبوط سہارا ہوتی ہے۔"

عفت سحر طاہر

نرس وہیل چیئر کو آہستہ آہستہ دھکیلتی چلی آرہی تھی۔ نمیر نے دور سے ان کو لان کی طرف آتے دیکھا تو بے اختیار بینچ پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ زرنگار اب خوش ہو کر اردگرد کھلے پھولوں کو دیکھتی اور اشارے کر کر کے ان کے متعلق نرس سے پوچھ رہی تھیں۔ نمیر کی آنکھوں میں حسرت سی اترنے لگی۔

کاش!

اس کی ماں اس کے بارے میں بھی ایسے ہی پوچھتی۔ وہ چند قدموں کے فاصلے پر تھیں جب لمبے ڈگ بھر کر نمیر ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ نرس نے وہیل چیئر روک دی اور مسکرا کر نمیر کو دیکھتی واپس چلی گئی۔ وہ جانتی تھی ماں بیٹے کے بیچ اب کیا مکالمہ ہونے والا تھا۔ زرنگار نے چہرہ اٹھا کر قدرے خفگی سے نمیر کو دیکھا۔

"تم کون ہو... اور کیوں میری سیر کا راستہ روکا؟" وہ ان کی وہیل چیئر کے دونوں بازوؤں پر ہاتھ جما تا پنجوں کے بل ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

"آپ پھر مجھے بھول گئیں؟ آپ نے کہا تھا کہ اگلی بار آپ مجھے یاد رکھیں گی۔"

"تم کیا سبق ہو میرا۔ جسے یاد کرنا بہت ضروری تھا؟" وہ چڑ کر بولیں۔

"بالکل صحیح کہا آپ نے... بچے ماؤں کے لیے سبق ہی ہوا کرتے ہیں جنہیں وہ سرتاپا حفظ کر لیتی ہیں۔ کبھی نہ بھولنے کے لیے۔"

پینگڈویں قسط

وہ ان کے انداز پر بے اختیار مسکرا دیا۔ مگر وہ ابھی نمیر کی اس بدتمیزی سے ناراض تھیں جس کا ارتکاب اس نے ان کا راستہ روک کر کیا تھا۔

"میں نمیر ہوں امی۔۔۔ نمیر وقار آفندی' آپ کا بیٹا۔" نمیر نے بڑے تیقن سے اپنا تعارف کروایا تو انہوں نے ہر بار کی طرح خالی نظروں سے اسے دیکھا۔

"لیکن میرا تو کوئی بیٹا نہیں۔" ان کی نگاہوں میں بے یقینی اتر آئی اور ہمیشہ ایسے موقع پر نمیر کا دل بوجھل ہوتا "آپ یاد ہی نہیں رکھتیں۔ ورنہ اتنے ہینڈسم بیٹے کو بھولتا ہے کوئی۔" وہ خود کو سنبھالتے ہوئے ذرا ناراضی سے بولا۔ تو انہوں نے تنقیدی نظروں سے اسے دیکھا۔ لیکن ان نگاہوں میں فقط تنقید ہی تھی۔ پچھلے چودہ سالوں سے وہ ان آنکھوں میں اپنے لیے شناسائی کی ایک جھلک کے لیے ترس گیا تھا۔ مگر ان میں پہچان کی رمق اترتی ہی نہ تھی۔ وہ سرد آہ بھرتے ہوئے ان کی وہیل چیئر کو تھام کر آہستہ آہستہ دھکیلنے لگا۔

اب اسے ہمیشہ کی طرح انہیں پرانی باتیں یاد دلانے کی کوشش کرنا تھی۔ وہ باتیں جن میں اگرچہ زرنگار کے لیے غم ہی غم تھے لیکن اسے وہ سب یاد کروانا بہت ضروری تھا۔ ہر ملاقات میں زرنگار یہ کہانی سنتیں۔ اس پر جذباتی عورتوں کی طرح رائے دیتیں۔ کبھی آنسو بھی بہا لیتیں۔ اور نمیر سے وعدہ کرتیں کہ اگلی ملاقات میں وہ اسے نہیں بھولیں گی۔ مگر اگلی ملاقات پھر سے یہیں سے شروع ہوتی۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی نمیر انہیں سب کچھ بتا رہا تھا۔ ان کے ذہن کو جگائے رکھنے کے لیے یہ مینٹل تھراپی بہت ضروری تھی۔ اور وہ روزانہ ایک گھنٹہ کے لیے ان کے پاس لازمی آتا تھا۔ ایک گھنٹہ ان کے ساتھ گزار کر اس نے نرس کو بلوایا۔

زرنگار اب لاتعلقی سے لان میں چلتے پھرتے لوگوں کو دیکھ رہی تھیں جن کی چہل قدمی یا گھر والوں سے ملاقات کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ ان کے سامنے زمین پر پنجوں کے بل بیٹھا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

"میں جا رہا ہوں' پیار نہیں کریں گی بیٹے کو؟" وہ انگشت شہادت سے اپنی پیشانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں کچھ یاد دلا رہا تھا۔ مگر وہ یونہی اسے دیکھتی رہیں۔ تب ایک گہرے دکھ میں گھرتے ہوئے نمیر نے ان کا ہاتھ تھام کر اپنے سر پر رکھا۔ نرس ان کے پاس پہنچ چکی تھی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ نرس وہیل چیئر کو دھکیلتی لحہ بہ لحہ اس سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ اور نمیر کی آنکھوں کی سرد مہری تھی کہ بڑھتی ہی چلی جاتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"مہو کو بلاؤ ذرا۔۔۔" تائی جان ابھی آغا جان کی بات سن کر آرہی تھیں۔ ملاحہ کو کہا تو وہ ان کا چہرہ دیکھ کر گویا اندازہ لگانے لگی کہ کیا بات ہوئی ہوگی۔

"آپی تو شاید کچن میں ہیں۔۔۔ خیریت تو ہے نا؟" اس نے تشویش سے پوچھا۔ تو وہ جھلا گئیں۔

"کبھی تم بھی غلطی سے کچن میں جھانک لیا کرو۔"

"جھانکا تھا' تبھی تو پتا چلا کہ آپی کچن میں ہیں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کر جوتوں میں پاؤں پھنسانے لگی۔ تائی جان اس بیزاری سی حالت میں اس کے بستر پر نیم دراز ہو گئیں۔ خود کچن میں کام سنبھال کر ملاحہ نے مہو کو ان کی بات سننے کے لیے بھیجا۔

"جی امی۔۔۔؟" وہ ان کے سامنے ٹک گئی۔ انہوں نے تکیہ اونچا کر کے ٹیک لگاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے سے مرجھائی ہوئی نظر آرہی تھی۔

"آگے کی زندگی کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟" انہوں نے پوچھا تو مہماہ کے دل پر بوجھ سا آگرا۔

"پہلے کون سا زندگی میرے بنائے ہوئے منصوبوں کے مطابق گزر رہی ہے۔" وہ سخت بددلی سے بولی۔
"پہلے نہیں مگر اب تو گزار سکتی ہو نا۔" انہوں نے اسے حوصلہ دیا۔
"تمہارے آغا جان نے کہا ہے کہ تمہارے لیے رشتہ دیکھ کر ان کو بتاؤں۔" ان کی بات سن کر مہو کو کرنٹ سا لگا۔ اس نے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا۔
"سارا معاملہ جانتے ہوئے بھی۔۔۔ نکاح پر نکاح کروائیں گے وہ میرا؟"
"کون سا نکاح۔۔۔ کہاں ہے نکاح نامہ؟ بس کرو اب یہ سب مہو۔ وہ خبیث انسان تمہیں ایسے ہی لٹکائے رکھے گا ساری عمر۔ نہ ادھر کی رہو گی نہ ادھر کی۔" انہوں نے غصے سے کہا۔
"میرے پاس نکاح نامہ نہ سہی۔ اس کے پاس تو ہے نا اور میں تو جانتی ہوں کہ یہ نکاح ہوا تھا۔" وہ جذباتی ہوئی تو آنکھیں بھر آئیں۔
"تم فکر مت کرو۔ تنسیخ نکاح کا کیس کرتے ہیں ہم۔ پھر تم آزاد ہو گی۔" انہوں نے جانے اسے تسلی دی یا خود کو۔
"میرے پاس اس نکاح کا کوئی ثبوت نہیں نہ کوئی گواہ ہے۔ بنا ثبوت محض کسی شخص کا نام بتا کر کیا ہم تنسیخ نکاح کا کیس فائل کر سکتے ہیں؟" وہ ناراضی سے بولی۔ تائی جان کنفیوز ہونے لگیں۔
"نام کا تو پتا ہے نا اس کے۔۔۔"
"امی! خدا کے لیے۔۔۔ تنسیخ نکاح ہو بھی جائے۔ اب جہاں میرا رشتہ کریں گی وہاں اس نکاح اور طلاق کی کہانی سنائیں گی کیا؟" وہ زچ آ کر بولی۔ تو انہوں نے نادمی انداز میں کہا۔
"دماغ تو خراب نہیں ہے ہمارا۔ کون اس بے سروپا کہانی پر یقین کرے گا۔ بس چپ کر کے عزت کے ساتھ تمہیں رخصت کر دیں گے۔" وہ جیسے ہاتھ جھاڑ کر بولیں تو وہ پھٹ پڑی۔
"اور وہ۔۔۔ نمیر آفندی؟ جو بدلہ لینے کی خاطر اتنا بڑا قدم اٹھا چکا ہے۔ وہ نکاح نامہ لے کر وہاں آ گیا تو کیا ہو گا۔ یہ سوچا ہے آپ لوگوں نے؟"
"اسے کون سا پتا چلے گا۔" انہوں نے اس سے زیادہ خود کو بہلایا۔
"خدا کے لیے امی! خوش فہمیوں کے پہاڑ مت کھڑے کریں۔ ان پر سے پھسل کر گرے تو بندہ دوبارہ اٹھ نہیں پاتا۔" مہو بیزار تھی۔
"یہ اقوالِ زریں اپنے باپ اور دادا کو جا کر سناؤ۔" وہ ضبط کھو کر غصے سے بولیں۔ "ان سے کچھ کہو تو وہ مجھے سناتے ہیں۔ تم ہو تو خود وکالت پڑھی ہوئی ہو جیسے۔ ارے کسی کے پاس کوئی تو حل ہو گا نا اس مسئلے کا۔"
"ابھی آپ لوگ صبر کر لیں پلیز امی۔۔۔ تھوڑا ویٹ کریں۔ اس خبیث شخص کو سامنے آ لینے دیں۔ آپ کا کیا خیال ہے اس نے محض مجھ سے شادی کرنے کے لیے یہ قدم اٹھایا ہے؟ نہیں اس کا اصل لالچ پراپرٹی میں سے اپنا حصہ وصول کرنا ہے۔" تائی جان نے بے بسی سے اسے دیکھا تو ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔
محض اپنی اولاد کے لیے آنکھ نم کرنے والوں کے دل حقیقتاً "بہت سخت ہوا کرتے ہیں۔ صدیقہ بیگم کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا تھا۔ ان کے لیے بس اپنے دکھ اور تکلیفیں ہی دکھوں میں شمار ہوتے تھے۔
"مان جاؤ مہو! آغا جان بہت رازداری سے تمہارا نکاح پڑھوا کر ملک سے باہر رخصت کر دیں گے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔"
"ملک سے باہر نہ تو اللہ کوئی اور ہے اور نہ ہی اللہ کی شریعت۔ اللہ کا واسطہ ہے امی۔۔۔ کچھ عرصہ کے لیے اس

ٹاپک کو مت چھیڑیں۔" ان کی بات سن کر مہ ماہ کا دل کٹتا تھا۔ آنکھیں بھیگ گئیں۔
"اور میں نے کیا گناہ کیا ہے۔ جو یوں چوری چھپے نکاح کر کے گمنام ہو جاؤں۔ ساری عمر چھپ چھپ کر "کسی کو پتا نہ چل جائے" والی زندگی گزاروں اور سب سے بڑی بات یہ کہ نکاح پر نکاح؟"
مہ ماہ نے تکلیف سے کہتے شکوہ کناں نظروں سے انہیں دیکھا تو باوجود ضبط کے اس کی آنکھیں چھلک گئیں۔ وہ ماں تھیں' ان کا دل بھی کٹ کر رہ گیا۔ مگر فی الحال اس معاملے کا کوئی اور حل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ مزید کوئی بات کیے بنا اٹھ کر چلی گئی۔ تائی جان دوپٹہ پھیلا کر اوپر دیکھتے ہوئے نئے سرے سے زرنگار اور نمیر کو بددعائیں دینے لگیں۔ جن کی بدولت ان کے نیک نام خاندان کو بٹا لگ گیا تھا۔۔۔ اور اب ان کی عزت کو بھی۔

☼ ☼ ☼

"بے وقوف ہو تم۔ جو کبیر خان کی نرمی دیکھ کر اس قدر استحقاق سے اس کے خواب دیکھنے لگی ہو ملاحہ! پہلے آغا جان کے ری ایکشن کے بارے میں سوچو۔" فرزین نے اس کی ساری بات سن کر تاسف سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ جس پر خوشی جگمگا رہی تھی۔ پھر اسے گھسیٹ کر حقیقت کی دنیا میں لانے کی سعی کی۔
"نفع و نقصان محبت میں نہیں کاروبار میں دیکھا جاتا ہے فری! محبت تو ایک بہت خالص جذبہ ہے۔"
"وہ بے شک ہمارے ساتھ پلا بڑھا ہے ملی! مگر آغا جان کے لیے اس کی حیثیت ایک نوکر کے جیسی ہی ہے۔ تم طوفان کو بلاوا مت دو۔ رحم کرو کبیر خان پر۔ کیوں اس کا خانہ خراب کرواتا ہے۔" فرزین کو تو ابھی سے آنے والے طوفان کی دھمک سنائی دینے لگی تھی۔ پریشانی سے بولی تو ملاحہ ہنستی چلی گئی۔
"محبت اگر خدشات اور دھمکیوں کی فکر کرتی تو اب تک اس دنیا سے اٹھ چکی ہوتی۔ ہر قسم کے طوفان کا مقابلہ کر کے بھی ثابت قدم رہنا ہی تو محبت ہے۔"
بس کرو فری۔۔۔ ابھی تو بس اس سرور میں گم رہنے دو کہ کبیر کی بھی میرے لیے وہی فیلنگز ہیں جو میری اس کے لیے۔" وہ آنکھیں بند کیے خوشی سے جھوم رہی تھی۔
"نمیر آفندی' آغا جان کا اپنا خون ہے۔ وقار چچا کا بیٹا۔ مگر اس کی حیثیت دیکھ لو تم آغا جان کی نظروں میں۔ کبیر کو وہ کیا سمجھتے ہیں بھلا" فرزین ظالمانہ حد تک حقیقت پسند تھی۔ ملاحہ نے اسے گھور کر دیکھا۔
"تم میری طرف ہو یا آغا جان کی طرف؟ جب سے یہ خوش خبری تمہیں سنائی ہے کسی منحوس سیاستدان کی طرح بری پیش گوئیاں کر رہی ہو بس۔"
"ایک بھی لفظ غلط کہا ہو تو بتاؤ؟" وہ ٹیرس کی دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے بے نیازی سے اسے چیلنج کر رہی تھی۔ ملاحہ کا دل لمحہ بھر کو افسردہ ہوا۔ پھر اس کی نظر ریلنگ سے گزرتے ہوئے نیچے پورچ کی طرف اٹھی تو وہ فرزین کا بازو گھسیٹ کر اسے ریلنگ تک لائی۔ نیچے کبیر خان کی گاڑی آکر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ گاڑی سے اتر کر اب واچ مین سے کوئی بات کر رہا تھا۔ بلیو جینز اور گرے بلیک ٹی شرٹ میں ملبوس۔ سن گلاسز بالوں پر اٹکائے' اونچا لمبا اور خوش شکل خان بلاشبہ خوب صورت مردوں میں شمار ہوتا تھا اور سب سے بڑھ کر اس کی طبیعت کا دھیما پن۔
"دیکھو اسے اور بتاؤ۔۔۔ کیا غلط ہے میرا اس کی محبت میں مبتلا ہو جانا۔" وہ پرشوق نظروں سے کبیر خان کو دیکھتے ہوئے بہت جذب سے پوچھ رہی تھیں۔ کبیر خان اب اندر کی طرف آرہا تھا۔ سن گلاسز اتارتے ہوئے ٹیرس کی طرف سے خود پر جمی دو محبت بھری نگاہوں کی چمک اس نے ایک اچٹتی نظر میں ہی پالی تھی۔ مگر اس ایک بلا ارادہ اٹھنے والی نظر کے بعد وہ فوراً" نظر جھکا کر لمبے ڈگ بھرتا اندر چلا گیا تھا۔ تمتماتے چہرے اور چمکتی آنکھوں کے ساتھ

ملاحہ نے فرزین کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہو۔۔۔اب بتاؤ؟

"وہ بہت اچھا ہے ملی۔۔۔ مگر کہاں لکھا ہے کہ اچھے لوگوں کو تباہ و برباد کر دیا جائے؟" فرزین نے بڑے تحمل سے طنز کیا تھا۔

"تباہ کیوں؟" ملاحہ نے اسے ذرا سا گھورا پھر مسکرا کر دونوں بازو دائیں بائیں پھیلاتی آنکھیں بند کیے گھوم سی گئی۔ "محبت تو بنا دیتی ہے سنوار دیتی ہے۔۔۔ اور خوب صورت بنا دیتی ہے زندگی کو۔ انسانوں کو۔"

"جی۔۔۔ بالفرض انسان زندہ بچے تو۔" فرزین کا لقمہ کڑوے کریلے جیسا تھا۔ ملاحہ نے آنکھیں کھولیں اور خشمگیں انداز میں اسے گھورا۔

"تم تھوڑی دیر کے لیے اپنی یہ منحوس باتیں بند کر کے مجھے خوش نہیں ہونے دے سکتیں؟"

"مفروضوں پہ زندگی نہیں گزرا کرتی ملاحہ۔ تائی جان ہی کا سوچ لو۔ وہ تو داماد کے لیے اپنے بنائے معیار سے ایک انچ بھی نیچے تمہیں آئیں گی۔" فرزین نے اسے آئینہ دکھانے کی کوشش کی مگر جو خود کو کامل سمجھ بیٹھا ہو اس کا علاج کیا ہو سکتا تھا بھلا؟

"اللہ کے کرنے سے سب ہو جاتا ہے فری! بندوں کے چاہنے سے نہیں۔ میں تو بس اللہ سے مانگ رہی ہوں کبیر کو وہی دے گا مجھے۔" وہ اس قدر تیقن سے بولی کہ فرزین کا مزید کچھ کہنے کو کھلا منہ بند ہو گیا۔ مگر اس نے ملاحہ کے جگمگاتے چہرے کو دیکھ کر اس کی خوشیوں کے دائمی ہونے کی دعا ضرور کی تھی۔

☆ ☆ ☆

رات کے کھانے کے بعد آغا جان نے مہاہ کو اپنے کمرے میں بلوا لیا۔

"میں نے آپ کو بتا تو دیا تھا اپنا جواب پھر کیوں بلا رہے ہیں؟" وہ نروس سی ہو کر تائی جان سے ناراضی سے کہہ رہی تھی۔

"مجھ سے تو کہہ لیا۔ اصل کام ۔ آغا جان کو سمجھانا ہے۔ وہ تو بس کسی کے ساتھ بھی دو بول پڑھا کر تمہیں رخصت کرنے کو ہیں۔ اب جاؤ اور وہ عقل مندانہ باتیں انہیں بھی سناؤ۔" وہ طنز سے بولیں۔ ہاں تھیں ان کی بھی یہی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح مہاہ اپنے گھر کی اس طرح ہو جائے کہ نمیر کو پتا بھی نہ چلے۔ اگر مہاہ ذرا سی بھی اپنے رویے میں لچک دکھاتی تو اب تک یہ کام ہو چکا ہوتا۔ اب بات آغا جان تک پہنچ گئی تھی اور مہاہ کے خیالات بھی۔

وہ لرزتے دل کے ساتھ اسٹڈی میں داخل ہوئی۔ آغا جان چائے کا کپ سامنے رکھے کسی کتاب کی ورق گردانی میں مصروف تھے۔ اسے دیکھ کر فوراً" کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی تو مہاہ کو اندازہ ہو گیا کہ وہ لمبی بات کرنے کے موڈ میں ہیں۔ ورنہ اگر مختصر بات کرنی ہوتی تو وہ محض کتاب میں انگلی رکھ کر بند کر لیتے۔ اور بات ختم کرتے ہی وہیں سے کتاب کھل جاتی۔ انہوں نے مہاہ کو سامنے کاؤچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ دھڑکتا دل لیے بیٹھ گئی۔ سر جھکائے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست کیے۔ گناہ گار نہ ہوتے ہوئے بھی گناہ گاروں کی طرح

وہ کھنکھارے۔ گویا بات شروع ہوا چاہتی تھی۔

"ہوں۔۔۔ پتا چلا ہے مجھے تمہاری ماں سے تمہارے خیالات کا۔ مگر کیا زندگی اس طرح گزاری جا سکتی ہے؟"

"زندگی اس طرح بھی نہیں گزر سکتی آغا جان! جس طرح امی کہہ رہی تھیں۔ کسی کو فریب دے کر رشتہ جوڑ بھی لیا تو نمیر کے سامنے آتے ہی طوفان مچ جائے گا آغا جان۔"

"کوئی ثبوت نہیں اس نکاح کے ہونے کا مہو۔" ان کا لہجہ دھیما تھا۔ مہواہ کی آنکھ بھر آئی۔
"اس کے پاس نکاح نامہ ہے آغا جان اور اس پر میرے سائن۔"
"تنسیخ نکاح ہو جائے گا تو پھر تمہیں کسی سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟"
"اس نے بدلہ لینے کے لیے اتنا غلط راستہ استعمال کیا ہے آغا جان۔ بالفرض اگر نکاح ختم ہو بھی جائے تو کیا وہ چپ بیٹھا رہے گا؟ کل کو اس گھر کی کسی دوسری بیٹی پر آنچ آئے اس سے بہتر ہے کہ میں ہی قربانی دوں آغا جان۔ زندگی تو وہی تھی جو برباد ہو گئی اب اور کیا ہو گی۔"
بہت مدھم لہجے میں گفتگو کرتے آغا جان کو غصہ آیا۔ "کیا کرنا چاہتی ہو تم؟"
"میں چاہتی ہوں کہ وہ ہمارے سامنے آئے۔ اسے اس کا حق دیا جائے تب وہ مجھے آزاد کر دے گا آغا جان۔"
مہواہ نے دل مضبوط کر کے کہہ ہی دیا تھا۔
"کیا بکواس ہے یہ۔" وہ گرج اٹھے۔ "ایک طوائف کا بیٹا اب ہماری وراثت کا حصہ دار بنے گا؟"
"وہ وقار آفندی کا بھی بیٹا ہے آغا جان! اور نسلیں بیٹوں سے چلا کرتی ہیں۔ ان کی بیویوں سے نہیں۔" اندر سے خوف زدہ ہوتے ہوئے بھی مہواہ نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔
"الحمد اللہ۔۔۔ اللہ نے وارث دے دیا ہے ہمیں۔ اب اور کسی ایرے غیرے کی ضرورت نہیں رہی۔" ان کا چہرہ طیش سے لال ہوا۔
"آپ کے کہہ دینے سے جو رشتہ موجود ہے، وہ ختم نہیں ہو جائے گا آغا جان! اس غلط رویے نے اسے اس راہ پر چلنے پر۔۔۔"
"بکواس مت کرو۔" وہ مہواہ کی بات کاٹ کر گرجے تو اس کا دل دہل گیا۔ زبان ایک دم تالو سے چپک گئی۔ آغا جان کے سامنے تو ضرورت کی بات کر لینا ہی کسی معرکے سے کم نہ تھا کجا کہ ان کے سامنے تیمور وقار آفندی کے حق کے لیے آواز اٹھانا۔
"دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا؟ اس بے حمیت انسان کے ساتھ مل گئی ہو تم جس کے نام و نشان کا کچھ پتا نہیں۔"
"ایسا مت کہیں آغا جان۔۔۔" وہ اس الزام پر تڑپ اٹھی۔ "اس ساری لڑائی میں سب سے زیادہ استحصال میرا ہوا ہے۔ میں تو دیکھتے ہی اسے گولی مار دینے کے حق میں ہوں۔"
"تو پھر کیوں اس کی حق داری کی حمایتی بن کر بات کر رہی ہو؟" ان کا غصہ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔
"تو اور کون سا طریقہ ہے اس سے مجھے چھٹکارا دلوانے کا؟ ایسے وہ کبھی بھی سامنے نہیں آئے گا آغا جان اور دنیا میں ایسا کوئی انسان نہیں جو میرے ایک نکاح کے ہوتے ہوئے مجھ سے دوسرا نکاح کر لے۔" وہ بے بسی کی حد تک زچ آ گئی۔ آغا جان کے دماغ سے ان کے فرمودات نکال کر اپنا خیال اس میں ڈالنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔
"تم صرف اپنا منہ بند رکھو، سمجھیں۔" انہوں نے درشتی سے اسے جھڑک دیا۔ پھر مونچھوں کو تاؤ دے کر تنبیہی انداز میں بولے۔
"کچھ باتیں اور فیصلے بڑوں پر چھوڑ دینے میں ہی بھلائی ہوتی ہے۔ دنیا میں کیا کیا نہیں ہوتا۔ ایک تمہارا دھوکے سے نکاح ہو گیا تو کیا؟ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ سمجھیں۔ میں نے دوسرے مسلک کے ایک عالم سے پتا کروالیا ہے۔ زبردستی کے نکاح کی کوئی حیثیت نہیں۔" وہ اسے بچوں کی طرح بہلا رہے تھے۔ مہواہ کو صدمے نے گھیرا۔

"اپنی من مرضی کا فیصلہ لینے کے لیے آپ نے دوسرے مسلک کے عالم سے فتویٰ لے لیا؟"
"تو کیا ہوا... جب مذہب ہمیں گنجائش دے رہا ہے تو کیوں نہ فائدہ اٹھائیں"۔ وہ اطمینان سے بولے تو زندگی میں پہلی بار مہپاہ کو احساس ہوا کہ اس پُر رعونت شخص نے اپنی زندگی میں کتنے اور غلط فیصلے کیے ہوں گے۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ کچھ لوگ مذہب کو کس طرح اپنی ذات کے لیے توڑ موڑ کر استعمال کرتے ہیں۔ یعنی جس مسلک سے اپنی پسند اور طمانیت کا فتویٰ ملا اسے لاگو کر کے زندگی آسان بنالی... مگر صرف دنیاوی زندگی... اخروی زندگی پر تو ایک ہی فتویٰ لاگو ہونے والا تھا... مالک کل کائنات کا فتویٰ... جو روز روشن کی طرح عیاں کتاب میں درج ہے۔ مگر جس کا ہر کوئی اپنی مرضی اور آسانی کے لیے مطلب نکال رہا ہے... مذہب میں گنجائش نکالنے والوں پر بہت بھاری دن آئے گا بے شک... تو کوئی ہے، جو سوچے سمجھے؟
"آپ اس سے رابطہ کریں آغا جان۔ اسے ٹیبل ٹاک پر آمادہ کریں۔ کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکل آئے گا۔"
"ہونہہ... وہ طوائف کا بیٹا اس قابل ہے کہ آغا ذوالفقار خان اس کو اپنے بالمقابل بیٹھنے کا شرف بخشے۔" (اف... اے خاک کے پُتلے تیری رعونت) مہپاہ کا دماغ چیخنے لگا۔
"طوائف کا بیٹا سہی آغا جان! لیکن اللہ کو یہی منظور تھا کہ وہ آغا ذوالفقار خان کی نسل میں پیدا ہو۔" آج بہت عرصے کے بعد وہ آغا جان کے سامنے احتجاج کر رہی تھی۔ وہی پرانی مہپاہ... ڈانٹ کھا کر بھی اپنی بات آغا جان کے کانوں تک پہنچا دینے والی۔
"با... س..." وہ ہاتھ اٹھا کر گرجے تھے۔ مہپاہ کی زبان لڑکھڑا گئی۔
"اٹھو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے... تم اس قابل نہیں ہو کہ تم سے کوئی عقل مندانہ مشورہ لیا جا سکے" مہپاہ کا دل تو چاہا کہ کہہ دے آپ جیسے عقل مندانہ مشورے تو میں ساری زندگی نہیں دے سکتی۔ مگر پھر لب بھینچتی اٹھ کر تیزی سے باہر نکل آئی۔ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے اسے اپنی اس بے بس زندگی پر اور رونا آیا۔ وہ اس قدر ملول اور افسردہ تھی کہ اپنے کمرے سے نکلتی ثمرہ نے بے اختیار ہی اسے آواز دے ڈالی۔
"ابھی طبیعت ٹھیک نہیں ہے چچی جان... ٹھہر کر آتی ہوں۔" اس نے نظر چُراتے ہوئے بھرائے لہجے پر قابو پا کر بہانہ بنایا۔
"بس دو منٹ کے لیے آجاؤ مہو... زیادہ وقت نہیں لوں گی تمہارا۔" انہوں نے نرمی سے اصرار کیا تو مہپاہ سے مزید کوئی بہانہ نہیں بنایا گیا۔ اور وہ ان کے کمرے میں چلی آئی۔
"بیٹھو..." انہوں نے بیڈ کے پاس رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا اور خود اس کے سامنے بیڈ کے کنارے پر ٹک گئیں۔

لمحہ بھر انہوں نے کچھ سوچ کر جیسے الفاظ جمع کیے۔ پھر گہری سانس بھر کر اسے دیکھا۔ "آگے کی زندگی کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟"
"یہاں پہلے کون سا میری سوچ پر زندگی چل رہی ہے۔" وہ تلخ ہوئی۔ جیسے زمانے بھر سے ناراض ہو۔
"پھر بھی۔ اس مسئلے کا کوئی حل تو نکالنے کی کوشش کی ہی ہو گی تم نے؟" وہ اسے بات کرنے پر اکسا رہی تھیں۔
"آغا جان ہیں ناں ہر مسئلے کا حل بتانے والے۔ اس طرح کے تمام معاملات کے لیے ان کی ذاتی ڈائری ہے فتووں والی۔" وہ تلخی سے گویا ہوئی۔ پھر نم آنکھوں سے انہیں دیکھ کر بولی۔ "مگر میں نکاح پر نکاح کر کے حرام کی زندگی نہیں گزار سکتی چچی جان۔"
"تم بھابی اور بھائی صاحب سے بات کرو۔ نکاح کھیل نہیں ہوتا۔" وہ تاسف سے بولیں۔ تو اس نے انگلی سے

پلک کی نوک پر آجانے والا آنسو جھٹکا اور خود اذیتی سے ہنسی۔
"وہ بھی اسی خاندان سے ہیں۔ جو آغا جان کہہ دیں گے' وہ فتویٰ بن کر ہماری قسمت پر لاگو ہو جائے گا۔ امی تو صبح ہونے سے پہلے مجھے کسی کے بھی ساتھ باعزت طریقے سے رخصت کرنے کو تیار ہیں۔"
"اُف۔۔۔ وہی پرانے لوگ اور وہی ان کی سوچیں۔ بس کیلنڈرز ہی بدل رہے ہیں اس گھر کے' وقت اور سوچ تو جیسے تھم کر رہ گئی ہے یہاں۔" وہ کوفت سے بولیں۔ "وقار اور زرنگار کے قاتل ان ہی کو گردانتی ہوں میں۔ آدھا تو ان کے رویے نے ہی مار ڈالا تھا انہیں۔" وہ بات کرتے ہوئے دکھ کے اس دور میں چلی گئی تھیں جیسے۔ "اتنا پیارے دل والا بندہ تھا وقار۔۔۔ کیا تھا جو اس نے ایک عورت کو عزت کی زندگی دینے کا سوچ لیا؟ یہ فیصلہ تو اللہ کی طرف سے ہوا تھا کہ زرنگار کوٹھے سے نکل کر اس کوٹھی میں چلی آئے۔ وقار آفندی تو بس وسیلہ بنا۔ مگر۔۔۔ یہاں وسیلوں کی حقیقت کو مانتا ہی کون ہے۔ ہر کسی کا اپنا عقیدہ' اپنا فلسفہ۔ پورا آفندی ہاؤس دشمن ہو گیا ان کا۔ اللہ معاف کرے جن حالات میں وقار کی موت ہوئی ہو گی۔ اس کے گھر کی کسمپرسی چیخ چیخ کر بتا رہی تھی۔
اس کے بیٹے کی آنکھوں کی کبھی نہ پوری ہونے والی حسرتیں۔۔۔ اتنی بڑی جائیداد کا حصے دار' ایک بار بھی پلٹ کر کوئی مطالبہ کرنے نہیں آیا اور اب اگر وہ بیوقوفی کر ہی رہا ہے تو آغا جان محبت سے اسے گلے لگا کر سارے گلے شکوے مٹانے کے بجائے اس جنگ کو مزید بڑھاوا دے رہے ہیں۔"
"میں نے کہا تھا آغا جان سے۔۔۔ کہ اب اگر رابطہ ہو تو وہ نمیر کو مذاکرات کی ٹیبل پر بلائیں اور اس کا حق اسے دے کر بات ختم کر دیں۔ مگر ان کی انا یہ ہار برداشت نہیں کر سکتی چچی جان۔ چاہے اس میں کسی کی بھی زندگی برباد ہو جائے۔"
"نمیر کو صرف سمجھانے کی ضرورت ہے مہماہ! اسے یہ احساس دلانے کی کہ وہ ایک عزت دار ماں کا بیٹا ہے۔۔۔ اس کی ماں تو وہ ہیرا تھی جس کو وقار آفندی نے پورے ادب و احترام کے ساتھ اپنے خاندان کے سر کے تاج میں سجا دیا۔ مگر بات صرف یہ ہے کہ آفندی ہاؤس میں ہر کوئی اتنے بڑے دل والا نہیں تھا۔"
"میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں۔ مگر میری زندگی جس شخص نے برباد کر دی ہے میں اس کے ساتھ ہمدردی کیسے کروں؟"
"بڑے فیصلے کرنے کے لیے دل بڑا کرنا پڑتا ہے مہر! اور سوچ بھی۔" انہوں نے گہرے لہجے میں کہا تو وہ خاموشی سے آنسو بہانے لگی۔

☼ ☼ ☼

"تم کیا ہر وقت کمرے میں ہی گھسی رہتی ہو۔ اس گھر کے لوگوں کے ساتھ تمہارا کوئی واسطہ نہیں ہے؟" آج طلال آتے ہی بستر پر لیٹی موبائل میں مگن تزئین پر برس پڑا۔ تو اس نے محض ایک سرسری نگاہ اس پر ڈالی اور دوبارہ سے اسی کھیل میں مصروف ہو گئی۔ طلال نے دانتوں پر دانت جما کر اسے گھورا۔
"میرا جس کے ساتھ نکاح ہوا ہے اس کو ہمارے رشتے کا احساس نہیں تو باقی گھر والوں سے مجھے کیا لینا دینا۔" وہ طنزیہ کہتی طلال کے غصے کو ہوا دے گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر تزئین کے ہاتھ سے موبائل جھپٹا اور بیڈ پر پٹخ دیا۔
"مشینوں سے زیادہ انسانوں کو اہمیت دینا سیکھو تزئین۔ سارا دن ٹی وی اور موبائل بس۔"
"اوہو۔۔۔" وہ اپنا طیش چھپاتے ہوئے تمسخرانہ ہنسی۔ "تو اس پڑھے لکھے گھرانے میں بھی لوئر کلاس مینٹیلٹی (نچلے طبقے کی ذہنیت) پائی جاتی ہے۔ آتے ہی بیٹے کے کان بہو کے خلاف بھر دیے۔"
"حد میں رہو تزئین۔" لال ہوتی آنکھیں لیے اس نے انگلی اٹھا کر تزئین کو تنبیہی انداز میں کہا۔ "میں

اندھا نہیں ہوں۔ مجھے بھی دکھائی دیتا ہے جو رویہ تمہارا گھر والوں کے ساتھ ہے۔"
"اور تمہیں اپنا رویہ دکھائی نہیں دیتا؟ مجھے کیا تم نے پتھر کی مورت سمجھ رکھا ہے۔ بے روح، بے دل۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی تمہارے رویے سے؟" وہ بھی پھٹ پڑی۔
"شرم کرو تزئین... کیا کمی ہے تمہیں یہاں۔ شادی کی ہے تو نبھا بھی رہا ہوں۔ اس کے باوجود تمہاری یہ سوچ ہے۔"
"ہاہ... بظاہر ہی شادی کر لی تم نے تو مجھ سے ورنہ دل و دماغ پر تو مہپاہ کا غلبہ اس قدر شدید ہے کہ مجھ میں اس کی شبیہہ اس کا لمس تلاشتے ہو تم۔"
وہ اس قدر کڑوا اور گھٹیا قسم کا طنز کرے گی یہ طلال کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ بے اختیار ہی اس کا ہاتھ اٹھا اور تزئین کے چہرے پر نشان چھوڑ گیا۔
"کیا بکواس کر رہی ہو تم؟ اس طرح کا گھٹیا انسان سمجھتی ہو تم مجھے۔" اسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے وہ دانت پیستے ہوئے کہہ رہا تھا۔
اس کے بھاری ہاتھ کا تھپڑ کھا کر بے یقینی سے پتھرئی تزئین کو جیسے ایک دم ہوش آیا تو وہ بھوکی شیرنی کی طرح غرا کر اس پر پل پڑی۔ تھپڑ، مکے، ناخن سب بے دریغ چلانے لگی۔ طلال اپنا غصہ بھول کر اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں جکڑ تا بہ مشکل اپنا بچاؤ کر رہا تھا۔
"تم... تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھے تھپڑ مارنے کی۔"
"بی ہیو یور سیلف۔" طلال نے اس کے دونوں ہاتھ اس کی کمر پر جکڑ لیے اور دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔
"چھوڑ دو مجھے طلال... اگر تمہیں مہو کی چاہ ہے تو تمہاری یہ قربت میرے لیے بھی ایک آزمائش سے کم نہیں۔"
وہ تحقیر بھرے لہجے میں بولتی طلال کو بھک سے اڑا گئی۔
وہ تزئین سے اتنی گھٹیا انداز گفتگو کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ زور سے دھکا دے کر اسے بیڈ پر پھینکا اور منہ سے کف اڑاتے ہوئے بولا۔ "لعنت ہو تم پر اور تمہاری گھٹیا سوچ پر... تم کبھی بھی مجھے حال میں جینے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہونے دو گی۔"
وہ کچھ نہیں بولی۔ بیڈ پر اوندھی پڑی سسکتی رہی۔ طلال سے اس قدر سخت رویّے کی اسے امید نہیں تھی۔ وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر فریش ہونے کے لیے واش روم میں گھس گیا۔ منہ پر پانی کا چھینٹا مارتے ہی چہرے پر درد کی شدید لہر اٹھی تو اس نے سسکاری بھر کے بے اختیار ذرا سا چہرہ گھما کر سامنے آئینے میں دیکھا۔ تو منہ سے بے اختیار تزئین کے لیے گالی نکل گئی۔ اس کا ناخن طلال کے رخسار پر لمبی کھرونچ ڈال چکا تھا۔ جہاں پر خون کی لال بوندیں امڈ آئی تھیں۔ اسی وجہ سے پانی وہاں کرنٹ کی طرح لگا تھا۔ اس نے شیونگ کٹ کھول کر اس میں سے آفٹر شیو لوشن نکال کر زخم پر لگایا تو شدید تکلیف ہوئی۔
"الو کی..." وہ دانتوں پر دانت جما کر درد ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

آغا جان نے مبین آفندی کو مہپاہ کا رشتہ ڈھونڈنے اور اسے انتہائی رازداری کے ساتھ رخصت کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ اب شریعت جو بھی کہے اور مسلک کوئی بھی فتویٰ دے آغا جان کو ذرا احساس نہیں تھا۔ مبین صاحب سر تھام کر بیٹھ گئے۔ مگر صدیقہ بیگم کے دل میں ٹھنڈ پڑ گئی۔
"اچھا ہے نا... اس بے غیرت انسان کو بھی پتا چلے جو عزت دار گھرانے میں زبردستی گھسنے کی کوشش کر رہا

ہے۔" وہ نمیر کو شکست دے کر خوش تھیں۔

"عزت ایسے نہیں ملا کرتی چھین جھپٹ کر۔"

مہپاہ کو پتا چلا تو وہ ساکت رہ گئی۔ پھر پھٹ پڑی۔ "دماغ خراب ہو گیا ہے سب کا۔ میں نے بتا دیا تھا آغا جان کو کہ میں کسی طور بھی یہ شادی نہیں کروں گی۔"

"تو بلا لو اس بے نام و نشان کو۔ اس کے ساتھ رخصت کر دوں تمہیں۔" صدیقہ بیگم بدزبان تو اول درجے کی تھیں۔ اب بھی بیٹی کے جذبات اور احساسات کا خیال کیے بنا بولیں تو وہ جیسے حواس کھو کر چلائی۔

"ہاں... صحیح کہہ رہی ہیں آپ۔ ذلت کے اس گڑھے میں گرنے سے بہتر ہے کہ میں اس کے ساتھ رخصت ہو جاؤں۔ حلال رشتہ تو ہو گا نا۔" ضبط کرتے ہوئے بھی اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ تب تائی جان کو اپنی فضول گوئی کا احساس ہوا۔ وہ کون سا مرضی سے اپنا نصیب لکھوا کر لائی تھی جو اسے طنز کا نشانہ بنایا جاتا۔

"مہو... میری بچی! بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ کس کس کو زبردستی کے اس نکاح کی کہانی سناؤ گی۔ اگر وہ کمینہ ساری عمر کے لیے روپوش رہا تو کیا اس کے نام پر زندگی گزار دو گی؟" وہ بے بسی سے بولیں۔

"چند دن... صرف چند دن صبر کرلیں آپ لوگ۔ کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکل آئے گا۔ میں خود اس سے بات کروں گی۔ ڈائیورس مانگوں گی۔ اس نے ظلم سہا ہوا ہے امی! وہ رحم کی اہمیت سے لازمی واقف ہو گا۔" مہپاہ نے منت کرتے ہوئے یقین سے کہا۔

"اتنا ہی رحم کرنے والا ہوتا تو زبردستی کے نکاح کے وقت تمہاری التجائیں سن لیتا۔" وہ بدمزہ سی ہو کر بولیں۔

"اسے تو آپ لوگوں سے انتقام لینا تھا۔ وہ لے چکا۔ اگر واقعی گندا خون ہوتا اس کی رگوں میں تو مجھے صحیح سلامت واپس نہ چھوڑ جاتا امی! اس رشتے کا فائدہ اٹھانے کو کوشش کرتا۔" وہ ان سے نظر ملائے بنا بولی۔

"تو اب بھی کون سا اچھا کیا ہے اس نے ہمارے ساتھ۔ ابھی تک رشتے دار ہزار سوال کرتے ہیں۔ تمہارا رشتہ کیوں نہیں ہوا... اور اسی لڑکے کو تزئین کا رشتہ کیوں دے دیا۔"

"لوگوں کا تو کام ہی باتیں بنانا ہوتا ہے امی! آپ مہربانی کریں اور آغا جان کو منائیں۔ میں کسی طور یہ شادی نہیں کروں گی۔" مہپاہ نے بات ختم کر دی۔

مگر یہ بات ختم ہونے کے بجائے صحیح معنوں میں اب شروع ہوئی تھی۔ آغا جان کے ملنے جلنے والوں میں سے دو تین رشتے نکل آئے۔ مہپاہ کے لیے۔ اس رات مہپاہ نے شکر ادا کیا کہ نمیر کی کال آگئی۔

"کہاں تھے تم، تمہیں احساس ہے کہ کسی کی جان سولی پر لٹکا رکھی ہے تم نے۔" وہ کال اٹینڈ کرتے ہی اس پر الٹ پڑی۔

"ارے۔" وہ جیسے خوش گوار حیرت میں گھرا۔

"مجھے پتا ہوتا کہ مسز نمیر آفندی کو یہ جدائی سولی پر چڑھنے کے مترادف لگ رہی ہے تو روزانہ نائٹ پیکج پہ ساری رات بات کرتا۔" وہ ہلکا سا ہنسا۔

"نمیر... پلیز فار گاڈ سیک۔ میری زندگی تباہ کر رہے ہو تم۔ آغا جان کو تمہارے اس اقدام سے کیا نقصان ہوا بھلا؟ تباہی کے دہانے پر تو میں آکھڑی ہوئی ہوں۔"

"اب پتا چلا کہ کس قدر بے حس انسان بستے ہیں تمہارے آفندی ہاؤس میں۔" وہ تلخ ہوا۔

"تم تو ان میں سے نہیں تھے۔ ثمرہ چچی اتنی تعریفیں کرتی ہیں تمہاری امی کی۔ پھر تم نے اتنی بے حسی کیوں دکھائی؟" مہپاہ کا طنزیہ حملہ اس قدر اچانک تھا کہ لمحہ بھر کو دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

"غصے میں انسان بہت سے غلط قدم بھی اٹھا لیتا ہے۔" قدرے توقف کے بعد وہ مدھم لہجے میں بولا تو مہپاہ کو لگا

جیسے شکار قابو میں آگیا ہے۔

"اپنی غلطی کو سدھار لینا انسانیت کی دلیل ہے نمیر۔ تم کفارہ ادا کر سکتے ہو اس غلطی کا۔" وہ جال بچھاتے ہوئے بڑی ہوشیاری سے اسے راہ پر لاتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔۔ تو بتاؤ۔ کب لاؤں بارات؟" جواباً" اس نے اس قدر برجستگی سے پوچھا کہ مہواہ بھک سے اڑی۔" اس سے اچھا کفارہ اور کیا ادا ہوگا۔" وہ اپنی عقل مندی پر گویا سر دھن رہا تھا۔

"دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا۔۔؟" وہ غرائی۔

"ہاہاہا۔ مہواہ آفندی۔ معصومیت کا لبادہ اوڑھ کر مجھے ٹریپ کرنے کی کوشش مت کرو۔ بے وقوف نہیں ہوں میں۔ تمہارے لب و لہجے کے اتار چڑھاؤ سے جان لیتا ہوں کہ کس ٹون میں بات کر رہی ہو۔" وہ اس کے بے وقوف بن جانے پر حظ اٹھا رہا تھا۔

"مجھ سے اچھا سلوک کیا ہوتا تو میں تمہیں سب کے سامنے سپورٹ کرتی نمیر! تم انتہا پر اترنے سے پہلے ایک بار تو مجھ سے بات کرتے۔ میں تمہارے حق کے لیے آواز اٹھاتی۔ مجھے پتا ہے کہ اندر سے تم ایک اچھے انسان ہو۔ آغا جان کو تمہارا حق ادا کرنا چاہیے۔"

"چلو۔ اس گھر میں مجھے بھی سپورٹ کرنے والا کوئی تو ہوا۔" وہ خوش دلی سے کہہ کر ذرا دیر کو رکا۔ پھر مدھم لہجے میں اضافہ کیا۔

"مگر ایک بات یاد رکھنا مہواہ۔ میرے اس حق میں اب تم بھی شامل ہو۔"

"شٹ اپ یو اسٹوپڈ۔" وہ جو غور سے اس کو سن رہی تھی اس کی بات کا مطلب سمجھ کر بے اختیار ہی غرا اٹھی تو وہ ہنستا ہی چلا گیا۔

"بس۔۔ یہ ہے تمہاری حقیقت۔" وہ سنجیدہ ہوا۔

"مجھے نفرت ہے دوغلے پن سے مہواہ۔ تم کیا سمجھتی ہو میں اپنے لیے تمہارے دل میں بھرے زہر سے واقف نہیں ہوں۔ مجھے دھوکا دینے کی کوشش مت کرو۔ اور نہ ہی میں ان شوگر کوٹڈ لفظوں سے متاثر ہونے والا ہوں۔"

"تو پھر تم جہنم میں جاؤ۔" غصے سے بے قابو ہو کر کہتے ہوئے مہواہ نے کال کاٹ دی۔ غصے اور ٹینشن کے مارے سر میں درد شروع ہو گیا تھا۔ وہ سر تھام کر بیٹھ گئی۔

✵ ✵ ✵

"معذرت۔۔ آغا جان کے کام سے گیا ہوا تھا۔ وہاں سے سمجھیں گاڑی اڑاتا ہوا آیا ہوں۔" کبیر نے بہ آواز بلند وضاحت اور معذرت پیش کی۔ تو لامحالہ اسے نگاہ اٹھا کر دیکھنا پڑا۔ بیک مرر میں کبیر کی مسکراتی آنکھوں کے شریر کانچ میں بہت لو دیتا سا جذبہ تھا۔ ملاحہ کا دل جیسے دیئے کی لو پر رکھا آہستہ آہستہ پگھلنے لگا۔ اس نے بوجھل ہوتی پلکوں کو جھکا لیا۔

"میں کب سے تمہارے انتظار میں تھی۔"

"یقین کریں، میرے بھی دھیان کے سب دھاگے آپ ہی سے جڑے ہوئے تھے۔" جیسا شکوہ تھا ویسا ہی برجستہ جواب تھا۔ ملاحہ کا دل بہت سبک سا ہو کر دھڑکنے لگا۔

"پیپر تو بہت اچھا ہوا ہوگا آپ کا؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ ملاحہ کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"آپ چہرے سے ہی بہت لائق نظر آتی ہیں۔" اس کی سادہ سی بات نے ملاحہ کے چہرے پر ہنسی بکھیر دی۔

"تمہیں کیسے پتا چلا۔ تم تو نظر اٹھا کر دیکھتے ہی نہیں ہو خان۔" اس کا انداز چھیڑنے والا تھا۔

"نظر اٹھا کر دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی ملاحہ بی بی۔" وہ گہرے انداز میں بولا تو ملاحہ کے چہرے پر رنگ سے بکھر گئے۔ مگر اس کی بات کا اثر زائل کرنے کے لیے ملاحہ نے بات بدل دی۔

"اف' یہ بی بی کا دم چھلا تو مت لگایا کرو میرے نام کے ساتھ۔" اس نے ناک سکیڑ کر کہا۔ کبیر نے اچٹتی نگاہ بیک مرر پر ڈالی اور پھر ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

"جہاں تک حق ہے وہیں تک بات ہو سکتی ہے' اس سے آگے تو بے ادبی ہوگی۔"

اس کی بات سن کر ملاحہ سوچتی نظروں سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ گاڑی میں پھیلی خاموشی بہت معتبر تھی۔ ان کہی' ان سنی سی۔ گاڑی پورچ میں آکر رکی تو وہ اتر کر اندر بڑھنے لگی۔ پھر کچھ سوچ کر واپس پلٹی اور گاڑی کی اگلی کھڑکی کے پاس ذرا سا جھکی۔

"تمہیں حق ہے اس بے ادبی کا کبیر!" وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ کر پلٹ گئی' کبیر کے لبوں پر کھیلنے والی مسکراہٹ میں طمانیت کے سب ہی رنگ تھے۔

☼ ☼ ☼

"آغا جان نے مہپاہ کے لیے رشتہ ڈھونڈ ہی لیا بالآخر۔" ثمرہ نے موحد کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے جیسے اسے خوش خبری سنائی تو وہ جو جھک کر دراز سے کچھ نکال رہا تھا سیدھا ہو کر پورے کا پورا ان کی طرف مڑ گیا۔

"واٹ۔؟" اس کی آواز ہی نہیں بلکہ تاثرات میں بھی بے یقینی تھی۔ "اس کا تو نکاح ہو چکا ہے۔"

"ہونہہ۔۔۔ اس زبردستی کے نکاح کی بھلا کیا اہمیت ان کی نظروں میں۔۔۔ نہ کوئی گواہ نہ کوئی نکاح نامہ" وہ لاپروائی سے کہتی اس کی الماری کھول کر جائزہ لینے لگیں۔ "اب تم بھی شادی کر ہی لو موحد۔ کم از کم وارڈروب کی حالت تو ٹھیک رہے گی تمہاری۔" وہ بالکل غیر متعلق بات پر آگئیں مگر موحد کی سوئی تو وہیں اٹکی تھی۔

"دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ان لوگوں کا۔ نکاح پر نکاح کروائیں گے؟" اس کی تیوریاں چڑھیں۔

"یہ بات تو تم اپنے آغا جان سے پوچھو جا کر۔ یہاں ظلم کی ہر روایت ان ہی کے دست مبارک سے شروع ہوتی ہے۔" وہ تلخی سے گویا ہوئیں۔

"آپ بھی تو بدل سکتی تھیں۔ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ وہ نمیر وقار آفندی کے نکاح میں ہے۔" وہ ناراضی کا اظہار کرنے کی خاطر دراز زور سے بند کرتے ہوئے بولا۔

"مہپاہ کی گواہی کافی نہیں ہے اس کے لیے؟" انہوں نے تحمل سے کہتے ہوئے اس کی ٹائیوں کی ترتیب کو درست کیا اور الماری کا دروازہ بند کر دیا۔

"اور مہپاہ۔؟"

ثمو گہری سانس بھر کر تاسف سے بولیں۔ "پنجرے میں پھنسا شکار جتنی کوشش کر سکتا ہے وہ بھی اتنی کر رہی ہے۔"

"آغا جان کا تو دماغ خراب ہے۔" اس نے درشتی سے کہتے ہوئے سر جھٹکا۔ بھلا وہ کیسے مہپاہ کو حرام کی زندگی گزارنے پر مجبور کر سکتے تھے۔

"نمیر کے اس اقدام سے آغا جان ہوں یا صدیقہ بھابھی' کسی کی ضد کا بت نہیں ٹوٹا موحد! ٹوٹی ہے تو صرف مہپاہ اور اس کے خواب۔" وہ دکھ میں گھری گہرے لہجے میں کہہ کر چلی گئیں۔ انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ موحد آفندی ایسے کھڑا رہ گیا۔ جیسے زمین نے وہیں پیروں کو جکڑ لیا ہو۔

☼ ☼ ☼

"تم دوسری شادی کر رہی ہو؟" وہ کچن میں آیا تو مہماہ کو چائے کا پانی پکنے کے انتظار میں کھڑے دیکھ کر زبان پھسل گئی۔ جواباً مہماہ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سنبھل کر بولا۔

"میرا مطلب ہے کہ آغا جان کا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟؟"

"تو تم بات کر لو جا کر ان سے۔ داؤ پیچ لڑا کر بزنس سمیٹ سکتے ہو تو یہ بات کیوں نہیں۔" وہ تلخی سے کہہ کر ابلتے ہوئے پانی میں پتی ڈالنے لگی۔ ماحول پر ایک خوش گوار سی مہک حاوی ہو گئی۔ اس کی بات سن کر لمحہ بھر کے لیے تو موحد بھی چپ سا ہو گیا۔ پھر بہت پُرسکون لہجے میں بولا۔

"بہت عرصہ سب نے اس بزنس پر عیاشی کی ہے۔ اگر میں کر لوں گا تو کوئی غضب نہیں ہو جائے گا۔"

مہماہ چپ چاپ کھولتے قہوے کو دیکھ رہی تھی۔ موحد نے اچٹتی نظر اس پر ڈالی۔ جب وہ اس گھر میں آیا تھا تو سب سے چمکتا ہوا روپ مہماہ کا تھا۔ مگر اب وہ مرجھائی ہوئی تھی۔ اسے ثمرہ کی بات یاد آئی (بھلا اپنے خوابوں سے کٹ کو کون جی پایا ہے)

"تم نے آغا جان سے بات نہیں کی۔ یہ نکاح شرعاً حرام ہو گا۔" وہ نرمی سے بولا۔

"آغا جان کی اسٹڈی میں شریعت اور فتاویٰ کی کتابوں کے انبار ہیں۔ کیا پھر بھی لال حرام کا یہ فرق میں جا کر انہیں سمجھاؤں؟" مہماہ نے تحمل سے اسے دیکھا۔

"تم یہ نکاح کر لو گی؟" وہ بے یقینی سے پوچھ رہا تھا۔

مہماہ کی آنکھیں اپنی بے بسی پر بھر آئیں۔ "آغا جان کو اپنی بات سمجھانا مشکل سہی مگر اپنی جان دے کر خود کو حرام کام سے بچانا تو ثواب کا کام ہو گا یقیناً"۔" موحد گنگ رہ گیا۔ مگر یہ محض ایک لمحے کی بات تھی۔ اگلے ہی پل اس نے مہماہ کا بازو پکڑ کر جھٹکا دیا۔

"شٹ اپ۔ یو فول۔ خود کشی حرام ہوتی ہے 'پتا ہے نا'۔" وہ درشت لہجے میں بولا۔

مہماہ نے اس کا ہاتھ پیچھے ہٹایا اور رسان سے بولی۔ "حرام زندگی یا حرام موت۔ ایک کو چننا میرا نصیب ہے موحد! حرام کی زندگی گزارنا بہت مشکل ہے۔ تو ہر روز مرنے سے بہتر نہیں کہ میں ایک ہی بار مر جاؤں۔" وہ جذباتی کیفیت میں گھری کہتے ہوئے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو دی تو موحد سے دکھ کی اس فضا میں کھڑے رہنا انتہائی مشکل ہو گیا۔

✡ ✡ ✡

ثمرہ نے اپنی پوری کوشش کی آغا جان کے دماغ سے مہماہ کی شادی کا کیڑا نکالنے کی مگر وہی ڈھاک کے تین پات۔

"اس رذیل انسان کے ساتھ زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ وہ حرام کی زندگی ہی گزار لے۔" وہ طیش بھری نفرت سے بولے تو ثمرہ کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔

توبہ توبہ۔ کیسے کفریہ کلمات تھے۔

"یعنی آپ جانتے ہیں کہ یہ صحیح راستہ نہیں ہے آغا جان؟" وہ دکھ میں گھری بامشکل بول پائیں۔

"تو کیا کروں؟ اس طوائف کے بیٹے کو فرزندی میں لے لوں؟" وہ بگڑے پھر تفاخر سے جتایا۔ "اس خاندانی ساکھ کی رگوں میں دو بیٹوں کی قربانی کا خون دوڑ رہا ہے۔ بہو۔ کل کے لونڈے کے ہاتھوں اسے زمین پر رول نہیں سکتا۔"

ثمرہ نے دکھ سے انہیں دیکھا۔ "وہ وقار کا بیٹا ہے آغا جان! یہی سمجھ کر اسے قبول کر لیں اور مہر کو باعزت طور پر رخصت کر دیں اس کے ساتھ۔ پھر بھلے ساری زندگی اس سے نہ ملیں۔"

ثمرہ نے پُرامید نظروں سے انہیں دیکھا۔ تو انہوں نے تنفر سے ایک طرف تھوک دیا اور حقارت سے بولے۔

"وقار آفندی گند میں گرا تھا اور میں اس گند کو اٹھا کر اپنے خاندان کے اونچے شملے میں لگا لوں؟؟"

"مہماہ کے لیے زندگی بہت مشکل ہو جائے گی آغا جان! اگر نمیر شادی کا ثبوت لے کر سامنے آ گیا تو دوسرا نکاح باطل ثابت ہو جائے گا۔ اور دنیا کی باتیں الگ۔ ساری عزت چلی جائے گی۔" وہ بڑے حوصلے سے انہیں سمجھا رہی تھیں۔

"بس بس۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر ثمرہ کو کرختی سے ٹوک دیا۔

"ہماری نسل کے وارث کی ماں ہو اس لیے تمہاری اتنی بات بھی سن لی۔ اب جاؤ اور مہمانوں کی آمد کا انتظار کرو بس۔" وہ بے بسی اور غصے کے ملے جلے تاثرات لیے وہاں سے اٹھ گئیں۔

"دیکھ لیا بات کر کے۔" سائرہ چچی کو ان کی شکل سے ہی اندازہ ہو گیا کہ کیا خاطر کی ہو گی آغا جان نے ان کی۔

"جہاں ماں کو ہی بیٹی کے احساسات کی پروا نہ ہو وہاں بھلا آغا جان کیا خاک احساس کریں گے۔" ثمرہ سخت کبیدہ خاطر تھیں۔

"آپ کو کیا پڑی ہے بھابی! پرائی آگ میں کودنے کی۔ اچھا ہے بیاہ کر یہاں سے رخصت ہو۔ ابھی تک تو طلال کو اس کے نکاح کی حقیقت کا نہیں پتا یہ پردہ پڑا ہی رہے تو بہتر ہو گا۔" وہ بے زاری سے بولیں تو ثمرہ نے دکھ اور افسوس کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ انہیں دیکھا۔

اپنی بیٹی کی بہتر زندگی کے لیے وہ مہماہ کو کسی کھائی میں بھی دھکیلنے کو تیار تھیں۔ رات کے کھانے کے بعد جب مہماہ فریج میں سے سویٹ ڈش لانے کے لیے اٹھی تو آغا جان نے کسی کو بھی مخاطب کیے بنا بہ آواز بلند گویا اعلان کیا۔

"مہماہ کو دیکھنے کل ایک فیملی آ رہی ہے۔ چائے کی تیاری کر لینا اچھی سی۔"

"آغا جان... ذرا کچھ دن اور نکال لیتے۔ ہو سکتا ہے یہ معاملہ کسی سائیڈ پر لگ ہی جاتا۔ کل کو وہ نکاح ہونے کے دعوے کے ساتھ آ بھی سکتا ہے۔" مبین صاحب نے ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔ مہماہ کے قدم باہر ہی ٹھہر گئے۔

"آغا جان اگر کوئی جاننے والے لوگ ہیں تو ان کو ساری صورت حال بتا کر بھی تو رشتہ طے ہو سکتا ہے۔" صدیقہ بیگم تو راضی برضا تھیں۔ کسی طور بس اس طوائف کے بیٹے سے جان چھوٹ جاتی۔

"چپ کر کے یہ رشتہ ہو جانے دو۔ خبردار جو کسی کو کوئی بھنک بھی پڑنے دی ہو تو۔" آغا جان سرد مہری سے بولے۔ ثمرہ نے چبھتی نظروں سے واش بیسن پر ہاتھ دھو کر آتے موحد کو دیکھا۔

"ایسا کون مہربان بیٹھا ہے ہمارا جو سب کچھ جان کر مہماہ کا رشتہ قبول کرے گا یا مانگے گا۔" انہوں نے تنفر سے ہنکارہ بھرا۔ جیسے سارا قصور ہی لڑکی کا ہو۔ موحد اپنی کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے ٹھٹکا۔ اسے فی الفور سمجھ میں آیا تھا کہ بات کس رخ چل رہی ہے۔ اس کے ماتھے پر بل پڑے۔ اس نے ناگواری سے کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ اس کے تاثرات دیکھتی ثمرہ نے ٹھہرے ہوئے مگر بلند لہجے میں کہا۔

"میں مانگتی ہوں آغا جان۔ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی میں مہماہ کا رشتہ اپنے موحد کے لیے مانگتی ہوں۔ اور مجھے امید ہے کہ بھابی اور بھائی صاحب کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

وہ تو دھماکا کر کے خاموش ہو گئیں مگر ٹیبل پر ایک دم سکوت طاری ہو گیا۔ موحد نے بے یقینی سے ماں کی طرف دیکھا تھا۔ ڈائننگ روم کے باہر کھڑی مہماہ کے لرزتے ہاتھوں سے شیشے کا ______ ڈونگا پھسلا اور چھناکے سے زمین بوس ہو گیا۔ اس کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

حنا بُشریٰ

بس ذرا سا احساس

"در نجف تھوڑا جلدی اٹھ جایا کرو!" معاذ کمرے کا اے سی آن کرتے ہوئے بولا۔

"کیا مطلب۔۔۔ جلدی۔۔۔؟" در نجف نے جائے نماز لپیٹی اور دوپٹا کھول کر کندھے پر ڈالتے ہوئے حیرت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

زدہ انداز میں بولی۔

"جلدی کا مطلب ہے کہ اتنے مناسب وقت پر اٹھ جایا کرو کہ سحری کا انتظام اچھے طریقے سے کرسکو۔ گھر کے افراد زیادہ ہیں' ٹائم کم ہوتا ہے۔۔۔ اب دیر سے اٹھوگی تو ایسی ہڑبونگ تو مچے گی نا!" معاذ کے ماتھے کی شکنیں گہری ہونے لگیں۔

"کھل کے کہیں معاذ! مجھے آپ کی بات مکمل طور پر سمجھ میں نہیں آرہی۔۔۔!" درنجف کے لہجے میں ہنوز حیرت برقرار تھی۔

"آج سحری میں جو پورے کا پورا ہی کا پیالہ عین دسترخوان پہ کسی بم کی طرح پھوڑا۔ جانتی بھی ہو کہ مجھے امی ابو کے سامنے کتنی شرمندگی ہوئی۔۔۔ رزق الگ برباد ہوا اور امی سے یہ بھی سننا پڑا کہ آج کل کی لڑکیاں سگھڑ اور سلیقہ مند نہیں ہیں۔ ایک ڈیڑھ بجے اگر تم اٹھ جایا کرو تو سحری بھی اطمینان سے تیار ہوجائے گی اور کم از کم بھاگم بھاگ ایسے تماشوں سے میری گھر والوں کے سامنے بے عزتی تو نہیں ہوگی!" معاذ قدرے غصے سے بولا اور آنکھوں پہ بازو رکھ لیا۔

"گھروں میں ایسا ہوجاتا ہے۔ سلیقہ مند عورتوں کے ہاتھوں سے بھی برتن ٹوٹتے پھوٹتے رہتے ہیں۔۔۔ ذرا سی بات پہ آپ مجھے بدسلیقہ اور پھوہڑ ہونے کے طعنے دینے لگے ہیں۔" درنجف کا غصے سے برا حال ہوگیا۔

"غلطی نہ ماننا اپنی' بس ارسطو بن کر بحث شروع کردیا کرو۔۔۔ سادہ سی بات کی ہے۔ میں نے کہ جلدی اٹھ جایا کرو۔ تاکہ سب کچھ اچھی طرح سے مینیج ہوجایا کرے۔ مگر تمہاری سمجھ میں آتا ہی کب ہے۔۔۔ تم نے تو یونیورسٹی سے بھی پڑھ کر ضائع کیا ہے۔" معاذ بھی آپے سے باہر ہوگیا۔

درنجف کی برداشت جواب دے رہی تھی۔۔۔

ماحول کے مزید خراب ہونے کا ڈر نہ ہوتا تو اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کہے۔ "جلدی اٹھنے کے لیے جلدی سونا ضروری ہوتا ہے۔

"آئندہ ایسی شکایت نہیں ہوگی آپ کو۔۔۔" درنجف نے ضبط کرتے ہوئے کتنے ہی کڑوے گھونٹ حلق سے اتارے۔

"ہاں پوری بحث اور منہ ماری کے بعد مانا تو کیا مانا۔" معاذ ناگواری سے بولا۔ درنجف آنسو ضبط کرنے لگی۔

"اب لائٹ بند کردو۔ مجھے کچھ دیر آرام کرنا ہے اور پھر آفس جانا ہے۔" معاذ نے گھڑی کا الارم سیٹ کیا۔

لائٹ آف ہوتے ہی آنسوؤں نے باہر نکلنے کا راستہ پالیا۔۔۔ "جلدی اٹھا کرو۔"

یہ جملہ اس کے دماغ کے ساتھ چپک گیا تھا۔۔۔ فجر کی نماز پڑھ کر سحری کے تمام کام نمٹا کر دو لمحوں کے لیے وہ بھی کمر سیدھی کرنے کے ارادے سے لیٹی ہی تھی کہ معاذ کے کڑوے جملوں نے اس کی تھکن میں اضافہ کردیا۔

✲ ✲ ✲

سوئی جاگی حالت میں اس نے معاذ کو آفس کے لیے بھیجا۔۔۔ فراغت کے بعد وہ اپنا تھکا ماندہ وجود بستر کے سپرد کرنے ہی لگی تھی کہ دروازے کی بجتی گھنٹی نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ دودھ والے سے دودھ لے کر بوجھل آنکھوں کے ساتھ فریج میں رکھنے ہی لگی تھی کہ ساس صاحبہ نے آواز لگائی۔

"درنجف! گرمیوں کے دن ہیں۔۔۔ دودھ ابالے بغیر رکھا جائے تو خراب ہوجاتا ہے۔ رزق بھی ضائع اور پیسے بھی برباد۔۔۔"

درنجف نے بے بس نگاہ گھڑی پر ڈالی جو دس بجارہی تھی۔۔۔ دودھ ابالتے ابالتے کتنی بار نیند کے جھونکوں نے نڈھال کیا۔۔۔ فارغ ہوتے ہی ایک بار پھر سرعت سے بستر پر گئی تھی کہ فون کی گھنٹی گنگنا اٹھی۔۔۔

"سو رہی تھیں؟" معاذ کا انداز تفتیشی تھا۔

"نہیں لیٹی ہوئی تھی۔۔۔" درنجف بدمزہ ہوئی۔

"ہاں' ایک ہی بات ہے نا لیٹنا یا سونا۔" معاذ طنزیہ سا بولا۔

"معاذ! آپ نے صرف میری چیکنگ کے لیے فون کیا ہے؟" درنجف جل بھن کر بولی۔

"ہاں بھی اور نہیں بھی۔۔۔ خیر تم اے سی بند کر دینا۔۔۔ گرمیوں کے روزے ہیں - زیادہ ضرورت دوپہر اور افطاری کے بعد پڑتی ہے۔۔۔ اس وقت تو خوامخواہ کا ضیاع ہی ہے!" معاذ ناگواری سے بولا۔

"جی ٹھیک ہے۔" اس نے بغیر کچھ کہے اے سی بند کر دیا۔

"اور ہاں۔۔۔ گلی میں سبزی والا آئے تو سبزی لے لینا۔۔۔" معاذ نے دوسرا حکم جاری کیا۔

"معاذ! آپ آفس سے واپسی پر لیتے آئیں!" درنجف نیند سے بے حال ہونے لگی۔

"اتنی گرمی ہے۔۔۔ معلوم بھی ہے کہ پہلا روزہ ہے۔ منڈیوں میں خاصا رش ہو گا۔ آفس سے تھکا ہارا پہلے منڈی جاؤں۔۔۔ تم نے کون سا ہل چلانا ہے۔ ہر چیز میں تم عورتوں کے آرام ہی آرام ہیں!" معاذ نے کھری کھری سنا کر فون بند کر دیا۔

اب مرحلہ تھا' سبزی والے کے انتظار کا۔۔۔ درنجف نے بیڈ کراؤن کے ساتھ ٹیک لگالی تاکہ نیند کا غلبہ بھی نہ ہو اور سبزی والے کی آواز بھی آجائے۔

☼ ☼ ☼

افطاری کا باقی سامان لے کر معاذ آفس سے لوٹا تو ایک فخریہ نگاہ درنجف کے چہرے پر ڈالی کہ تم نے تو صرف چند لمحوں میں سبزی لے لی تھی میں دیکھو کتنا سامان لے کر آیا ہوں۔ وہ بھی روزے میں اور اتنی گرمی میں' ارے نادانوں' مانو میرے احسان عظیم کو۔

درنجف نے ابو کو روٹی بنا کر دی۔۔۔ نماز ظہر ادا کرنے کے بعد سارا سامان ٹھکانے لگایا اور چند لمحوں کے لیے لیٹ گئی تاکہ افطاری کی تیاری کے لیے فریش ہو جائے۔

"بھئی۔ تم عورتوں کے بھی بڑے مزے ہیں۔ صبح بھی سو کے روزہ گزارو اور اب بھی دوپہر کو آرام ہی آرام۔۔۔!" صبح سحری سے لے کر اب تک وہ گھن چکر بنی ہوئی تھی مگر معاذ نے سب کچھ نظر انداز کر کے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا۔

"معاذ پلیز۔۔۔ میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔۔۔ ابھی ابو کو روٹی پکا کر دے آئی ہوں۔۔۔ کچھ دیر سو لوں تو پھر افطاری کا انتظام بھی کرنا ہے۔" درنجف جل کر کڑھ کر بولی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔۔۔ افطاری کی تیاری امی سے پوچھ کر کرنا۔۔۔ ہمارے گھر میں افطاری خاصے اہتمام سے کی جاتی ہے۔" معاذ نے ہدایات جاری کیں۔

درنجف نے بے بسی سے اسے دیکھا اور کڑھ کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

چکن پکوڑے' فروٹ چاٹ' دہی بھلے' فروٹ کریم' چکن کٹلس' کھجوریں اور دیگر لوازمات کے ساتھ ٹیبل سجی تھی مگر فردوس بیگم کے چہرے پر بے اطمینانی کا راج تھا۔ تسبیح کے دانے گرانے کے ساتھ ساتھ تنقیدی نظر میز پر تھی۔۔۔ درنجف نا سمجھی سے ان کے تاثرات ملاحظہ کر رہی تھی۔

"بیٹا! پہلا روزہ تھا۔ میں میٹھا پکوا کر ختم دلواتی ہوں۔۔۔ تمہارا اس گھر میں پہلا رمضان ہے اس لیے تمہیں یہاں کے اصول و قوانین کا اندازہ نہیں تھا۔ اب کل کھیر ضرور بنانا۔۔۔" ساس صاحبہ سے مزید برداشت کرنا مشکل ہو گیا تو کہہ ہی دیا۔۔۔

لو جی' کھیر کی وجہ سے دل و نظر نفرت و ناراضی کی جھلک دکھا رہے تھے۔

"جی امی! ٹھیک ہے۔" وہ قدرے تحمل سے بولی۔

☼ ☼ ☼

"میں عشاء کی نماز پڑھ آؤں تو کھانا لگا دینا۔ ابو بھی کھانا کھائیں گے۔" معاذ نے قرآن پڑھتی ہوئی درنجف کے کان میں کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

ابو نے روزہ نہیں رکھا مگر افطاری کی... چلو افطاری کر بھی لی مگر اب کھانا...! در نجف کا ذہن الجھ گیا۔

اتنا کچھ کھا لینے کے بعد تو بندہ ہلنے کے قابل نہیں رہتا... اور چند گھنٹوں کے بعد سحری کا آغاز ہو جائے گا... در نجف سوچنے لگی۔

☼ ☼ ☼

رات کا کھانا، دہی جمانا، آٹا گوندھنا، نماز عشاء اور تراویح کی ادائیگی ان کاموں سے فراغت کے بعد اس کی نظر گھڑی پر پڑی تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ ایک گھنٹے بعد اٹھنا کس قدر دوبھر ہوگا... اس سے تو بہتر ہے کہ بندہ سوئے ہی نا...

رات گہری ہو رہی تھی... سب گھر والے میٹھی نیند کے مزے لے رہے تھے۔ وہ خاموشی سے صحن میں آگئی... ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا دل و دماغ کو تازگی بخش رہی تھی... آسمان پر ہلکے بادلوں کا راج تھا... چند ننھے منے ستارے بھی بار بار اپنا روشن مکھڑا دکھاتے تو بادل انہیں چھپا لیتے...

سارا دن آگ برساتی گرمی کے بعد رات اتنی ہی فرحت انگیز تھی... ماحول میں رمضان کی برکت کی وجہ سے نور پھیلا تھا۔ سارا دن کولہو کے بیل کی طرح چکرانے کے بعد وہ بندوں کو خوش تو نہ کر سکی... مگر وہ رب العزت چند سجدوں اور چند اشکوں سے راضی ہو جاتا ہے... واہ میرے مولا تیری شان... کتنی دیر سجدے میں سر رکھے وہ اپنے رب کی حمد و ثناء بیان کرتی رہی...

☼ ☼ ☼

گرمی سے لڑتے، گھر والوں کی خوشنودی کے لیے سحر و افطار کا اہتمام کرتے کرتے پہلا عشرۂ رحمت گزر گیا۔

دوسرے عشرے میں داخل ہوتے ہی افطاریوں کا نیا سلسلہ شروع ہو گیا... کبھی خاندان والوں کی دعوت اور کبھی معاذ کے دوستوں کی افطاریاں، در نجف گھن چکر بن کر رہ گئی...

☼ ☼ ☼

ہر روز رات کو وہ ایک گھنٹہ سکون کا ملتا تو وہ دل کھول کر اپنے رب سے اپنے دل کا درد بیان کرتی، اپنی تمام تھکاوٹوں کا ذکر کرتی۔ اگلے دن کے لیے ہمت و توانائی مانگتی... دعا کے لیے ہاتھ اٹھتے تو بے اختیار کالج کے تقریری مقابلے میں پڑھی جانے والی نظم لبوں پر آجاتی...

مندر مسجد جانے والو
عورت کا حق کھانے والو
اس بت میں جان نہیں ہے
کیا عورت انسان نہیں ہے
اس کے ہاتھوں جھولنے والو
احسانوں کو بھولنے والو
اس کی کوئی شان نہیں ہے
کیا عورت انسان نہیں ہے
بیٹی کو شر جاننے والو
رب سے بیٹا مانگنے والو
اس کا رب رحمان نہیں ہے؟
کیا عورت انسان نہیں ہے؟

☼ ☼ ☼

"معاذ! امی ابو افطاری پر بلا رہے ہیں..." در نجف نے پوچھا۔

"منع کر دو...!" معاذ لاپروائی سے بولا۔

"کیا مطلب؟ منع کر دوں۔ آدھا رمضان گزر گیا ہے۔ کتنی بار وہ کہہ چکے ہیں مگر میں ہر بار مصروفیت کا کہہ کر ٹال دیتی ہوں اور آپ ابھی بھی منع کر رہے ہیں۔" در نجف دکھ سے بولی۔

"دیکھو، تمہیں پتا بھی ہے کہ یہاں صرف تم کام کرتی ہو۔ امی سے اب کام نہیں ہوتا، نائلہ ابھی پڑھ رہی ہے۔ شادی کے بعد پہلا رمضان ہے۔ تمہیں سب کے دلوں میں جگہ بنانی ہے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ امی کو اعتراض کا کوئی موقع ملے۔" معاذ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ملتجی انداز میں کہا۔

معاذ نے در نجف سے پسند کی شادی کی تھی۔ بیٹے

کی ضد کے آگے مجبور ہو کر فردوس بیگم مان تو گئیں مگر کچھ روٹھی روٹھی سی رہتی تھیں۔

"معاذ! ایک دن کے لیے نائلہ بھی تو سنبھال سکتی ہے۔" درنجف کا لہجہ بھیگ گیا۔

"تم اپنی جگہ ٹھیک کہہ رہی ہو مگر شادی کے بعد بہن کو کوئی کام کہنا ہمارے گھر میں گویا حرام ہے۔۔۔ امی کو بالکل اچھا نہیں لگے گا۔ تم اپنے والدین کو منع کردو۔ ہم چاند رات پہ پہلے ان کی طرف جائیں گے۔" معاذ نے نرمی سے کہا۔

"اچھا، کل تیار رہنا افطاری کے بعد تمہیں عید کی شاپنگ کرواؤں گا!" معاذ نے درنجف کی نم آنکھوں کو دیکھا تو محبت سے بولا۔

"نہیں، مجھے نہیں کرنی شاپنگ۔۔۔ افطاری کے بعد بہت کام ہوتے ہیں۔" درنجف نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

امی کے ہاں افطاری کے بعد وہ شاپنگ کر کے گھر لوٹے ہی تھے کہ فردوس بیگم کا پھولا ہوا منہ سب کچھ سمجھا گیا۔

"بیٹا، بہت دیر نہیں کردی تم لوگوں نے۔" وہ تنک کر بولیں۔

"امی! واپسی پر آپ لوگوں کے لیے شاپنگ کرنے گئے تھے۔" درنجف نے خوش دلی سے کہا۔

"اچھا اپنے ابو کے لیے روٹی ڈال دو!" وہ ناگواری سے بولیں۔

درنجف نے ایک نظر نائلہ پر ڈالی جو ٹیرس میں کھڑی اپنی دوست سے گپیں لگا رہی تھی۔ گھر میں بیٹی موجود تھی مگر باپ کو روٹی دینے کے لیے بہو کا انتظار کیا جارہا تھا۔ اس کا دل کرب سے بھرنے لگا۔

ضبط لازم تھا کیونکہ اپنے والدین کی طرف افطاری جو کرلی تھی۔ سزا تو ملتی تھی۔

"بھابھی پلیز! میرے لیے ملک شیک بنادیں۔ کب سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔" طلحہ کانوں میں واک مین لگائے پاس سے کہتا ہوا گزر گیا۔

"بھابھی! میں بھی ملک شیک پیوں گی۔" نائلہ جو باتوں میں مصروف تھی فون کان سے ہٹا کر بولی اور پھر سے باتوں میں مصروف ہوگئی۔

"آپ نے بھی کوئی آرڈر بک کروانا ہے تو کروادیں۔" درنجف تلخی سے بولی تو معاذ نظریں چرا گیا۔

☆ ☆ ☆

صرف ایک دن کے لیے اپنی امی کی طرف گئی تو سارا انتظام درہم برہم ہوگیا۔۔۔ بس چوبیس گھنٹے آن ڈیوٹی رہنا ہے۔۔۔ مشینیں بھی جواب دے جاتی ہیں مگر بہو اسے تو جواب دینے کی بھی اجازت نہیں۔۔۔ کیا بہو انسان نہیں ہے؟ پسینے میں بھیگتی وہ مشینی انداز میں کام کرتی ہوئی جل بھن رہی تھی۔

"درنجف! میرے آفس کولیگ کل افطاری پر آئیں گے۔" معاذ جو ٹی وی پر رمضان کو نز شو دیکھ رہا تھا، اسے آتا ہوا دیکھ کر بولا۔

"کتنے لوگ ہوں گے۔" وہ بولی۔

"تقریباً" بارہ افراد ہوں گے!" وہ مختصراً" بولا۔

"کیا۔۔۔ اتنے زیادہ لوگ۔۔۔ معاذ! میں انسان ہوں کوئی جن تو نہیں جو اتنے لوگوں کا کھانا اکیلے پکالوں۔" درنجف تلخی سے بولی۔

"ہر گھر میں عورتیں ہی کام کرتی ہیں اور بہت خوش اسلوبی سے تمام کام انجام دیتی ہیں۔ تم تو ہر وقت کام کام کا رونا روتی رہتی ہو۔" معاذ چڑ سا گیا۔

"معاذ! آپ کچھ باہر سے منگوالیں۔ باقی میں تیار کرلوں گی۔" درنجف نے مشورہ دیا۔

"میں سارا سامان لے آیا ہوں اور اگر باہر سے ہی منگوانا تھا تو گھر میں افطاری کا کیا فائدہ؟ ہوٹل سے افطاری کروادوں۔" وہ بولا۔

"میں تو چاہ رہی تھی کہ کام آسانی سے۔۔۔" وہ مزید بول نہ سکی۔

"اپنے مشورے اپنے پاس رکھو۔" معاذ مزید بولا۔

"معاذ! میرا بھی روزہ ہوتا ہے۔ امی میری مدد نہیں کر سکتیں' نائلہ نے تو گویا قسم کھا رکھی ہے کہ کچن میں جھانکنا بھی نہیں' فراغت میں صرف فون بازی ہو سکتی ہے مگر بھابھی کی مدد نہیں کر سکتی۔ رہ گئے آپ تو آپ نے میری کیا ہیلپ کرنی ہے۔" در نجف صاف گوئی سے بولی۔

"واہ! کیا بات ہے۔ یعنی اب میں کچن میں تمہارے ساتھ کام کیا کروں تاکہ تمہاری ہیلپ ہو۔ تم کل کا روزہ چھوڑ دو۔ ویسے بھی تم عورتوں کو روزے رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم لوگوں کے لیے گھر کا کام اور گھر والوں کی خدمت ہی گویا عبادت ہے۔" معاذ نے نرالی منطق بیان کی۔

"معاذ! کیا ہو گیا ہے؟ میں نے کب کہا کہ کچن میں میری مدد کروائیں۔ خیر چھوڑیں اور روزہ چھوڑنے کی نرالی بات کی ہے کہ یا اللہ گھر کے کام بہت ہیں اس لیے روزے کی معذرت۔ آپ مرد تو بے حسی میں حد سے گزر جاتے ہیں۔" در نجف نے کہتے ہوئے ہار مان لی۔

صنف نازک تو ہوتی ہی ہارنے کے لیے ہے ہر کسی کا زور چل جاتا ہے۔ اپنے لیے مکمل احتجاج بھی نہیں کر سکتی۔

☼ ☼ ☼

صبح سے وہ کچن میں گھسی افطاری کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھی۔ کوئی تلاوت قرآن میں مصروف تھا۔ کوئی اے سی میں بیٹھا دوستوں سے گپ مارنے میں لگا ہوا تھا تو کوئی میچ دیکھ کر روزہ گزار رہا تھا۔

"در نجف... کوئی چیز چاہیے ہو تو بتا دو۔ میں مسجد جا رہا ہوں۔ لیتا آؤں گا!" معاذ کے لہجے میں ندامت تھی۔

سال کا سب سے بڑا دن اور دگنی گرمی... بڑے بڑوں کے چھکے چھوٹ گئے تھے... پیاس سے بری حالت تھی۔

"نہیں۔ کچھ نہیں چاہیے!" در نجف بنا دیکھے بولی۔

"در نجف! کہا بھی تھا کہ کام کی زیادتی ہو گی۔ روزہ نہ رکھو مگر۔ تم کہاں مانتی ہو۔" اپنی دانست میں وہ اس کے لیے فکر مند ہو رہا تھا۔

"معاذ! میں اس وقت صرف تنہائی چاہتی ہوں... مجھے کام کرنے دیں۔" در نجف نے ناگواری سے اسے ٹوک دیا۔

☼ ☼ ☼

پُر تکلف افطاری' ہر روزہ دار در نجف کی امور خانہ داری کو سراہ رہا تھا۔ ہر لب پر اس کے ہاتھ کے ذائقے کی تعریف تھی۔ معاذ خوشی سے نہال ہو رہا تھا۔ فردوس بیگم اتنے مہمانوں کی عزت افزائی پر اپنے ماتھے کے بل کم کر چکی تھیں۔ یکایک معاذ کی نظر در نجف پر پڑی... وہ بار بار پانی پیتی جا رہی تھی... ایک کھجور کھا کر وہ صرف پانی پی رہی تھی... وہ چہرے سے انتہائی نڈھال لگ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

سب کام تن تنہا انجام دے کر وہ بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔

"یہ میرے باس نے تمہیں عیدی دی ہے!" معاذ نے دس ہزار اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

وہ سو چکی تھی۔ معاذ نے دو تین بار اسے پکارا مگر وہ نہ اٹھی... معاذ نے روپے اس کے تکیے کے نیچے رکھ دیے...

سحری میں بھی وہ خاموشی سے کام میں لگی رہی تھی۔

"ناراض ہو؟" تنہائی میسر آتے ہی اس نے بے قراری سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

معاذ نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر اپنا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ دیا۔

"بخار ہے تمہیں...!" اس نے فکر مندی سے استفسار کیا۔

"نہیں... نہیں یوں ہی گرمی کی وجہ سے طبیعت بوجھل ہے۔" در نجف نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

"دُرِ نجف! بہت لاپرواہ ہو تم... بخار ہے تمہیں اور تم نے نہ مجھے بتایا اور نہ ہی دوا لی؟!" معاذ بوجھل دل کے ساتھ بولا۔

"معاذ! کیا ہو گیا ہے؟ یہ کون سی اتنی بڑی بات ہے۔ انسان بیمار بھی ہوتا ہے۔ تھک بھی جاتا ہے!" درِ نجف لاپروائی سے بولی۔

معاذ گہری خاموشی سے اسے دیکھے گیا۔ ندامت بڑھتی جا رہی تھی۔

"جب اتنے لوگوں کی پرواہ کرنی پڑے تو پھر اپنی ذات کو فراموش کرنا ہی پڑتا ہے اور تھکاوٹوں کا کیا ہے۔ دور ہو جاتی ہیں مگر رویے دکھ دے جاتے ہیں!" درِ نجف نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"جب پتا تھا کہ بخار ہے تو روزہ نہ رکھتیں مگر تم بھی بہت ضدی ہو!" معاذ چڑ کر بولا۔ الفاظ معاذ کے منہ سے نکلے اور درِ نجف کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔

"اسی بخار میں کل افطاری کی تیاریوں میں لگی رہی... آج بھی پورے گھر کا کام کیا۔ جب سب کے حقوق پورے کرتی رہی تو پھر فرض کیوں چھوڑوں... اور میں نے کسی کتاب میں نہیں پڑھا کہ عورت پر کام کی زیادتی ہو تو وہ روزہ چھوڑ سکتی ہے... معاذ! روزہ چھوڑنے کا آپ نے مشورہ دے دیا مگر کام سب کو پورا چاہیے' جب میں گرتے پڑتے کام کر رہی ہوں تو پھر آپ میرے اللہ اور میرے درمیان نہ آئیں۔" درِ نجف نے کہہ کر کروٹ بدل لی معاذ کچھ کہنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

رمضان تیسرے عشرے میں داخل ہو چکا تھا... فردوس بیگم کی طرف سے شان دار افطاریوں کا حکم... ہر طاق رات میں کوئی نہ کوئی الگ انتظام... محلے والوں کی افطاری' خاندان والوں کی افطاری نہ جانے کس کس کے سامنے اپنی سخاوت کا مظاہرہ کیا جا رہا تھا۔

"امی! نائلہ سے کہہ دیں کہ کچھ دیر کے لیے میرے ساتھ کچن میں آ جایا کرے!" درِ نجف نے ڈرتے ڈرتے دل کی بات کہہ ڈالی۔

"دیکھو دلہن! رمضان کے فوراً بعد اس کے بی اے کے پیپرز ہیں۔ اب ان کام دھندوں میں لگے گی تو دھیان بٹے گا اور تیاری خاک ہو گی!" ساس صاحبہ نے ٹکا سا جواب دے دیا۔

سارا معاملہ معاذ کی عدالت میں پہنچا تو وہ جلی کٹی سنائے بغیر نہ رہ سکا۔

"کیا ضرورت تھی امی سے نائلہ کے بارے میں بات کرنے کی... ایک مہینے کی بات ہے پھر تو تم عورتوں نے آرام ہی کرنا ہے..."

"معاف... ایسا کیا غلط کہہ دیا میں نے اگر چند لمحوں کے لیے مدد مانگ لی۔ نائلہ فون پر گھنٹہ گھنٹہ دوستوں سے بات کرتی ہے تو اس وقت اس کی پڑھائی کا حرج نہیں ہوتا!" درِ نجف چپ نہ رہ سکی۔

"کام' کام' کام... جب سے رمضان شروع ہوا ہے۔ یہی کِل کِل سن رہا ہوں۔ میں تمہارے لیے ملازمہ رکھ دیتا ہوں!" معاذ بھڑک اٹھا۔

"معاف کریں... آپ کی امی کے طعنے سنوں کہ آج کی عورت سلیقہ مند نہیں ہوتی۔ ہم تو اپنے دور میں اکیلے سارے گھر کا کام بھی کرتے تھے اور بچوں کو بھی سنبھالتے تھے۔ اور جن گھروں میں ملازم کام کریں تو وہاں برکت ختم ہو جاتی ہے!" درِ نجف نے غصے سے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا اور باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

آسمان پر ہر سو بادلوں کا راج تھا۔ ٹھنڈی ہواؤں نے گرمی کا زور توڑ دیا تھا۔ معتدل موسم روح کو سکون بخش رہا تھا۔ دور مسجدوں سے ذکر الٰہی کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔

"طاق رات" اس کے دل و دماغ میں کسی نے چپکے سے سرگوشی کی تھی۔ جسم میں درد اور حرارت کے باوجود وہ جائے نماز پر کھڑی ہو گئی۔ آج طبیعت کی خرابی نقاہت کا باعث بن رہی تھی مگر وہ ان مقدس راتوں کو

کسی حالت میں نظرانداز نہیں کرسکتی تھی۔ خلوص دل سے رب العزت کے حضور سجدے کیے۔ چہرہ آنسوؤں سے تر ہوا اور دماغ ماضی کی یادوں میں کھونے لگا۔

بچپن میں کتنا پُرسکون رمضان ہوا کرتا تھا..... نہ بے تحاشا کام اور نہ ہی بے شمار ذمہ داریاں۔ پہلے ہی عشرے میں وہ تین قرآن ختم کرلیا کرتی تھی اور اختتام رمضان تک آٹھ قرآن پاک ختم ہوجایا کرتے تھے..... بس یہی ایک دھن سوار ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ رمضان عبادت میں گزارنا ہے..... مہمان مہینہ ہے اور مہمان کو راضی کرکے رخصت کرنا ہے..... پتا نہیں اگلے سال زندگی میں یہ بابرکت مہینہ دوبارہ پاسکوں یا نہ.....

سائرن کی آواز آئی تو وہ ماضی سے باہر آگئی..... سحری کا وقت ہوچکا تھا..... اس نے آنسو پونچھے اور کام میں لگ گئی۔

طبیعت کی خرابی کی وجہ سے درنجف سے کچھ کھایا نہیں گیا مگر باقی سب کو سحری اہتمام سے کروانا تو فرض تھا۔

''اری دلہن جلدی ہاتھ چلاؤ۔ ٹائم ختم ہونے والا ہے۔ جلدی پراٹھے لے آؤ اور دہی آج کتنا پتلا جمایا ہے تم نے!'' ڈائننگ ٹیبل پر شان سے بیٹھی ساس صاحبہ فرمان جاری کررہی تھیں۔

''لارہی ہوں امی!'' دُرنجف قدرے نقاہت بھرے انداز میں بولی۔

''کیا بات ہے طبیعت ابھی بھی خراب ہے!'' معاذ نے بھی دُرنجف کے کام میں سستی محسوس کی تو کچن میں پوچھنے چلا آیا۔

''نہیں۔ ٹھیک ہوں!'' دُرنجف بنا دیکھے بولی۔

''بھئی لوگ بیماری میں روزہ چھوڑ دیتے ہیں..... روزے کے معاملے میں تمہاری یہ شدت پسندی میری سمجھ سے باہر ہے!'' معاذ نے سیب کھاتے ہوئے کہا اور سر جھٹکا۔

''ٹھیک ہے میں روزہ چھوڑ دیتی ہوں اور کاموں کی چھٹی کون دے گا مجھے۔ کیا آپ میری جگہ کام کریں گے!'' درنجف نے کہتے ہوئے گرما گرم پراٹھا اس کی پلیٹ میں رکھنے کے بجائے اس کے ہاتھوں پر رکھ دیا تو وہ تڑپ گیا اور ساتھ ہی ساتھ پراٹھے کو اچھالتے ہوئے اسے گرنے سے بمشکل بچایا۔

☼ ☼ ☼

گھر کے سب افراد درنجف کی طبیعت کی خرابی محسوس کرتے رہے اور اپنے اپنے انداز میں ''خیال'' کرتے رہے۔

''دلہن! بس جلدی سے ٹھیک ہوجاؤ' دیکھو تو ذرا کپڑوں کا کس قدر ڈھیر لگا ہے!'' فردوس بیگم بہو کے اتنے لاڈ ہی اٹھا سکتی تھیں۔

''بیٹا! تھوڑی دیر آرام کرلو' جب دھوپ ذرا ٹھنڈی ہوجائے تو میرے لیے دو روٹیاں ڈال دینا اور ساتھ پودینے کی چٹنی اور سلاد بھی!'' سسر نے کمال مہربانی کرتے ہوئے التجا کی۔

''بھابی! آج فروٹ ٹرائفل بنالیں افطاری میں..... آپ کی طبیعت بھی خراب ہے تو کچھ لائٹ سی افطاری کرلیتے ہیں!'' طلحہ نے ہمدردی دکھائی۔

''بھابھی آپ بھی کمال کرتی ہیں یہ طبیعت کیوں خراب کرڈالی..... بس اب ''فوراً'' سے پہلے ٹھیک ہوجائیں۔ مابدولت کی فرینڈز افطاری پر آرہی ہیں دو دن بعد!'' نائلہ بھی بھابھی کا خیال رکھنے میں پیچھے نہ رہی۔

درنجف بوجھل دل اور نڈھال جسم سے سب کی باتیں سنتی رہی۔ وہ ہمت کرکے کاموں میں لگی رہی۔ مگر جسم جواب دے گیا۔ افطاری کے بعد نماز مغرب کی ادائیگی کے بعد وہ چکرا کر بے ہوش ہوگئی۔

☼ ☼ ☼

سب کے ہاتھ پیر پھولے وہیں کوئی نہ کوئی ناراضی کا اظہار بھی کرتا رہا۔

''دلہن! یہ کیا ضد ہے..... کاموں کی وجہ سے اگر روزے چھوڑ دو گی تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ بندہ اپنی

جگہ کسی غریب کو روزہ رکھوادے۔۔۔ روزہ بھی ہوجائے گا اور نیکی کی نیکی۔۔۔ یوں گرتے پڑتے روزہ رکھنا کہاں کی عقل مندی ہے اور ایسے روزے کا فائدہ بھی کچھ نہیں!" ساس صاحبہ نے اپنی مرضی کا فتویٰ لگایا اور ناک بھوں چڑھاتی یہ جاوہ جا۔

"کیوں ضد نہیں چھوڑ دیتیں۔۔۔ ایک دو روزے چھوڑ دو۔ سب کس قدر پریشان ہو رہے ہیں!" معاذ فکر مند ہوا۔

"میرے لیے یا کاموں کے لیے!" درنجف کی سلگتی نگاہیں معاذ کے چہرے پر تھیں۔

"تو پھر یہ خیال نظر کیوں نہیں آتا۔ کیا نائلہ اتنا بھی نہیں کرسکتی کہ اپنے اور بھائی کے لیے ملک شیک بنالے یا اپنے باپ کے لیے دو روٹیاں ہی ڈال دے۔ ان چند لمحوں کے کام سے اس کی پڑھائی کا کیا حرج ہوجاتا تھا مگر نہیں ہر کام کے لیے بھابھی یا بہو کو پکارا جائے گا۔

عورت بھی موسم سے متاثر ہوتی ہے وہ بھی تھک جاتی ہے۔۔۔ اسے بھی آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔ روزہ چھوڑدوں کیوں کہ آپ لوگوں کو میری بہت فکر ہے۔۔۔ کیا روز قیامت آپ سب ذمہ داری قبول کریں گے کیے۔ معاذ! آپ سے مجھے اس بے حسی کی امید نہیں تھی۔۔۔" درنجف کے آنسو بہنے لگے۔

معاذ خاموشی سے سن رہا تھا۔۔۔ کچھ بہت غلط ہوتا جارہا تھا۔۔۔ مگر وہ الجھن کا شکار تھا۔

شام کو درنجف کے والدین آگئے۔

"ہم کچھ دن کے لیے اسے ساتھ لے جانے کے لیے آئے ہیں۔!" والدین تھے بیٹی کو بیمار دیکھ کر رہ نہ پائے اور فوراً" پہنچ گئے۔

☼ ☼ ☼
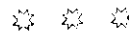
پانچ روزے رہ گئے تھے کبھی گھر والوں کی آنکھ نہ کھلتی۔۔۔ کبھی آٹھ پہر روزہ رکھنا پڑتا' سحری میں نائلہ کے ہاتھ کے جلے ہوئے پراٹھے کھانے پڑتے۔۔۔ دہی اکثر ہی بازار سے لانا پڑتا۔

افطاری میں باہر کی چیزیں کھا کھا کر اہل خانہ کو بدہضمی اور خرابی معدہ کی شکایت ہونے لگی۔ معاذ سب کچھ خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ ضمیر نے عدالت لگائی اور معاذ مجرم بنا کٹہرے میں کھڑا تھا۔

"ایک عورت جو گھر کے لیے اس قدر اہم ہوتی ہے جو گھر اور گھر والوں کے لیے دن رات اپنی جان مارتی ہے۔ کیا اس کی اہمیت صرف کام کے لیے ہوتی ہے۔ ایک دن وہ بیمار ہوجائے سب کو اپنی پڑجاتی ہے۔ عورت بھی موسم' تھکاوٹ اور بیماری سے متاثر ہوتی ہے۔ ہمارے لیے انواع و اقسام کے کھانے بنائے۔ ہمارا گھر سنوارے۔ ہمارے بچے پالے۔ بدلے میں صرف محبت اور احساس مانگتی ہے اور ہم وہ بھی دیتے ہوئے کتراتے ہیں۔ وہ بیمار پڑجائے تو ماں باپ کے گھر بھیج دیا جائے۔"

ضمیر کے ہتھوڑوں نے معاذ کو ہلا کر رکھ دیا۔

"معاذ! مجھے آپ سے اس بے حسی کی امید نہیں تھی!" درنجف کے الفاظ اور بھیگا لہجہ اسے تڑپا گیا۔

"ہم صرف عورتوں کو ملازمہ سمجھتے ہیں جو چوبیس گھنٹے ڈیوٹی دے نہ تھکے اور نہ ہی بیمار پڑے اور کاموں

کی زیادتی کا شکوہ کرے تو اسے ناشکری اور کام چور کہہ کر چپ کروا دیا جائے۔

"عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔۔۔ تم سے روز قیامت ان کے بارے میں سوال کیا جائے گا!" خطبۂ جمعہ میں امام صاحب کے الفاظ نے معاذ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

☼ ☼ ☼

ابھی بھی تین روزے رہ گئے تھے۔ تلافی کا وقت تھا۔ باقی گھر والوں کو احساس نہ بھی دلا سکوں مگر میں خود تو احساس کر سکتا ہوں۔

"میں تمہیں لینے آیا ہوں!" معاذ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"کام کے لیے؟" در نجف نے طنز کیا۔

"نہیں۔ آرام کے لیے۔ یہ جو آرام تمہیں یہاں مل رہا ہے یہ میرا فرض بنتا ہے کہ میں دوں۔ میں خود غرض اور بے حس نہیں بننا چاہتا!" معاذ نے اس کا ہاتھ تھام کر نرمی سے دباتے ہوئے کہا۔

☼ ☼ ☼

سحر و افطار کے کئی چھوٹے موٹے کام معاذ خود کر دیتا، شربت بنا دیتا، برتن سیٹ کرنے میں مدد کر دیتا، بے جا افطاریوں اور شو بازیوں سے پرہیز کرنے لگا۔ فردوس بیگم نے اس کی طبیعت کا خیال کرتے ہوئے اہتمام کے بجائے سادگی سے سمجھوتا کر لیا۔۔۔ گرم موسم اور رمضان کا خیال رکھتے نت نئی فرمائشوں میں کمی کی گئی۔ اس ذرا سے خیال سے در نجف پھر سے کھل اٹھی تھی۔ روزے بھی رکھتی رہی اور کاموں کا بھی بے جا بوجھ نہ ہوتا۔ معاذ کو سارے رمضان وہ سکون نہیں ملا تھا جو ان تین دنوں میں ملا تھا۔

☼ ☼ ☼

معاذ عید کی نماز پڑھ کر گھر لوٹا تو سب اپنے اپنے کمرے میں انجوائے کرتے ہوئے دکھائی دیے۔ اس کی نظروں کو در نجف کی تلاش تھی۔

"ضرور کچن میں ہو گی!" اس کے دل میں خیال گزرا۔

"عید مبارک!" وہ دبے قدموں کچن میں گیا اور در نجف کے کان میں سرگوشی کی۔

"اف معاذ۔۔۔ ڈرا ہی دیا۔۔۔ ابھی کھیر کا پیالہ گر جانا تھا!" در نجف نے مصنوعی خفگی سے کہتے ہوئے ریشمی زلفوں کو ایک ادا سے ہٹایا جو گلاب چہرے کو بار بار شرارت سے چھو رہی تھیں۔

"بن گئی کھیر تو کھلاؤ نا!" معاذ مسکراتے ہوئے بولا۔

در نجف نے کھیر کی پیالی اس کی طرف بڑھائی۔

"ایسے نہیں۔ اپنے ہاتھ سے کھلاؤ!" معاذ شرارت سے بولا۔

"معاذ! ابھی آپ کی امی آ گئیں نا تو سارا رومانس نکال دیں گی!" در نجف کھیر کھلاتے ہوئے شرما سی گئی۔

"در نجف۔۔۔ تم نے اپنا دل صاف کر لیا نا۔۔۔!" معاذ محبت بھرے انداز میں بولا۔

"معاذ! میں آپ سب سے ناراض نہیں تھی۔ بس ذرا سا احساس مانگ رہی تھی۔" وہ دھیمے سروں میں بولی۔

"میرا تم سے وعدہ ہے کہ آئندہ رمضان تمہارے لیے یوں تھکاوٹوں بھرا نہ ہو گا۔ بلکہ محبت بھرا ہو گا۔" معاذ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے یقین دلایا۔

"اچھا اب باتیں ہی کرتے رہیں گے یا کھانے کے لیے سامان بھی لا کر دیں گے۔" در نجف شرمگیں مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"جی نہیں۔۔۔ آج بلکہ عید کے تین دن تمہاری کچن سے چھٹی۔۔۔ جیسے باقی سب انجوائے کر رہے ہیں۔ تم بھی کرو، کھانا باہر کھائیں گے۔۔۔" معاذ محبت سے بولا۔

در نجف کی تمام تھکاوٹوں کا ازالہ ہو گیا تھا ایک ذرا سا احساس مانگتی ہے اور پھر عورت اپنے کام میں مصروف ہو جاتی ہے کیونکہ گھر اور گھر والوں کی خدمت بھی تو عبادت ہے۔

☼

اُمِّ اقصیٰ

لباس

آمنہ بھابھی ہمارے خاندان میں پہلی غیر بہو تھیں۔ ہماری اکلوتی پھپھو کے اکلوتے صاحب زادے کسی کورس کے سلسلے میں جہلم گئے تھے اور ساتویں برس آمنہ بھابھی کے ہمراہ لوٹے تھے۔ آمنہ بھابھی کا حسن لاجواب تھا تو ہر ادا مثال ٹھہری۔ اطوار میں یکتا' اخلاق میں اعلا مگر ہمارے نزدیک تو ان کی خوش لباسی مثال ٹھہری تھی۔

یوں تو مجھے روزِ اوّل سے اچھے لباس کا شوق رہا تھا مگر آمنہ بھابھی کے لباس دیکھ دیکھ کر تو میرے شوق کو ہوا کے بجائے آندھی آ لگی تھی مگر دادا مرحوم کی محدود پنشن اور خاص طور سے دادی جی کی نصیحتیں میرے شوق کی راہ میں رکاوٹ رہیں۔ دادی جی ہمیشہ کہتیں۔

"لڑکیوں کو شادی کے بعد پہناوے پہننے چاہئیں۔ کوئی چاہنے سراہنے والا تو ہوتا ہے۔۔۔ اور میں خاندان کی ہر تقریب پہ بس آمنہ بھابھی کو دیکھے جاتی۔ بے انتہا خوب صورت لباس اور اس پر جچا ہوا نکھرا میک اپ۔ تصور میں ان کے پہناوے خود اپنے وجود پہ دیکھتی۔۔۔ "آمنہ بھابھی بہت خوش قسمت ہیں" یہ بات میں نے نہ صرف بارہا سوچی تھی بلکہ ایک دن ان سے کہہ بھی دی تھی۔ وہ میری بات کے جواب میں ہلکا سا مسکرائی تھیں فقط۔

نجانے کب میری شادی ہوگی اور مجھے اچھے اچھے لباس پہننے کو ملیں گے۔ جو بیسواں سال لگتے ہی یہ بات میں شدومد سے سوچنے لگی تھی۔ دادی بی نے بھی نماز کے بعد کوئی وظیفہ شروع کردیا تھا۔ علی سجاد اٹھتے ہاتھوں میں میرے لبوں پہ آٹھہرا تھا۔ خوشی تھی کہ اب رنگ برنگ کے پہناوے ملیں گے۔ دادی بی نے گیلی۔۔۔ آنکھوں سے میری توقع سے بڑھ کے سب کیا تھا اور تو اور میرا چھوٹا سا بھیا بھی میرے لیے سوٹ خرید کے لایا تھا۔

کس رنگ کے ساتھ کون سی لپ اسٹک، چوڑیاں ہار، بندے چلیں گے میں ہمہ دم ایسے تانوں بانوں میں محو رہتی۔ ملن کی گھڑی خوشیوں گنگناہٹوں کے ہمراہ آئی تھی۔ سرخ زرتار جوڑا پہنے میں آنے والے دن کے لباس کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔۔۔ حجلہ عروسی میں بیٹھی ہوئی رنگوں کے تانے بانے میں الجھی رہی۔ اپنی ساس اور نند کے پریشان چہرے، چہ مگوئیاں بمل جنگلہ، سوٹ کیس نجانے کیا پہیلی تھی۔ خیر میں خاموش رہی کوئی خاص بات ہوئی تو مجھ سے ذکر ہوتا۔ میں منہ دکھائی کے سبز نیلے نوٹوں پہ نگاہوں کے جال بچھائے ہوئی تھی کہ ان کے بھی مجھے لباس لینے تھے من پسند۔

علی سجاد حقیقتاً "اچھے تھے۔۔۔ اونچے لمبے، خوش شکل۔۔۔ دھیمے لہجے میں ناپ تول کے بولنے والے مرکزی بازار میں بیکری تھی ان کی چھوٹی سی۔ اگلے روز پہیلی حل ہو کے مجھے پہیلی بنا گئی۔ نند کے بڑے بیٹے نے گاڑی پل کے ٹوٹے جنگلے میں دے ماری تھی۔ نتیجتاً" گاڑی کا پچھلا حصہ ٹوٹ کے اڑتا ہوا نہر میں جا گرا تھا۔ ڈگی میں میرے بری کے سوٹ کیس تھے۔ منہ دکھائی کے پیسوں سے اور کپڑے تو کیا بنواتی، پہلے ہی والے سب غارت ہو گئے۔ الٹا منہ دکھائی علی سجاد نے نند کو جا پکڑائی "گاڑی اور بیٹے کی چوٹوں کا ہرجانہ۔۔۔ میں دادی بی کے گھٹنوں سے لگی پہروں روئی آخر انہوں نے ٹوک ہی دیا۔

"میرے سب کپڑے اسی میں تھے دادی بی۔۔۔۔" میرا افسوس کسی طور کم ہوتا ہی نہ تھا۔

"ارے بھاڑ میں گئے کپڑے سب۔۔۔ تو علی سجاد کا شکرانہ پڑھ۔۔۔ منہ ڈھکا ہونا چاہیے۔ تن کا کیا ہے وہ تو پتوں سے بھی ڈھک جاتا ہے۔"

"دادی بی لوگ تو تن ڈھکا دیکھتے ہیں ناں۔"

"ارے لوگوں کا کیا ہے۔" دادی بی نے ناک سے مکھی اڑائی۔

آہ آمنہ بھابھی اور ان کے پہناوے۔۔۔ مہینوں میرے لبوں سے آہیں نکلتی رہیں۔

☼ ☼ ☼

میرا سسرال روایتی تھا۔ ساس کی ہر کام میں مین میخ، نندوں کے نخرے اور پروٹوکول۔۔۔ علی سجاد البتہ بہت مختلف تھے۔۔۔ کبھی ماں بہنوں کی لگائی بجھائی میں نہ آتے۔ نہ انہیں ٹوکتے۔۔۔ نہ مجھے ڈانٹتے ڈپٹتے۔ ایک دو بار میں نے ان سے اپنی ساس، نند کی شکایت کی۔ سن کے چپ ہو رہے۔ بعد ازاں میں نے ایسی کوشش ترک کردی۔

انہیں دیکھ کے بسا اوقات مجھے اسفنج کا خیال آتا۔ سب جذب۔ پر یہ تو نچوڑنے پہ بھی اظہار نہ کرتے۔ صرف ان ہی کی خاطر میں سب سن اور سہ لیتی۔۔۔ بس ایک ہی حسرت اندر ڈیرے ڈالے رہتی۔۔۔ اچھے پہناووں کی۔

اس بار امی کی جانب آئی تو بازار کی جانب اٹھتے قدم نجانے کیسے آمنہ بھابھی کے گھر کی جانب مڑ گئے۔

پھپھو بے حد تپاک سے ملیں آمنہ بھابھی میکے گئی ہوئی تھیں سو میں بھی جلدی اٹھ گئی۔ پھپھو کھانے کا اصرار کرتی رہیں اور پھر کل دوبارہ پھر آنے کا وعدہ لے کر ہی چھوڑا۔ داخلی دروازہ پار کرتے میں نے وحید بھائی کی چنگھاڑ نما آواز سنی تھی۔

"کمینی' بے غیرت' آئی نہیں ابھی تک۔" پل بھر کو ذہن الجھا۔۔۔ "کام والی کو کہہ رہے ہوں گے۔" میں نے خود کو تسلی دی۔

ویسے وحید بھائی شروع سے خاصے اکھڑ اور بد مزاج مشہور تھے۔ خاندان بھر میں ان کا نام "اکھڑی کلہاڑی" مشہور تھا۔ آمنہ بھابھی بہت پُر وقار اور دھیمے مزاج کی تھیں۔۔۔ میں وہاں سے بازار چلی گئی تھی اور پھر سے جلد ہی لوٹ آئی میں۔ دادی بی سب چیزیں ذوق و شوق سے دیکھ رہی تھیں۔ اپنے لیے میں نے ایک سستا سا کیمبرک کاٹن کا سوٹ لیا تھا۔

"حالات سہنے آسان ہوتے ہیں بٹیا! پر ولگ سہنے بہت کٹھن۔ فکر نہ کر یہ دن بھی گزر جائیں گے۔ اللہ اچھا وقت لائے گا تو من بھاتا پہننا اوڑھنا' ابھی دل میلا نہ کر۔" میں بھی دادی بی کی خوشی کی خاطر مسکان سجائے شاپنگ دیکھنے لگی۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح علی سجاد مجھے لینے آ گئے۔ دادی بی سے رخصت لے کر ہم پھپھو کی طرف چلے آئے۔ آج تو وحید بھائی بھی خوش گوار موڈ میں تھے' دیر تک علی سے گپ شپ لگا کے اندر تیار ہونے کے لیے اٹھ گئے۔ ذرا دیر میں انہیں اپنے دوست کے ولیمہ میں جانا تھا۔ آمنہ بھابھی نہا کے نکلی تھیں سو ویسے ہی فٹافٹ کھانا لگایا۔ ہماری خاطر مدارات کرنے کے ساتھ ساتھ وہ وحید بھائی کو تیاری میں بھی مدد کرواتی رہیں۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ علی سجاد کے ہاتھ سے ذرا چائے چھلک گئی تھی' وہ واش بیسن پہ دھونے کے لیے اٹھ گئے۔ آمنہ بھابھی بھی چائے لے کر قریب ہی آ کھڑی ہوئیں۔

"یہ کیا ہے؟" وحید بھائی کوٹ لیے دھاڑتے ہوئے آمنہ سے پوچھ رہے تھے۔

"اوہ' یہ اس دن ذرا سی مٹی لگ گئی تھی۔" آمنہ بھابھی نے منمناتے ہوئے وضاحت کی۔

"تو یہ کیا صاف تمہاری ماں آ کے کرے گی۔" میں نے بے ساختہ نگاہیں جھکا کے ساری توجہ ہاتھ میں پکڑے کپ کی جانب کر لی تھی۔

"میں ابھی کر دیتی ہوں۔" آمنہ بھابھی نے جلدی سے اٹھ کے کوٹ پکڑنا چاہا۔

"بے غیرت! جب دیکھو جو کپڑا دیکھو خراب۔" ہاتھ جھٹکتے' ہزار صلواتیں سناتے وہ باہر کی جانب بڑھ گئے۔۔۔ آمنہ بھابھی تیزی سے آنکھیں جھپکتی اندر کی جانب بڑھ گئیں۔

"کیا ارادے ہیں۔" علی سجاد تولیے سے ہاتھ پونچھتے میرے قریب آئے۔

"ہاں چلیں بس۔" میں جیسے کسی خواب سے جاگی تھی۔ پھپھو سے مل کے میں آمنہ بھابھی کے کمرے کی جانب آئی۔

وہ سنگھار میز کے سامنے کھڑی مسکارا لگا رہی تھیں۔ آئینے میں شبیہہ دیکھ کے میری جانب مڑیں۔ گیلی آنکھیں خوب صورت میک اپ سے مزین تھیں۔ ہمیشہ کی طرح جچتا ہوا خوب صورت میک اپ اور عمدہ لباس' بے شکن اور جھلملاتا ہوا پر نجانے کیوں ان کے لباس میں مجھے جگہ جگہ چھید نظر آ رہے تھے۔ میک اپ زدہ چہرے پہ ایک ان دیکھی آنسوؤں کی قطار سی تھی۔ رخصت لیتے ان کی نگاہیں قدرے جھکی ہوئی تھیں۔

کمرے سے باہر آ کر علی سجاد کے ہمراہ بیرونی گیٹ کی جانب جاتے مجھے اپنے لباس کے بیش قیمت ہونے کا احساس ہو رہا تھا اور یہ پہلی بار تھا کہ آمنہ بھابھی کے سامنے میں خود کو رشک سے دیکھ رہی تھی۔ مطمئن من کے ساتھ یہ اطمینان بھی تھا کہ میں زندگی جی رہی ہوں' جھیل نہیں رہی۔

☆

ایمل رضا

رقصِ گم

ثریا کوثر اپنے خالہ زاد سکندر احمد کی محبت میں یک طرفہ طور پر مبتلا تھیں۔ سکندر بیرون ملک مقیم تھے۔ ثریا کی انتہا کی محبت کو دیکھتے ہوئے خالہ نے سکندر کو بہانے سے بلا کر زبردستی ان کی شادی ثریا سے کر دی۔ ماں کی وفات کے بعد سکندر نے ثریا کوثر کو طلاق کے لیے ہر طرح سے قائل کیا۔ مگر وہ ان کی محبت سے کسی طور دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

بالآخر سکندر واپس یونان چلے گئے جہاں انہوں نے ایک امیر گھرانے کی خاتون صوفیہ سے شادی کر رکھی ہے۔ یہ خاتون بھی سکندر کی محبت میں گرفتار ہیں۔ سکندر کے تین بچے انس' احمد اور ڈورس ہیں۔ ڈورس باپ کی بے حد لاڈلی' حسین' ذہین اور ان کی محبت پر قابض ہے۔ احد اس بات کو بے حد محسوس کرتا ہے اور ڈورس سے اکثر اس کی جھڑپیں رہتی ہیں۔ ڈورس کو ہر معاملے میں باپ کی حمایت حاصل ہے۔

ثریا کوثر اپنے دو بچوں منال اور اسد کے ساتھ اپنے اکلوتے بھائی کے گھر میں رہتی ہیں۔ اسد ہر حال میں خوش رہنے والا بچہ ہے۔ دونوں بچوں کی زندگی میں ان کا باپ صرف ایک تصویر کی صورت میں ہے۔ منال کے ماموں نے دونوں بچوں کو

مکمل ناول

باپ کی کمی کبھی محسوس نہیں ہونے دی۔ ان کی بیٹی حفصہ منال کی دوست ہے۔ جبکہ نادیہ سے ان بن رہتی ہے۔

مرنے سے پہلے ثریا کوثر نے اپنی محبت کی داستان منال کو سنائی مگر باپ کو بے قصور ماننے کے بجائے اس کے دل میں اس کے لیے مزید نفرت بڑھ گئی۔ ثریا کی وفات پر سکندر کا پتا چلا کہ ان کے دو بچے بھی ہیں۔

سکندر احمد کی پہلی شادی کی خبر پر صوفیہ کا ردعمل نارمل تھا۔ انہوں نے سکندر کی بات کا یقین کرلیا تھا۔ انس اور احد نے بھی یہ بات سمجھ لی مگر ڈورس نے شدید ردعمل ظاہر کیا۔ سکندر اپنے دونوں بچوں کو لے کر یونان آگئے۔

سکندر احمد اور ان کے بچوں کی شاہانہ زندگی نے منال کے احساس محرومی کو بڑھا دیا اور اس نے پورے گھر کا سکون غارت کرنے کی ٹھان لی۔ اس نے سکندر احمد کو اذیت میں مبتلا کرنے کے لیے ڈورس کو نشانے پر رکھ لیا۔ جو باپ کی محبت میں اسے برداشت کررہی تھی۔ ڈورس اور منال میں ٹھن گئی۔ دونوں ایک دوسرے کو زک پہنچانے کی تگ ودو میں لگ گئیں۔

مگر صوفیہ کے حسن اخلاق کی وجہ سے منال کا رویہ ان کے ساتھ دوستانہ تھا۔ اسد کا داخلہ لندن کی یونی ورسٹی میں ہوگیا تھا۔ وہ انس کے ساتھ وہاں چلا گیا۔ ایک روز منال کا اپنی یونیورسٹی میں ایک لڑکے عجرم سے ٹکراؤ ہوا۔

منال کو اپنے ساتھی اسٹوڈنٹس کے ساتھ ایونٹ ڈیزائن کا پراجیکٹ ملتا ہے۔ ان کے ڈیزائن کردہ ہال پر جب ڈورس کیٹ واک کرتی آتی ہے تو سب اسے دیکھ کر مبہوت رہ جاتے ہیں اور منال کی خوشی خاک میں مل جاتی ہے۔ وہاں سکندر احمد بھی آتے ہیں جو منال کی پرفارمنس سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ منال کو اس کے علاوہ بھی پراجیکٹ ملتے ہیں جن سے حاصل ہونے والی رقم وہ اپنے ماموں اور حفصہ کو بھیجتی رہتی ہے۔ احد اس سے بھی ڈورس کی طرح الجھتا رہتا ہے۔ احد کی زندگی کا صرف ایک مقصد ہے ہروقت گھر والوں سے پیسے مانگنا۔

عجرم منال کے سخت رویے کے باوجود اس سے دوستی میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ اور وہ اسے ایتھنز کی سیر کراتا ہے۔ عجرم کی دوستی منال کے رویے میں تبدیلی پیدا کردیتی ہے۔ سکندر احمد اپنی کوتاہی پر نادم ہوتے ہیں۔ منال ان سے محبت کرنا چاہتی ہے مگر ماں کی محرومیوں کا احساس اسے کسی پیش قدمی سے روکتا ہے۔

صوفیہ اپنی محبت اور اس جدوجہد کا بتاتی ہیں جو سکندر احمد اور صوفیہ نے مل کر زندگی کو شاہانہ بنانے کے لیے کی۔

عجرم منال کو اپنے ڈانس انسٹرکٹر ینٹ سے ملواتا ہے اور ایک روز عجرم اچانک ہی اس سے رابطہ ختم کردیتا ہے۔ عجرم کی گمشدگی اس کے معمولات پر اثر انداز ہوتی ہے جسے صوفیہ اور سکندر احمد محسوس کرتے ہیں مگر وہ انہیں کچھ نہیں بتاتی۔

ایک طویل عرصے بعد عجرم اسے میسج کرکے اپنے فلیٹ پر بلاتا ہے۔ جہاں ڈورس اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کا مذاق اڑانے کے لیے موجود ہوتی ہے۔ وہ منال سے عجرم کا تعارف اپنے منگیتر کی حیثیت سے کراتی ہے۔

✡ ✡ ✡

تیسری اور آخری قسط

وہ بھول چکی تھی کہ وہ کس کی بیٹی ہے۔ وہ اس عورت کی بیٹی ہے جسے کبھی محبت نہیں ملی تھی۔ اس نے غلطی کی۔ اس نے اپنی ماں ہی کی طرح ایک مرد کو دعوت دی کہ وہ آئے اور اس کی زندگی برباد کردے۔ محبت کے نام پر اسے کچھ حسین پل دے اور پھر ساری زندگی کے لیے اپنے پیچھے تڑپنے کے لیے چھوڑ جائے۔

تیزی سے کار چلاتے ہوئے وہ ایک دوسری کار سے ٹکرا گئی۔ حادثہ معمولی تھا۔ وہ مقامی آدمی تھا۔ اپنی کار سے زیادہ اسے اس کی فکر تھی کہ اسے زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں۔ اسپتال سے بینڈیج کروانے کے بعد وہ وہیں اسپتال کی راہداری میں بیٹھی رہی۔

اگر وہ اس کار حادثے میں مرجاتی تو زیادہ بہتر تھا۔ وہ زندہ رہی، کتنا برا ہوا۔

رات گہری ہو چکی تھی۔ اس کا دماغ کام نہیں کررہا تھا۔ گھنٹے دو گھنٹے تک وہ وہیں ایک ہی انداز میں بیٹھی رہی۔ اس نے اپنی آنکھیں سختی سے مسلیں لیکن آنسو باہر آنے لگے۔ اس کا چہرہ گیلا ہو چکا تھا۔ وہ بے آواز رونے لگی تھی۔ لیکن وہ ثریا کوثر نہیں تھی جو چپ چاپ ہی روتی رہتی۔ اس میں ثریا جتنا حوصلہ نہیں تھا کہ اپنی آواز کو اپنے وجود میں دفن کرسکتی۔ آہستہ آہستہ اس کی آواز بلند ہوگئی۔ گھٹ گھٹ کے روتے اب وہ بلند آواز میں رو رہی تھی۔

ثریا کوثر کی بیٹی کی آواز سنی جاسکتی تھی۔ پاس سے گزرتے دو لوگوں نے اسے دیکھا۔ کافی دیر تک دیکھتے رہنے کے بعد وہ آگے بڑھ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد اس کے پاس اسٹاف نرس آگئی۔ اسی نرس نے اس کی بینڈیج کی تھی۔ وہ اس سے سوال کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ اسے مطمئن کررہی تھی۔

"پریشان مت ہو۔ معمولی زخم ہے.... یقین کرو معمولی زخم ہے۔"

وہ اس کے ہاتھ کے زخم کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ اس کی پیشانی اور گردن پر لگے زخموں کو بھی....

"درد کہاں ہے؟" وہ اس سے مسلسل پوچھ رہی تھی۔

"درد کہاں ہے....؟"

منال نے اجنبی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے خود بھی کہاں پتا تھا کہ درد کہاں ہے۔ اور کہاں کہاں ہے۔ اسے اپنی دل کے ٹوٹنے پر رونا آرہا تھا یا خود کو دھوکا دیے جانے پر.... یا آگ کے یہ دونوں ہی دریا مل کر اسے جلا رہے تھے۔

نرس مسلسل پوچھے جارہی تھی۔ وہ کیسا محسوس کررہی ہے، اسے کیا چاہیے، وہ رو کیوں رہی ہے؟ اس کے جواب نہ دینے پر وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھا کر اپنے ساتھ لے کر چلنے لگی۔

"تمہیں پرسکون رہنے کی ضرورت ہے۔ حادثے نے تمہارے اعصاب پر بری طرح سے اثر ڈالا ہے۔ تم ضرورت سے زیادہ خوف زدہ ہوگئی ہو شاید.... جبکہ تمہیں زیادہ چوٹیں نہیں آئیں۔ میں ایک بار پھر تمہارا چیک اپ کرلیتی ہوں۔"

اس حادثے نے ہی اس کے اعصاب پر اس بری طرح اثر ڈالا تھا کہ وہ نرس کی گرفت سے اپنا ہاتھ آزاد کروا کر وہاں سے بھاگ گئی۔ بھاگتے بھاگتے اس نے راہداری عبور کی۔ کار میں بیٹھ کر دروازہ لاک کرکے وہ اندھیرے میں خود کو گھورنے لگی۔ اب وہ کھل کر رو سکتی تھی۔

"اسی لیے آپ نے آخری خواہش کی تھی کہ میں یہاں آؤں....؟"

وہ اماں سے غائبانہ شکوہ کرنے لگی۔

"کیا ضرورت تھی مجھے یہاں آنے کی؟ ہمارے اس گھر میں بنا باپ کے میری وہ زندگی اچھی تھی۔ جس گھر میں میری ماں تھی، میں دکھی تھی لیکن کسی نے میرا دل نہیں توڑا تھا۔ مجھے دھوکا نہیں دیا تھا۔ جہاں میرا تماشا نہیں بنا تھا.... کیا آپ نہیں جانتی تھیں کہ میرا نصیب آپ کے نصیب پر لکھا گیا ہے۔ میری قسمت آپ کی قسمت سے ہٹ کر کیونکر ہوسکتی تھی۔ اب مجھے بھی تمام زندگی ایک مرد کی محبت کو رونا ہے۔ ایسی محبت کو جو کبھی میری تھی ہی نہیں۔ جو ملا وہ فریب سے بھی بڑھ کر کراہیت آمیز ہے۔ اتنا کہ میں آپ کی طرح ان بدبودار لمحوں کو یاد کرکے بھی زندگی نہیں گزار سکتی۔"

روتے روتے وہ چلا رہی تھی۔ رات کا اندھیرا کم تھا، اس اندھیرے سے جو اس کی آنکھوں کے آگے چھایا ہوا تھا۔ کیا اب صبح ہوگی۔ دنیا کی اور اس کی آنکھوں کی۔ کیا وہ اب بھی روشنی دیکھ سکے گی۔

"ویسے تم کافی ڈھیٹ ہو اور خوامخواہ ہی میرے گلے پڑ گئے ہو...."

"خوامخواہ تو نہیں.... پوری پلاننگ کے ساتھ...."

اسے عجوم کی بات یاد آئی۔ اس نے سچ کہا تھا۔ وہ پوری پلاننگ کے ساتھ ہی آیا تھا جو اس نے اور ڈورس نے مل کر کی تھی۔ وہ اس کے ساتھ وقت گزار رہا تھا۔ صرف وقت..... جو وہ کسی کے ساتھ بھی گزار سکتا تھا۔ ایک لڑکی سے باتیں کرنا، کھانا کھانا، گھومنا پھرنا، یہ تو ایک عام سی بات تھی۔ اس عام بات کو خاص منال نے سمجھا۔ وہ تو ایسا ہی تھا۔ اس کے لیے کیا مشکل تھا ان کے ساتھ دوستی کرنا اور پھر بھول جانا۔ یہی اس کا اسٹائل تھا۔ اس سے جان چھڑانے کے لیے اس نے جھوٹ بول کر اپنا رابطہ ختم کرلیا اور آخری دل پسند تماشا ڈورس نے لگایا۔

عجوم کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ آخری بار اویا و لیج میں وہی تھی جس نے عجوم کو بتایا تھا کہ وہ اس کے لیے کتنا اہم ہے۔ وہ اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔ تصدیق چاہتا تھا کہ اس کا اور ڈورس کا پلان کامیاب جارہا ہے یا نہیں۔ پلان کامیاب ہوچکا تھا۔ اس نے اقرار کرلیا تھا۔ روتے روتے وہ خود پر لعنت بھیجنے لگی۔

وہ بھلا حسن کی ملکہ ڈورس کو چھوڑ کر اس سے محبت کیوں کرتا۔ وہ ضمیر کی آوازوں کا بہرہ ہوسکتا تھا لیکن آنکھوں کا اندھا نہیں۔ اسے کئی بار یہ وہم ہوا کہ عجوم کے بہت سے انداز ڈورس سے ملتے ہیں۔ اکثر ڈر کر وہ سوچا کرتی تھی کہ دونوں ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں۔ وہ مکمل نہیں کرتے تھے۔ وہ مکمل ہی تھے۔ شروع سے ہمیشہ سے، اس لیے اس کی خاطر وہ اس کا دل توڑنے کے لیے اس کے قریب آیا تھا۔

محبوب ڈورس جیسا ہو تو اس کی بات کیسے ٹالی جاسکتی ہے بھلا؟

”ساری یونیورسٹی کو چھوڑ کر میں نے تمہارے ساتھ مذاق کیا ہے۔“

”خدایا.....!“ منال نے اپنا سر مضبوطی سے تھام لیا۔ عجوم نے تو کچھ بھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ وہ تو ایک ایک بات بالکل سچ کہتا رہا تھا۔ وہ اپنے فریب کا بوجھ ساتھ ساتھ اتارتا رہا تھا۔ سانپ کی کینچلی کی طرح..... اور اب وہ نکھر کر پھر سے صاف ستھرا تھا۔

منال جان گئی تھی کہ ساری یونیورسٹی کو چھوڑ کر اس نے اس کے ساتھ ہی مذاق کیوں کیا تھا۔ اسی سے بات کیوں کی تھی۔ نام کی دوستی، اور کام کی محبت کیوں کی تھی۔ اس نے اپنے حصے کا ایکٹ بہت خوب صورتی سے ادا کیا تھا۔ وہ ”ڈرمر“ جیسا بھی تھا، ڈانس میں کیسا بھی فلاپ تھا مگر وہ اداکار کمال کا تھا۔

”میں رووں تو..... اتنی معمولی تکلیفیں نہیں دیتی۔“

وہ مرجانا چاہتی تھی لیکن..... آخری بار وہ ڈورس سے ملنا چاہتی تھی۔

٭ ٭ ٭

آدھی رات کے بعد وہ گھر آئی۔ اس کی کار نے کام کرنا بند کردیا تھا۔ راستے میں ہی اسے چھوڑ کر وہ ٹیکسی میں گھر آئی۔ سامنے ہی سکندر احمد اور صوفیہ پریشان بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھ میں فون تھا۔ اسے دیکھتے ہی انہوں نے فون بند کردیا اور لپک کر اس کے پاس آئے۔

”آگئیں منال! کہاں تھیں تم.....؟“

احد بھی بوجھل آنکھیں لیا اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ”تم ٹھیک تو ہو ناں.....؟“

اسے دیکھتے ہی سکندر احمد جتنا خوش ہوئے تھے اس کی حالت دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ اس کا حلیہ خراب تھا۔ اس کا چہرہ رونے کی وجہ سے مرجھایا ہوا تھا۔ سکندر احمد نے اسے اپنی گرفت میں لیا۔ رات سے ان کی جان سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔ ایک مخصوص وقت تک جب وہ نہیں آئی تو دونوں نے ہی باری باری اسے فون کرنا شروع کردیا لیکن اس سے فون پر رابطہ ہی نہیں ہوا۔ میسج کے جواب بھی نہیں آرہے تھے۔ لگاتار فون کرنے کے بعد انہوں نے اس کے کلاس فیلوز سے رابطہ کیا۔ کسی کو کچھ خبر نہیں تھی۔ بارہ بجتے ہی انہوں نے پولیس کو کال کی۔ پولیس کو تفصیل بتانے کے بعد

وہ بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگے۔ زیادہ فکر انہیں ٹریفک حادثے کی تھی اور پولیس اس کا پتا لگا رہی تھی۔

پولیس کے خبر دینے سے پہلے وہ آچکی تھی۔۔۔ اس موت کا ماتم کرنے جو بس اس کی آخری سانسیں کھینچ لینے کو تھی۔۔۔

''کیسے ٹھیک ہو سکتی ہوں میں۔۔۔''

اس نے پوری قوت سے چلا کر کہا اور خود کو ان کی گرفت سے آزاد کروایا۔ اس کی آواز اور اس کے سوال نے لمحے بھر میں ہی انہیں بہت کچھ بتا دیا تھا۔ سکندر احمد اور صوفیہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ سوالیہ نظروں سے۔ منال نے انہیں زیادہ دیر تک انتظار نہیں کروایا تھا۔

''مجھے بددعا دی گئی ہے آپ کی اولاد ہونے کی۔۔۔''

وہ حلق کے بل چیخی اور اس طرح سے چیخنے کے سوتی جاگتی آنکھوں کو پورا کھول کر احد نے اسے دیکھا۔ اس کی متورم آنکھیں' اس کے چہرے پر جگہ جگہ زخم کے نشان' اس کی آواز' اس کا لہجہ' اس کا آج کا انداز اس پر ترس دلا رہا تھا۔

''ہوا کیا ہے منال۔۔۔ کچھ بتاؤ تو سہی۔'' صوفیہ آنٹی محبت اور فکرمندی سے اس کی طرف بڑھیں۔

لپک کر وہ ڈورس کے کمرے میں گئی۔ وہ انگلش مووی دیکھ رہی تھی۔ احد تک اس کے لاپتا ہونے کی وجہ سے لاؤنج میں بیٹھا اکا انتظار کر رہا تھا لیکن وہ انگلش مووی دیکھ رہی تھی۔ سکندر احمد اور صوفیہ اس کے ساتھ اس کے پیچھے آئے۔ انہیں توقع نہیں تھی کہ وہ ڈورس کے کمرے میں جائے گی۔ ایک عرصے سے ان کے درمیان کوئی خاص بدمزگی نہیں ہوئی تھی۔ دونوں کا خیال تھا وقت کے ساتھ ساتھ وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ ایک دوسرے کے قریب آجائیں گی۔ یہ ان کی خام خیالی ثابت ہوئی تھی۔ جواب ہوا تھا وہ پہلے سے بھی بدتر ہوا تھا۔

دھاڑ سے دروازہ کھلنے پر بھی ڈورس نے گردن موڑ کر اسے نہیں دیکھا۔ البتہ اس کی آنکھیں جیسے ردھم پر رقص کرنے لگیں۔

''تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا۔۔۔؟''

وہ عین اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اب ڈورس نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا' کوئی جواب نہیں دیا اور والیوم تیز کر دیا۔ منال نے پاس پڑا ایک وزنی ڈیکوریشن پیس پلازمہ اسکرین پر دے مارا۔ سکندر احمد' صوفیہ احمد جہاں تھے وہیں کھڑے رہ گئے۔

''تم نے ایسا کیوں کیا۔۔۔؟''

جتنا شور اسکرین کے ٹوٹنے سے ہوا تھا' اس سے زیادہ شور اس کی آواز میں تھا۔ صوفیہ اس کے پاس آنے لگیں' وہ ان دونوں سے خود بات کرنا چاہتی تھیں۔ مگر ایک طرف کھڑے سکندر احمد نے ان کا ہاتھ پکڑ کر روکا اور خاموشی سے کھڑا رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ ان دونوں کو سننا چاہتے تھے۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ اس گھر میں ان کی دو بیٹیوں کے درمیان ایسا کیا ہوا ہے کہ منال اس انداز میں اس سے بات کر رہی ہے۔

''کیونکہ تم یہی ڈیزرو کرتی تھیں۔'' کچھ طنز اور زیادہ اطمینان سے ڈورس نے کہا۔ ''یہی اوقات تھی تمہاری۔۔۔ تم اسی قابل تھیں۔''

''ٹھیک کہا تم نے۔۔۔ میری اوقات یہی تھی کہ میں اس گھر میں نہ آتی۔'' اس نے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کیے۔ ''آنا تو مجھے اس دنیا میں ہی نہیں چاہیے تھا۔'' وہ رونے لگی اور روتی رہی۔۔۔

''تم آج اسی جگہ کھڑی ہو جہاں کی ایک ایک چیز تم نے اپنی نفرت کی وجہ سے توڑ دی تھی۔ یاد ہے۔۔۔ یاد ہے تم نے میرے ساتھ کیا کیا تھا۔'' ڈورس تن کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ''تمہاری اسی نفرت کا ایک طمانچہ میں نے بھی مارا ہے۔۔۔ صرف ایک۔۔۔'' اس نے غرور سے کہا۔ ''اب تم عجرم کو مار ڈالو گی؟ اسے مروڑ دو گی؟ میری ہر چیز پر قبضہ کرنے کی عادت ہے نا تمہیں۔۔۔ اب کرو عجرم پر قبضہ۔۔۔ وہ پاپا نہیں ہے' جسے تم مجھ سے چھین لو گی۔''

اس کے لہجے میں وہ سب تھا جو ہونا چاہیے تھا۔ غصہ' طنز' تمسخر' ناپسندیدگی' نفرت۔۔۔۔

"چیزیں۔۔۔؟" اس نے ہزاروں سوال آنکھوں میں سجا کے دیکھا۔ "اپنی چیزوں کا مقابلہ تم نے میرے دل سے کیا؟"

سکندر احمد اور صوفیہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اور پھر ڈورس کی طرف۔۔۔۔

"میں نے تمہاری چیزیں نہیں اپنے وہ ارمان توڑے تھے جو صرف تمہیں ملے تھے مجھے نہیں۔ میں نے ڈورس کی نہیں' سکندر احمد کی چیزیں توڑی تھیں جو صرف تمہارے پاپا تھے۔"

ڈورس نے شانے اچکائے جیسے کچھ بھی کہو اب۔

"اسی جگہ پر کھڑی ہو کر میں بھی دل سے رو رہی تھی۔۔۔۔ بھول گئی ہو۔۔۔۔ میں نے تب ہی تم سے کہہ دیا تھا کہ تم نے ٹھیک نہیں کیا۔ اپنے ساتھ۔۔۔۔ تمہیں پچھتانا پڑے گا۔۔۔۔ وہ بھی بہت زیادہ۔۔۔۔"

"یاد ہے۔۔۔ سب یاد ہے مجھے۔۔۔۔" منال نے اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھتے ہوئے اس طرح سے کہا کہ سکندر احمد سمیت صوفیہ اور احد کا دل بھی کٹ کر رہ گیا۔

"اچھا۔۔۔؟ تو پھر اب کیوں رو رہی ہو۔" اس کا انداز ایسا تھا جیسے۔۔۔ اوہ! افسوس ہوا سن کر' چلو اب بھول جاؤ۔

"کیوں کہ جس کے سینے پر سر رکھ کر تم سوتی رہی تھیں میں اس کی تصویر سے لپٹ کر روتی رہی تھی۔ اس لیے تھا وہ سب۔۔۔ تم تو میری جگہ نہیں رہی تھیں' تم نے خود کو "منال" کیوں بنایا۔ بیس سال میں نے اپنے باپ کا انتظار کیا' اتنے سال تم نے ان کا پیار پایا۔

تم نے کیا کھویا تھا؟ پاپا کو یاد کر کے جتنے آنسو میں ایک رات میں بہاتی تھی' تم نے ساری زندگی نہیں بہائے ہوں گے۔ ساری تکلیفیں میں نے سہیں اور تم سے میرے غصے کے چند چھینٹے نہیں سہے گئے۔ تم نے مجھے برباد کرنے کے لیے میرے دل کا انتخاب کیا۔ مجھے توڑنے کے لیے تم عجوم کو لے آئیں۔۔۔۔"

"میں نے تم سے کہا تھا کہ میں نے معاف کرنا نہیں سیکھا۔" اس نے گھور کر اسے دیکھا۔

"ٹھیک کہا تھا سب۔۔۔۔ یہ صرف تمہارا گھر ہے۔ وہ صرف تمہارے پاپا ہیں۔ ایک مسکین لڑکی کو تمہاری سلطنت میں قدم نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ تم نے وہ چیزیں دیکھیں جو میں نے توڑیں' وہ دکھ نہیں دیکھے جنہوں نے مجھے توڑ ڈالا تھا۔"

وہ جہاں کھڑی تھی وہیں بیٹھتی چلی گئی۔ جیسے ڈھے گئی ہو۔ اس کے دل کے ٹوٹنے نے اس کا وجود توڑ ڈالا تھا۔ زندگی میں اس کا سب کچھ تقسیم شدہ تھا۔ ایک اس کے پاس عجوم ہی تھا جو سارے کا سارا اس کا تھا اور اب۔۔۔۔ اس پر عقدہ کھلا کہ وہ تو اس کا سرے سے تھا ہی نہیں۔ وہ سسکنے لگی۔

"آپ کی دیوی نے میرا دل توڑ دیا ہے پاپا! اس نے میری قبر بنادی ہے تاکہ میں اس میں خود کو دفن کرلوں۔"

بری طرح سے سسکتے اس نے پاپا کی طرف سر اٹھا کر کہا۔ اس کا محبت اور محبت کے نام پر بنے ہر رشتے پر سے اعتبار اٹھ چکا تھا۔ ڈورس نے ٹھیک کیا تھا کیونکہ اس نے اس کے ساتھ ٹھیک نہیں کیا تھا۔ اس نے ایسی ہمت کی ہی کیوں؟ اسے احتیاط کرنا چاہیے تھی۔ یاد رکھنا چاہیے تھا کہ وہ کس عورت کی بیٹی ہے۔ ایک ایسی عورت کی بیٹی جو اپنی سچی محبت پر بھی جھوٹا ساتھ حاصل نہیں کر سکی تھی۔ جس کی سانسیں جدائی کے راگ الاپتے الاپتے' سرد ہو گئیں اور وہ محبت کی ایک بھی چنگاری اپنے محبوب کے دل میں نہیں جلا سکی۔ وہ ایسی عورت کی بیٹی تھی جس کا نصیب ٹھنڈا تھا اور جس کی اولاد پیدا ہوتے ہی یتیم تھی۔ اس نے کیسے یہ سوچ لیا کہ وہ لڑ کر' مر کر' بول کر' اپنا نصیب جگا لے گی۔

صوفیہ نے اسے گلے سے لگانے کی' اسے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی' مگر وہ ایسے ہی بیٹھی رہی۔ احد بھی گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا

تھا۔ وہ ایسے رو رہی تھی کہ ان کا دل رو دینے کو تھا۔

اس کا رونا ان سب کا دل چیر رہا تھا۔

"کیا کیا ہے تم نے منال کے ساتھ...؟" جو بات واضح ہو چکی تھی وہ اس سے پوچھ رہے تھے۔ ڈورس کے منہ سے سننے کے لیے۔

ڈورس نے اچھنبے سے پاپا کے لہجے اور تنے ہوئے اعصاب کو دیکھا۔ اس نے انہیں پہلی بار اتنے غصے میں دیکھا تھا مگر جیسے اسے فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ مزے سے کھڑی منال کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے اپنی پسند کے ڈرامے کے اس کلائمکس سین کا اسے شدت سے انتظار رہا ہو۔

"میں نے اس سے اپنی ہر بات کا بدلہ لے لیا ہے... وہی جس کے قابل یہ..."

"بس"۔ سکندر احمد نے اس کی بات وہیں ختم کر دی۔ سکندر احمد جتنی قوت اور غصے سے چیخ سکتے تھے، وہ چیخے تھے۔

"کاش میری ایک ہی بیٹی ہوتی اور وہ تم نہ ہوتیں..."

چاند بھی زمین پر آگرتا تو ڈورس کو اتنی حیرت نہ ہوتی جتنی اس ایک جملے سے ہوئی۔

جتنا اب تک منال اس کے سامنے بیٹھی رو چکی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ تیزی سے آنسو اس کی آنکھوں سے نکلے۔ اپنے سرخ چہرے اور بہتی آنکھوں کے ساتھ اس نے بڑھ کر ان کے شانے کو چھوا جو منال پر جھکے ہوئے تھے۔

"پاپا..." اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ سب اس کے پاپا نے اس سے کہا ہے۔ اس طرح اسے دھتکارا ہے۔

وہ اس کے پاپا کا لہجہ نہیں تھا... ہرگز نہیں تھا...

وہ منال کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور اس کے گرد اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ وہ اس کے سر پر مسلسل پیار کر رہے تھے۔ اپنی آغوش میں لے کر اسے تسلی دے رہے تھے۔ وہ ویسے ہی اونچی آواز سے ہچکیوں سے روتی رہی۔ ڈورس نے آنکھوں میں دھند لیے اس منظر کو دیکھا۔

"مائی گوڈس... میری دیوی... میری جان۔" وہ اکثر اسے اپنی گرفت میں لے کر کہتے تھے۔ آج ان کی گرفت میں منال تھی۔

منال نے خود کو ان کی گرفت سے آزاد کروایا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

رات بھر ڈورس روتی رہی۔ وہ مر بھی جاتی تو اس بات کو تسلیم نہ کرتی کہ پاپا بھی اس سے یہ سب بھی کہہ سکتے ہیں۔

اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ اس وقت سے ایک ہی انداز میں بیٹھی، سامنے لاؤنج میں بیٹھے سکندر احمد کو دیکھ رہی تھی۔

سکندر احمد اور صوفیہ نے کافی دیر تک منال کے کمرے کا دروازہ کھلوانے کی کوشش کی، لیکن وہ ناکام ہی رہے۔ اس کے رونے کی آوازیں باہر تک آرہی تھیں۔ سکندر احمد وقفے وقفے سے اس کے کمرے کے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر اسے منا رہے تھے، بہلا رہے تھے، مگر پھر بھی اس نے دروازہ نہیں کھولا تھا۔

سارا وقت وہ اس کے کمرے کے دروازے پر نظریں جمائے بیٹھے رہے۔ انہیں سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس غم کی کیسے تلافی کریں۔

انہوں نے اسے ہر وہ چیز لا دی تھی جو وہ لا کر دے سکتے تھے، مگر کسی کا دل وہ کیسے لا کر دے سکتے تھے۔

ڈورس کی نفرت اس انتہا پر پہنچ چکی ہوگی۔ انہیں اندازہ ہوتا تو وہ کبھی منال کو یہاں نہ رکھتے۔ زندگی میں کی گئی غلطیاں اکثر آپ کے سامنے آتی ہیں۔ ان کی کی گئی بھول بار بار ان کے سامنے آرہی تھی... اب تک کی ان کی زندگی کا اصل "صفر" ہو چکا تھا۔ ماں کے دباؤ میں آکر انہوں نے شادی کرلی تھی تو انہیں پلٹ کر اس عورت کی خبر بھی لینی چاہیے تھی۔ انہیں اس عورت کی بات پر یقین بھی کرنا چاہیے تھا کہ وہ باپ بننے والے ہیں۔ کاش وہ ایک بار پلٹ کر پیچھے دیکھ لیتے... تو

منال کی سسکیاں' ان کے دل پر بھاری نہ پڑ رہی ہوتیں۔

☆ ☆ ☆

ساری رات ان دونوں کی آنکھوں میں کٹ گئی۔ احد وہیں صوفے پر سو رہا تھا۔ فریش ہو کر وہ منال کے نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔

اس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ اپنے شلوار سوٹ میں کمرے سے باہر آئی۔ یہ وہ لباس تھا جو وہ پاکستان سے اپنے ساتھ لائی تھی۔ کسی کی بھی طرف دیکھے بغیر وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"منال۔۔۔" وہ اس کے پاس آئے۔ "ادھر آؤ میرے پاس۔۔۔ ناشتا کرکے جانا۔"

مگر انہیں نے اور دیکھے بغیر وہ گھر سے باہر نکل گئی۔ وہ اس کے پیچھے لپکے' مگر تیزی سے چلتی وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

"ہم دونوں اسے ہاف ٹائم میں یونیورسٹی سے پک کرلیں گے۔۔۔ مل کر لنچ کریں گے۔" صوفیہ نے انہیں اطمینان دلانا چاہا۔ "وہ ڈسٹرب ہے۔ اس طرح وہ اور ڈسٹرب ہو جائے گی۔ ہمیں اسے کچھ وقت دینا چاہیے۔"

"اسے ہماری ضرورت ہے۔ ہم دونوں کو اس کے ساتھ ہونا چاہیے۔"

"چلیں۔۔۔ پھر ابھی چلتے ہیں۔۔۔ میں گاڑی نکالتی ہوں۔ اسے یونیورسٹی سے پک کر لیتے ہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" انہوں نے کہا پھر خود ہی چپ کر گئے۔ "ہاف ٹائم میں ہی پک کریں گے۔ میرا خیال ہے وہ کچھ دیر اکیلی رہنا چاہتی ہے۔"

تین گھنٹے بمشکل گزار کر صوفیہ اور سکندر احمد ایک ساتھ اسے لینے یونیورسٹی گئے' لیکن وہ یونیورسٹی پہنچی ہی نہیں تھی۔ کال کرنے پر انہیں فون بند ملا۔ اردگرد اس کی جانی پہچانی جگہوں سے دیکھ کر آنے کے بعد وہ دونوں واپس آ گئے۔ دن سے شام ہوئی اور شام سے رات ہو گئی' مگر وہ واپس نہیں آئی۔ ان کا خیال تھا کہ شاید وہ کچھ وقت اکیلا رہنا چاہتی ہے' لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا' ان کا خیال غلط ثابت ہو رہا تھا۔ جتنا اور جہاں جہاں جا کر اسے ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ وہ اسے ڈھونڈ آئے تھے' مگر وہ کہیں نہیں ملی۔ وہ اپنی مرضی سے گئی تھی۔ پولیس کو اطلاع دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ احد اور اس کے دوست الگ اپنی اپنی جگہ کوشش کر رہے تھے۔ احد بہت سی جگہوں پر گیا۔ اس کے کلاس فیلوز سے ملا۔ رات تک وہ جہاں جہاں جا سکتے تھے گئے' مگر وہ کہیں نہ ملی' نہ ہی اس کی کوئی خبر۔

"وہ نہیں آئے گی۔۔۔" تھک ہار کر انہوں نے اپنا اندیشہ ظاہر کیا۔ "اس نے خود کو اس گھر سے' ہم سب سے دور کر لیا ہے۔ اس نے خود کو چھپا لیا ہے۔۔۔ وہ نہیں آئے گی۔"

یونان اب اس کے لیے نیا اور انجانا نہیں تھا۔ وہ کہیں بھی جا سکتی تھی۔ کہاں۔۔۔؟ یہ انہیں معلوم نہیں تھا۔ صوفیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ مختلف طریقوں سے پاکستان بھی فون کر چکی تھیں' مگر وہاں بھی اس کا کوئی فون نہیں آیا تھا۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔ ان کے منہ میں کھانے کے نام پر ایک دانہ نہیں گیا تھا۔ ایک ہی وہم ستا رہا تھا کہ وہ اپنے ساتھ کچھ کر نہ لے۔

بہت کوشش اور انتظار کے بعد' ان کے اور منال کے درمیان کی برف پگھلنے لگی تھی۔ وہ ان سے بات کرنے لگی تھی' ان کی دی ہوئی چیزیں استعمال کرتی تھی۔ ان کے ساتھ لندن تک گئی تھی۔ آتے جاتے انہیں سلام کرتی تھی۔ کبھی کبھی آفس ڈراپ بھی کر دیتی تھی۔

ڈوریس کی طرح وہ ان کے گلے سے تو نہیں جھول جاتی تھی' لیکن زیادہ وقت تو نہیں رہ گیا تھا کہ وہ اپنی باہیں ان کے گلے میں حمائل کرتی اور کہتی۔۔۔

"پاپا! چلیں نا لنچ کے لیے چلتے ہیں۔۔۔"

ہر زخم کے مندمل ہونے کا ایک وقت ہوتا ہے۔
ان کے درمیان موجود خلا کو بھی اتنا ہی وقت چاہیے تھا۔ کون چاہتا ہے کہ ہم سے نفرت کی جائے۔ خاص کر والدین۔۔۔ جن کے لیے محبت اور احترام مخصوص ہے۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کی کامیاب زندگی ہمیشہ کے لیے بے کار ہو گئی ہے۔ ان کے لیے مرتبے اور خوشی کے معنی بدل گئے تھے۔
انہیں اب صرف منال چاہیے تھی۔۔۔
"پاپا۔۔۔!" ڈورس ان کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔
کل سے اب تک وہ ان کے پاس پچاس بار آئی تھی۔ انہوں نے اسے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔
وہ ان کے پاس بیٹھتی' انہیں مخاطب کرنے کی کوشش کرتی اور ان کے متوجہ نہ ہونے پر روتی ہوئی اٹھ جاتی۔
اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ان کی زندگی اس موڑ پر بھی آسکتی ہے کہ وہ اپنے باپ کے سامنے بیٹھی سسکتی رہے اور اس کا باپ ان سنی کردے۔ آنکھ اٹھا کر اسے دیکھے بھی نہ۔ منال نے آکر سب کچھ برباد کر دیا تھا۔ بدلے میں اس نے بھی ایسا ہی کیا اور اب وہ اس بوجھ کو اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھی جو انجام کی صورت اس کے نام کیا جا رہا تھا۔ وہ منال کے رونے اور واویلا کرنے پر محظوظ ہوئی تھی' لیکن باپ کے رویے نے یک دم غیر محفوظ کر دیا۔
وہ صرف اس کے پاپا ہی نہیں تھے' ان کا دل منال کے لیے بھی اتنا ہی دھڑکتا تھا جتنا اس کے لیے۔ پاپا سے متعلق اس کی باتیں' دعوے' فخر' غرور سب ختم ہو گیا تھا۔

"مجھے معاف کردیں پلیز۔۔۔"
ایک بار پھر وہ ان کے پاس آئی۔ اس نے ان کے گھٹنوں پر اپنا سر رکھا۔ مسلسل رونے سے اس کی آواز بیٹھ چکی تھی۔
"آپ پلیز مجھ سے بات کریں۔" اسے وہیں چھوڑ کر سکندر احمد اٹھ گئے۔
"پاپا۔۔۔" وہ ان کے پیچھے لپکی' مگر انہوں نے کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ باہر کھڑے کھڑے وہ پھر سے ان سے معافی مانگنے لگی' مگر انہوں نے دروازہ نہیں کھولا۔ یہ دروازہ ڈورس نے خود اپنے لیے بند کیا تھا۔
"انہیں پریشان نہ کرو ڈورس! وہ بہت اپ سیٹ ہیں۔ انہیں آرام کی ضرورت ہے۔" صوفیہ نے کہا۔
"نہیں! مجھے پاپا سے بات کرنی ہے۔" اس نے ہٹ دھرمی سے کہا۔
"تم دیکھ رہی ہو کہ منال گھر چھوڑ کر جا چکی ہے۔ ہم کتنے پریشان ہیں اس کے لیے۔"
"وہ واپس آجائے گی۔"
"جب وہ آجائے گی' تب تمہارے پاپا بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔"
"آپ دیکھ رہی ہیں کہ میں کتنی ڈسٹرب ہوں۔"
"نہیں ڈورس! تم ان سے زیادہ دکھی نہیں ہو۔ تم ان کا دکھ نہیں سمجھ سکتیں۔ اسی لیے تم نے یہ سب کیا۔"
آنکھیں موند کر وہ لاؤنج کے صوفے پر لیٹ گئی۔
جب سے منال اس گھر سے گئی تھی' اس گھر کے کسی شخص کو نیند نصیب نہیں ہوئی تھی۔ جب منال یہاں آئی تھی۔ تب بھی اس کا سب کچھ چھین لینا چاہتی تھی' اب وہ جا چکی تھی تو بھی سب کچھ اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ وہ پاپا سے اس کی محبت بانٹنے آئی تھی اور بالآخر ساری ہی محبت اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ وہ جیت گئی تھی' ہاری ہوئی ڈورس اپنے باپ کی راہ میں نظریں بچھائے بیٹھی تھی۔
احد' صوفیہ اور سکندر احمد صرف منال کو ڈھونڈنے میں مصروف تھے۔ سارا وقت گاڑی لیے وہ مختلف جگہوں پر جاتے۔ وہ لاپتا یا گم نہیں ہوئی تھی جو وہ کسی ادارے کی مدد لیتے۔ وہ ان کے سامنے ان کے گھر سے چلی گئی تھی۔ اس نے گھر چھوڑ دیا تھا۔ وہ پاکستان میں بھی نہیں تھی۔ وہ وہاں سے بھی پوچھ چکے تھے۔ اسے ڈھونڈنے کے بعد تھک ہار کر سب واپس آجاتے۔ گھر گھر نہیں رہا تھا۔ ڈورس بیمار تھی' لیکن سکندر احمد کو پروا نہیں تھی کہ وہ کتنی بیمار ہے۔ وہ رو رہی ہے تو کیوں؟

وہ دکھی ہے تو کس کے لیے۔

''آپ تو کہتے تھے کہ آپ مجھ سے countless (بے انتہا) محبت کرتے ہیں۔ اس محبت کے لیے آپ مجھے ایک بار معاف نہیں کرسکتے۔''

''میں نے تم سے اتنی محبت کی' تم نے میرے لیے کیا کیا؟ میں نے تم سے صرف ایک چیز مانگی' ایک بار کہا کہ تم اسے تسلیم کرلو۔ وہ میری بیٹی ہے اور تمہاری بہن ہے۔ بس اتنا ہی....''

''میں نے اسے آپ کی بیٹی مان لیا تھا پاپا!''

''لیکن اسے اپنی بہن نہیں سمجھا تھا۔''

''اس نے بھی مجھے اپنی بہن نہیں سمجھا تھا۔''

''تم میں اور اس میں فرق تھا۔ وہ ایک برے وقت کو بری طرح گزار کر آئی تھی۔ اسے میرے نہ ہونے کا دکھ رہا تھا۔ اسی لیے تم سے کہا تھا کہ تمہیں بہت کچھ نظر انداز کرنا ہوگا۔ کیا تم نے نظر انداز کیا؟ ایک بار اسے معاف کیا؟ اس نے تمہیں نہیں مجھے پریشان کیا تھا۔ کیونکہ تمہیں پریشان دیکھ کر میں پریشان ہوجاتا تھا۔ اس نے تمہاری نہیں میری چیزیں توڑی تھیں کیونکہ وہ میں نے تمہیں لاکر دی تھیں۔ وہ تم سے نہیں مجھ سے بدلہ لے رہی تھی کہ میں نے اپنی ساری محبت صرف ایک بیٹی کو کیوں دے دی۔ میں نے پلٹ کر دوسری بیٹی کی خبر کیوں نہیں لی۔ میں نے تم سے محبت کی انتہا کردی اور تم نے اس سے نفرت کی....

وہ جہاں جہاں تمہیں نقصان پہنچاتی رہی' میں وہاں وہاں اس کی تلافی کرتا رہا' مگر جو کچھ تم نے کیا اس کی تلافی کیسے ہوگی۔ تم نے اپنے دوست کے ذریعے اس کا دل توڑا۔ اب میں اس کا ٹوٹا دل کیسے جوڑوں....

میں نے تمہاری تربیت کی' تم میرے زیر سایہ پلی بڑھیں۔ میں نے تمہیں ایسی نفرت کا سبق کب دیا؟ تمہارے لیے چیزیں خریدتے خریدتے میں نے تمہیں بھی ایک چیز ہی بنا دیا ہے۔ میری بیٹی ہوتیں تو میرے دل کے ساتھ تمہارا دل دھڑکتا۔ میری تکلیف' تمہیں اپنی تکلیف لگتی.... تمہیں میرا احساس نہیں ہے.... تم وہ سب کرو جو تمہارا دل چاہتا ہے۔''

''آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں نے آپ سے محبت نہیں کی۔ آپ ایسا نہیں کہہ سکتے۔''

''تم نے جو پایا وہی لوٹا دیا۔ میری محبت کے جواب میں اپنی محبت۔ تم نے میری آغوش میں آنکھ کھولی۔ مجھے ہر وقت اپنے ساتھ پایا۔ تمہاری آنکھ کو آنسو نصیب ہی نہیں ہوا۔ تمہیں اپنے باپ سے محبت ہی کرنی تھی۔ سوچو اس بچی کے بارے میں جس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ پھر بھی اسے ساری دنیا میں صرف ایک چیز چاہیے تھی.... ''میں''.... میرا پیار' کسی قسم کی آسائش .... میں نے اسے کچھ نہیں دیا تھا' پھر بھی وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔ تمہیں سب کچھ دیا اور پھر بھی تم میری محبت کا حق ادا نہیں کرسکیں۔ تم اس سے بڑی تھیں' تمہیں اپنے بڑے ہونے کا ثبوت دینا تھا' لیکن تم نے اپنے چھوٹے ہونے کا ثبوت دیا۔ تم نے اسے ہار جیت کا میزان کیوں بنایا۔ تم نے یہ سوچا ہی کیوں کہ تمہیں اسے ہرانا ہے۔ تم نے اس پر ظلم کیا۔ حقیقتاً'' مجھ پر.... اس کی ٹوٹی پھوٹی حالت نے مجھے توڑ دیا ہے۔ وہ اتنا روئی ہے کہ میں ساری زندگی اس کے وہ آنسو صاف نہیں کرپاؤں گا۔''

''اگر تمہاری شرمندگی اسے واپس لاسکتی ہے تو جاؤ۔ اسے واپس لاؤ۔ مجھے اب صرف وہ چاہیے۔'' وہ رنجیدہ ہوگئے۔

''تم تو ڈورس ہو' سمندر کی دیوی' صاف پانی۔ پھر تم نے اتنا گھٹیا کام کیوں کیا؟ تم نے اپنے ساتھ اس کا مقابلہ کیوں کیا؟ میں اس کا ماضی نہیں بدل سکتا تھا۔ تم مجھے اس کا حال تو بدلنے دیتیں.... تم نے منال کے معاملے میں میری بیٹی ہونے کا نہیں ڈورس ہونے کا ثبوت دیا۔ جو کسی کو معاف نہیں کرتی۔ میں نے ہی تمہیں ایسا بنا دیا اور سزا بھی میں نے پالی۔

✡ ✡ ✡

اسپتالوں میں ایمرجنسی اور دوسرے حادثات کی

پڑتال کرتے کرتے ان کی عجیب کیفیت تھی۔ ان کے دل سے دعا نکلتی تھی کہ وہ اتنی بے وقوف نہ ہو کہ اپنی زندگی کے ساتھ کچھ کر چکی ہو۔ ان کی ساری خواہشیں بس اس ایک خواہش میں بدل گئی تھیں کہ وہ انہیں کسی پارک میں کھیلتی ہوئی ملے یا کسی ہوٹل سے کھانا کھا کر نکلتی ہوئی یا کسی دوست کے ساتھ نظر آجائے۔ ورنہ جب وہ گھر جائیں تو انہیں معلوم ہو کہ وہ تو کب سے واپس آکر نہا کر کھانا کھا کر سو بھی گئی ہے۔

کوئی خواہش پوری ہوئی نہ ہی کوئی وہم یقین میں بدلا۔ وہ گم ہو چکی تھی۔ وہ واپس ملنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"وہ نہیں ملے گی۔" سیٹ کی پشت سے سر لگائے وہ بے جان ہو رہے تھے۔

"مل جائے گی ہماری بیٹی، جائے گی کہاں۔ آپ جانتے ہیں وہ ایسے ہی تنگ کرتی ہے۔ ناراض ہے۔ ناراضی ختم ہوتے ہی آجائے گی۔"

صوفیہ تسلی دیتی تھی، آثار بتا رہے تھے جیسے وہ اس شہر اور ملک میں ہی کہیں نہیں ہے۔ پریشانی نے سکندر احمد کو لاغر اور کمزور کر دیا تھا۔ ان کی شاندار پرسنالٹی گہنا گئی تھی۔

انس اور اسد بھی آچکے تھے۔ اس نے اسد سے بھی رابطہ نہیں کیا تھا۔ گھر میں خاموشی کا راج تھا۔

اس ملک میں وہ کہاں جا سکتی ہے۔ یہ سوچ کر وہ ہر اس جگہ پر جا چکے تھے جہاں جا سکتے تھے اور جہاں وہ جا سکتی تھی۔ سکندر احمد نے آفس جانا چھوڑ دیا تھا۔ انہیں آفس سمیت کسی چیز میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔ مجبوراً انس اور صوفیہ کو آفس جانا پڑتا تھا۔ ڈورس صبح سے نکلتی اور رات گئے واپس آتی۔ سکندر احمد کے لیے وہ ابھی بھی گھر میں نہ ہونے کے برابر تھی۔

ڈورس ان کے لیے اپنی جان بھی دے دیتی اگر جان دینے سے منال مل جاتی۔ وہ اس کی بیٹی گئی۔ ہر اس شخص سے ملی جس سے وہ ملتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ ان لوگوں سے بھی مل آئی جن کا اس نے کام کیا تھا اور ان لوگوں سے بھی جن کے حوالے سے اسے کام دیا گیا تھا مگر وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ وہ اس شہر کو جانتی تھی اگر وہ کہیں چھپ کر رہتی تو وہ اسے نہیں ڈھونڈ سکتے تھے۔

☆ ☆ ☆

جس وقت وہ گلی میں داخل ہوئی دوپہر کا کھلا کھلا وقت تھا۔ گلی میں کافی سے زیادہ رونق تھی۔ جو اس کے لیے نئی تھی۔ گھروں کے سامنے، دروازوں میں اندر باہر کافی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ جیسے جیسے وہ گھر کی طرف فاصلہ طے کرتی جا رہی تھی، ویسے ویسے دروازوں، کھڑکیوں میں لوگوں کا اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو اس کی طرف متوجہ کر رہے تھے۔

اس نے بلیو جینز پر سفید شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ وہ سادہ حلیے میں آئی تھی اور سادہ ہی لگ رہی تھی لیکن ہر نظر اسے اوپر سے نیچے تک دیکھ رہی تھی۔ اونچی نیچی گلی میں اسے چلنے میں دشواری کا سامنا تھا، پھر لوگوں کا ایسے دیکھنا اسے خائف کر رہا تھا۔ وہ شرمندہ بھی ہو رہی تھی اور ڈر بھی رہی تھی۔

کیا یہ سب لوگ بھی اس سے حساب لیں گے کہ منال کہاں ہے؟

جس وقت وہ گھر میں داخل ہوئی سب گھر کے چھوٹے سے صحن میں چارپائی اور موڑھوں پر بیٹھے تھے۔ ان کے اندر داخل ہوتے ہی سب چونک کر کھڑے ہو گئے۔ اسد پہلے داخل ہوا تھا۔

"اسد! تم یہاں؟" سب ایک ساتھ چلائے۔

"السلام علیکم مامی جی!"

"وعلیکم السلام! بتایا کیوں نہیں اپنے آنے کا؟ بھئی ہمیں بھی موقع دیتے کہ ہم بھی کسی کو ایئرپورٹ لینے جاتے۔"

"سوچا، سرپرائز دوں۔"

اسد سے مل کر سب اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ سر ہلا کر سب کو سلام کر رہی تھی۔

"یہ ڈورس آپی ہیں۔"

اسد نے سب سے اس کا تعارف کروایا۔ ماموں بھی بھاگم بھاگ آفس سے آچکے تھے۔

"میری منال نہیں آئی؟" مامی پوچھ رہی تھیں۔ پوچھ تو باری باری سب ہی رہے تھے۔

"اس کے ایگزام ہیں۔" اسد نے نظریں چرائیں۔ وہ اچانک آئے تھے۔ کسی کو بھی خبر کیے بغیر۔ ان سب کو یقین تھا کہ وہ پاکستان میں ہی ہے اور ظاہر ہے اس نے انہیں بتانے سے منع کیا ہوگا۔ اسی لیے وہ فون پر لاعلمی ظاہر کرتے رہے۔ سکندر اور صوفیہ خود آنا چاہتے تھے، مگر سکندر احمد کی دن بدن بگڑتی صحت انہیں سفر کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔

ڈورس نے خود آنے کا فیصلہ کیا اور اسد کے ساتھ آگئی۔ اس نے منال کو گھر سے نکالا تھا، اب اسے ہی اسے واپس لانا تھا۔ مامی اور سب کے سوالوں نے اسے بہت مایوس کردیا۔ وہ سب لوگ اشتیاق سے اس کا پوچھ رہے تھے۔ وہ واقعی یہاں نہیں تھی یا وہ سب اچھے اداکار تھے۔ ڈورس کی امید ٹوٹ گئی۔ اسے یقین تھا کہ وہ یہاں ضرور ملے گی۔ سکندر احمد کی صحت دن بدن خراب ہورہی تھی۔ انہیں منال چاہیے تھی اور اسے لینے کے لیے اب ڈورس دنیا کے ہر کونے میں جانے کے لیے تیار تھی۔

باقی رشتے داروں میں بھی اسد نے تسلی کرلی تھی، لیکن وہ یہاں تھی ہی نہیں۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ انہیں دیکھتے ہی چھپ جاتی۔

"یہ دیکھیے... یہ منال کا گھر ہے۔" حفصہ اور نادیہ اسے اگلے دن اوپر لے کر آئیں۔

"اس کے جانے کے بعد پاپا نے سب کچھ ایسے ہی رہنے دیا... پاپا کہہ رہے تھے جب جب وہ پاکستان ہم سے ملنے آیا کرے گی یہاں اپنے گھر میں ہی رہے گی۔"

ڈورس نے دونوں کمروں کو اندر باہر سے دیکھا۔ گھر کی ایک ایک اینٹ بتا رہی تھی کہ یہاں اس کی زندگی کیسی گزری ہوگی۔ دو تنگ کمرے اور چند فٹ کا کچن۔ گھٹن سے ڈورس کا سانس اٹکنے لگا۔

"وہاں سب اتنے ہی خوب صورت ہوتے ہیں جتنی آپ ہیں؟" نادیہ نے اچانک پوچھا۔ جب سے وہ آئی تھی نادیہ اور حفصہ اس کے آگے پیچھے تھیں۔

"نہیں وہاں سب سے زیادہ بدصورت ہوں۔" اس نے کہا، لیکن نادیہ نے یقین نہیں کیا بلکہ وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی۔

"منال نے ٹھیک کہا تھا کہ ڈورس اتنی خوب صورت ہے کہ تم لوگ اسے دیکھتے ہی پاگل ہوجاؤ گے۔ سچی آپ تو واقعی پاگل کردیں۔"

"اور کیا کیا کہا تھا منال نے...؟" ڈورس کو تعجب ہوا۔ وہ اس کی باتیں کرتی تھی ان سب کے ساتھ...؟

"اس نے کہا تھا کہ آپ وہاں موجود لوگوں میں سب سے زیادہ خوب صورت ہیں۔"

اسے سن کے مایوسی ہوئی۔ وہی اس کے ظاہری حسن کے چرچے جس نے سب کچھ گہنا دیا تھا۔

دونوں مل کر اسے منال کے بچپن، اسکول اور شرارتوں کے قصے کہانیاں سناتی رہیں۔

"تم دونوں بہت پیار کرتی ہو نا منال سے؟" ان کی باتیں اسے بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ ماموں، مامی بھی کتنی بار اس کی باتیں یاد کرکے رو پڑے تھے۔

"بہت..." نادیہ نے محبت سے کہا۔ "مگر شاید آپ جتنا نہیں... آپ تو بہن ہیں نا اس کی اور اتنی خوب صورت بھی ہیں۔ منال بہت خوش قسمت ہے۔ ایسے ہی تو منال وہاں جاکر واپس نہیں آئی۔ ورنہ یہاں سے تو کہہ کر گئی تھی کہ کچھ عرصہ رہوں گی پھر واپس آجاؤں گی۔ دل لگ گیا تھا اس کا وہاں۔"

"ہاں، دل ہی لگ گیا تھا، ورنہ وہ لوٹ آتی۔ وہاں تھا ہی کیا جو اسے روک کر رکھتا۔" نادیہ اور حفصہ کی باتیں، اس کی تذلیل نہیں کررہی تھیں، بلکہ اسے اس کا اصل چہرہ دکھا رہی تھیں۔

دو دن وہاں رہ کر وہ واپس آگئے۔ وہاں رہنا بے کار تھا۔ ماموں کو الگ سے تاکید کرکے آئے تھے کہ اس کی کال آتے ہی ان سے رابطہ کیا جائے۔ صرف ماموں کو ہی انہیں تھوڑا بہت بتانا پڑا تھا۔ وہ انہیں زیادہ پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن بتائے بغیر کوئی حل بھی

نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

"منال نے گھر چھوڑ دیا ہے۔" اپنی طرف سے اس نے اسے اطلاع دی تھی' لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور مسلسل کانٹے سے تربوز کھاتا رہا۔

"منال نے گھر چھوڑ دیا ہے۔" اب کی بار اس نے تیز آواز میں کہا۔ جب کہ اسے اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ اس کی بات سن لی گئی ہے۔

"مجھے معلوم ہے۔" عجوم نے سردمہری سے اس کی طرف دیکھا۔ جیسے "تو.....؟"

وہ اس سے نظریں چرا گئی۔ "پلیز! اسے تلاش کرو۔ تم زیادہ وقت اس کے ساتھ رہتے تھے۔ میں کتنے دنوں سے تمہیں ڈھونڈ رہی ہوں۔ تم سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ نہ فون پر نہ گھر میں' نہ تم ملے۔ کہاں تھے تم.....؟"

"میں کیوں ڈھونڈوں اسے.....؟" اس کا لہجہ اور انداز کرخت تھے۔ سوال اس سے بڑھ کر چبھنے والا.....

"پاپا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"یہ تمہارا اور تمہارے پاپا کا مسئلہ ہے۔ میرا نہیں....."

ڈورس نے ہونٹ کاٹے۔ اس کی آنکھیں چھلکنے کے لیے تیار تھیں۔ اب وہ بات بات پر رونے لگتی تھی۔

"ہماری شادی کی بات کی تم نے اپنے گھر میں؟ اب میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔" عجوم نے بات بدلی۔

"منال گھر سے غائب ہے عجوم! اور تم شادی کی بات کر رہے ہو؟" ڈورس کو شدید حیرت ہوئی تھی۔

"منال کے ہماری شادی میں ہونے یا نہ ہونے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"لیکن میرے گھر والوں کو پڑتا ہے..... گھر میں بہت پریشانی چل رہی ہے عجوم!"

"پھر ہم سادگی سے شادی کر لیتے ہیں۔"

"فی الحال میں شادی نہیں کر سکتی۔ مجھے ابھی صرف منال کو تلاش کرنا ہے۔"

"منال اگر زندگی بھر نہیں ملے گی تو کیا ہماری شادی زندگی بھر نہیں ہو گی۔"

"ایسی باتیں تو نہ کرو عجوم!" اس نے گہرے دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔

"جو کچھ ہم نے اس کے ساتھ کیا ہے' عین ممکن ہے وہ اب زندگی بھر ہمیں نہ ملے....."

سب لفظ دم توڑ گئے..... ڈورس خاموش ہو گئی۔

"اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ شادی کر لیتے ہیں۔"

"تم یہ سب اس لیے کہہ رہے ہو نا کہ مجھے مزید احساس جرم میں مبتلا کر سکو.....؟" وہ رونے ہی تو والی تھی۔

"میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں۔ تمہیں جرم کا احساس دلانا خود کو جرم کا احساس دلانا بھی تو ہے۔ تم نے یہ کام اکیلے تو نہیں کیا....."

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں عجوم! میری مدد کرو۔ پلیز..... ہم دونوں مل کر اسے تلاش کر لیں گے۔ تم یونی میں اس کے ساتھ تھے۔ ہر جگہ اس کے ساتھ رہے ہو۔ تم معلوم کر سکتے ہو کہ وہ کہاں جا سکتی ہے۔ ملک سے باہر بھی وہ نہیں گئی۔ وہ اسی ملک میں ہے۔ مجھے اکیلا مت چھوڑو۔ میں یہ سزا اکیلی نہیں جھیل سکتی۔ میرے سب دوست میری مدد کر رہے ہیں۔ تم بھی کرو....."

عجوم نے اپنے کندھے پر موجود اس کا ہاتھ جھٹکا۔

"کوئی اور بات کرو....."

اور اٹھ کر میوزک پلیئر میں میوزک آن کر دیا۔ خاموش کمرے میں "کھڑی نیم کے نیچے....." کی آواز گونجنے لگی۔

☆ ☆ ☆

دن ہفتوں میں بدل گئے اور ہفتے مہینوں میں..... انس اور اسد اس کا انتظار کرتے کرتے واپس چلے گئے۔ ہر جانے والی رات اور آنے والا دن یہ بتا کر جاتا کہ وہ واپس نہیں آئی نہ ہی آئے گی۔

"آفس کے مسائل بڑھتے جا رہے ہیں۔ میں انہیں اب ہینڈل نہیں کر سکتی۔"

صوفیہ نے کوشش کی تھی کہ وہ آفس کے معاملات سے انہیں ڈسٹرب نہیں کریں گی، مگر ناکام رہیں۔ انہوں نے ہر طرح سے ان کی دل جوئی کی تھی۔ آفس کے ہر معاملے کو بھی آخری حد تک سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی تھیں، مگر اب انہیں سکندر احمد کو یہ سب بتانا ہی پڑا۔

"آپ صرف تھوڑی دیر کے لیے چلے جایا کریں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں گی۔ آپ کی وہاں موجودگی ضروری ہے۔" وہ چاہتی تھیں کہ وہ گھر سے باہر نکلیں۔ کام میں اپنا دل لگائیں۔

"میں نہیں جانا چاہتا۔" ہر بار کا ایک ہی انکار۔ ان کے چہرے پر بے چارگی چھا گئی۔

"آپ جانتے ہیں مجھے آپ سے زیادہ اور کچھ پیارا نہیں۔ مجھے کاروبار کے تباہ ہونے کی نہیں۔ آپ کی فکر ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ میں اس کے سب معاملات نہیں دیکھ سکتی اور مجھے ان معاملات کے لیے آپ کی ضرورت ہے، لیکن اب اگر آپ نہیں آنا چاہتے تو میں اصرار نہیں کروں گی۔ آپ کے آرام کے ساتھ میں چاہتی ہوں کہ آپ کا کام میں دل لگ جائے۔"

وہ اتنی اچھی تھیں کہ ہر بار حالات کے ساتھ انہیں ہی سمجھوتا کرنا پڑتا تھا اور وہ جی جان سے کرتی بھی تھیں۔ وہ ایک باہمت اور ہمدرد خاتون تھیں، مگر کچھ باتوں کے لیے ساری ہمت بھی کم ہی ہوتی ہے۔ اتنا پھیلا ہوا کاروبار۔ اس کے مسائل، گھر، سکندر احمد کی دیکھ بھال، یہ ان کی ہمت ہی تھی جو سب دیکھ رہی تھیں۔

سکندر احمد نے ان کی طرف دیکھا... ان کی شریک حیات تھک گئی تھی... وہ دیکھ سکتے تھے۔

"ٹھیک ہے... میں آؤں گا۔"

ہفتے میں ایک بار آنے کی کوشش کرتے کرتے وہ روز آنے لگے۔ کچھ وقت کے لیے ہی سہی، لیکن وہ آفس میں موجود تھے۔ ان دونوں کے ساتھ ڈورس بھی آفس آتی تھی۔ پہلے سکندر احمد اکیلے ہی اتنا کام کر لیتے تھے کہ وہی کام اب وہ تین دیکھ رہے تھے۔

اکثر ڈورس اپنا لنچ لے کر ان کے آفس آتی تو وہ اٹھ جاتے۔

"میں گھر جا رہا ہوں صوفیہ!" کہتے اور چلے جاتے۔

"آپ ایک بہترین انسان ہیں۔ اپنی گلٹ کو ختم کریں۔ آپ کو ناپسند کیا ہی نہیں جا سکتا۔ جو کچھ ہوا وہ حالات کی وجہ سے ہوا، جانتے بوجھتے آپ نے کچھ نہیں کیا۔ آپ نے اپنی پوری کوشش کی معاملات کو سلجھانے میں، لیکن بس سب کچھ ہوتا ہی چلا گیا۔" صوفیہ انہیں سمجھانے کی کوشش کرتیں۔

"مجھے سچا ثابت کر رہی ہو۔" انہیں یقین نہیں تھا ان کی باتوں پر۔

"آپ کو بتا رہی ہوں کہ آپ غلط انداز میں خود کو سرزنش کرتے ہیں۔"

"میری بیٹی گھر چھوڑ کر جا چکی ہے۔ میں کیا کروں..." بے بسی سے انہوں نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا لیا۔ "کاش میں اسے یہاں لایا ہی نہ ہوتا۔ اسے کہیں اور رکھ لیتا۔ اسے الگ گھر لے دیتا، مگر میری خواہش تھی کہ میری ایک ہی فیملی ہو اور ایک ہی جگہ، ایک ہی گھر میں ہو۔"

"آپ نے بالکل ٹھیک کیا۔ اسے اور ہم سب کو ایک ساتھ ہی رہنا ہے۔ وہ میری بھی بیٹی ہے۔ آپ ایسے... نہ اس کے لیے نہ ہی اپنے لیے سوچیں۔ میں نے ہمیشہ آپ کو ضرورت سے زیادہ جذباتی ہونے سے روکا، منع کیا، آپ کی محبت کی انتہا نے ڈورس کو ایسا بنا دیا۔ مجھے کبھی بھی آپ کی ڈورس سے محبت پر اعتراض نہیں رہا... انداز محبت پر رہا ہے۔ آپ کی ہی محبت میں اس نے خود کو حال سے بے حال کر لیا ہے۔ آپ کی لاتعلقی نے اسے پاگل کر دیا ہے۔ وہ رات دن اسے ہر جگہ ڈھونڈ رہی ہے۔ وہاں بھی جہاں منال ہو ہی نہیں سکتی۔ آپ جو کبھی اس سے ناراض نہیں ہوئے تھے اب آپ نے اس کی طرف دیکھنا، اس سے بات کرنا ہی

چھوڑ دیا ہے۔ محبت ایسے ہی موقعوں پر آزمائی جاتی ہے کہ جب نفرت بڑھنے لگے تو محبت بڑھ کر نفرت کو محبت میں بدل دے۔ کچھ بھی ہو سکندر! ماضی میں تبدیلی کا وقت گزر چکا ہے۔ تبدیلی حال میں ہی کی جاسکتی ہے۔ ماضی کے لیے صرف رویا جاسکتا ہے یا اسے بھلایا جاسکتا ہے۔"

☆ ☆ ☆

"کھڑی نیم کے نیچے ہوں تھاں ہیکلی
جا تڑوواٹا رومناں جھانی مانی دیکھ لے"

"منال سینٹ سے شادی کر رہی ہے۔" عجوم نے بلا کی سنجیدگی سے ڈورس کو اطلاع دی۔

"کیا...؟ کہاں ہے منال...؟ تمہیں پتا چلا اس کا...؟ بتاؤ جلدی..."

"مجھے صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ وہ دونوں شادی کر رہے ہیں۔"

"سینٹ سے... ناممکن... وہ کیوں کرے گی اس سے شادی۔" ڈورس سینٹ سے ملی نہیں تھی، لیکن عجوم کے ذریعے سے اسے جانتی تھی۔

"مذاق کر رہے ہو ناں...؟" اسے یقین آتا بھی کیوں۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا یہ سب...؟"

وہ اسی طرح خاموشی سے بیٹھا اس کے سوال سن رہا تھا۔

"میرے ایک فرینڈ نے اسے ایک ایشین لڑکی کے ساتھ دیکھا ہے۔ میں نے اسے منال کی تصویر دکھائی تو اس نے تصدیق کردی کہ یہ وہی لڑکی ہے جسے اس نے سینٹ کے ساتھ دیکھا تھا۔"

"تم سینٹ سے ملے...؟"

"نہیں..." عجوم نے گہری سانس لی۔ "اس نے اپنا گھر بدل لیا ہے۔ مجھے بس اتنی ہی معلومات ملی ہیں۔ اس سے رابطہ ہی نہیں ہو رہا ہے۔ آئے دن وہ اپنے ٹھکانے بدلتا رہتا ہے۔ کئی شہر بدل چکا ہے۔ معلوم نہیں وہ یہاں ایتھنز میں ہے بھی کہ نہیں۔ اسے ایک جگہ سکون نہیں ملتا۔ پتا نہیں وہ ملتا ہے یا نہیں۔"

"کوشش کرو عجوم! پلیز... وہ ایسا کیسے کر سکتی ہے۔"

"ہاں... وہ ایسا کیسے کر سکتی ہے۔" اس نے ڈورس سے کہا تھا یا خود سے پوچھا تھا۔ اس کے لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ ڈورس چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

جھر مر جھر مر مینہ برسے۔ بھنوری لولا گائے
مورپپیا میٹھا بولے کوئل شور مچائے
اوتھاں ناں پوچھاں جھیل بھانوریا ہیکلی
جا تڑوواٹا رومناں جھانی مانی دیکھ لے

"مناں ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں سوچ سکتی...؟" عجوم نے استہزائیہ لہجے میں پوچھا۔ "کیا وہ تم سے پوچھ کر شادی کرے گی یا مجھ سے...؟"

"مجھے نہیں معلوم..." اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "لیکن اسے یہ شادی نہیں کرنا چاہیے..."

عجوم نے خاموش نظروں سے ڈورس کو دیکھا...

اونٹھے چڑھیو اونٹھروانی رڑیو رڑیو جائے
سانسری مورا جھیل بھانوریو باسادریو جائے
جا تڑوواٹا رومناں جھانی مانی دیکھ لے

"اور تم یہ کیا ہر وقت عجیب سا گانا سنتے رہتے ہو عجوم! ایک تو آگے ہی میں بہت سیڈ ہوں اوپر سے یہ سیڈ سا سونگ..."

ڈورس نے کہا اور آگے بڑھ کر میوزک پلیئر آف کردیا۔

"کھڑی نیم کے نیچے..." آگے کے الفاظ بند ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

"مناں کہاں ہے...؟" بہت کوششوں سے اس کا پتا کرنے کے بعد انہوں نے اسے ایک لائبریری میں پکڑ لیا تھا۔

"من... آل...؟" اس نے کھانے کا آرڈر آرام سے دینے کے بعد پوچھا اور مناں کا نام بالکل اسی طرح

لیا جس طرح پہلی بار لیا تھا۔ "مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"جھوٹ مت بولو۔ تم جانتے ہو کہ وہ کہاں ہے۔"

"میں کیوں جانوں گا۔ وہ میرے ساتھ رابطے میں نہیں ہے۔"

"وہ تمہارے ساتھ رابطے میں نہیں ہوگی، مگر تمہارے ساتھ ضرور ہوگی۔" عجوم چبا چبا کر بولا۔

"بہت سے لوگوں نے اسے تمہارے ساتھ دیکھا ہے۔ اس شہر کو وہ جتنا بھی جانتی ہو، مگر ایسے گم نہیں ہو سکتی۔ اس کی مدد یقیناً" تم نے کی ہے۔"

سینٹ مزے سے سلاد کھاتا رہا۔ اس کی وضع قطع میں بڑی تبدیلی آئی تھی۔ اس کے عجیب و غریب حلیے کو انسانوں والا حلیہ مل گیا تھا۔ اس کے گنجے سر پر بال آ گئے تھے اور انسانوں کی طرح ہی بنے ہوئے تھے۔

"بتاؤ سینٹ وہ کہاں ہے؟" ڈورس نے بے چینی سے پوچھا۔

"تم کون ہو۔ تم نے اپنا تعارف نہیں کروایا۔" سینٹ کے لہجے میں کچھ تھا۔ ڈورس اس کے سوال سے جیسے سہم سی گئی۔

"میں ڈورس ہوں۔ منال کی۔ بہن۔"

"بہن۔؟ اچھا؟ حیرت ہے۔"

"کیوں۔" وہ یہ سوال نہ پوچھتی اگر سینٹ کا لہجہ اتنا بے رحم نہ ہوتا۔

"کیونکہ بہت عجیب لگ رہا ہے کہ ایک بہن اپنی بہن کے بارے میں ایک اجنبی سے پوچھ رہی ہے کہ وہ اسے اس کی بہن کے بارے میں بتا دے۔ بہن کو تو خود معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی بہن کہاں ہے۔"

"وہ ناراض ہو کر گئی ہے۔" ڈورس کی آواز کمزور پڑ گئی۔

"کس سے؟"

"ہم سب سے؟"

"ہم سب کون؟"

"مجھ سے اور پاپا سے؟"

"اسے ناراض ہی رہنے دو، کیوں ڈھونڈ رہے ہو؟" وہ طنز سے ہنس دیا۔

"پلیز، مجھے بتاؤ سینٹ کہ وہ کہاں ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔" ایک ہی جواب۔ ایک ہی انداز۔

"غلطی میری تھی، میں اس سے معافی مانگ لوں گی۔"

"یہ تم لوگوں کا فیملی ایشو لگتا ہے۔ میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"تم اس سے شادی کر رہے ہو؟" عجوم نے اپنی طرف سے اس پر یہ انکشاف کیا کہ وہ جانتا ہے وہ کیا کر رہا ہے۔ سینٹ نے شانے اور سر کو ہلایا، جیسے اسے نہیں معلوم کہ وہ کیا پوچھ رہا ہے۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو۔ تم مجھ پر شک کر رہے ہو؟"

"شک ہے یا حقیقت۔ تم بتاؤ۔"

"حقیقت۔؟ تم نے ایسا سوچا بھی کیسے۔؟"

"اس سے شادی کرنے کے لیے تم نے خود کو بدلا ہے نا؟ دیکھو خود کو۔"

"صبح ہی دیکھ کر نکلا تھا۔ اوہ مین۔" سینٹ دیر تک ہنستا رہا۔

"تم ہمیں بتانا ہی نہیں چاہتے۔ تم بات کو گھما رہے ہو۔ تم اس سے شادی کر رہے ہو۔ تمہیں وہ اچھی لگتی تھی۔ تم نے مجھے خود بتایا تھا کہ وہ تمہیں اچھی لگتی ہے۔"

"وہ مجھے اچھی نہیں، بہت اچھی لگتی ہے۔ تو۔؟" وہ ساتھ ساتھ کھا رہا تھا۔ "کیا اچھے لوگ اچھے نہیں لگتے۔؟ اور رہا شادی کا تعلق تو عجوم۔!" اس نے دونوں کی طرف باری باری دیکھا۔ "جب اچھا بننے والے لوگ اچھے لوگوں کی قدر نہ کریں تو ان بے چاروں کو برے لوگوں کی ہی ضرورت پڑتی ہے اور میں اس کی قدر کرتا ہوں۔ میں برا ہوں یا اچھا ہوں۔ میں نہیں جانتا، لیکن وہ اچھی ہے۔ مجھے اتنا معلوم ہے۔"

اس کے انداز کا ہر تاثر یہ بتا رہا تھا کہ وہ اگر جانتا بھی ہے تو بتائے گا نہیں۔ ڈورس بے انتہا مایوس ہو گئی۔ عام حالات میں ایسے کورے جواب پر وہ اس کا سر پھاڑ سکتی تھی، مگر اب اسے برداشت ہی کرنا پڑا۔

"ایسے الٹے سیدھے سوالوں کے لیے مجھے دوبارہ لنچ آفر مت کرنا۔ اچھے کھانے کے ساتھ مجھے اچھی گفتگو چاہیے ہوتی ہے ورنہ خاموشی بھی کم لذیذ نہیں ہوتی۔" سینٹ نے ہاتھ نیپکن سے صاف کیے.... یعنی وہ جا رہا تھا۔

"میں درخواست کرتا ہوں کہ تم اس کے بارے میں بتا دو۔ اس کے گھر والے بہت پریشان ہیں۔"

"اور تم...؟ تم نہیں ہو پریشان...؟" سینٹ نے براہ راست اس سے پوچھا۔

"نہیں...." عجوم نے ڈورس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"تو پھر یہاں کیا کر رہے ہو....؟" اس نے الٹا سوال کیا۔

"یعنی تمہیں معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے۔" ڈورس پھر بولی۔ جب کہ ڈورس کو اندازہ بھی تھا کہ وہ اس کے سوالوں کے جواب نہیں دے رہا سوائے اس کی بے عزتی کرنے کے.... وہ بھی بہت طریقے سے....

"میں تمہارے کسی بھی سوال کے جواب دینے کا پابند نہیں ہوں مس ڈورس! میں اس کا پتا رکھنے کا پابند ہوں نہ ہی اس سے رابطے کا۔ اگر تمہیں وہ چاہیے تو تم اسے خود تلاش کرو کیونکہ میرا خیال ہے، جو گم کرتا ہے اسے ہی ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ دنیا کا دستور ہے اور اس دستور کو بدلنے کا میرا فی الحال کوئی ارادہ نہیں۔ تمہارے گھر والے پریشان ہیں، خدا ان کی پریشانی دور کرے۔ میں ہمدردی کر سکتا ہوں، مگر کوئی مدد نہیں۔ اگر مدد کر سکتا تو ضرور کرتا کیونکہ میرے برے حالات میں عجوم نے میرا اسٹوڈنٹ بن کر مجھ سے ہمدردی کی تھی۔"

"میں اتنا جانتا ہوں سینٹ! کہ تم جانتے ہو کہ وہ کہاں ہے۔ میرا اندازہ غلط نہیں ہو سکتا۔"

"اندازہ...؟" وہ دل کھول کر ہنسا۔ "تم اندازے ہی لگا سکتے ہو۔ تم یقین کرنا کب سیکھو گے؟"

"طنز کر رہے ہو...؟"

"حقیقت بتا رہا ہوں۔ برا لگا تو معذرت کرتا ہوں۔ میرا کوئی ذاتی مسئلہ نہیں ہے تمہارے ساتھ۔ مجھے جانے دو...."

"یہ جانتا ہے، نہ صرف جانتا ہے بلکہ سب حالات سے بھی واقف ہے یا شادی کر چکا ہے یا کرنے والا ہے۔"

اس کے جاتے ہی عجوم نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ اس کے خیال کے سنتے ہی ڈورس کا دل ڈوبنے لگا۔

☼ ☼ ☼

دو گھنٹے کی ڈرائیو کر کے وہ یہاں آئی تھی۔ شہر کے مرکز سے دور دراز یہاں کسی کا گھر تھا۔ ڈورس کے کچھ رابطوں سے اطلاع ملی تھی منال کی۔ ہر بار وہ ایسی اطلاع پر جاتی تھی تو پتا چلتا تھا کہ وہ منال کے بیچ کا اسٹوڈنٹ ضرور ہے، مگر منال نہیں۔

اس بار بھی اسے یہی اطلاع دی گئی تھی کہ اسی بیچ کا ایک اسٹوڈنٹ اس گھر میں کام کر رہا ہے۔ جس گھر کے باہر وہ کھڑی تھی۔ وہ اسٹوڈنٹ منال بھی ہو سکتی تھی اور کوئی اور بھی۔ ڈورس موہوم سے شک کے ساتھ آگئی تھی۔

وہ چھوٹی سے چھوٹی بے معنی اطلاع پر بھی دوڑ پڑتی تھی۔ اس کے بارے میں جھوٹی اطلاع بھی اس کے لیے سچی تھی۔ وہ کسی بھی خاص اور عام خبر کو جانے نہیں دیتی تھی۔ گھر میں رہائش نہیں تھی کسی کی۔ گھر خالی تھا۔ ایک دو جگہ مرمت کا کام ہو رہا تھا۔ جس شخص کے ریفرنس سے وہ آئی تھی اس شخص کا حوالہ جان کر مالک مکان نے اسے پچھلی طرف کھلنے والے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ وہاں ہے' ڈرائنگ روم میں...."

وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ کون ہے لڑکا یا لڑکی اور یہ کہ وہ کیسی ہے، لیکن ان سب میں بھی اس نے وقت

ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔
ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولتے ہی اسے لڑکی کی پشت دکھائی دی۔۔۔ پیڈ اور پن ہاتھ میں لیے۔ کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔ وہ لڑکی منال نہیں تھی۔ ڈرائنگ روم میں اکا دکا فرنیچر کا سامان رکھا تھا۔ اس کی یہ امید بھی ٹوٹ گئی۔ اسے پہلے بھی کم ہی امید تھی، مگر پھر بھی اسے بہت دکھ ہوا۔ ہر بار ایسی ہی مایوسی پر اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔ اتنے عرصے سے وہ اسے مسلسل ڈھونڈ رہی تھی۔ اتنا عرصہ اس نے ایک ان چاہی بیٹی بن کر گزارا تھا۔ اس کے گم ہو جانے کا احساس اس کے لیے عذاب بن چکا تھا۔ وہ معافی مانگتی بھی تو کس سے۔۔۔ جس نے معاف کرنا تھا وہ گم تھی۔
ایک سال سے منال نہیں ملی تھی تو پاپا بھی نہیں ملے تھے۔ ڈورس بھی تو کھو گئی تھی۔۔۔
ست روی سے چلتی وہ دروازے سے ہی پلٹ کر گھر سے باہر آ گئی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کار یہیں چھوڑ کر خود ٹیوب میں چلی جائے۔ اس میں ڈرائیونگ کرنے کی ہمت تھی اور نہ ہی طاقت۔ کار میں بیٹھتے بیٹھتے ہی وہ فیصلہ کرنے لگی کہ کیا کرے اور کیا نہیں۔
وہی لڑکی جسے وہ ڈرائنگ روم میں دیکھ کر آئی تھی اور جس کے دھوکے میں وہ یہاں آئی تھی۔۔۔ باہر آئی۔ باہر کمپنی کی وین کھڑی تھی۔ پینٹ کمپنی کی مخصوص وین۔ اسی کمپنی کے لیبل کی اس نے شرٹ اور کیپ پہن رکھی تھی۔ کچھ دیر تک وہ اسے یوں ہی بے خیالی میں دیکھتی ہی رہی۔ ایک نئے خیال کے آتے ہی وہ کار سے نکل کر اس لڑکی کے پاس آئی اور روک کر اس سے پوچھنے لگی۔
"کیا تم انٹیریئر ڈیزائنر ہو۔۔۔؟"
"نہیں، میں تو اس کمپنی کی ورکر ہوں۔" اس نے سامنے کھڑی وین کی طرف اشارہ کیا۔
ڈورس تیزی سے چلتی اندر آئی۔ ایک بار پھر اس نے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا۔ پیڈ اور پن لیے منال اپنے کام میں مصروف تھی۔

پہلے جس وقت وہ کمرے میں آئی تھی تو دروازے سے ہی پلٹ گئی تھی۔ اگر وہ تھوڑا سا آگے چل کر دیکھ لیتی تو ڈرائنگ روم سے منسلک ڈائننگ روم میں وہ اسے کام کرتی نظر آ جاتی۔
منال کی اس کی طرف پشت تھی۔ وہ تیزی سے کچھ لکھ رہی تھی۔ پہلے تو اسے دیکھ کر وہ ہولے سے کانپ اٹھی۔ اسے لگا جیسے وہ خواب دیکھ رہی ہے۔ وہ واقعی میں اس کے سامنے کھڑی ہے یا یہ اس کی نظر کا دھوکا ہے۔ دروازے ہی میں وہ جامد کھڑی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے لپٹ جائے یا اس کے آگے ہاتھ جوڑے کہ وہ واپس گھر چلے۔
اس میں یہ دونوں کام کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ وہ اس سے خوف زدہ نہیں تھی، لیکن پھر بھی بہت تھی۔ سکندر احمد کی مستقل لاتعلقی نے اسے کہیں کا نہیں رہنے دیا تھا۔ وہ جان چکی تھی کہ کوئی کبھی بھی اس سے لاتعلق ہو کر اسے چھوڑ سکتا ہے۔
"چلو میرے ساتھ۔۔۔" پیچھے سے بے خبری میں جا کر پہلے اس نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ اسے سب سے زیادہ ڈر یہی تھا کہ وہ بھاگ جائے گی۔ اس کے لہجے میں تحکم تھا، التجا تھی، منت تھی۔
پہلے تو وہ بری طرح سے ڈر گئی۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ جھٹکے سے اس کی گرفت سے آزاد کر دیا۔
"کون ہو تم۔۔۔؟"
"ہم یہ سب باتیں کریں گے، لیکن پہلے گھر چلو۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑنے کے لیے اس کی طرف بڑھی۔ تاکہ اسے زبردستی لے جا کر کار میں بٹھا دے۔
"میں تمہیں جانتی ہی نہیں تو تمہارے ساتھ جاؤں کیوں۔۔۔؟" دو قدم پیچھے ہٹ کر اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ اس کا ہر انداز گواہی دے رہا تھا کہ وہ ڈورس کو نہیں جانتی۔ اس کی آنکھیں، اس کے لفظ، اس کا لہجہ۔۔۔
"تم مجھے جانتی ہو، مگر تم پہچاننا نہیں چاہتیں۔ ٹھیک ہے۔۔۔ تم مجھے مت پہچانو، یہ ضروری بھی نہیں ہے۔ تم صرف گھر چلو، پلیز میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ تم

تم یہاں وقت ضائع نہ کرو' تم نے اتنا عرصہ ہم سے دور رہ لیا ہے۔ اب اور کتنا دور رہنا ہے۔"

"میرا کوئی گھر نہیں ہے۔" وہی انداز۔

"تم جانتی ہو تمہارا گھر ہے۔ یہ وقت ان سب باتوں کا نہیں ہے' پلیز گھر چلو' تم اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ تمہارے بعد پاپا کا کیا حال ہو چکا ہے۔ اس گھر کا کیا حال ہے ہم اپنے ساتھ سب کی خوشیاں لے آئی ہو......"

"آج بھی سب کو اپنے برباد ہونے کی' اپنی خوشیوں کی فکر ہے اس گھر میں......" اس نے سیدھی چوٹ اس پر کی تھی۔

"آج بھی وہاں تمہارے گمشدگی کا سوگ منایا جا رہا ہے۔ کچھ میرے کمرے میں' کچھ پاپا کے کمرے میں' ہر رات سسکیاں گونجتی ہیں۔ آنسو بہائے جاتے ہیں۔"

منال نے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔ "اچھے ڈائیلاگ ہیں...... ماڈلنگ کے ساتھ ساتھ ایکٹنگ بھی کرنے لگی ہو؟"

"ضد چھوڑ دو منال! تم ناراض ہو اور تمہیں ہونا بھی چاہیے مگر مجھ سے' پاپا سے نہیں۔"

"کیوں؟ ضد کیا صرف ڈورس ہی کر سکتی ہے۔"

اس نے اس کا بھرپور مذاق اڑایا۔

"میں تمہارے سامنے کھڑی ہوں۔ تمہیں جو کہنا ہے مجھے کہہ لو' جو کرنا ہے کر لو لیکن میرے ساتھ پاپا کے پاس چلو' تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم سب پاگل ہو چکے ہیں۔"

"وہ میرے کچھ نہیں لگتے' میں نے ان کی بسائی دنیا چھوڑ دی ہے۔ تم نے ہی کہا تھا ناں کہ وہ صرف تمہارے پاپا ہیں۔ صرف تمہارا گھر' اور یہ بھی کہ میں وہ گھر خود چھوڑ کر جاؤں گی...... میں نے وہ گھر چھوڑ دیا ہے۔ میں تم سے ہار گئی ہوں اور میں نے اپنی شکست بھی تسلیم کر لی ہے۔"

"میں نے کہا تھا' غلط کہا تھا۔ نہیں کہنا چاہیے تھا' تمہاری ہر سزا مجھے منظور ہے۔ میں سب کچھ مانتی ہوں لیکن صرف پاپا کے لیے۔ وہ نفرت کرتے ہیں مجھ سے انہیں صرف تم چاہیے ہو۔"

"تو تم ان کی نفرت کے ازالے کے لیے مجھے لے جانے آئی ہو؟"

"مان جاؤ...... مجھ سے ان کی محبت' میرے ہی ہاتھوں ختم ہوئی۔ وہ مجھے معاف نہیں کریں گے۔ جب تک تم مجھے معاف نہیں کرو گی۔ مجھے معاف کر دو۔ واپس آ جاؤ' تم آ جاؤ میں وہاں سے چلی جاؤں گی...... نہیں رہوں گی وہاں اس گھر میں' میں کہیں بھی چلی جاؤں گی...... میں وعدہ کرتی ہوں کہ کبھی اس گھر میں واپس نہیں آؤں گی۔ مگر تم آ جاؤ...... اپنے پاپا کے پاس...... رہو ان کے ساتھ...... ان کا سارا پیار لے لو...... میں اس طرح سے پاپا کو نہیں دیکھ سکتی...... وہ ہر پل تمہیں یاد کرتے ہیں۔ بیمار رہتے ہیں۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"وہ میری طرف دیکھتے بھی نہیں ہیں۔ مجھ سے بات بھی نہیں کرتے ہیں۔"

منال کے لیے یہ بات ہی عجوبہ تھی کہ سکندر احمد اپنی دیوی کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتے۔

"میں اپنی دنیا میں سکون کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ میں نے طلب اور خواہش کرنا چھوڑ دی ہے۔ ہر خواہش اور اس کی تکمیل مجھے ایک نئے جان لیوا دکھ کی طرف لے گئی۔ مجھے اب اس زندگی میں واپس نہیں جانا۔" اسے ڈورس کے کہے ایک بھی لفظ پر یقین نہیں تھا۔ اس کے لیے سکندر احمد' عجوم' ڈورس ایک ایسا دھوکا تھے جو اس کی قسمت میں لکھ دیا گیا تھا۔ ہر احساس سے اس کا تعلق ختم ہو چکا تھا۔ محبت کی ہر قسم کے ہاتھوں وہ ذلیل ہوئی تھی۔

"تمہیں یقین کیوں نہیں آ رہا۔ میں کس طرح سے تم سے معافی مانگوں کہ تم مجھے معاف کر دو' چلو تم مجھے معاف نہ کرو' نہ یقین کرو میری باتوں پر۔ لیکن تم..."

اس کی ایک ہی تکرار تھی' گھر واپسی کی......

"نہیں جانا مجھے کسی کے گھر......" اس کا ضبط جواب دے گیا تھا' اس کی تیز آواز خالی کمرے میں گونجنے لگی۔ "جاؤ یہاں سے تم۔ یا تم چاہتی ہو کہ میں خود کو مار ڈالوں...... کیا تب تم خوش ہو گی؟"

"ہم دونوں بہنیں ہیں۔ ہمیں خوشی سے مل کر ایک

ساتھ رہنے کی ایک بار کوشش کرنی چاہیے۔ ہم اچھے دوستوں کی طرح اچھی زندگی گزارنے کی کوشش کریں گے۔"

"بہنیں۔۔۔؟" وہ ہنسی۔ "تم وہی بہن ہو ناں جس نے عجوم کو یہ دعوت دی تھی کہ وہ تمہاری بہن کو اپنے جال میں پھنسائے۔ وہ میرے دل سے کھیلے؟"

"ہاں۔۔۔ میں نے ایسا کیا۔ وہ سب میں نے ہی کیا اور میرے کہنے پر ہی عجوم نے۔۔۔ تم میری سزا دوسروں کو مت دو۔"

"تو پھر تمہاری سزا یہی ہے کہ تم اپنی زندگی اسی نام نہاد شرمندگی کے ساتھ گزارو جس کا تم یہاں اعلان کرنے آئی ہو۔" منال نے اسے نفرت سے دیکھا۔

"ٹھیک ہے' میں اپنی زندگی ایسے گزارلوں گی مگر تمہیں میرے ساتھ جانا ہوگا۔" نرمی سے کہہ کر وہ پھر اس کی طرف بڑھی۔

"تم بھول جاؤ کہ میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔" وہ دو قدم پیچھے کی طرف بڑھی۔

"ٹھیک ہے پھر پاپا' ماما آجائیں گے' یہاں سے تمہیں لے جائیں گے لیکن تمہیں آنا ہی ہوگا۔ ان کے آنے تک تمہیں میرے ساتھ ہی رہنا ہے۔" اس نے جیسے بات ہی ختم کردی۔

"میں پولیس کو کال کرلوں گی۔ میری مرضی کے بغیر کوئی مجھے نہیں لے جاسکتا' پاپا' آنٹی یا تم۔۔۔" اس نے پختہ لہجے میں کہہ کر بات ہی ختم کردی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا وہ ایسا ضرور کرے گی۔

"پلیز منال۔۔۔ گھر چلو۔۔۔" جہاں وہ کھڑی تھی وہیں بے بسی سے نیچے بیٹھتی ہی چلی گئی۔ "میرے لیے یہ زندگی عذاب بن گئی ہے۔ ایسا میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔" وہیں بیٹھی وہ رو رہی تھی اور روتی ہی جا رہی تھی۔ بالکل ایسے ہی جیسے ٹھیک ایک سال پہلے منال اس کے کمرے کی دہلیز پر بیٹھ کر رو رہی تھی۔ اس کی خوب صورت بڑی بڑی سمندروں جیسی آنکھیں پانی سے گیلی ہو رہی تھیں۔ وہ روتے ہوئے کبھی بھی اچھی نہیں لگی تھی۔

منال پتھر کا بت بنی تھوڑی دیر وہیں کھڑی رہی اور پھر آگے بڑھ گئی۔ وہ وہاں سے بھی جا چکی تھی۔

ڈور بس اس کے پیچھے اسٹیشن تک گئی مگر وہ آگے ہی آگے بھاگتی چلی گئی۔ اسٹیشن پر موجود گارڈ سے اس نے اس کی طرف اشارہ کرکے کچھ کہا۔ گارڈ نے اسے روکا اور روکے ہی رکھا۔ جب تک اس کی ٹرین چلی نہیں گئی۔

"میم! آپ ایسے کسی کو پریشان نہیں کرسکتیں۔ مجھے مجبور نہ کریں کہ میں پولیس کو کال کروں۔"

گارڈ کو سن کر وہ واپس اسی گھر میں آگئی۔ گھر کے مالک کے پاس سوائے فون نمبر کے اور کچھ نہیں تھا۔ دوسری بار کال کرنے پر اس کا نمبر بھی بند ملنے لگا۔

گاڑی میں بیٹھ کر وہ بے تحاشا رونے لگی۔ آج ہوئی اس ملاقات نے اس کے سب حوصلے منجمد کردیے تھے۔ اس کی امیدیں دم توڑ چکی تھیں۔ سکندر احمد اب اس سے ہمیشہ دور رہیں گے۔ اب وہ شاید ہی ان کے لیے قابل محبت ہو۔

☆ ☆ ☆

رات گئے واپس آنے پر اس نے کسی کو نہیں بتایا کہ وہ منال سے مل کر آرہی ہے۔ آج کی ملاقات اور اس کا واپس نہ آنا شاید سکندر احمد کو اور رنجیدہ کردیتا۔ ان کی بھی آس امید ٹوٹ جاتی۔

اس کی خواہش کو رد نہیں کیا جاتا تھا۔ اسے ناپسند نہیں کیا جاتا تھا۔ اسے ایک ایسی زندگی ملی تھی جو مکمل نہیں' ایک مکمل خواب تھی۔ اسے دل کے ٹوٹنے کا پتا نہیں تھا۔ شرمندہ ہونا یا کسی سے گڑگڑا کر معافی مانگنا' یہ اس کی زندگی کا حصہ نہیں رہا تھا۔ آج وہ منال کے قدموں میں جاکر بیٹھ گئی تھی مگر وہ نہیں مانی تھی۔ اسے اس کے قدموں میں بیٹھنے پر شرمندگی نہیں تھی۔ دکھ اسے اپنے رد کیے جانے پر تھا۔ اس کے گھر چھوڑ جانے نے اسے اندر باہر سے بدل دیا تھا۔ پاپا کی لاتعلقی نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اہم بننے کے لیے رشتہ یا تعلق ہی ضروری نہیں ہوتا۔ اہم اور پیارا لگنے کے لیے آپ کو

لینے کے ساتھ ساتھ دینا بھی پڑتا ہے۔ اس نے اپنے پاپا سے محبت کی اور ان ہی کی بیٹی سے شدید نفرت۔ ایسا ہو گا' یا ایسا بھی ہوتا تھا اگر کوئی مستقبل میں جھانک سکے تو کبھی بھی اپنا حال برباد نہ کرے۔ اگر وقت کی لگام مل جائے تو کچھ بھی تباہ نہ ہو۔

پہلے اسے منال کی ایک ایک حرکت کوڑے کی طرح لگتی تھی۔ اس نے خود کو اتنا اونچا بٹھا لیا تھا کہ وہ خود کو ہر تکلیف اور پریشانی سے مبرا سمجھنے لگی تھی۔ اسے اس دن اس سے نفرت ہو گئی جب وہ اس کی کرسی پر آ کر بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے احساسات میں ردوبدل نہیں کیا تھا۔ جو ناپسند ہے۔ وہ ناپسند ہی رہنا چاہیے۔ اس نے ایک بار اسے ناپسند کیا اور پھر اس نے اس کے لیے اپنی رائے نہیں بدلی۔

خواہشات کی انتہا تھی اور بے مہری کی فراوانی۔۔۔ بچپن سے جب اسے سب ملا تھا تو وہ صرف گنتی کے دنوں کے لیے بے صبری کیوں ہوتی۔

اسے اپنے پاپا کی بے جا حمایت پر سخت افسوس تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے مقابلے میں کسی اور کی وہ بھی منال کی حمایت کی جائے۔ پاپا کا ہر وقت اس کے لیے پریشان رہنا' ماما سے پوچھتے رہنا کہ وہ ٹھیک تو ہے' خوش تو ہے' اسے کچھ چاہیے تو نہیں' میری بیٹی کا بس یہاں دل لگ جائے ہم اسے بہلایا کرو صوفیہ۔۔۔ وہ اکثر اس کے سامنے اسی کا ذکر لے کر بیٹھ جاتے۔ اس نے سارا دن کیا کیا' کیا کھایا' وہ کتنا ہنسی' وہ اداس تو نہیں تھی' اسے شاپنگ پر لے جاؤ' گھمانے لے جایا کرو' ہر وقت اس کے ساتھ رہا کرو' اسے اکیلے نہ رہنے دیا کرو' وہ اس کے ایک ایک منٹ کا پوچھتے' صبح شام کا پوچھتے' اس کے سونے جاگنے کا پوچھتے' ہر وقت انہیں اسی کی فکر لگی رہتی' وہ ان کے ساتھ جاگنگ کرتی یا واک پر جاتی' کسی نہ کسی بات پر انہیں وہی یاد آتی۔۔۔

"میرا دل چاہتا ہے کہ وہ بھی میرے ساتھ ایسے ہی آئے اور ہم باتیں کریں۔ الٹی سیدھی بے معنی باتیں۔"

اس کا دل جل کر جیسے کوئلہ ہو گیا۔ اسے لگا وہ کہیں پیچھے جاتی جا رہی ہے۔ پاپا کا دل اس کے لیے ایسی سلطنت تھا جس پر وہ کسی کا قبضہ نہیں چاہتی تھی۔

"میری بیٹی بہت حساس ہے۔ بہت دکھی رہتی ہے۔"

"دکھی۔۔۔" وہ اس وقت تمسخر سے سوچا کرتی تھی۔

"دکھی یا ڈرامے باز؟" اور دل ہی دل میں اسے انگریزی گالیاں دیتی۔ اپنا کمرہ توڑے جانے کے بعد تو وہ اس کا قتل ہی کر دیتی۔ وہ اسے ایک منٹ اس گھر میں نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کے لیے یہ سوچ ہی ناقابل برداشت تھی کہ وہ یہاں رہے گی۔ اس کے ساتھ اس کی نظروں کے سامنے' اس نے سکندر احمد سے کئی بار کہا کہ وہ اسے پاکستان واپس بھجوا دیں یا اسے اسد کی طرح یو کے بھیج دیں مگر وہ اسے دور کرنا نہیں چاہتے تھے۔

"میں ایک لمحے کے لیے بھی اسے خود سے الگ نہیں کروں گا۔ اسے میرے ہی پاس رہنا ہے اب۔۔۔"

اتنا کچھ ہونے پر بھی وہ اسے گھر میں رکھنا چاہتے تھے۔

"دیکھو ڈورس! تم اتنی بڑی ہو اس سے' تمہارا دل بڑا ہونا چاہیے۔ وہ ہم سب سے ناراض ہے۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گی۔"

"مائی فٹ۔۔۔" اس نے بنا کسی لحاظ کے کہا' انہوں نے خفگی سے اسے دیکھا۔

"مجھے تمہاری یہ بات پسند نہیں آئی۔ اس کے لیے اپنے خیالات بدلو۔۔۔" یہ ان کی طرف سے تنبیہہ بھی تھی اور ڈانٹ بھی۔ اس کا موڈ بری طرح سے آف ہو گیا اگر منال بھی اسد کی طرح رہتی تو اسے کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر وہ اسد نہیں تھی نہ احد' وہ سکندر احمد کی چہیتی تھی۔ جس کے لیے وہ ہر وقت فکر مند رہتے تھے۔

"تمہاری طرف سے تکلیف نہیں ملنی چاہیے اسے۔۔۔"

اس نے ان کی یہ بات اس وقت سنی ضرور مگر یاد نہیں رکھی' سکندر احمد اسے بنا کہے سب کچھ دیتے

تھے۔ انکار وہ ڈورس کو بھی نہیں کرتے تھے مگر ڈورس یہ چاہتی تھی کہ اسے انکار کیا جائے۔ شروع کا غم و غصہ عداوت میں بدلنے لگا۔ معاف کرنا اس نے سیکھا نہیں تھا۔ پھر وہ بہانے بہانے سے پاپا کو بھڑکاتی رہتی تھی کہ وہ اس سے ایسے کہیں، اس کے ساتھ یہ کریں وہ کریں، جیسے وہ احد کے لیے انہیں پریشان کرتی تھی مگر منال کے معاملے میں وہ اس کی ایک نہیں سنتے تھے۔

اس کے ایک فرینڈ نے منال میں دلچسپی دکھائی تو اسے حیرت کے ساتھ ساتھ غصہ بھی آیا۔ وہ اس کے گھر میں منال سے تعارف کے بعد دو تین بار اس کا پوچھ چکا تھا۔ ڈورس تو اس کا نام بھی نہیں سننا چاہتی تھی۔ اور وہ اس سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ڈورس اپنے ساتھ اسے بھی لایا کرے تاکہ وہ مل کر گپ شپ کریں۔ منال اسے اچھی لگی تھی۔

"تم اس کے ساتھ فلرٹ کرنا چاہتے ہو....؟" اس نے چڑ کر پوچھا۔ نہ وہ ایسا تھا نہ اس کی ضرورت تھی۔ وہ انتہائی ڈیسنٹ اور اپنے کام سے کام رکھنے والا تھا۔

"تم ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہو.... مجھے یہ سب کرنے کی عادت نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے.... مگر پھر بھی تمہارا ارادہ کیا ہے؟"

"اس نے مجھے اٹریکٹ کیا.... میرا خیال ہے، اس سے ملنا چاہیے، بات چیت کرنا بھی اچھا رہے گا۔" اس نے صاف گوئی سے بتایا۔ "ڈورومت.... میں تمہاری بہن کے ساتھ فلرٹ نہیں کروں گا ورنہ تم مجھے جان سے مار دو گی۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

ڈورس حیرت سے اس کو دیکھ کر رہ گئی۔

"تمہیں کیوں لگتا ہے کہ ایسا کرنے پر میں تمہیں مار دوں گی۔"

"ظاہر ہے، کوئی تمہاری بہن کو دکھی کرے گا، اس کا دل توڑے گا تو تم اسے زندہ تو نہیں رہنے دو گی۔ ہم سب تمہیں جانتے ہیں۔ اپنی کلاس فیلوز کے ساتھ فلرٹ کرنے والوں کو تم نے چھوڑا نہیں تھا۔" اس کا اشارہ اس کی اسکول لائف کی طرف تھا۔ وہ جانتی تھی کہ لڑکیاں اپنی لو لائف کے لیے بہت حساس ہوتی ہیں۔ جنہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ تو ازل کی عورت ہے جو مرد کے لیے اور مرد کے پیچھے خوار ہونے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔

اس نے اپنے دوست سے سختی سے کہا کہ وہ دوبارہ اس سے منال کا نہیں پوچھے۔ اس کی ایک ہی بار کی گئی بات کافی ہوئی تھی۔ اس نے دوبارہ بھی منال کا ذکر نہیں کیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے فرینڈز اسے اس کی بہن کی حیثیت سے پہچانیں۔ وہ اس کی بہن نہیں تھی۔ اس کے پاپا کی کوئی اور بیٹی نہیں تھی۔ جب یہاں اس کا دل نہیں لگے گا تو وہ واپس چلی جائے گی۔

"منال...." اس نے زیر لب نام لیا۔ "مائی فٹ۔"

منال کے بارے میں پوچھنے والے ڈورس کے دوست کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس نے انجانے میں ڈورس کو کس کھیل کی دعوت دے دی ہے۔ اس نے ڈورس کو اس بازی کا بتا دیا تھا جس کے سارے پتے ڈورس کے دیکھے بھالے تھے۔

اب ڈورس کو معلوم تھا کہ اسے اس کے ساتھ کیا کرنا ہے۔ نہ پاپا منال کو کچھ کہتے تھے نہ ہی ماما۔ اسے ہی اپنے معاملات کا حساب لینا تھا۔ اس کے لیے وہ ایسا کھیل تھی جو ہر صورت اسے ہی جیتنا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ واپس چلی جائے۔ اسے وہ تکلیف ملے جس کا ازالہ نہ ہو سکے۔

"عجوم...."

کرب کے سب ہی عارضوں کا نام وہ جانتی تھی۔

✡ ✡ ✡

کام اس کے لیے زندگی کی وہ چکی بن چکا تھا جس میں وہ خود کو پیس رہی تھی۔ اسے پیسوں کی ضرورت نہیں تھی۔ جہاں وہ رہ رہی تھی اور جس طرح کی زندگی وہ گزارنے لگی تھی اس میں آسائشوں کی چاہ نہیں تھی۔ وہ ایک ایسے تہہ خانے میں بند تھی جو تاریک بھی تھا اور مقفل بھی.... جہاں اسے اپنے آنسو بھی نظر نہیں آتے تھے۔ وہ حیات کے سالوں کو اب ایسے ہی

لپیٹ کر رکھنا چاہتی تھی۔ اگر اسے اپنے دیوانے ہو جانے کا خوف نہ ہوتا تو یقیناً" وہ اپنے فلیٹ سے کبھی باہر نکلا ہی نہ کرتی۔۔۔ لیکن یہ سب کام وہ موت سے پہلے اپنی سانسوں کو ہوش مندی میں گزارنے کے لیے کر رہی تھی۔

وہ ہر وقت کام کرتی رہتی تھی۔ کام نہ بھی ہوتا تو اپنی اگلی اسائنمنٹ کے بارے میں ہی سوچتی رہتی۔ وہ خود کو ہر صورت مصروف رکھنا چاہتی تھی۔

اس نے پچیس سال ایک ایسی عورت کے ساتھ گزارے تھے جو محبت میں جدائی کے پاگل پن کا شکار رہی تھی۔ شکار وہ بھی ہوئی تھی۔ محبت میں فریب کا لیکن وہ اب مزید سال خود اپنے پاگل پن کے ساتھ نہیں گزار سکتی تھی۔ کیا پچیس سال کافی نہیں ہوتے زندگی گزارنے اچھے وقت کے لیے برے وقت کا محصول ادا [illegible]؟ لیکن اس کی تقدیر میں شاید اچھے وقت کی [illegible] تھی کہ وہ اکیلی زندگی گزارے۔ پتا نہیں زندگی کی کہانی بنانے والے نے اس میں سمجھوتے کی داستان کیوں ڈال دی تھی۔

آج بھی اپنے کام کے سلسلے میں کسی آفس سے ہو کر آنے کے بعد وہ باہر سڑک پر کھڑی ٹیکسی کا انتظار کر رہی تھی کہ ایک گاڑی تیزی سے اس کے پاس آکر رکی۔ اس گاڑی پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اور اس کی حالت متغیر ہو گئی۔ وہ تیزی سے ایک ٹیکسی کی طرف لپکی اور اس میں بیٹھ گئی۔

ٹیکسی ڈرائیور کو اسے ڈبل کرایہ دینا پڑا تھا۔ وہ اسے شہر کا ایک چکر لگوا کر اپنی بلڈنگ کے پاس آئی تھی۔

اپنے فلیٹ میں آتے ہی وہ کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔ آفس میں کام کے دوران ہی اسے بہت بھوک لگ رہی تھی مگر اس کار کو دیکھ کر اب اس کی ساری بھوک اڑ چکی تھی۔ کھڑکی میں کھڑی ہو کر وہ اوپر سے اپنے شہر کا نظارہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔۔۔ لیکن ناکام رہی۔ سوچیں تھیں کہ جیسے بصارت پر چڑھ دوڑی تھیں۔ رات آہستہ آہستہ پھیلتی جا رہی تھی۔ روشنیوں کی چمک اس کی آنکھوں میں پانی کی چمک جیسی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور وہ الٹی سیدھی باتیں سوچ رہی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے میوزک آن کیا۔

مائی بھاگاں کی آواز گونجنے لگی۔ اس نے پرسکون رہنا سیکھ لیا تھا یا شاید وہ بڑی ہو گئی تھی۔ شروع میں جب خواب ٹوٹتے ہیں تو بہت بے چینی ہوتی ہے۔ پھر عادت ہو جاتی ہے۔ ٹوٹنے اور بے چین رہنے کی۔۔۔

دروازے کی گھنٹی بجی۔۔۔ جیسا کہ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ ایسا ضرور ہو گا۔ اس نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ گھنٹی پھر بجی اور اس کے بعد پینتالیس منٹ تک وقفے وقفے سے مسلسل بجتی رہی۔ تھک کر اس نے بلڈنگ سیکیورٹی کو کال کی۔ اس کے فلیٹ کے سامنے ہلکا سا شور اٹھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ دروازے کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ سیکیورٹی اسے وہاں سے جانے کے لیے کہہ رہی تھی۔ ان کا انداز مہذب تھا۔ مہذب جملوں کے بعد بات چیت چھوٹے سے ہنگامے میں بدل گئی۔

وہ شاید اسے ہاتھ سے پکڑ کر زبردستی چلنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ اس نے دروازہ کھول کے باہر جھانک کر دیکھا۔ لفٹ کی طرف جاتے ہوئے اسے تین افراد کی پشت نظر آئی۔ وہ اسے زبردستی اپنے ساتھ لے کر جا رہے تھے۔ راہداری میں ان کی آوازوں اور تکرار کا شور اٹھ رہا تھا۔

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ شاید اسے یقین تھا کہ وہ دروازہ ضرور کھولے گی اور وہ دروازہ کھول کر ہی کھڑی تھی۔

"منال۔۔۔" وہ دور سے ہی چلایا اور ان کی گرفت سے نکل کر اس کی طرف آیا۔

"تم میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہو؟"

سیکیورٹی ایک بار پھر اس کے پاس کھڑی اس سے چلنے کے لیے اصرار کرنے لگی لیکن اب وہ پہلے سے بھی زیادہ اکڑ کر کھڑا تھا۔

"ان سے کہو مجھے چھوڑ دیں۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" اس نے لجاجت سے کہا۔ "پلیز۔۔۔"

وہ ویسے ہی کھڑی رہی جیسے سنا ہی نہیں۔ دو قدم پیچھے ہٹ کر وہ دروازہ بند کرنے لگی۔

"تم ایسے نہیں کر سکتیں۔" اس نے تیز آواز میں کہا۔ "ایک بار تمہیں مجھ سے ملنا ہی ہو گا۔" اس کی آواز دور ہوتی جا رہی تھی۔ وہ دروازہ بند کیے کھڑی اسے سن رہی تھی۔

"تم نے ایک بار مجھے کچھ دینے کا وعدہ کیا تھا... یاد کرو' اپنا وعدہ پورا کرو اور مجھے اندر آنے دو..."

منال نے سختی سے اپنی آنکھیں رگڑیں اور دروازہ کھول کر اپنا سر باہر نکالا۔

"اسے چھوڑ دیں..."

سکیورٹی کو شکریہ کہہ کر وہ اندر آ گئی۔ دروازہ کھلا ہی تھا۔ وہ کچن میں چلی گئی اور بہت دیر بعد وہاں سے باہر آئی۔ وہ وہیں بیٹھا تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے وہ بیٹھی تھی۔

"میں سمجھا تم میرے لیے کافی بنا رہی ہو لیکن تم... خالی ہاتھ ہی باہر آ گئیں۔" پھر وہ کیا کرتی رہی تھی اتنی دیر تک کچن میں۔

"سوری... میرے لیے تمہیں سکیورٹی کو بلانا پڑا۔" وہ عام سے لہجے میں بولا۔

اسی لیے وہ شہر گھوم کر آئی تھی کہ اسے اس کا گھر نہ مل سکے۔ اس نے اسے آفس کی بلڈنگ کے باہر کار میں اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ مگر اس کا شہر گھوم کر آنا بے کار ثابت ہوا۔ وہ آ چکا تھا اور اب یہاں اس کے قریب بیٹھا تھا۔

"کیسی ہو منال...؟" اس کے پاس آ کر اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے نرمی سے پوچھا۔

"کیوں میرا پیچھا کر رہے ہو؟ مجھے اپنی فیملی سے نہیں ملنا۔" وہ چاہتی تھی کہ وہ جلد سے جلد یہاں سے چلا جائے۔

"میں یہاں تمہاری فیملی کی باتیں کرنے نہیں آیا۔"

اس نے اطمینان سے ایسے جواب دیا جیسے ابھی ابھی دونوں باہر سے ڈنر کر کے آ رہے ہوں۔

"تمہیں کیا لگتا ہے ایک سال اور تین ماہ کے بعد' اس ملک کے ہر شہر کی خاک چھاننے کے بعد' میں یہاں تمہارے پاس تمہاری فیملی کی باتیں کرنے یا ان کے پریشان ہونے کی درخواست لے کر آیا ہوں گا؟ کیا تمہیں لگتا ہے کہ میں یہاں تمہیں تمہارے پاپا کی یاد دلانے آیا ہوں...؟"

وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ وہ ابھی بھی اسی کونے میں کھڑی تھی۔ اسے دلچسپی نہیں تھی کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔

"بولو... کچھ تو کہو... کیا تمہیں ایسا لگتا ہے۔" وہ اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں تمہیں نہیں جانتی۔ بہتر ہے کہ تم ابھی یہاں سے چلے جاؤ' میں اکیلی رہتی ہوں یہاں' میں کسی اجنبی کا یہاں قیام پسند نہیں کرتی۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اجنبی...؟ مجھے اجنبی کہہ رہی ہو۔" اس نے ہنسنے کی کوشش کی۔

"تو... اور کون ہو تم...؟"

"تم جانتی ہو میں کون ہوں۔"

"تم ایک دھوکے باز ہو... یہ ٹھیک ہے؟"

"میں یہاں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔ اگر تم آرام سے بیٹھ کر میری بات سن لو گی تو یہ ہم دونوں کے لیے بہت اچھا ہو گا۔ تمہارے ہر سوال کا جواب ہے میرے پاس... مگر... تمہیں سننا بھی ہو گا اور یقین بھی کرنا ہو گا۔"

"کیا تم نے مجھے دھوکا نہیں دیا۔ اس کا جواب دو اور جاؤ..."

وہ کئی لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ "ہاں..."

"اب جاؤ..."

"تم نے کبھی مجھ سے اس انداز میں بات نہیں کی۔ مجھے معلوم ہے کہ تم ناراض ہو مگر اتنی۔" اسے افسوس ہو رہا تھا اس کے انداز پر۔

"جس انداز میں تم نے دھوکا دیا ہے۔ اسی انداز کو میں نے اپنا لیا۔"

"وہ دھوکا صرف اتنا تھا کہ میں ڈورس کے کہنے پر تم سے ملا تھا۔ صرف اتنا کہ میں اپنی یونیورسٹی چھوڑ کر تمہاری یونیورسٹی آگیا تھا۔ تم سے پہلی بار ملنا بھی وہی دھوکا تھا۔ بس صرف اتنا ہی... اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔"

"اوکے... اب جاؤ..." وہی انداز۔

"میں جاؤں گا مگر تمہیں لے کر۔" اس نے اسی مضبوط لہجے میں کہا۔ "تمہیں میری بات سننا ہوگی۔ ایک ایک لمحے کی بات، جتنا جھوٹ تھا وہ سب تمہیں بتا دیا جو سچ ہے وہ بھی سنو..."

"مجھے کچھ نہیں سننا... تم نے سنا نہیں...؟"

"تم نہیں جانتیں کہ میں کون ہوں۔" وہ عین اس کے سامنے آکر کھڑا اس سے پوچھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے۔

"نہیں..." اس نے ذرا سا تامل بھی نہیں کیا۔

"تم جھوٹ بولو گی اور میں مان جاؤں گا۔"

"تمہیں کیا لگتا ہے تم جھوٹ بولو گے اور میں مان جاؤں گی۔"

"میری محبت تمہیں ابھی بھی جھوٹ لگتی ہے۔ وہ سب جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔"

"محبت..." وہ استہزائیہ ہنسی۔ "تم دھوکے کو محبت کہہ رہے ہو۔ تم ڈورس کے فیانسی ہو اور تم اپنا جھوٹ لے کر میرے پاس آئے ہو کہ تم میں اور مجھ میں محبت تھی۔ تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔"

"اگر یہ ضیاع ہے تو مجھے منظور ہے۔ مجھے بولنے دو۔ میرا تم سے اس کے کہنے پر ملنا جھوٹ تھا، فریب تھا اور باقی سب۔ وہ میں تھا، **عجوم** تھا اور **عجوم** کے لیے تم۔"

"جو ٹوٹ چکا ہے، تم اسے جوڑ نہیں سکتے۔" اس نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔

"غلط فہمیاں کہاں نہیں ہوتیں...؟"

"غلط فہمیاں ہوتی ہیں... جھوٹ اور فریب نہیں۔"

"مجھے ڈورس نے..."

"تم اسی کے پاس جاؤ..." اس کا لہجہ حد درجہ کرخت ہوگیا۔

"جس کے پاس مجھے ہونا چاہیے میں اسی کے ساتھ ہوں... ایک بار... صرف ایک بار میری بات کا یقین کرلو۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے جھنجھوڑا۔

"تم یہاں سے جاؤ گے یا میں سیکیورٹی سے تمہیں نکلوا دوں۔" اس نے غصے سے اس کے ہاتھ جھٹکے۔

"تم مجھے نکلواؤ گی...؟"

"ہاں... اگر تم خود سے نہیں جاؤ گے..."

"تم مجھے دیکھنا نہیں چاہتیں، سننا نہیں چاہتی، تم تو مجھ سے محبت کرتی تھیں۔"

"مجھ سے محبت کے سوال جواب مت کرو، صرف ایک یہی لفظ ایسا ہے جس پر مجھے بات نہیں کرنی..."

"اگر تم بات کرنا نہیں چاہتیں تو ٹھنڈے دماغ سے میری بات سنو..." اسے غصہ آگیا تھا۔ "ایک سال تین ماہ سے تمہیں پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہا ہوں اور تم مجھے سننا نہیں چاہتی، تم یہ جاننا نہیں چاہتیں کہ وہ کیا ہے جو میں کہنا چاہتا ہوں، تم خفا ہو میں جانتا ہوں، مگر مجھے موقع تو دو، میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ تمہارے بغیر میری زندگی کیسی ہے، تمہارے بغیر **عجوم** کیسا ہے۔"

اس نے بے تاثر آنکھیں لیے اسے دیکھا۔ "بس، اب تم جب تک چاہو یہاں رہو..." وہ باہر کی طرف بڑھی۔

"تم ایسے کیسے جاسکتی ہو..." حیرت سے زیادہ اسے دکھ تھا۔ پیچھے سے جاکر اس کا بازو پکڑ کر اس نے اسے اپنی سمت گھمایا۔

"میں جاسکتی ہوں..." اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "جیسے تم چلے گئے تھے..."

"منال... میں معافی مانگنے آیا ہوں۔ مجھے اتنا وقت تو دو کہ میں تمہارے گلے شکوے دور کرسکوں۔"

"کال سیکیورٹی پلیز۔" راہداری میں ایک دو لوگوں کی آمدورفت تھی۔ جن میں سے ایک سے منال نے کہا۔

"تمہیں میری محبت کا یقین نہیں ہے...؟" اس کی آواز پاتال سے آئی۔ منال کی آنکھیں بے تاثر ہی رہیں۔

"جو موجود ہی نہیں اس کا یقین کیا کرنا؟"

"جب تک تم سب جان نہیں لیتیں تم مجھے ایسے دھتکار نہیں سکتیں۔ یہ وہی عجوم ہے جس کے لیے تمہارا دل خوب صورت بنا تھا۔ جو کچھ ہوا حالات کی وجہ سے ہوا۔ تم ایک شرمندہ انسان کو ایسے کیسے خود سے الگ کر سکتی ہو۔ تم اتنی بری طرح سے میرے جذبے کی تذلیل نہیں کر سکتیں، تم ہاں کرو یا ناں، میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ تمہارا رویہ برا ہو یا بدترین، مجھے فرق نہیں پڑتا۔"

"منال..." اس نے پوری قوت سے چلا کر پکارا۔

"میں نے غلطی کی لیکن..." اس کی آواز دور ہونے لگی۔ دروازے کے پیچھے کھڑی منال نے اپنے آنسو صاف کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

"مجھے لانے کے لیے اب اس نے تمہیں بھیجا ہے۔" اس نے غائبانہ اسے مخاطب کیا۔ "تم اس کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہو ناں... مجھ سے دوستی بھی اور" کھڑے کھڑے وہ رونے لگی۔ بہت دنوں بعد وہ سنبھلی تھی۔ عجوم کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ کاش کوئی ایسی جگہ ہو جہاں عجوم نام کی پرچھائیں بھی نہ ہو۔ فون اٹھا کر اس نے سینٹ کو کال ملانا شروع کی۔ اسے اب یہ گھر بھی چھوڑنا تھا۔

✲ ✲ ✲

بے تحاشا اداسی لیے وہ دل گرفتہ اپنی کار میں آکر واپس بیٹھ گیا۔ وہ بہت مشکل سے اسے تلاش کرتا ہوا اس کلائنٹ تک پہنچا تھا جس کا منال آج اس آفس میں کام کرنے گئی تھی۔ جس وقت وہ آفس سے باہر نکلی اسی وقت اس کی نظر اس پر پڑی۔ اس سے پہلے کہ وہ کار سے باہر آتا۔ اس پر نظر پڑتے ہی منال ٹیکسی لے کر چلی گئی۔ وہ جہاں اس کے لیے سارا ایتھنز کھنگال آیا تھا۔ اس کے لیے اس شہر میں اس کا پیچھا کرنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ آسانی سے اس کی بلڈنگ تک پہنچ گیا تھا لیکن اسے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ یقین ہی نہیں کرے گی۔ ڈورس نے ٹھیک کہا تھا۔

"حقیقت معلوم ہوتے ہی وہ تم سے نفرت کرنے لگے گی۔ تمہیں ناپسند کرے گی۔"

اور حقیقت ڈورس کی بتائی بات سے زیادہ تباہ کن ثابت ہوئی تھی۔ اس کی نفرت، اس کی ناپسندیدگی عجوم کو جلا گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اس کے لیے پہچان کی کوئی رمق تھی نہ ہی اس کے دل میں اس کے لیے محبت کا کوئی ماضی۔

✲ ✲ ✲

"وہ ہے کون؟" اسے ڈورس کی بات عجیب بھی لگی اور مضحکہ خیز بھی۔

"وہ جو کوئی بھی ہے، وہ لڑکی ہے۔ اتنا کافی نہیں؟ تمہیں اس کے ساتھ فلرٹ کرنا ہے۔ اس کے دوست بن جاؤ، اس کا دل توڑ دو اور بس... اتنا سا ہی کام ہے۔"

"کم آن ڈورس!" اسے ہنسی آگئی۔ "یہ بچوں والے کام، میرے پاس ان فضول کاموں کے لیے وقت نہیں ہے۔ میری طرف سے انکار ہے۔"

"اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ تمہارے پاس وقت نہیں ہوتا۔ تو تم ایک ہی یونیورسٹی جوائن کر لو، اس کی یونیورسٹی، جو وقت تمہارے پاس ہوگا۔ وہ تم اس کے پاس رہ کر گزار لینا، یونیورسٹی کے علاوہ تم ایسے کیسے اس سے مل سکتے ہو..."

"کوئی مسئلہ ہے تم دونوں کے درمیان...؟"

"ہاں... ہے مسئلہ... مگر تم اسے کبھی بھول کر بھی میرے بارے میں نہ بتانا۔ تم صرف وہاں جاؤ اور بس۔"

"نو..." اس نے صاف انکار کیا۔ "تم کسی اور سے کہہ دو..."

"کسی اور سے کہہ سکتی تو تمہیں نہ کہتی۔" وہ خفا ہوئی۔ "تم میرے دوست ہو مجھے صرف تم پر ٹرسٹ ہے۔"

"نو۔۔۔" وہ مسلسل انکار کرنے لگا۔ "یہ سب فضول کام ہیں۔۔۔ غیر اخلاقی' غیر انسانی۔۔۔ میں یہ نہیں کرسکتا۔"

"ٹھیک ہے' تم صرف اس کی یونیورسٹی چلے جاؤ اور اس کے دوست بن جاؤ۔۔۔ نو فلرٹ۔ تمہارے جیسے انسان کا کسی کے ساتھ ملتے رہنا ہی کافی ہے۔ باقی کام وقت کردے گا۔"

"کیا مطلب۔۔۔؟"

"تم نہیں سمجھو گے۔"

"تم پر تو نہیں کیا وقت نے کام۔۔۔ میرے ساتھ رہتے رہتے۔" اس نے آنکھ دبائی۔

"ہم اپنی بات بھی کرلیں گے۔ خود ہی تو کہتے ہو کہ ان باتوں کا ابھی وقت نہیں آیا۔"

"تمہارے لیے یہ آخری بار۔۔۔ پھر تم مجھے تنگ نہیں کروگی۔"

"آخری بار۔۔۔ پکا۔" وہ اٹھلائی۔ "ویسے پہلے کبھی کوئی کام کیا ہے تم نے میرا؟ میں اپنے کام خود ہی کرتی ہوں۔"

"یہ بھی کرلو نا پھر۔"

"سمجھو' یہ بھی خود ہی کر رہی ہوں۔ تم اور میں ایک ہی تو بات ہے۔" اس نے شرارت سے کہا' عجزم خوش ہوگیا۔ وہ اسے پسند کرتا تھا' وہ جانتی تھی لیکن زیادہ گھاس نہیں ڈالتی تھی' یہ وہ جانتا تھا۔

"برداشت کرلوگی مجھے اس کے ساتھ۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔ تم پر اعتبار جو بہت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرے علاوہ کسی کے نہیں ہوسکتے۔"

پہلے دن وہ دونوں ایک ساتھ منال کی یونیورسٹی گئے تھے۔

عجزم کے لیے کسی کو مخاطب کرنا اور منٹوں میں خود سے فرینک کرلینا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یہ مسئلہ صرف وہاں موجود منال کا تھا۔ ورنہ یہ مسئلہ کسی کا بھی نہیں تھا۔ منال نے ایسا تعلیمی ماحول پہلی بار دیکھا تھا۔ یہ سب اس کے لیے پہلی بار ہو رہا تھا۔ وہ سب کچھ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

"مجھے دیکھ کر وہ وہاں سے بھاگ رہی تھی۔" وہ فون پر ڈورس کو بتارہا تھا۔

"واؤ۔۔۔"

"روڈ۔۔۔ یہ تو میری انسلٹ ہوئی ناں۔" اس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"اگر تم مجھے روز ایسے ہی رپوٹ دوگے تو مجھے غصہ آنے لگے گا۔ یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ اگر تم اس کے رویے پر حیران ہو رہے ہو تو۔ وہ ایسے ہی تمہیں حیران کرے گی یا وہ کچھ نہیں کرتی یا بہت کچھ کرتی ہے۔ جب ہم ملیں گے تو بات کریں گے۔"

"تم بھی روڈ ہی ہو۔" وہ خفا ہوا۔

"ایسا ہی ہے۔" اس نے قہقہہ لگایا۔

وہ ڈورس کی کون تھی وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ ڈورس کو جانتا تھا۔ وہ سب فرینڈز ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ سے ایک ساتھ تھے۔ اسکول سے فارغ ہونے کے بعد ان سب نے کوشش کی کہ وہ سب ایک ہی ساتھ کالج میں رہ سکیں اور اگر کوئی اس کالج میں نہیں تھا تو وہ اکثر ایک ساتھ مل بیٹھتے تھے۔ ان کی عادات' سوچ' میں اختلاف تھا مگر دوستی میں نہیں۔ وہ سب کے سب امیروں کے بچے تھے۔ خوب صورت اور خوش باش۔ انہوں نے زندگی کے وہ رنگ نہیں دیکھے تھے جو غم اور خوشی کے امتزاج سے بنتے ہیں۔ ڈورس اور عجزم میں دوسروں کی نسبت زیادہ دوستی تھی۔ باقی فرینڈز کا خیال تھا کہ انہیں مستقبل میں شادی کرلینی چاہیے۔

وہ ایک دوسرے کے قریب تھے۔ ایک دوسرے کو سمجھتے تھے۔ ڈورس نے اسے ایک لڑکی سے دوستی کے لیے کہا اور وہ مان گیا۔ اس نے ڈورس سے پوچھا کہ وہ کون ہے مگر شاید وہ بتانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے بھی اصرار نہیں کیا۔

یونیورسٹی آنے کے بعد' منال سے ملنے کے بعد' وہ جیسے اپنے گروپ سے کٹ گیا۔ اس کا حلقہ اس یونیورسٹی میں بھی لامحدود تھا۔ اس کے ہیلو ہائے فرینڈز کی کمی نہیں تھی مگر وہ منال کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اس

کے ساتھ اس کی اچھی دوستی ہو چکی تھی۔ وہ قریباً" بھول چکا تھا کہ ڈورس منال کو جانتی ہے۔ وہ اس کے لیے اس کی یونیورسٹی فیلو تھی' ایک اچھی دوست۔ اس کے ساتھ وہ ٹرام میں سفر کرتا تھا۔ ایک بار ٹرام میں سفر کر کے اسے اچھا لگا تو وہ کرنے لگا۔ وہ اس کی باتوں پر حیران ہوتی یا صرف ہنستی رہتی۔ ایک بار اس نے پوچھا۔

"تمہیں دنیا میں سب سے پیارا کون ہے؟"

وہ سوچنے لگی دراصل وہ سوچ رہی تھی کہ وہ بتائے یا نہ بتائے۔ وہ دکھی اور افسردہ نظر آنے لگی۔

"جو سب سے پیارا ہے وہ میرے ساتھ نہیں ہے۔"

"کون....؟" وہ مزے سے آئس کینڈی کھا رہا تھا۔

"میری ماں....." اس نے دکھ سے بتایا۔ اس نے خوامخواہ اسے دکھی کر دیا تھا۔ وہ اس کا افسردہ چہرا دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں بوجھل۔ ہو رہی تھیں۔ وہ شاید ابھی رو پڑتی' اسے خوش کرنے کے لیے وہ اسے لنچ پر لے گیا۔ اسے بار بار خود پر غصہ آرہا تھا کہ اس نے بیٹھے بٹھائے منال کو کیوں اداس کر دیا تھا۔

ڈورس کا دیا ٹاسک' دوستی میں بدل چکا تھا۔ اسے منال کی معصومیت پسند تھی' اور وہ اس سے باتیں کر کے خوش ہوتا تھا۔ عجزم اس کے ساتھ ویسا ہی تھا جیسے اپنے باقی سب دوستوں کے ساتھ تھا۔ جیسا وہ تھا' اس نے خود کو منال کے لیے نقلی نہیں بنایا تھا۔ اسے خود سے کوئی بھی بات گھڑنے کی ضرورت نہیں تھی یا خود کو بدلنے کی' وہ وہی کرتا تھا جیسا وہ کرتا تھا۔ وہی اور ویسا ہی ہوتا تھا۔ جیسا وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا۔ منال کے لیے الگ سے "نیا" یا خاص یا بناوٹی اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔

جس دن اس نے اس کا گانا سنا' اسے ایک بار پھر سے شرمندگی ہوئی' اسے لگا اس نے اسے پھر سے اداس کر دیا ہے۔ وہ گانا گا رہی تھی جو اس کی ماں گایا کرتی تھی۔ اس رات اس نے رات گئے تک اس کے بارے میں سوچا تھا۔ اس کے گانے میں کیا تھا۔ درد یا کچھ اور۔ وہ نہیں جانتا تھا لیکن اس گانے نے اسے ڈسٹرب کر دیا تھا۔ اسٹریٹ فیسٹیول میں اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ گم ہو جائے گی۔ اس نے اس کا ہاتھ تھام کر کورس میں اٹالین گانا گایا۔

یہ اس کی غیر ارادی حرکت تھی۔ وہاں ڈورس یا کوئی بھی اس کی دوست ہوتی تو بھی وہ یہی کرتا۔ وہ آفاقی محبت کے لیے گایا جا رہا تھا اور اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ بس... مگر شاید اس نے غلطی کی۔ اس نے اگلے ہی لمحے سوچا۔ منال کی آنکھیں اس قدر روشن ہو گئی تھیں کہ وہ ان میں اپنی تصویر دیکھ سکتا تھا۔

وہ اس کی غلط فہمی دور کر سکتا تھا مگر اس نے نہیں کی بلکہ اس نے اسے وہ مالا پہنا دی' جسے وہ ہر بار فیسٹیول میں تلاش کرتا تھا اور حیرت انگیز طور پر ہر بار اس مالا کو مس کر دیتا تھا' وہ اسے ملتی ہی نہیں تھی.... ملی تب جب منال اسے ملی۔

وہ کچھ بھی نہیں کر رہا تھا' سب کچھ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے کچھ پلان نہیں کیا تھا۔ وہ اسے بے حد اچھی لگتی تھی۔ بہت پیاری.... اسے اس کا تصویریں لینا اچھا لگا۔ کبھی کبھار آنے والا اس کا غصہ۔ کبھی کبھار کی جانے والی اس کی بچکانہ ضدیں....

"oia....." اس کے لیے اس جگہ میں کوئی خاص چارم نہیں تھا۔ سب کے ساتھ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ بہت بار وہاں گیا تھا مگر منال کو تو جیسے کوئی خزانہ مل گیا تھا۔

"تم چلو تو سہی.... دیکھو تو وہ کیسی جگہ ہے۔"

"میں دیکھ چکا ہوں۔ پلیز مجھے بور مت کرو۔ میں بہت بار جا چکا ہوں۔"

"صرف ایک بار میرے ساتھ...." اس نے بچوں کی طرح کہا۔

وہ ابھی بھی بور ہو رہا تھا مگر اسے ضرور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ہر قدم ایسے اٹھا رہی تھی جیسے کوئی پرندوں کے درمیان سے گزرتا ہے۔ ایسے کہ کوئی پرندہ ڈر کے اڑ نہ جائے۔

گنبد کی گھنٹیوں کے بجنے پر اس نے مسکرا کر اس کی

طرف دیکھا تھا۔

"ان گھنٹیوں کی آواز سن کر لگتا ہے ناں جیسے یہ کسی خوش خبری کی نوید دے رہی ہوں۔"

"مجھے تو لگ رہا ہے سترھویں صدی کے بچوں کو چھٹی دی جا رہی ہو اسکول سے..."

"ڈرمر ہو اور میوزک کی بے عزتی کر رہے ہو... افسوس..."

"کیونکہ ان کی آواز میوزک جیسی نہیں۔" وہ اسے چڑا رہا تھا۔

"ان کی آواز ڈرم سے نہیں نکل رہی ناں..."

"بہت سی آوازیں تو کہیں سے بھی نہیں نکلتیں۔ پھر بھی پیاری لگتی ہیں۔"

"ایسی کون سی آوازیں ہیں۔" وہ ہنسنے لگا۔

"خواب کی آواز' یاد کی آواز' تصور کی آواز اور دوستی کی آواز..."

"اوہ... کم آن..." اس نے اسے درمیان میں ہی ٹوکا۔ "تم کچھ بھی کہو' گنبد کی یہ گھنٹی مجھے ویسی ہی لگے گی۔"

منال نے بے نام خفگی سی سے اس کی طرف دیکھا۔ "ہاؤ روڈ" اس نے اسی کا جملہ لوٹایا۔

پتا نہیں وہ وہاں کیا تلاش کر رہی تھی۔ ہر جگہ ہر کونے میں جا کر وہ کچھ نہ کچھ محسوس کرتی تھی۔ شاید وہ اس لمحے کے انتظار میں تھی جو عجوم پر ظاہر ہو اور عجوم اسے کچھ کہہ دے... اور اس نے کہہ دیا۔

"تم نے یہاں یہی سرگوشیاں سنی ہیں ناں کہ دنیا بہت خوب صورت ہو جاتی ہے۔ جب ایک شخص کے لیے آپ کا دل خوب صورت ہو جاتا ہے۔"

وہ خاموش رہی۔

"کیا ایسا ہے منال؟" اس کے دونوں ہاتھ تھام کر وہ پوچھتا رہا۔

"ہاں..." اس نے اقرار کر لیا تھا۔ اقرار عجوم نے بھی کر لیا تھا' وہ خوش تھا۔ وہ لمحہ اس پر بھی آشکار ہوا تھا جس میں اس نے خود کو منال کے قریب پایا تھا۔

واپس آتے ہی وہ سیدھا ڈورس کے پاس گیا۔

"منال کون ہے؟" عجوم کو معلوم تھا کہ وہ یہاں اپنے فادر کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کی مدر کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔ معلوم اسے یہ کرنا تھا کہ ڈورس کا اس کے ساتھ کیا مسئلہ تھا۔

"کیا مطلب کون ہے؟ اور تم کہاں غائب رہے اتنے دن بنا بتائے۔ اب تم غائب بھی رہنے لگے ہو۔" ڈورس کی بات میں طنز تھا۔

"میں تمہیں سب بتا دوں گا۔ تم یہ بتاؤ' منال کون ہے۔ تم نے مجھے اس کے ساتھ فلرٹ کرنے کے لیے کیوں کہا۔ تم نے کیوں کہا تھا کہ میں اس کا دل بری طرح سے توڑوں..."

"تمہیں یہ سب پوچھنا اب کیوں یاد آ رہا ہے۔" ڈورس کے اعصاب تن گئے۔ "یہ ہم پہلے ڈسکس کر چکے ہیں۔"

"لیکن اس کے ساتھ تم ایسا کیوں کرنا چاہتی تھیں۔"

"میں تمہیں کیوں بتاؤں؟"

"پھر میں منال سے پوچھ لوں گا کہ تم کون ہو اور تم دونوں کے درمیان کیا مسئلہ ہے۔"

"تم منال سے یہ سب کہو گے؟ وہ سب بھی جو ہم دونوں کے درمیان طے ہوا؟"

"نہیں' مجھے صرف یہ جاننا ہے کہ تم نے ایسا کیوں چاہا کہ اس کے ساتھ ایسا ہو۔"

"کیونکہ میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔ اتنی کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔" ڈورس نے غصے سے کہا۔

عجوم اس کی صورت دیکھنے لگا۔ اسے اتنا اندازہ تو تھا ہی کہ ڈورس کا منال کے ساتھ کوئی سیریس مسئلہ ہے لیکن ڈورس منال سے اتنی شدید نفرت کرتی ہے جتنا وہ چلا کر کہہ رہی تھی' اس بات کا عجوم کا گمان تک نہ تھا۔

"مگر کیوں؟ اس نے ایسا کیا کیا ہے؟"

"جو کچھ بھی کیا ہے' مجھے وہ شدید ناپسند ہے۔ وہ پاپا کی بیٹی ہے' ان کی سیکنڈ وائف کی..."

"تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ وہ تمہاری بہن

ہے۔" وہ حیرت سے ڈورس کو دیکھ رہا تھا۔

ڈورس کے گھر ہونے والی گیدرنگ میں صرف ایک وہی تھا جو شامل نہیں تھا۔ ایک عجوم ہی ایسا تھا جسے اس کی بہن کے بارے میں معلومات نہیں تھی اور نہ ہی ڈورس۔۔۔ کبھی اس کا ذکر کرتی تھی۔

"میں نے ضروری نہیں سمجھا۔" اس نے کمال بے نیازی سے کہا۔ "وہ پاپا کی بیٹی ہو گی' میری بہن نہیں ہے۔"

"تم نے مجھے اپنی بہن کے ساتھ فلرٹ کرنے کے لیے کہا۔۔۔؟" وہ شدید حیرت لیے پوچھ رہا تھا۔

"تم شاید بھول رہے ہو عجوم! تم فلرٹ کرنے کے لیے راضی نہیں ہوئے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ تم صرف اس کے ساتھ دوستی کر لو۔۔۔ باقی کام وقت کر دے گا۔" ڈورس نے جتا کر کہا۔

"وقت نے باقی کام کر دیا ہے۔"

"اوہ گڈ! ٹھیک ہے۔ تو اب تم اسے چھوڑ دو۔۔۔ تمہارا کام ختم۔۔۔"

"مجھے یقین نہیں آ رہا ڈورس! تم اتنی ظالم ہو سکتی ہو؟ تم جانتی ہو جب اسے یہ معلوم ہو گا کہ میں تمہارا فرینڈ ہوں تو اس پر کیا گزرے گی۔"

نہ اس نے ایسے کسی کے ساتھ فلرٹ کیا تھا نہ اسے ضرورت تھی۔ نہ اس کے پاس حسن کی کمی تھی اور نہ ہی پیسے کی۔۔۔ یہ ہی ایک کام تھا جو اس کے گروپ کا کوئی لڑکا نہیں کرتا تھا۔ انہیں گرل فرینڈز کے نام پر فضول سی لڑکیوں کے ساتھ دوستی کرنے کی عادت نہیں تھی۔

اس کا خیال تھا کہ ڈورس کا حسب معمول کوئی چھوٹا سا فضول سا جھگڑا یا مسئلہ ہو گا۔ جیسا کہ اس کا اکثر ہو جاتا تھا اور پھر وہ نت نئی ترکیبوں سے بدلہ لیتی تھی اور ایسے۔۔۔ معاملے میں وہ اپنے دوستوں کو بھی معاف نہیں کرتی تھی۔ منال سے ملنے کے بعد وہ بھول ہی گیا کہ وہ ڈورس کے کہنے پر اس سے ملا تھا۔

ڈورس اسے اپنی ناپسندیدگی کی وجہ بتا رہی تھی۔

اس کے الجھن زدہ چہرے کو دیکھ کر اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے چھوڑ دو سب۔"

"کیسے چھوڑ دوں۔۔۔؟"

"منال اور یونیورسٹی دونوں کو۔۔۔ میرے ہی کہنے پر تم نے منال سے دوستی کی تھی ناں۔ تمہیں اگر مسئلہ ہے تو چھوڑ دو۔۔۔"

"مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" اس نے اطمینان سے کہا۔ "اب میں کسی کو بھی چھوڑ سکتا ہوں۔ منال کو نہیں۔۔۔"

ڈورس نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"I am in love with her" (میں اس سے محبت کرتا ہوں)

"محبت۔۔۔؟" ڈورس ہنسی۔ "اس سے۔۔۔؟"

"مذاق مت اڑاؤ۔۔۔ کوئی شخص اپنی محبت کا مذاق اڑایا جانا برداشت نہیں کر سکتا۔"

اس نے حد درجہ سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔

ڈورس کے آس پاس چھوٹے چھوٹے دھماکے ہونے لگے۔

"منال سے محبت؟ تم منال سے محبت نہیں کر سکتے۔" ڈورس کو گہرے صدمے سے بری طرح چوٹ لگی۔ ہر بار منال اسے کیسے نقصان پہنچا سکتی ہے۔

"میں نہ کرتا اگر میرے اختیار میں ہوتا۔ بس میرا اختیار مجھ پر سے ختم ہو گیا ہے۔ میں اس کی خوبیاں اور خامیاں نہیں جانتا مگر میں اسے بے حد پسند کرتا ہوں۔"

"اور میں۔۔۔؟" ڈورس جیسے ٹوٹنے ہی تو والی تھی۔

"تمہیں اب کیوں اپنا خیال آ رہا ہے ڈورس؟ میں نے تم سے جب بھی جواب مانگا تم نے یہی کہا کہ ابھی نہیں۔۔۔ ابھی نہیں۔۔۔ تم سوچو گی' پھر جواب دو گی۔ اور یہ کہ میں تمہارے انتظار میں نہ رہوں۔ تمہیں بھی کوئی ملے گا تو تم اس سے شادی کر لو گی اور مجھے بھی کوئی ملے تو میں اس سے شادی کر لوں۔۔۔"

"لیکن میں تمہیں چاہتی ہوں عجوم۔۔۔"

"تم مجھے نہیں چاہتیں۔۔۔ تمہیں صرف یہ بات ہرٹ کر رہی ہے کہ میں نے تم پر تمہاری بہن کو فوقیت

دی ہے۔"

"میں نے تم پر ٹرسٹ کیا۔"

"میں نے کچھ برا نہیں کیا ڈورس!" وہ نرمی سے بولا۔ "تمہارے ذاتی اختلافات اپنی جگہ مگر وہ تمہاری بہن ہے۔"

"جب منال کو یہ بات معلوم ہوگی کہ تم میرے کہنے پر اس کے پاس گئے تھے تو وہ تم سے نفرت کرے گی۔"

"کیا تم اسے بتاؤ گی...؟"

"ہاں' میں بتاؤں گی۔" اس نے صاف صاف جواب دیا۔ "اگر میں نے نہ بھی بتایا تو ایک نہ ایک دن اسے معلوم ہو ہی جائے گا۔ تم کب تک چھپاؤ گے؟"

عجوم جانتا تھا وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اگر اسے خود سے پتا چلا تو وہ ہرٹ ہوگی۔ اگر عجوم نے بھی بتایا تو بھی شاید ہی کچھ اچھا ہو۔

"سچائی جانتے ہی وہ تم سے نفرت کرنے لگے گی۔ وہ پاپا سے نفرت کرتی ہے' مجھ سے بھی' ہم سب سے کرتی ہے۔ حقیقت جان لینے کے بعد وہ تم سے بھی کرے گی۔ وہ تمہاری طرف پلٹ کر دیکھے گی بھی نہیں۔"

عجوم نے خود کو بے انتہا بے بس محسوس کیا۔ منال ہر بار صرف اپنی ماں اور پاکستان کا ذکر کرتی تھی۔ اس نے کبھی بھول کر بھی سکندر احمد یا ڈورس کا ذکر نہیں کیا تھا... عجوم جانتا تھا یہ حقیقت ہے جس سے اس کا سامنا جلد ہی ہونے والا ہے۔ اسے خود پر افسوس ہو رہا تھا۔ ڈورس کے کہنے پر اس نے یہ سب کیوں کیا۔ وہ کب سے اتنا گھٹیا ہو گیا تھا۔ جب اسے یہ معلوم ہو گا تو وہ ہرٹ ہوگی۔ اسے لگے گا کہ اس کی ہر بات جھوٹ تھی۔

اس کی ہر بات جھوٹ ہی بننے والی تھی۔

☼ ☼ ☼

اب وہ صرف اتنا ہی کر سکتا تھا کہ ڈورس اور منال کے تعلقات بہتر ہونے تک کا انتظار کرے۔ اور ڈورس اپنے وعدے کے مطابق خود ہی منال کو سب کچھ بتا دے۔ اس نے یونیورسٹی جانا چھوڑ دیا۔ وہ منال سے دور ہی رہنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اچانک منال کو کسی طرح سے معلوم ہو اور وہ یہ سمجھے کہ وہ ڈورس کے کہنے پر اس کے ساتھ وقت گزار تا رہا ہے۔

اس نے اسے فون کیا۔ اسے بتایا کہ وہ ملک سے باہر جا رہا ہے اور کچھ عرصے کے لیے اس سے رابطہ نہیں رکھ سکے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ منال بلاوجہ پریشان نہ ہو۔ اس دوران وہ ڈورس سے اصرار کرنے لگا کہ وہ اس صورت حال کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرے۔

ٹیمپل میں اس کی آواز پر وہ کیسے پلٹتا' جب وہ اس سے کہہ چکا تھا کہ وہ وہاں نہیں ہے۔ اسے نہیں اندازہ تھا کہ اتنے بڑے شہر میں اسے دیکھ لیا جائے گا۔ اسے خوف تھا کہ وہ اس کی ہر بات اس کے منہ پر دے مارے گی۔ اس کے سب سچ جھوٹ بن جائیں گے۔

جب محبت ہوتی ہے تو ہزار طرح کے خدشے اور وسوسے بھی اپنے آپ ہی نمو پانے لگتے ہیں۔ وہ اس ردعمل کا سوچ کر سہم جاتا تھا جو منال کا اس ساری کہانی کو سننے کے بعد سامنے آنے والا تھا۔ وہ خود سے باتیں کرتا تھا' اسے اپنے سامنے کھڑا کر کے' غصے سے بھری اس کی آنکھوں اور تلخ سوالوں کے جواب دیتا رہتا تھا۔

اس رات سب فرینڈز اچانک ہی اس کے فلیٹ میں آ گئے۔ ڈورس سب کو اکٹھا کر کے لائی تھی۔ ان سب کی آمد کے ٹھیک ڈیڑھ گھنٹے بعد دروازے کی گھنٹی بجی۔ وہ کچن میں ان سب کے لیے کوکنگ کر رہا تھا۔

جب وہ باہر آیا تو سامنے منال کھڑی تھی۔ پاس ہی ڈورس کھڑی تمسخر سے اسے گھور رہی تھی۔

وہ جتنی حیرت ظاہر کر سکتا تھا اس نے کی۔ وہ یہاں رات کو اس وقت کیوں آئی تھی؟ جب کہ اسے معلوم ہے کہ وہ یہاں نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ منال رات کو اس کے فلیٹ میں چیک کرنے آئی ہو کہ وہ یہاں ہے یا جھوٹ بول رہا ہے۔

ڈورس نے بڑی ادا سے عجوم کے کندھے پر اپنا

بازو اور پھر اس بازو پر اپنا سر رکھا تھا اور پھر مسکرائی تھی۔ عجوم کو ساری بات سمجھنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگا تھا۔ ڈورس نے اسے دھوکا دیا تھا۔ منال کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔

"منال!" عجوم نے اسے پکارا۔۔۔ مگر وہ نہیں رُکی۔

جاتے جاتے وہ اپنی واضح نفرت کا ثبوت دے گئی تھی۔ مالا گرتے ہی ٹوٹ چکی تھی۔ عجوم نے اس کا ایک ایک موتی چنا' وہ صرف ایک مالا ہوتی تو وہ اسے وہاں پھینک کر نہ جاتی۔ وہ اس کی محبت اتار کر پھینک گئی تھی۔ جتنی تیزی سے وہ اس کے پیچھے گیا تھا اتنی ہی سست روی سے واپس آیا۔ اب اس کا کہیں کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ اسے فون کر رہا تھا مگر فون پر اس کی کال ریسیو نہیں کی جا رہی تھی۔ یہ بدترین انجام تھا جو اس سارے واقعہ کے ساتھ ہوا تھا۔ سب حیران پریشان کھڑے تھے سوائے ڈورس کے۔۔۔

"یہ تم نے کیا کیا ڈورس۔۔۔؟" اس کا لہجہ اور انداز دونوں خطرناک تھے۔

"کچھ بھی نہیں۔۔۔ تمہارے موبائل سے اسے ٹیکسٹ کیا کہ وہ یہاں آجائے۔ وہ یہاں آگئی اور ہمیں دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ شاید وہ ہمیں یہاں ایکسپکٹ نہیں کر رہی تھی۔" ڈورس مزے سے اسے بتانے لگی۔

"وہ مجھے بھی یہاں ایکسپکٹ نہیں کر رہی تھی۔ تمہیں معلوم تھا کہ میں اس کے لیے ملک سے باہر ہوں۔ جب میں یہاں ہوں ہی نہیں تو تم نے یہ حرکت کیوں کی۔۔۔؟" اس کے لہجے اور آنکھوں سے جیسے شعلے نکل رہے تھے۔

"میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ تم صرف میرے ہو۔" ڈورس بھی اصل بات پر آگئی۔

"کب سے۔۔۔؟"

"جب سے ہماری دوستی ہوئی ہے تب سے۔۔۔"

"تم نے پہلے تو کبھی یہ نہیں کہا۔۔۔ پھر یہ اچانک تمہیں کیا ہو گیا؟"

"میں نے تم سے کہا لیکن تم نے یقین نہیں کیا۔۔۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں عجوم! ان سب سے پوچھ لو۔۔۔" ڈورس نے بے چارگی سے سب فرینڈز کی طرف اشارہ کر کے کہا جو سب کے سب ان دونوں کو ہی دیکھ رہے تھے۔

"پھر تم نے وعدہ کیوں کیا۔۔۔ تم نے کہا تھا کہ تم میری مدد کرو گی۔"

"میں تمہاری مدد کیسے کرتی عجوم۔۔۔ میں کیسے تمہیں کسی اور کا ہوتا ہوا دیکھ سکتی تھی۔"

"جھوٹ بول رہی ہو تم۔ تمہیں مجھ سے محبت نہیں' منال سے دشمنی ہے۔"

"میرا یقین کرو۔۔۔"

"تم صرف اپنی بہن سے جیلس ہو۔۔۔ تم اس سے بدلہ لینا چاہتی تھیں۔ اس کے ہاتھ سے چھین کر' مجھے حاصل کرنا چاہتی ہو۔ تم جانتی تھیں کہ مجھے یہاں تمہارے ساتھ دیکھ کر اس کا ری ایکشن کیا ہو گا۔ تم اچھی طرح سے جانتی تھیں اس کا ری ایکشن' لیکن پھر بھی تم نے وہی کیا جو تم کرنا چاہتی تھیں۔ یہ میری غلطی کی سزا ہے جو مجھے ملی ہے۔ مجھے اس سے بڑی سزا ملنی چاہیے۔

تم ان ہی دوستوں میں سے ہو جو گلا نہیں دل کاٹتے ہیں۔ تم نے کہا یونیورسٹی چھوڑ دو' میں نے چھوڑ دی۔ تم نے کہا وقت کا انتظار کرو' میں نے مان لیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ تم میری دوست ہو' تم جانتی تھیں کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور۔۔۔ اور پھر بھی تم نے۔۔۔"

وقت گزر چکا تھا وہ جانتا تھا کہ یہ برا وقت ایسے ہی لکھا گیا تھا۔ اگلے دن وہ سب سے پہلے اس کی یونیورسٹی گیا۔ وہ یونیورسٹی میں بھی نہیں تھی۔ وہ گھر گیا۔ صوفیہ آنٹی سے مل کر وہ مایوس واپس لوٹ آیا۔ اگر یونیورسٹی ٹائم پر وہ گھر میں نہیں تھی تو کہاں تھی۔ انہوں نے اسے بتایا کہ وہ یونیورسٹی گئی ہے اور وہ اسے ہی لینے یونیورسٹی جا رہے ہیں لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ یونیورسٹی گئی ہی نہیں ہے۔ انہیں یہ بتائے بغیر وہ اسے اس کی مخصوص جگہوں پر ڈھونڈتا رہا لیکن وہ کہیں بھی

نہیں تھی۔ پورے ایتھنز میں کہیں بھی نہیں تھی۔
وہ کئی دن تک اسے ڈھونڈتا رہا لیکن وہ وہاں ہوتی تو اسے ملتی وہ تو کہیں اور تھی۔
ڈورس کئی بار اس کے پاس آئی مگر اسے پروا نہیں تھی کہ وہ کتنی شرمندہ ہے۔ یہ سب اسی کی وجہ سے ہوا تھا۔
"یہاں سے جاؤ ڈورس! مجھے مت کہو کہ میں اسے تلاش کرنے میں تمہاری مدد کروں۔ تم نے اپنی تسکین کرنی تھی کرلی..."
"ہاں' میں نے اپنی تسکین کرلی۔ میں اسے اپنے فرینڈز کے سامنے ذلیل کرنا چاہتی تھی جن کے سامنے اس نے میری انسلٹ کی تھی۔ میں پاگل تھی عجوم"۔ وہ رونے لگی۔
"تمہیں مجھ سے محبت ہے ناں... تو اب کرو مجھ سے شادی... میں مزید انتظار نہیں کر سکتا۔" وہ ہر بار ڈورس سے یہ ہی سب کہتا۔
"منال ملے یا نہ ملے... مجھے اس بات سے کوئی لینا دینا نہیں... میں اگلے ماہ تک شادی کا ارادہ رکھتا ہوں۔"
ڈورس جانتی تھی کہ وہ اسے اس بات سے ذلیل کر رہا ہے۔ ذلیل تو وہ خود بھی ہو رہا تھا... اگر غلطی ڈورس کی تھی تو وہ بھی اس میں شامل تھا۔ سزا دونوں کو ملنی چاہیے تھی۔ انسان کو کوئی اپنے کھیل کا میدان کیسے بنا سکتا ہے۔
"تم نے جھوٹا وعدہ کیا تھا نا مجھ سے..."
اسے جیسے صرف اسی بات کا دکھ تھا کہ اس کی دوست نے اس سے جھوٹا دلاسا دیا۔ جو اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ پھر منال کا کیا حال ہو رہا ہو گا جو جھوٹی محبت کا بوجھ سہہ رہی ہو گی۔ سب یاد کرتے ہوئے اس کا ذہنی تناؤ اتنا بڑھ جاتا کہ اسے لگتا اس تناؤ کو تمسل تو کیا دنیا کی کوئی بھی جگہ کوئی بھی انسان دور نہیں کر سکتا۔
"ہاں... میں نے جھوٹا وعدہ کیا تھا..." اس نے ہر جگہ... اپنی شکست تسلیم کرلی۔

"کیا ملا تمہیں پھر اتنا سب کچھ کر کے ڈورس...؟"
"منال کے ساتھ چند ماہ کی محبت تم فراموش نہیں کرپا رہے عجوم اور میری دوستی بھلانے لگے ہو..."
"کیونکہ اس کی محبت میں کوئی فریب نہیں تھا۔ وہ اس کے دل کی طرح خالص تھی۔"
"میں گھر پر پاپا کی ناراضی کو برداشت کر رہی ہوں' چوبیس گھنٹے منال کو تلاش کر رہی ہوں' اور ادھر تم... تم بھی مجھ سے بدگمان ہو۔ کسی ایک طرف سے تو مجھے آسانی دو عجوم!"
"کسی ایک طرف سے تو منال کی آمد کی نشانی دو ڈورس۔ کیا دے سکتی ہو؟" اس کا لہجہ سخت تھا۔
"نہیں..." اپنی ہتھیلیاں رگڑتے ڈورس رودی۔

☆ ☆ ☆

اس کے ایک فرینڈ نے انہیں بتایا کہ اس نے سینٹ کے ساتھ منال کو دیکھا ہے۔ وہ منال کو جانتا تھا۔ یہ اس کا کالج فیلو تھا اور عجوم کا فرینڈ۔ جس طرح ناراضی میں منال گھر چھوڑ کر گئی تھی کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ سینٹ سے شادی کرلیتی۔ وہ منال تھی یا وہ کچھ نہیں کرتی تھی یا بہت کچھ کرلیتی تھی۔ اس کے اس طرح سے گم ہو جانے نے اسے زندہ درگور کر دیا تھا۔ یہ وہ محبت تھی جسے اس نے اپنی وجہ سے کھویا تھا۔
"تم کہاں ہو..." وہ اکثر بے خیالی میں اٹھتے بیٹھتے اسے مخاطب کرتا۔ "میں نے تمہیں کھو ہی دیا ناں!"

خواب کی آواز
یاد کی آواز
تصور کی آواز

اسے اس کی سب آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔
سکندر ہاؤس کی پریشانی اس وقت اور بڑھ گئی جب آدھی رات کو عجوم ڈورس کو پک کرنے آیا تھا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی وہ بری طرح سے ڈر گئی تھی۔ اس کی شکل بتا رہی تھی کہ کچھ نہیں بہت کچھ ٹھیک نہیں رہا۔ اس کے ساتھ کار میں سینٹ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اسے

اپنے ساتھ لے جانے آیا تھا۔ جس طرح اور جس حلیے میں وہ اس کا فون سنتے ہی اپنے کمرے سے نکل کر باہر اس کے پاس آئی تھی۔ اسی حلیے میں وہ فوراً" اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

جتنی یاد اور جتنی دفعہ وہ دعائیں مانگ سکتی تھی وہ مانگ رہی تھی۔ اسے اب معلوم ہو رہا تھا کہ جان پر اصل عذاب کب نازل ہوتا ہے۔ سانسیں کب اپنی گنتی گنتے گنتے ختم ہونے لگتی ہیں۔

شہر کے مرکز کے ایک قریبی بڑے ہسپتال میں انہیں اسے ڈھونڈنے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی اس بار وہ بھاگی نہ ہی وہ اس کی طرف لپکے۔ وہ انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں اپنی موت کی طرف بے نیازی سے بڑھ رہی تھی۔ وہ یہی چاہتی تھی۔ مرجانا۔ زندگی سے منہ موڑلینا۔

وہ وہاں بارہ گھنٹوں سے تھی۔ اس کا کار ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ وہ اپنے کسی کلائنٹ کے ساتھ اس کی کار میں جا رہی تھی۔ اس کی کلائنٹ ایک عورت تھی اور وہ دونوں ہی انتہائی نگہداشت میں تھیں۔ پولیس کو سینٹ سے رابطہ کرنے میں وقت لگا۔ یہ سینٹ ہی تھا جس کے پاس منال گھر سے نکلنے کے بعد گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ مقامی باشندہ ہے اور وہ کوئی ایسا گھر اسے ضرور لے دے گا جس میں وہ رہ سکے۔ اس نے سینٹ کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ اتنا ٹوٹ پھوٹ چکی تھی کہ سر رکھ کر رونے کے لیے اسے ایک شانہ چاہیے تھا۔

سینٹ نے اسی دن اسے ایتھنز سے باہر، سکندر احمد کی پہنچ سے دور ایک فلیٹ کرائے پر لے دیا تھا۔ وہ اس سے رابطے میں رہتا تھا۔ اس کا حال چال پوچھتا رہتا تھا۔

شیشے کے اس پار اسے دیکھتے ہی ڈورس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یہ وہی تھی جس کی وجہ سے یہ سب ہوا تھا۔ بارہ گھنٹوں سے اسے ہوش نہیں آیا تھا۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو صرف وہ زندگی کی بازی نہیں ہارے گی' ڈورس بھی مرجائے گی۔

"آپ دعا کریں اسے ہوش آجائے۔" اس نے صوفیہ کو فون کر کے سب بتا دیا۔

جو تھوڑا بہت سکون تھا اس کے مل جانے کا وہ بھی جاتا رہا۔ رات انہوں نے وارڈ کے باہر گزار دی مگر اسے ہوش نہیں آیا تھا۔ اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہی ڈورس کو اپنا بد صورت چہرہ نظر آنے لگتا تھا۔ عجوم نے اس کے شانے پر تھپکی دے کر اسے تسلی دینی چاہی تھی لیکن وہ تسلی اس کے دل پر بہت بھاری گزری۔ وہ منال کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگا کر کہنا چاہتی تھی کہ۔

"میں اتنی بری بھی تو نہیں تھی کہ تم مجھے ایک بار بھی معاف نہ کرتیں۔"

✡ ✡ ✡

اڑتالیس گھنٹوں کے بعد اسے ہوش آیا اور ٹھیک سات دن بعد اسے کمرے میں شفٹ کر دیا گیا۔ انس اور اسید بھی آچکے تھے۔ وہ اتنی بری طرح سے زخمی ہوئی تھی کہ مہینوں چل پھر نہیں سکتی تھی۔ دو ہفتے وہ نیم بے ہوش ہی رہی۔ اپنی آنکھیں کھول کر وہ سب کو بمشکل پہچانتی تھی۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ اماں کے بعد ماموں اور مامی کو یاد کرتی تھی' بابا' صوفیہ یا ڈورس کو نہیں۔

سکندر احمد کو انہوں نے ابھی تک نہیں بتایا تھا۔ منال کو انہوں نے ایتھنز کے ہی ایک ہسپتال میں شفٹ کروا دیا تھا۔ ڈورس اور عجوم ہر وقت اس کے ساتھ رہتے تھے۔ صوفیہ دن میں کئی بار اسے دیکھ کر جاتی تھیں۔

جب وہ اتنی صحت یاب ہو گئی کہ اس نے ہوش مندی سے دیکھنا شروع کر دیا تو اس کی آنکھوں میں اجنبیت در آئی۔ ناراضی' غصہ' اذیت' لاتعلقی' سب کچھ .... صوفیہ اس کے پاس ہر وقت موجود رہتیں' اسے پیار کرتی رہتیں۔ ایک وہی تھیں جن کے لیے اس کی آنکھوں میں محبت تھی۔ اسے بولنے میں مسئلہ تھا۔ ورنہ شاید چلا چلا کر سب کو کمرے سے باہر نکل

جانے کا کہتی، مگر اس کی آنکھیں یہ سب کہتی تھیں۔ وہ ہاتھ نہیں ہلا سکتی تھی، وہ چل نہیں سکتی تھی۔ ورنہ شاید وہ پھر سے چلی جاتی۔ مگر وہ کیوں جانے دیتے اسے اب' اور کیوں نکلتے اس کے کمرے سے.....

اسپتال کے کمرے میں وہ ہر وقت اس کے ساتھ رہتے۔ دائیں بائیں اوپر نیچے ہر جگہ کوئی نہ کوئی بیٹھا ہوا نظر آتا۔ ان کی ایک بڑی پریشانی سکون میں بدل چکی تھی۔ وہ خطرے سے باہر تھی۔ اتنا کافی تھا کہ وہ ان سب کے سامنے ان سب کے ساتھ تھی۔ یہی بہت تھا۔ وہ اسے اب کہیں جانے نہیں دیں گے۔ صوفیہ آنٹی اپنی دھیمی آواز میں اس سے اچھی اچھی' نرم گرم باتیں کرتیں۔ کسی نے جو گزر چکا تھا اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ زیادہ تر وہ سوئی رہتی تھی۔ ابھی بھی اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ سکندر احمد آکر اس سے ملتے۔ انہیں ذہنی صدمے سے بچانے کے لیے انہیں ابھی اور انتظار کرنا تھا۔

ڈورس دن رات اس کے ساتھ رہتی تھی اور کبھی کہہ دیتی تھی۔

"تم مجھے اس سے زیادہ غصے سے دیکھ سکتی ہو۔ گالی بھی دے لو۔ لیکن میں مجبور ہوں' تمہیں اب جانے نہیں دے سکتی۔"

وہ منہ پھیرتی تو ڈورس ہنس دیتی۔

"تمہیں جلد ہی مسکرانا سکھانا ہوگا منال! بہت سے لوگ کب سے اداس ہیں۔"

☼ ☼ ☼

ڈورس کھڑکی کے پاس ہی بیٹھی میگزین پڑھ رہی تھی۔ عجوم اسے دیکھ رہا تھا۔ کسی کی بھی پروا کیے بغیر وہ سامنے کرسی پر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ احد اپنے گٹار کے ساتھ مصروف تھا۔ وہ کب سے احد کی فضول دھنیں سن رہی تھی اور تنگ آچکی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ ڈورس کے منع کرنے کے باوجود بھی وہ باز نہیں آیا تھا اور اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہ ایک مریضہ کو بری طرح سے تنگ کر رہا ہے۔ جب وہ تنگ آ گئی تو اسے بولنا ہی پڑا۔

"احد! اسے بجانا بند کرو۔ پلیز۔"

"آں۔۔" احد چلایا۔ "میں نے تمہیں کہا تھا ناں کہ یہ گٹار اسے بولنے پر مجبور کردے گا۔"

اس نے ڈورس سے کہا۔ منال نے منہ موڑ لیا۔

"اسے سن کر تو مردے بھی جاگ اٹھیں گے' یہ تو ابھی زندہ ہے۔" اسد شاید بیٹھا بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اب اٹھ گیا تھا۔

"تم لوگ ہی ڈر گئے تھے۔ ورنہ میں نے تو کہہ دیا تھا کہ چڑیلیں اتنی جلدی نہیں مرا کرتیں۔"

"تمہارا برا تجربہ ہے چڑیلوں کے ساتھ؟ اور بھوتوں کے بارے میں کیا کہو گے؟" ڈورس نے کہا۔

"بھوت معصوم ہوتے ہیں۔ ان کے نام احد' اسد اور عجوم ہوتے ہیں۔ وہ چڑیلوں کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کو تیار کرتے ہیں۔"

"تم اپنی بکواس بند نہیں کرسکتے۔" ڈورس نے چڑ کر کہا۔

"تم دیکھ رہی ہو کہ تمہاری بکواس منال نے بند کروادی ہے۔ تم دونوں کا غصہ اس نے گٹار پر نکالا ہے۔ دراصل وہ یہ چاہتی ہے کہ تم دونوں اس کمرے میں نہ رہو۔ گیٹ لاسٹ ہو جاؤ۔" احد نے ڈورس سے سب حساب کتاب ایک ہی بار میں برابر کرلیا۔

"اور یہ یہ بھی چاہتی ہے کہ تمہیں بھی اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا جائے۔" عجوم نے جل کر کہا۔

"اٹھا کر تو تمہیں منال باہر پھینکے گی اسے ٹھیک تو ہو لینے دو۔" کہہ کر وہ اور اسد ہنسنے لگے۔

اس کے پاس بیٹھے وہ ایسی ہی باتیں کرتے رہتے تھے۔ وہ اسے ذہنی طور پر ٹھیک کرنا چاہتے تھے۔ وہ اسے سمجھا رہے تھے کہ اب بس بہت ہو چکا۔

وہ سب شاید جا چکے تھے۔ نیم غنودگی میں اسے ڈورس کی آوازیں آتی رہی تھیں لیکن اب وہ بھی نہیں آرہی تھیں۔ وہ سوئی جاگی کیفیت میں تھی کہ کسی کے ہاتھوں کی گرفت سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا ایک ہاتھ زخمی ہوا تھا جسے وہ حرکت بھی نہیں

دے سکتی تھی۔ سوائے انگلیوں کی حرکت کے۔۔۔ تکلیف دوسرے ہاتھ میں بھی تھی لیکن نسبتاً" کم تھی۔ درد کی ہلکی سی لہر سے اس کی آنکھیں کھل گئی۔

عجوم اس کا ہاتھ پکڑے بیٹھا تھا۔ شاید وہ وہاں کافی دیر سے بیٹھا تھا۔ غصے سے اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کے دباؤ سے نکلنا چاہا مگر اس کا دباؤ ویسے ہی رہا۔ جیسے پروا نہیں اسے کہ اسے درد ہو رہا ہے کہ نہیں۔

"بلاؤ اب گارڈ؟" اسے اپنی طرف دیکھتے دیکھتے پاکر اس نے سنجیدگی سے کہا۔ منال نے اپنا منہ دوسری طرف کرلیا۔

"جواب دو۔۔۔ اب کیسے بلاؤ گی تم گارڈ کو۔۔۔؟"

نرس افراتفری میں اس کے کمرے میں آئی۔ منال کے دوسرے ہاتھ کی انگلی بدستور ایمرجنسی کال پر تھی۔ جیسے وہ سارے ہسپتال کو اکٹھا کرکے ہی دم لے گی۔

"اوہ!" عجوم نرس کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ وہ ابھی اتنی بھی بے بس نہیں ہوئی ہے۔

"کیا ہوا۔۔۔؟" نرس آتے ہی اسے چیک کرنے لگی۔

"انہیں یہاں سے لے جائیں۔ میں ٹھیک ہوں۔" اس نے نرس سے کہا۔

"یہ آئس کریم کھانا چاہتی ہے اور میں نے منع کیا ہے۔ اب یہ مجھے کمرے سے نکال رہی ہے۔"

نرس نے منال کی طرف دیکھا۔ منال نے نفی میں سرہلایا۔

"اس نے کہا کہ اگر اسے آئسکریم نہ کھانے دی گئی تو آئس کریم اس کے اوپر انڈیل دی جائے تاکہ یہ اسے محسوس ہی کرسکے۔" عجوم تیزی سے بولتا ہی جا رہا تھا۔ نرس نے پھر بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا۔۔۔؟" پھر وہ ہنسنے لگی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ ان کا کوئی پرائیویٹ جوک ہے اور وہ چلی گئی۔ عجوم نے ہاتھ بڑھا کر ایمرجنسی کال پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"میں نے مذاق کیا تھا۔ تم نے سچ میں گارڈ بلوالیا۔"

وہ ویسے ہی اس کے پاس بیٹھ گیا۔ جیسے پہلے بیٹھا تھا۔

"اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ تم اب بھاگ نہیں سکتیں یہاں سے۔۔۔ میں سارا دن' ساری رات' کئی دن' کئی راتیں' تمہارا سر کھا سکتا ہوں۔"

وہ ہنسنے لگا وہ بہت خوش تھا کہ وہ دونوں ایک ساتھ آمنے سامنے بیٹھے ہیں۔ وہ زخمی ہے یہ دکھ تھا لیکن وہ ٹھیک ہو رہی ہے اس بات کی خوشی تھی۔

"تم نے یہ سوچا بھی کیسے کہ میں تمہارے بغیر زندگی گزار لوں گا؟" اس نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد کہا۔

"آخری بار میں نے فون پر تم سے کہا تھا کہ تمہیں اپنا انداز میرے لیے بدلنا ہوگا۔ پھر بھی تم نے میرے لیے اپنا رویہ نہیں بدلا۔

جب تم میرے خواب' میری یاد کی آواز سن سکتی تھیں تو تم نے میرے دل کی آواز کیوں نہیں سنی۔ کیا تم نے سنا نہیں تھا کہ عجوم کا دل کیا کہتا ہے۔ کیا میرے دل نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ تمہارے لیے ہمیشہ دھڑکنا چاہتا ہے۔ تم تو وہ منال تھیں جو مجھے ملی تھی۔ جسے میں ملا تھا۔ کیسے ملا تھا یہ بھول کر تم صرف میری بات کا یقین نہیں کرسکتی تھیں۔ کیا تم سے محبت کے لیے مجھے جھوٹ بولنا تھا۔"

وہ اسے سنا رہا تھا۔ وہ سب جو اس نے سوچا تھا کہ وہ جب اسے ملے گی تو وہ اسے بتائے گا۔

"اس فیسٹیول میں تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم نے دنیا کو اپنی اردگرد رقص کرتے دیکھا ہے۔ مجھے اس وقت اس بات کا مفہوم سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ مجھے معلوم ہی نہیں ہوسکا کہ تم نے یہ کیوں کہا۔ کیا محسوس کرکے کہا۔ لیکن جب تم مجھ پر واضح ہوگئی تو مجھے بھی ویسا ہی ہولگا۔ مجھے دنیا کی ہر شے رقص کرتی ہوئی نظر آنے لگی۔ مجھ پر بھی حقیقت کھل گئی منال۔۔۔ مجھے معلوم ہوا کہ میں وہاں ڈورس کے کہنے پر نہیں' خود اپنے لیے گیا تھا۔"

وہ آہستہ آہستہ اسے ایک ایک بات بتا تا رہا تھا۔ وہ جھوٹ کو سچ نہیں کہہ رہا تھا۔ وہ اسے حقیقت بتا رہا

تھا۔ اس بات سے لاعلم کے دروازے کے باہر کھڑی ڈورس اس کی ساری باتیں سنتی اپنے آنسو ضبط کررہی ہے۔

"جو غلطی میں نے کی اس کا ازالہ مجھے کتنا مہنگا پڑا نا عجوم! پاپا کی ناراضی کو برداشت کیا۔ اور تمہیں کھو دیا۔" وہ خود سے سوچنے لگی۔

"بعض غلطیوں کا مداوا۔ شاید ساری زندگی کا روگ مانگ لیتا ہے۔ اس غلطی نے بھی مجھ سے یہی مانگ لیا۔"

☼ ☼ ☼

ڈورس رات دن منال کے ساتھ رہتی تھی۔ صوفیہ خود یہی چاہتی تھیں کہ ڈورس ہی رہے تاکہ دونوں کے درمیان فاصلہ کم ہو۔ جب اس نے چل کر باتھ روم جانا شروع کیا تو وہی اس کی مدد کرتی۔ وہ صاف اسے منع کرتی کہ اسے اس کی مدد اور سہارے کی ضرورت نہیں ہے لیکن وہ جیسے سنتی ہی نہیں تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ اس نے سیکھ لیا تھا کہ جس سے محبت کی جاتی ہے اس سے منسلک ہر چیز اور شخص سے محبت کی جاتی ہے اور وہ سیکھ رہی تھی کہ اپنے پاپا کی محبت میں وہ کس کس سے کتنی محبت کرسکتی ہے۔

جب وہ اٹھ کر بیٹھنے اور سہارے سے چلنے لگی اور اس کے ایک ہاتھ کی بینڈیج کھول دی گئی۔ اس وقت صوفیہ سکندر راحمہ کو اپنے ساتھ لے کر آئیں۔ انہیں معمولی حادثے کا بتایا گیا تھا اور وہ بھی اس سے مل لینے کے بعد۔۔۔ دیر تک اسے خود سے لگائے پیار کرتے رہے۔ منال نے اپنی بانہوں کا گھیر ان کے گرد تنگ کر دیا۔ وہ اپنے اس دنیا میں آنے کے بعد اب اپنے پاپا سے مل رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اسے گھر شفٹ ہونے کے بعد مکمل بیڈ ریسٹ کرنا تھا۔ وہ نہ سہارے کے بغیر چل سکتی تھی اور نہ ہی اٹھ سکتی تھی۔ رات کو پاپا اس کے ہی بیڈ روم میں اپنے لیے رکھے گئے سنگل بیڈ پر سوتے تھے۔ اس کے منع کرنے کے باوجود بھی ڈورس بھی اسی کے کمرے میں صوفے پر سوتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ ایسا کرے۔ وہ اس کا احسان نہیں لینا چاہتی تھی لیکن اکثر رات کو پانی کے لیے یا اٹھ کر بیٹھنے کے لیے کسی کے سہارے کی ضرورت ہوتی تھی اور پاپا سے پہلے وہ اس کے پاس موجود ہوتی تھی۔

رات کو اکثر اس کی آنکھ کھل جاتی اور وہ بے خیالی میں بہت کچھ سوچنے لگتی تھی۔ وہ اس گھر اور اس گھر سے باہر گزرے وقت کو یاد کرتی تھی۔ جس وقت وہ اس گھر سے ہمیشہ کے لیے جانے کے لیے گئی تھی۔ اس دنیا میں خود سمیت اسے کسی چیز میں دلچسپی نہیں تھی۔ وہ پاکستان جانا نہیں چاہتی تھی۔ وہاں وہ ایک اور زندگی طعنوں کے ساتھ نہیں گزارنا چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اب لوگ اسے یہ کہیں کہ اس کے باپ نے اسے گھر سے باہر نکال دیا ہے یا وہ اسے رکھنا نہیں چاہتے۔

وہ ایک اور زندگی اپنے بچپن جیسی نہیں گزارنا چاہتی تھی۔ وہ یہاں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی تھی۔ اسے اپنی تعلیم سے لگاؤ تھا اور وہ اس فیلڈ میں اپنا نام بنانا چاہتی تھی۔ اس نے کوشش کی کہ وہ اپنے ساتھ جڑے رشتوں کو فراموش کرے۔ نہ وہ کسی سے امید رکھے اور نہ ہی اس کی امید ٹوٹے۔ وہ خود کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے نکلی تھی۔ وہ سب کو بھولنا چاہتی تھی لیکن اتنا ہی سب کو یاد کرتی تھی۔ اس نے اٹھارہ ماہ ایک الگ زندگی گزاری تھی۔ وہ زندگی مشکل نہیں تھی لیکن تنہا ضرور تھی۔ اس نے خود اس زندگی کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ اسے مجبور کر دیا گیا کہ وہ ایسی زندگی گزارے۔ وجوہات کچھ بھی تھیں مگر ان کا شکار وہ ہوئی تھی۔

کمرے کی مدھم روشنی میں اس نے پاپا کی طرف دیکھا اور دور صوفے پر خم کھائے سوئی ڈورس کی طرف، اس کے خوب صورت سنہری مائل بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے دور سے بھی دیکھے جاسکتے تھے۔ وہ کئی راتوں سے نہیں،

کئی مہینوں سے نہیں سوئی' اس کی آنکھیں گواہی دیتی تھیں۔ اس کی خوب صورتی عکس کی طرح اس کمرے میں پھیل رہی تھی۔ وہ اس کمرے میں اس کے ساتھ تھی اس کی وجہ سے۔

"پاپا...!" اس نے آہستگی پاپا کو آواز دی تاکہ وہ اٹھ کر ڈورس کا لحاف ٹھیک کر دیں۔

"پاپا..." اس بار اس نے ذرا تیز آواز میں انہیں پکارا۔

"کچھ چاہیے...؟" وہ اٹھ کر اس کے پاس آگئے۔

"ڈورس کا لحاف نیچے گر چکا ہے۔ وہ اسے واپس اوڑھا دیں۔" اس نے صوفے پر سوتی ڈورس کی طرف آنکھوں سے اشارہ کیا۔ سکندر احمد نے حیرت سے منال کی طرف دیکھا۔ پہلے وہ ڈورس کے پاس گئے اور اسے اچھی طرح سے لحاف اوڑھا دیا پھر وہ دوبارہ منال کے پاس آئے۔

"منال..." اس کے قریب بیٹھ کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے...

"مجھے پتا ہے پاپا! آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں۔" اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ سکندر احمد نے بھی ایسا ہی کیا۔

"ڈورس نے جو بھی کیا وہ اس پر شرمندہ ہے۔ میں جانتا ہوں یہ عرصہ اس پر بہت بھاری گزرا ہے۔ تمہاری تلاش اس نے اس طرح کی ہے کہ میں نے اور صوفیہ نے بھی نہیں کی ہوگی۔ تم نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا' اپنے پاپا کو دکھ دینے کے لیے کیا۔ اس نے جو تمہارے ساتھ کیا اپنے پاپا کی محبت میں کیا۔ تم دونوں کا انداز ہی غلط تھا... یا شاید میں ہی غلط تھا۔ جو غلطی سالوں پہلے کی' اس نے مجھے سالوں بعد پچھتانے پر مجبور کیا۔ کیا اتنی ہی سچی محبت تھی ثریا کی..."

وہ خود سے پوچھ رہے تھے۔ منال کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اماں کے ذکر پر...

"تم بھی تو پھر اسی ثریا کی بیٹی ہو... اس جیسی محبت نہ کرو... بس معاف کر دو..."

سکندر احمد ڈورس کے لیے ہر چیز لاتے تھے۔ اب وہ اس کے لیے معافی لا رہے تھے۔ جس کی اسے اشد ضرورت تھی۔

"میں ڈورس کو معاف کر چکی ہوں پاپا!" پہلے اماں مجھے آپ کو معاف کرنے کے لیے کہتی رہی تھیں۔ میں نے ان کی بات نہیں مانی تھی۔ وہ مجھ سے روٹھ گئی تھیں۔ شاید... میں نہیں چاہتی' اب آپ مجھ سے

روٹھ جائیں۔"

صوفے پر خم کھائے لیٹی ڈورس نے لحاف کے نیچے کھلی آنکھوں کو ایسے بند کیا جیسے بہت لمبے عرصے کے بعد اب اپنی نیند پوری کرنے لگی ہو۔

☆ ☆ ☆

کیری جو انٹرنیشنل برانڈ کا ایجنٹ تھا۔ ایک بار پھر ڈورس کو سائن کرنے کے سلسلے میں اس سے ملنے آیا تھا۔ اگرچہ اس بار کنٹریکٹ بہت بڑا تو نہیں تھا لیکن "شو" بہت بڑا تھا۔ ایسی دلکش آفر کے باوجود ڈورس نے اسے انکار کر دیا تھا۔ کیری کو نجانے ڈورس کی ہی اتنی ضرورت کیوں آپڑی تھی جو وہ بار بار ڈورس کے گھر کے چکر لگانے لگا تھا۔

"تم اسے کیوں انکار کر رہی ہو؟"

ڈورس اپنے کمرے میں کسی میگزین کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ منال ہی تھی جو اس سے پوچھ رہی تھی۔ وہ اس کے خود کو مخاطب کرنے پر حیران نہیں ہوئی تھی۔ جیسے ڈورس کو یقین ہو کہ اتنی تکلیف سہ کر' اتنی ذلت برداشت کر کے' اتنے دکھ اٹھا کے' اتنا برا رویہ برداشت کر کے اب تو منال کو اسے مخاطب کرنا ہی تھا۔

"مجھے نہیں کرنی اب ماڈلنگ۔۔۔"

"کیوں ڈورس؟"

"بس اب میرا دل نہیں چاہ رہا۔۔۔" اس نے نرمی سے کہا۔

"وہ کافی بار آچکا ہے۔ اسے انکار مت کرو۔۔۔ میری خاطر ہی مان جاؤ۔" منال نے اپنا ہاتھ ڈورس کے کندھے پر رکھا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

ڈورس نے منال کے ہاتھ کو دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں میں۔۔۔

"اب تم کیا چاہتی ہو کہ میں کیا کیا کروں؟" اس نے اداسی سے کہا۔

"وہ سب جو تمہیں کرنا چاہیے۔"

☆ ☆ ☆

فیشن ویک کا تیسرا دن تھا۔ جب وہ عجوم' آنٹی کے ساتھ وہاں پر آئی تھی۔ اسے چلنے میں مسئلہ تھا۔ دس قدم چلنے کے بعد ہی وہ تھک جاتی تھی لیکن ڈورس کے اصرار پر وہ وہاں آگئی تھی۔

ایک گھنٹے تک مختلف ڈیزائنر کے کپڑوں کی واک ہوتی رہی تھی۔ ڈورس اس دن کی شوسٹاپر تھی۔ اسے سب سے آخر میں آنا تھا اور وہ آگئی۔ وائٹ برائیڈل ڈریس پہنے۔ مسکراتی ہوئی۔ اس کے آنے پر سب نے تالیاں بجائی تھیں۔ منال تالیاں نہیں بجا سکی تھی۔ عجوم نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

"تمہارے ساتھ اس طرح بیٹھنے کے لیے مجھے ایک عرصہ انتظار کرنا پڑا ہے منال!" عجوم نے اسے عین اسی لمحے بتایا تھا جب ڈورس ریمپ پر چلتی ہوئی ان کے قریب پہنچ چکی تھی۔

"مجھے بھی۔۔۔" منال نے اعتراف کیا۔

ڈورس مسکراتے ہوئے ان دونوں کو ہی دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ مسکراہٹ کے بھیتر' خوشی کی گہرائی میں اندر کہیں ایک جھیل ابلنے لگی تھی۔ آنکھوں کے چشمے سے کھارے پانی کی۔۔۔

وہ اب فوٹوگرافرز کو پوز دے رہی تھی۔ دھیان کہیں اور تھا۔۔۔ مسکرانا مشکل تھا۔

"تمہارا شکریہ عجوم! تم کیری کو منا کر واپس لے آئے اور اس نے ڈورس سے دوبارہ کنٹریکٹ کر لیا۔" منال عجوم سے کہہ رہی تھی۔

"شکریہ تو ابھی مجھے بھی ادا کرنا ہے۔۔۔ سینٹ کا۔۔۔ اس نے مجھے میری زندگی بھر کا کنٹریکٹ واپس دلوا دیا ہے۔" عجوم نے سرگوشی سی کی۔ منال شرما گئی۔

ہال کی لائٹس چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔ جیسے وہ کسی کی خوشی میں مگن ہوں۔ پھر وہ بند ہو گئیں۔ آج کا شو ختم ہو چکا تھا۔ لیکن زندگی ابھی شروع ہوئی تھی۔

شازیہ الطاف ہاشمی
شکست
WWW.PAKSOCIETY.COM

صبح صبح کا وقت تھا' چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ جلدی اٹھنا اور پھر ناشتا تیار کرنا آسان نہیں تھا' اوپر سے پرویز اس کا دیور علیحدہ ہونے کے باوجود اس کے سر پر سوار رہنا اپنا فرض سمجھتا تھا' جیسے ہی پہلا پراٹھا اترا سالن اس نے کٹوری میں ڈالا اور پاس روتے بچوں کو پچکارا' اپنے پیچھے پرویز کو پایا تھا' جو پورے انہماک سے کھانے میں مصروف تھا۔

اس کے چہرے پر بجی عجیب سی مسکراہٹ جو اس کی کبھی سمجھ میں نہ آسکی تھی۔ وہ طنزیہ ہنستا تھا۔ اسے چڑاتا تھا یا اسے تنگ کرنے کو ایسا کرتا تھا' مگر وہ کرتا روز ہی تھا' بڑے بھائی کی گردن پر سوار رہنا' ٹک کر کوئی کام نہ کرنا اور سارا دن صبا کو تنگ کرتے رہنا' کسی نہ کسی طرح سے اس کے کام تھے۔ وہ دوبدو لڑائی نہیں کرتا تھا' بلکہ اس کے لڑنے کے انداز انتہائی گھٹیا تھے۔

چھوٹے بچوں کے ساتھ گھر سنبھالنا' جوائنٹ فیملی سسٹم اور شریر سسرالیوں اور چالاک جٹھانی کے ساتھ اس کی زندگی کسی طرح آسان نہ تھی۔ پہلا دوسرا اور تیسرا پراٹھا نکلنے کے بعد وہ غور سے صبا کو دیکھ رہا تھا' جبکہ اس کا شوہر اسے پھوہڑ کہہ کر جاچکا تھا۔ وہ شاید پھوہڑ عورت ہی تھی۔ حاسد اور کمینے لوگوں کے درمیان رہتی تھی اور ان سے جان نہیں چھڑا سکی تھی۔ شاید ایسا ہی تھا۔ وہ آنکھیں رگڑ کر روٹی الٹنے لگی تھی۔

سارا آٹا ختم ہوچکا تھا۔ سالن روٹیاں سب ختم تھا۔ دو آدمیوں کا ناشتا سیاہ رنگت والا شیطان اکیلا کرچکا تھا اور وہ صرف رو سکتی تھی یا پھر پورا دن اداس رہ کر قسمت کو کوس سکتی تھی۔

دور سے اچھے دکھائی دینے والے اندر سے کیسے تھے' یہ کوئی اس سے پوچھتا۔ وہ بھی ان کے لہجے اور صورتوں سے دھوکا کھاگئی تھی اور برا کھاگئی تھی۔ بے حد چپ گم صم رہنے والا جیٹھ جتنا بہانے باز اور کم ظرف تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کا مقصد صرف آرام کرتے ہوئے بیٹھ کر دوسروں کی کمائی پر زندہ رہنا ہی تھا اور جٹھانی کی تیزیاں' چالاکیاں اس کا بی پی مسلسل لو رکھنے کو کافی تھیں جو اسے رہنے لگا تھا۔

اور سب سے بڑا کردار ساس جو کئی تنہا کرداروں کا مجموعہ تھیں۔ ان کی درد بھری آواز اور آنسو اور بیٹھے بیٹھے کھیل کھیلنا' اسے سوتے میں بھی جگا دیتا تھا۔ وہ قابل احترام ہستی تھیں یا بنادی گئی تھیں' اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ بڑے بیٹے کے مفادات کے لیے سیاست سیاست کھیلتی تھیں اور کمال کھیلتی تھیں۔ زندگی یہاں مشکل نہیں مشکل ترین تھیں۔ وہ کپڑے دھونے بیٹھتی تو جٹھانی موٹر بند کردیتی۔ جٹھانی کی بدتمیز لڑکیاں گھر اودھم کردیتیں' کوئی چیز ٹھکانے پر نہ رہتی اور پرویز ہاں پرویز وہ اس مصروف وقت میں ایک ایسی حرکت کرتا تھا جو اسے بری طرح تھکا ڈالتی تھی۔ وہ ایسے ہی وقت میں بچوں میں اناد یہ یا سعد کو لے کر غائب ہوجاتا تھا اور آج سعد غائب تھا۔

ساس جانتی تھی کہ یہ حرکت اس کے لخت جگر کی ہی ہے' سب کو پتا تھا وہ کسی کے سامنے ہی صرف اسے بے خبر رکھ کر اُلجھا کر بچوں میں سے کسی ایک کو لے کر گھنٹے دو گھنٹے او جھل ہوجایا کرتا تھا۔ صبا چیختی رہ جاتی' ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھکنے لگتی' مگر اس کی پریشانی اور پرویز کی گھٹیا حرکت پر ہر کوئی خوش اور مطمئن نظر آتا تھا۔ اس کی مدد کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس کے کندھے اور گردن درد سے بھر جاتے اور آنکھیں رو رو کر سوج جاتیں' تب وہ اچانک ہی کہیں سے بچہ لاکر رکھ دیتا اور اس وقت وہ صبا کو دنیا کا مکروہ ترین آدمی لگتا' ہر وہ شخص جو کسی ماں سے اس کے بچے کو جدا کردے یا چھپادے' وہ مکروہ ہی ہوتا ہے۔ اس کی سیاہ شکل پر تیزاب ڈالنے کو جی کرتا تھا۔ وہ اسی سزا کا مستحق تھا اور اس نے ٹھیک سوچا تھا' اسے ذہنی اذیت دینے والے کا یہی حشر ہونا چاہیے تھا' مگر وہ بے بس تھی اور کتنی بے بس تھی' اسے معلوم تھا۔

ارسلان اسے ہی نکمی اور بدبخت قرار دیا کرتا تھا۔ پرویز دور سے دانت نکوستا اسے دیکھ کر ہنسا کرتا تھا۔ اتنے کم ظرف اور چھوٹے لوگوں میں وہ پھوہڑ تھی یا اسے بنادیا گیا تھا۔ سارا سارا دن چھوٹی چھوٹی اذیتوں کی

نذر ہو جاتا تھا۔ نہاتی تو کوئی باہر سے نل بند کر دیتا تھا' سونے لگتی تو پنکھے کا تار کھینچ لیتے اور بچوں کو چپکے سے گھر سے باہر نکال دینا بھی روز کا معمول تھا۔ چھوٹا سا سعد کبھی سیدھی گلی میں چلتے چلتے کہاں سے کہاں نکل جاتا اور وہ اسے پھولتی سانسوں میں جا پکڑتی' جس گھر کا کوئی دروازہ نہ ہو' وہ گھر گھر نہیں ہوتا' دوزخ ہوتا ہے' تپتی گلیوں میں وہ روتی جاتی اور سوچتی جاتی اسے اپنے آنسو خود ہی صاف کرنے تھے' اپنے دل کو خود ہی تسلی دینی تھی۔ ساس بیٹے کی نظر میں اونچی تھی' جیٹھ شوہر کا بھائی تھا اور دیور چھوٹا بھائی اس کی جگہ کہیں نہیں نکلتی تھی یا شاید کہیں تھی ہی نہیں۔

بڑی محنت سے ارسلان کے سوٹ جما جما کر استری کیے اور انہیں الماری میں لٹکا دیا۔ صبح ارسلان کا آف وائٹ سوٹ پہننے کا ارادہ تھا۔ سعد اس کے سامنے رو رو کر تھک ہار کر خود ہی سو گیا تھا جبکہ انادیہ مٹی سے کھیلنے میں مصروف تھی۔ ساس نے پوتے کو چیخ چیخ کر سر پر آسمان اٹھائے دیکھ کر بھی آگے بڑھ کر چپ نہیں کروایا تھا۔ بلکہ وہ تو اسے سوتا دیکھ کر فل الیوم میں ٹی وی دیکھتی تھیں یا پھر کوئی ایسی اٹھا پٹخ کرتیں کہ وہ کچی نیند ہی اٹھ کر بیٹھ جاتا اور اگلے دو گھنٹے چپ ہونے میں نہیں آتا تھا۔

کہنے والے کہتے تھے کہ اپنا کھاتی پکاتی ہے مگر سسر کی نظر بھی اس کے کھانے پینے پر لگی رہتی تھی اور ساس کی بھی اور وہ دے کر بھی مجرم ہی تھی۔ احسان نہیں تھا۔ وہ اچھی نہیں تھی' ان کا حق تھا۔

☼ ☼ ☼

پرویز غیر شادی شدہ تھا۔ ماں اور بھابھی کو کھاتے پکاتے دیکھ کر مستقل اس کے پاس بیٹھ کر کھاتا تھا۔ بات کھانے کی نہیں تھی۔ بات پیچھے پڑنے اور ضد کی تھی۔ نفرت کی تھی۔

صبا کو تنگ کر کر کے تھکا تھکا کر گھر سے نکالنا اس کی ضد تھی' تو گھر نہ سے جانے کی ضد اسے بھی تھی۔ ماں' باپ تھے نہیں' بھائی' بھابھی لاہور میں رہتے تھے۔

اسے پتا تھا کہ بھائی اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ وہ صبا کو کبھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے مگر صبا انہیں تکلیف دینا نہیں چاہتی تھی۔ اتنے بڑے شہر میں ان کے اپنے کتنے مسائل تھے۔ دودھ' آٹا' چینی' چکن سب کتنا مہنگا ہے اور بچوں کی فیسیں' کپڑے' جوتے' سب جان نکال دینے کی حد تک مہنگے تھے۔ اسے ہمیشہ ہی اپنے آدھے سے بھی زیادہ سفید بالوں والے بھائی پر رحم آتا تھا۔

ان کے حالات اللہ کرے کہ بہت اچھے ہوں' تب بھی اس کا حق اپنے شوہر پر تھا اور ماجد بھائی پر اس کی بھابھی اور بچوں کا۔ اسے یہ جنگ یہیں بیٹھ کر لڑنی تھی۔ جیسے اس کی نندیں دور اپنے گھروں میں بیٹھی بھائی کے گھر میں اداسی پھیلائے رکھتی تھیں اور خوش ہوتی تھیں اس کے معاملے اس کی نندیں' جیٹھ' دیور سب ایک ہی تھے چاہے اور کسی بات پر اختلاف رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں۔ اسے پتا تھا کہ ارسلان اچھا کماتا ہے۔ اسے گھر بیٹھے مہنگے' سستے کی فکر نہیں تھی۔ صحیح معنوں میں آٹے' دال کے بھاؤ کا علم نہیں تھا۔ سب آتا تھا اور وافر مقدار میں آتا تھا۔ یہی تکلیف اندر ہی اندر سب کو چاٹ رہی تھی اور دور بیٹھی نائلہ باجی کے سینے پر سانپ لوٹتے تھے' کیونکہ شوہر نے انہیں ان کے مقام پر رکھا تھا اور سروری آپا کے اندر بھی ابال یہی تھا۔ اسے بھابھی کا کھانا' پینا' پہننا سونے نہیں دیتا تھا۔ ہاتھ نچا نچا کر کھولتی رہتی تھیں۔

"کھاتی پیتی ہے۔" وہ تو جیسے صبا کو کچا چبا ڈالنا چاہتی تھیں۔ پرویز کا درد بھی اس سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ سب کچھ ڈھیروں ڈھیر آیا کرتا تھا اور اکٹھے رہتے ہوئے صبا کو ہی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی تھی۔

☼ ☼ ☼

ارسلان نے مہربانی کی تھی اور دل کھول کر کی تھی۔ اسے علیحدہ کر دیا تھا اور یہ علیحدگی درد سر بن چکی تھی۔ سب کچھ ہو کر بھی کچھ نہیں تھا اس کے پاس' جب معید اس کی گود میں آنے والا تھا تو وہ بھاگ بھاگ کے

کام کیا کرتی تھی۔ اناد یہ اب تھوڑا بہت ہاتھ بٹانے والی ہوگئی تھی۔ مگر پرویز اب خونخوار گدھ کی شکل اختیار کرچکا تھا۔ ٹی وی پر اس کا قبضہ تھا۔

گھر کے سارے کمروں کے کونے کونے کی تلاشیاں لیتا پھرتا تھا اور اس کی ہمت نہیں تھی کہ وہ روک لے۔ گھر کی اکثر چیزیں وہ اٹھا کر کبھی ماں کو تھما دیتا تھا۔ کبھی بڑی بھابھی کو اور وہ چپ چاپ بس دیکھتی جاتی تھی۔ موٹر سائیکل کو عجیب سالاک لگا کر وہ باہر چلا گیا تھا اور اچانک ہی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ ارسلان کو موٹر سائیکل بہت پیاری تھی۔ وہ اس کا خیال رکھتا تھا اور پرویز اسے توڑنے پھوڑنے میں مگن رہتا تھا۔ کبھی کچھ توڑ دیتا' کبھی کچھ۔ وہ تو بچوں کے ساتھ اکثر رکشے میں بیٹھ کے بازار جایا کرتی تھی۔

پرویز موٹر سائیکل اپنے دوستوں کو بھی تھما دیا کرتا تھا اور وہ دیکھتی رہتی تھی' کہتی کچھ نہیں تھی۔ ارسلان جب اس سے لڑنے لگتا تھا تو پرویز اکثر تینوں بچوں کو اٹھا کر بڑی جٹھانی کے پاس سلا آتا تھا۔

"مطلب تم اسے گھر سے نکالو' بچے ہم پال لیں گے۔" اور خود دور کھڑا جلتی پر تیل ڈال کر لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ سعد' انادیہ اور معید کی چیخیں رات کا سینہ چیرتی دور' دور تک پھیل جاتیں۔ اور سب خوش ہوتے۔ جشن کا سماں ہوتا تھا۔

☆ ☆ ☆

وقت گزرتا گیا اور اتنا گزر گیا کہ خود اسے بھی خبر نہ ہو سکی تھی۔ اس کے سر میں سفیدی نے بکھرنا شروع کردیا تھا۔ پرویز کی نظر اب اس کے زیورات پر تھی جو اس نے بچیوں کے لیے سنبھال رکھے تھے۔ پرویز نے یہ بات ارسلان کے کان میں ڈالی تھی۔ اس کی ٹال مٹول کا مطلب وہ بخوبی سمجھ چکا تھا مگر "پھر بن جامیں گے۔" اس کی ایک ہی رٹ تھی اور رہا پرویز تو اس جیسا مکار اور بدنیت آدمی جس سے پھوٹی کوڑی نہیں مل سکتی تھی وہ جانتی تھی۔

پرویز آج بھرا بیٹھا تھا اور اتنا بھرا تھا کہ اس پر الٹ پڑا تھا۔ اور یہ غصہ اس قدر بڑھا تھا کہ وہ صبا پر ہاتھ اٹھانے والا تھا۔ کیونکہ وہ سب بے دھڑک کر رہا تھا۔ ارسلان نے اسے کبھی ٹوکا نہیں تھا۔ سب اسے مرد سمجھتے تھے اور وہ مرد کے سنگھاسن سے اترنا چاہتا بھی نہیں تھا۔

وہ آج تک صرف اپنی حکمت عملی کی وجہ سے بچتی آئی تھی۔ صرف اپنی وجہ سے۔ اس کے اٹھتے ہاتھ کو کسی نے پکڑ لیا تھا۔ اس کا ہاتھ اس کے گال تک پہنچنے نہیں پایا۔

سعد نے پرویز کے مضبوط ہاتھ کو اپنی جوان گرفت میں لے رکھا تھا اور وہ خاموش نظروں سے چچا کو دیکھ رہا تھا۔

"بس چاچو! اب اور نہیں۔" اس نے زور سے ہاتھ جھٹک دیا تھا۔ سعد کی دادی نے شور مچا دیا تھا۔ نافرمان پوتا' بدتمیز بھتیجا۔

پرویز کا اسے یقین تھا کہ اب وہ کبھی نہیں آئے گا اور ارسلان کے کہنے پر بھی نہیں' کیونکہ جیت بالآخر حق' سچ ہی کی ہوتی ہے۔ جھوٹ کی عمارت ہی تھی' آج کی شام نے فیصلہ سنا دیا تھا اور ٹاہلی کے گھنے درخت کے پار ڈوبتا سرخ سورج پرویز کی ساری اکڑ بھی ساتھ لے کر رخصت ہوا تھا۔ کیونکہ ہر عروج کو زوال ہوتا ہے' مگر پرویز جیسوں کو شاید پتا نہیں ہوتا۔

☆

سلویٰ سیف اللہ بٹ

برآمدے کی گولائی کو چار ستون گول کرتے تھے۔ ایک ستون دوسرے سے ساڑھے چار فٹ دور' دس فٹ اونچائی کے ساتھ کھڑا تھا۔ ہر ستون کے ساتھ بوگن ویلیا کی بیلیں لپٹی تھیں۔ برآمدے کے بیچوں بیچ سفید چادریں بچھی تھیں جن پہ عزیز واقارب عورتیں بیٹھی سیپارے پڑھ رہی تھیں۔ وسط میں چھوٹی میز پر سپارے اور اگربتیاں سلگا کر رکھی گئی تھیں۔ اگربتیوں سے اٹھتے دھند کی مانند مرغولے ماحول کو حد سے زیادہ بوجھل اور سوگواریت میں بدل رہے تھے۔

رابعہ احمد نے سپارہ بند کر کے میز پر رکھ کے دعا کو دیکھا۔ جو ٹھنڈے فرش پر ستون سے سر ٹکائے' مرحومہ ماں کا سفید دوپٹہ اوڑھے تھی۔ ہلکی گلابی مائل' سوجی آنکھیں' کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔ جن کی زمین تھوڑی تھوڑی دیر بعد سیراب ہو جاتی اور وہ کبھی دوپٹے اور کبھی ہتھیلی سے رگڑ کر خشک کرتی جاتی۔ اس نے صبح سے ماں کو پڑھ کر بخشنے کے بجائے رونے پر ہی سارا زور لگا رکھا تھا۔

"دعا بیٹی! اب رونا چھوڑ کے اپنی ماں کی مغفرت کے لیے دعا کرو' اللہ کا ذکر تمہاری ماں کا رستہ بھی صاف کرتا جائے گا اور تمہارے دل کو بھی صبر اور سکون کی

مکمل ناول

طاقت ملے گی۔"
رابعہ احمد نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی نرمی اور محبت سے سمجھایا۔
وہ اسے سکون کی راہ سمجھا رہی تھیں۔ لیکن دعا کو اس رونے میں بہت سکون مل رہا تھا۔ یہ صرف ماں سے بچھڑنے کا رونا نہیں بلکہ ان عمر بھر کی محرومیوں کا رونا تھا۔ جو اس کے نصیب کا حصہ رہی تھیں۔ جنھوں نے اسے عقل و شعور کے باوجود کبھی زبان کا مفصل اور مفید استعمال نہ کرنے دیا تھا۔
"اٹھو تم کل سے بھوکی ہو۔ میں نے تمہارے لیے دال چاول بنائے ہیں وہ تھوڑے سے کھالو۔" رابعہ احمد نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔
مرحومہ ثریا بیگم نے کچن کے لیے کبھی ملازمہ نہیں رکھی تھی۔ وہ خود بہت سگھڑ، سلیقہ مند اور باحوصلہ خاتون تھیں۔ ابھی تک سل بٹے کا استعمال کرتی تھیں۔ برتن تک خود دھوتیں۔ ان کا خیال تھا اگر گرہستن عورت کھانے پینے کی ذمہ داری خود اٹھائے اور اللہ کا نام لے کر ہر کام شروع کرے تو اس سے رزق میں برکت ہوتی ہے۔
دعا ابھی تک بے یقین تھی۔ حالانکہ ماں کو مرے ہوئے پندرہ گھنٹے سے زیادہ بیت چکے تھے۔ دعا ثریا بیگم کی اکلوتی اولاد تھی۔ وہ باقاعدگی سے نماز کی پابند تھیں اور ہر نماز کے بعد دعا کو آیتیں اور چند سورتیں پڑھ کے دم کرنا ان کی زندگی کا معمول تھا۔
کل جب وہ پڑھنے میں خاصی مگن تھی۔ ثریا بیگم نے نماز عصر ادا کر کے وظیفہ پڑھ کے دعا کو آواز دی۔
دعا ان کی پکار پر کتاب یونہی ہاتھ میں پکڑے ان کے پاس بیڈ پر جا بیٹھی اور پھر سے مطلوبہ صفحہ نکال کر پڑھنے میں مگن ہو گئی۔ وہ آج رات تک اس کتاب کو ختم کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اس نے اپنے کانوں سے ماں کو بسم اللہ پڑھتے سنا اور جب وہ چوتھا صفحہ بھی پڑھ چکی اور ماں نے پھونکی ماری تو اس کے ہاتھ اور نظریں اس لمحہ بھر کی آگاہی نے ساکت کر دیے۔ اس نے نظریں اور تھوڑا سا سر اٹھا کے ماں کو دیکھا۔ جن کے دائیں ہاتھ میں تسبیح اور بائیں ہاتھ میں سینے سے لگا پنج سورۃ تھا اور گردن بائیں طرف ڈھلکی ہوئی تھی۔ دعا کی چیخ و پکار نے گھر کے ملازمین کو اکٹھا کر دیا تھا۔ سب سے پرانے اور ادھیڑ عمر ملازم نے ثریا بیگم کی سانس اور نبض چیک کر کے ان کی موت کی تصدیق کر دی تھی۔

☼ ☼ ☼

انہوں نے دعا کو کھانا کھلا کے سلا دیا۔ ڈرائنگ روم میں الیاس احمد اور ریاض احمد فاتحہ خوانی کے لیے آنے والے مردوں کے پاس بیٹھے تھے۔ مگر اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ دونوں بھائی محو گفتگو تھے۔
"آپ لوگوں نے دعا کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟" رابعہ احمد نے مقابل صوفے پر بیٹھتے دونوں بھائیوں کو دیکھتے سوال ڈالا۔
"ہمیں بھلا کیا فیصلہ کرنا ہے۔" الیاس احمد بولے۔
"یہ گھر دعا کے سوتیلے باپ کا ہے۔ اس کی سگی ماں مر چکی ہے۔" رابعہ احمد نے خاصی سنجیدگی سے جتلایا۔
"حماد تو ابھی زندہ ہے ناں۔" الیاس احمد نے دوسرا نقطہ اٹھایا۔
"حماد، دعا کا سوتیلا بھائی اور اس کے لیے نامحرم ہے۔" رابعہ احمد نے خاصے چبا کے الفاظ ادا کیے۔ انہیں دیور کا معاملے کی گمبھیرتا کو نہ سمجھنا برا لگا تھا۔
"ہوں، رابعہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں، دعا اب ہماری ذمہ داری ہے۔" تب سے خاموش بیٹھے ریاض احمد نے فیصلہ لے لیا۔ جو الیاس احمد کو بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ رابعہ احمد اثبات میں سر ہلا کے اٹھ گئیں۔
"آپ شام کو گاڑی بھجوا دیجیے گا تب تک میں دعا کو انفارم کر دوں وہ اپنی پیکنگ کر لے گی۔"
ریاض احمد بھی جانے کے لیے اٹھ گئے۔ الیاس احمد نے بھی بھائی کی تقلید کی۔
"ٹھیک ہے پھر شام کو ہو سکا تو میں خود آجاؤں گا۔ ورنہ ڈرائیور کو بھیج دوں گا۔ خدا حافظ۔"

دونوں بھائی باہر کی طرف نکل گئے۔

"خدا حافظ' فی امان اللہ۔" رابعہ احمد زیر لب بڑبڑائی تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ سو کر اٹھی تو اس نے ذہنی طور پر خود کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اور سب سے پہلا خیال ذہن میں یہی آیا "مجھے امی جان کو پڑھ کے بخشنا ہے۔"

اس نے نہا دھو کر صاف ستھرا لباس پہنا۔ ابھی وہ وضو کر کے کمرے میں آئی تھی کہ رابعہ احمد دستک دے کر داخل ہوئیں۔

"گڈ یہ ہوئی ناں' اچھی بیٹیوں والی بات۔" رابعہ احمد کو اسے صاف ستھرا دیکھ کے اطمینان ہوا تھا۔

"اچھا اب جلدی سے اپنا ضروری سامان پیک کر لو۔ میں بھی تمہاری ہیلپ کرواتی ہوں۔" انہوں نے کہتے ہوئے وارڈروب کھول لی۔

"کیوں میں کہیں جا رہی ہوں۔" دعا نے حیرت سے سوال کیا۔ رابعہ احمد ہینگ کیے ہوئے کپڑے بیڈ پر ڈالنے لگیں۔

"آخر میں تمہارے ساتھ یہاں کتنے روز رہ سکتی ہوں۔ جانا تو تمہیں پھر بھی وہیں ہے ناں تو پھر ابھی کیوں نہیں۔ سوری بیٹا! میں تمہارے سنبھلنے تک مزید رک جاتی۔ لیکن تمہارے ماموں' عمر' عمیر آفس اور نوال کالج جاتی ہے جب تک میں موجود نہ ہوں۔ ملازمہ سارا سسٹم پلیٹ کر دیتی ہے۔"

دعا کو بتاتے ہوئے وہ کپڑوں کا ڈھیر بیڈ پر ڈال چکی تھیں۔ دعا صرف دیکھ اور سن رہی تھی۔

"بیگ کدھر ہے' میں یہ سارے کپڑے اس میں ڈالوں۔ مزید تم نے جو رکھنا ہے وہ بھی نکال لو۔"

رابعہ بیگم بولنے کے ساتھ سب سمیٹتی' دعا کے اتار چڑھاؤ سے بے خبر تھیں۔

"ممانی جان کیا میرا جانا بہت ضروری ہے۔" دعا کی آواز میں نمی گھل گئی۔

یک دم بدلتے حالات اس کی برداشت پر خاصا بوجھ تھے۔

یوں اچانک بیٹھے بٹھائے' ہنستے ہنساتے سب کیسے بدل گیا۔ ماں کے دور ہونے کا غم کم تھا جو اسے گھر بدر بھی کیا جا رہا تھا۔ وہ تو بیٹھی رومانوی ناول پڑھ رہی تھی۔ جس میں ہیروئین کو بہت خوب صورت خواب آتے ہیں۔ وہ ان خوابوں کی تعبیر میں سرگرداں ہے۔

رابعہ احمد ساکت بیٹھی دعا کے قریب آئیں اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"تم بچی نہیں ہو دعا! سب اچھی طرح سے سمجھتی ہو۔ حماد تمہارا سوتیلا بھائی اور تمہارے لیے نامحرم ہے۔ تم دونوں کا ایک چھت تلے رہنا مناسب نہیں۔" انہوں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں بہت کچھ کہہ دیا۔

وہ ممانی کو بہت کچھ بتانا چاہتی تھی۔ حماد کو اس نے کبھی سوتیلا بھائی نہیں سمجھا۔ وہ اس کے کردار کی گواہ

تھی۔ وہ بہت سلجھا ہوا اور شریف تھا۔ بالکل سگے بھائی جیسا۔ وہ اپنی ماں کے گھر اور کمرے کو چھوڑ کے کہیں نہیں جانا چاہتی تھی۔

ایسا اس کے ساتھ ہمیشہ ہوتا آیا تھا۔ وہ بہت کچھ سوچ سکتی تھی لیکن زبان کھولنے کی اجازت نہیں تھی۔ کیونکہ اس کی لمبی تقاریر صرف اسکول و کالجز تک محدود تھیں۔ دلائل اور ضدیں کرنے کا اختیار اسے ماں نے دیا نہیں تھا۔ اسے لگا کہ اس کی ماں زندہ ہوتی وہ بھی یہی فیصلہ کرتی جو رابعہ احمد اس کے لیے کر چکی ہیں۔ ثریا بیگم رشتے داروں اور ملازموں کے سامنے حماد کی شرافت کا اعتراف کرتی تھیں لیکن اگر گھر میں حماد لاؤنج میں بیٹھا ہوتا تو وہ اسے پڑھنے کے لیے کمرے میں بھیج دیتیں یا پھر اپنے ساتھ کچن میں مصروف کر لیتیں۔ وہ تنہا حماد کے پاس بیٹھ نہیں سکتی تھی اور نہ ہی کہیں باہر اس کے ساتھ آجا سکتی تھی۔ یہ ان کی احتیاط تھی۔ اپنی ماں کی موت کے چند گھنٹے بعد ہی وہ ان کے اصولوں اور احتیاط کو پھلانگ نہیں سکتی تھی۔

"چلو شاباش جلدی کرو۔" رابعہ احمد کے گال تھپکنے پر وہ ہوش میں لوٹی اور پژمردگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☼ ☼ ☼

اگلے آدھے گھنٹے میں اس نے سارا ضروری سامان سمیٹ لیا تھا۔ رابعہ احمد نے حماد کو بلا کر اس کے یہاں سے جانے کے متعلق بتا دیا تھا۔ دعا کا خیال تھا کہ شاید وہ اسے روک لے گا لیکن اس نے تمام گفتگو سنتے صرف اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تو دکھ۔ ڈرائیور گاڑی میں بیٹھا بار بار ہارن بجا رہا تھا۔ رابعہ احمد چادر اوڑھ کر باہر کی طرف بڑھ گئیں۔ دعا کے قدموں سے جان نکل چکی تھی۔ اس کا جی شدت سے چاہ رہا تھا کہ وہ اس گھر کے در و دیوار سے یوں لپٹ کر روئے جیسے کل وہ ماں کے مردہ وجود سے لپٹ کر پہلی بار روئی تھی۔ اس گھر کے چپے چپے سے اس کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔

وہ جھولا جو اسے ابو جان (مرحوم) نے ایک ہی بار فرمائش کرنے پر ڈال دیا تھا اور امی جان کتنا ناراض ہوئی تھیں اس کی ضد پہ، لیکن ابو جان نے اس کی طرف داری کرتے ہوئے انہیں خاموش کروا دیا تھا۔

"اللہ حافظ حماد بھائی۔" اس نے جھکی آنکھوں اور کپکپاتے ہونٹوں سے گم صم کھڑے حماد کو چونکا دیا۔

"اللہ حافظ۔" زیر لب بڑبڑاتے اس کا بھاری مردانہ ہاتھ اس کے سر پر آٹھہرا۔

یہ شفقت بھرا پیار باپ کی موت کے بعد سے ادھار تھا۔ کتنے ہی آنسو گال پر پھسل گئے۔ وہ بمشکل خود کو گھسیٹتے در و دیوار کو حسرت سے دیکھتی اس گھر سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

گول برآمدے کے ستون سے سر ٹیکے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ گول برآمدے کے ستون سے لپٹی بوگن ویلیا کی بیلیں۔ گرمیوں کی شاموں اور سردیوں کی دھوپ سے چمکتی دوپہر میں وہ اس سے ٹیک لگائے کورس کی کتابیں اور ناول پڑھا کرتی تھی۔ اس گھر کی سب سے خوب صورت جگہ اور اس کا ٹھکانہ یہی برآمدہ تھا۔

وہ چھ برس کی تھی۔ جب دلہن بنی ماں کی انگلی تھام کے اس گھر کی دہلیز پار کی تھی۔ یہ دس برس کے حماد کا گھر تھا۔ اس گھر کے بہت سے سرد گرم موسم اس کی یادداشت سے وابستہ تھے خوشیوں کے، حماد سے لڑائی جھگڑے، باپ سے فرمائشوں اور ماں سے روٹھنے منانے کے۔ گھر سے قدم باہر نکالتے اسے ماں کے الفاظ بڑی شدت سے یاد آئے تھے۔ "میں اپنی اکلوتی بیٹی کو بڑی دھوم دھام سے رخصت کروں گی۔" اس کے قدم گھر کی چوکھٹ سے باہر نکل گئے۔

اس کے پاس صرف یادیں ہی رہ گئی تھیں اور انہیں یاد کرنے کے لیے ایک عمر پڑی تھی۔ اس گھر سے وہ خالی ہاتھ خالی دامن جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

سرقدیر اپنے آفس میں لیپ ٹاپ پر مصروف تھے

جب عمر بغیر اجازت غصے سے بھرا اندر داخل ہوا۔
انہوں نے لیپ ٹاپ سے سر اٹھا کے 'عینک کے اوپر سے اس کو گھورا۔
"یہ کیا بدتمیزی ہے عمر؟" یہ سوال وہ پچھلے دو ماہ سے تھوڑے سے ردوبدل سے روز کرتے تھے۔
عمر نے ہاتھ میں پکڑا لیٹر زور سے میز پر پٹختے' بھڑکتے ہوئے کہا۔
"کیا آپ نے مجھے جاب سے فائر کر دیا ہے۔" تاثرات کھا جانے والے تھے۔
سر قدیر کا چہرہ بھی غصے سے تمتمانے لگا۔ وہ بہت وضع دار انسان تھے۔ عمران کے دوست ریاض احمد کا بیٹا نہ ہوتا تو وہ اسے ملازموں سے اٹھوا کے آفس سے باہر پھنکوا دیتے۔
"آف کورس۔" انہوں نے تحمل کا مظاہرہ کیا۔
"گیومی ریزن' آپ اس طرح سے میری انسلٹ نہیں کرسکتے۔" عمر کا بس نہیں چل رہا تھا کہ قدیر صاحب کی گردن مروڑ دے۔
"آئی تھنک میں اس کمپنی کا ایم ڈی ہوں' آپ نہیں۔"
قدیر صاحب نے پانی کا آدھا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ وہ خود کو صبر کا درس دے رہے تھے۔ ریاض احمد کے وہ کالج کے زمانے کے بہترین دوست رہ چکے تھے۔ جب انہوں نے اپنے بیٹے کی نوکری کے لیے سفارش کی تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنے شائستہ اور مہذب ریاض احمد کا بیٹا اتنا بدتمیز اور بدزبان ہوگا۔
"آئی تھنک یہ کانٹریکٹ سال کے لیے سائن کیا ہے۔" عمر نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔
"اس کانٹریکٹ کی کچھ کنڈیشنز بھی تھیں۔ جن کی بنا پر ہی آپ دو سال پورے کرسکتے تھے۔ فرسٹ' بی ہونیسٹ' سیکنڈ پنکچوئیلٹی۔" قدیر صاحب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
"آپ کو تو کام چاہیے ناں جلد یا بدیر' اتنی فاسٹ ایج تھوڑا بہت آگا پیچھا چلتا ہے۔" عمر کا انداز سراسر لاپروا تھا۔
"جو میرے آفس کے رولز اینڈ ریگولیشن کے خلاف ہے۔ ان ہی لاپروائیوں کی وجہ سے آپ کو فارغ کیا گیا ہے۔ اب پلیز میرا دماغ چاٹنے کے بجائے یہاں سے جائیں۔" انہوں نے کہہ کر لیپ ٹاپ پر نظریں مرکوز کرلیں۔
"مجھے خود بھی آپ جیسے جھوٹے اور کنزرویٹو انسان کے ساتھ کام نہیں کرنا' یوں بھی آپ کی یہ مفروض کمپنی' مجھ جیسے ایبل پرسن کے لائق نہیں میں لعنت بھیجتا ہوں آپ پر اور اس دو ٹکے کی نوکری پہ۔"
عمر نے بدتمیزی کی آخری حد پر' لیٹر کے دو ٹکڑے کر کے باپ کی عمر کے شخص کی طرف اچھال دیے۔
قدیر صاحب کا سانس پھول گیا۔ انہوں نے فون کا ریسیور اٹھالیا۔ جسے آگے بڑھ کر فوراً" عمر نے جھپٹ لیا۔
"زحمت نہ کریں میں خود ہی جا رہا ہوں۔"
عمر ریسیور کریڈل پر پٹخ کے' دندناتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔ قدیر صاحب ہکا بکا رہ گئے۔

☆ ☆ ☆

گاڑی ہلکے سے جھٹکے سے رکی۔ اس نے سیٹ کی پشت سے سر اٹھایا۔ ریاض احمد کے وسیع و عریض گھر کا مین گیٹ چوکیدار کھول رہا تھا۔ گاڑی آہستہ رفتار سے روش پر دوڑتی' پورچ میں جارکی۔ اس نے جھکے سر اور بے جان ہاتھوں سے دروازہ کھولا۔ جو ہزاروں بار ماموں کے گھر آئی تھی۔ اس کی ویک اینڈ کی چھٹی سے لے کر گرمیوں کی چھٹیاں تک اسی گھر میں گزرتی تھیں۔
ماموں کا جدید طرز کا دو کنال پر محیط یہ گھر ہمیشہ سے اپنے خوابوں کا محل لگتا۔ وہ جب بھی کوئی خوب صورت سپنا بنتی خود کو اسی گھر میں پاتی۔
لیکن آج اس کی کیفیات یکسر مختلف تھیں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ سرپٹ اپنے گھر کی طرف دوڑ لگا دے۔ بالکل پیچھے مڑ کر نہ دیکھے۔ رابعہ احمد نے اس کا بازو پکڑ رکھا تھا جیسے اس کی سوچ پڑھ لی ہو۔

لاؤنج کے صوفے پر بیٹھی نوال کی نگاہ جوں ہی اس پر پڑی وہ دوڑتی، خوشی سے اچھلتی ہوئی آئی۔

"ہائے دعا! تم آگئیں، سچ میں مجھے یقین نہیں آرہا کہ اب تم ہمارے ہی ساتھ رہو گی، میں کالج سے چھٹی کرکے کب سے تمہارا انتظار کررہی ہوں۔"

نوال اس سے چمٹی بولے جارہی تھی۔ وہ عمر میں اس سے پورے دو سال چھوٹی اور میڈیکل کے فائنل ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ ان دونوں میں اچھی دوستی تھی۔

"دور ہٹو نوال، موقع تو دیکھ لیا کرو۔ دعا بہت ڈسٹرب ہے اسے ریلیکس ہونے دو اور جاؤ، اس کے لیے کچھ کھانے کو لاؤ۔" رابعہ احمد نے بیٹی کو ڈانٹ کر الگ کیا اور دعا کو صوفے پر بٹھایا۔

"اچھا جارہی ہوں لیکن دعا کا الگ سے کمرہ سیٹ کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ میرے ساتھ روم شیئر کرے گی۔ میں بالکل اس کے ساتھ نہیں جھگڑوں گی۔"

نوال نے جانے سے قبل انگلی اٹھا کے متنبہ کیا۔ دعا کو نوال کی اس محبت پر مسکرانا پڑا۔

"ہرگز نہیں، تم تو اتنا بولتی ہو کہ دعا بے چاری کا سر کھا جاؤ گی، وہ اتنی سوبر بچی ہے۔"

رابعہ احمد نے دعا کے ہاں بھرنے سے پیشتر ہی نوال کی آفر رد کردی۔ نوال ماں کی اس بات پر روہانسی ہوگئی۔

"یہ سوبر بچی میری فرینڈ ہے ماما جان! آپ کی نہیں اور آپ مجھے ڈس ہارٹ کررہی ہیں۔" نوال مدد کے لیے دعا کی طرف لپکی۔

"تم میری فیور کرونا، میں تمہیں ہرگز تنگ نہیں کروں گی۔" رابعہ احمد پھر جلدی سے بیچ میں کودیں۔

"تم سے میں نے کہا تھا کہ دعا کے لیے کچھ کھانے کو لاؤ اور تم ابھی تک باتیں بگھار رہی ہو۔" انہوں نے خاصی سنجیدگی سے کہا۔

نوال افراتفری میں مڑی۔

"سوری ماما، بس میں ابھی گئی اور ابھی آئی۔" اسے ماں کے گھورنے پر آداب میزبانی یاد آہی گئے۔

نوال کے جاتے ہی رابعہ احمد دعا کے برابر جا بیٹھیں۔

"نوال ابھی ناسمجھ ہے اور تم سے پیار بھی بہت کرتی ہے۔ ایک ہی بات اس میں بری ہے کہ موقع محل دیکھے بغیر بولے چلی جاتی ہے۔ اب اگر وہ اپنا روم شیئر کرنے کی بات کرے تو تم خود ہی نرمی سے ٹال دینا۔" دعا کو ان کی بات بہت عجیب سی لگی۔

"میں ممانی جان۔" وہ ہچکچائی۔

"تم جانتی ہوناں میڈیکل کی پڑھائی کتنی ٹف ہے۔ اور اگر تم اس کے قریب رہیں تو یہ اپنی ساری انرجی اور وقت فضول کے قصے اور باتیں سنانے میں ہی ضائع کردے گی۔ بہتر ہے کہ اسے زیادہ ٹائم تنہا رہنے دیا جائے۔"

پھر رابعہ احمد محتاط سی نظر کچن پر ڈال کے، دعا کے کان کے قریب ہوکے بولیں "میں بھی اسے زیادہ منہ نہیں لگاتی۔"

دعا اور رابعہ احمد کی بے ساختہ ہنسی نکل گئی۔ دعا، نوال کی عادتوں سے واقف تھی۔ اسے ممانی جان بالکل درست لگیں۔

☆ ☆ ☆

مریم خاصے ڈھیلے ڈھالے نائٹ گاؤن میں ملبوس سنگھار میز کے اسٹول پر بیٹھی ہاتھوں پر کریم کا مساج کررہی تھی، آئینے میں نظر آتے الیاس احمد کے عکس پر بھی نظر ڈالتی جارہی تھی۔ جو بیڈ کراؤن کے تکیوں سے ٹیک لگائے کسی سے فون پر مصروف تھے۔

"رضوی صاحب! آپ ایک بار میری فیکٹری کا چکر ضرور لگائیں، آپ کو ہماری جدید مشینری اور کپڑے کی کوالٹی پرکھتے ہی اندازہ ہوجائے گا کہ ہمارا معیار، رانا صاحب سے کس قدر بہتر ہے۔"

الیاس احمد کا لہجہ واضح طور پر چاپلوسی کی غمازی کررہا تھا۔ مریم ان کی گیارہ برس کی ہم سفران کے ہر انداز سے واقفیت رکھتی تھی۔ اس لیے آخری اکتاہٹ بھری نگاہ ڈال کے، وہ آئینے کی سامنے کھڑی بالوں میں

ہیئر برش پھیرنے لگی۔
الیاس احمد دوسری طرف کی بات سننے کو خاموش ہوئے پھر سے شروع ہوگئے۔
"جی ۔۔۔ جی میری بھی یہی خواہش ہے کہ ہماری یہ بزنس ڈیل ہو جائے اور کام بالکل آپ کے حسب خواہش ہو۔"
الیاس احمد کا سر رٹو طوطے کی طرح ہل رہا تھا۔ ان کا یہ خوشامدی انداز صرف مخصوص لوگوں کے لیے تھا۔ گھر پر وہ کم ہی ایسی گفتگو کرتے تھے۔ مریم آخری بار خود کو آئینے میں ہر زاویے سے دائیں 'بائیں مڑ کے دیکھتی اطمینان سے شوہر کے برابر آبیٹھی۔
الیاس احمد نے مریم پر نگاہ ڈالی تو لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔
"چلیں جی' آپ مجھے کال کر دیجیے گا' میرا ڈرائیور ایئرپورٹ پہنچ جائے گا' اللہ حافظ۔"
فون بند کر کے ایک بیزار کن ہنکارا ابھرا۔
"ہوں۔"
"آپ کو بزنس ہینڈل کرنے کے لیے کتنے جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔" مریم نے خاصی معصومیت سے دریافت کیا۔ ایسا وہ اکثر جان بوجھ کر کرتی تھی۔
الیاس احمد کے تاثرات یک دم بیزاری سے کڑے تیوروں میں بدل گئے۔
"کیا تم مجھے جھوٹا کہہ رہی ہو۔" وہ گرجے۔
"نن ۔۔۔ نہیں ' آپ خدانخواستہ کیوں جھوٹ بولنے لگے ' یہ تو ۔۔۔ تو صرف لفظوں کا ہیر پھیر ہے۔"
اس نے انگلیاں مروڑتے ' ہکلاتے اپنے کہے کی وضاحت کی۔ الیاس احمد نے اس کی چالاکی پکڑلی تھی جو اسے بہت مہنگی پڑ جاتی۔ الیاس احمد سے کوئی اچھی توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ وہ بیوی کو جان بوجھ کر دبا کر رکھنے والے بارعب مرد تھے۔ مریم دبک بھی جاتی تھی اور کبھی اڑ جاتی۔
انہوں نے مریم کو گھورنا چھوڑ کے ' تکیہ کمر کے پیچھے سے نکال کے گھسیٹتے ہوئے سر کے نیچے رکھ لیا۔
"دعا آگئی ہے۔" آنکھیں بند کرنے سے پہلے پوچھا گیا۔
"جی شام کو آگئی تھی۔" مریم نے نیم دلی سے اپنا تکیہ درست کیا۔
"بھائی جان کو ہمدردی کا شوق چرایا ہے۔" بڑبڑاہٹ واضح تھی۔ مریم نے بغور آنکھیں بند کیے شوہر کو عجیب نظروں سے دیکھا۔ اسے ان کی بڑبڑاہٹ سے اختلاف تھا۔ دعا ان کی یتیم و یسیر بھانجی تھی۔ اس کا اب ان لوگوں کے سوا دنیا میں کوئی اپنا سگا رشتہ نہیں تھا۔
اسے ان ہی کے پاس آنا تھا لیکن الیاس احمد کو نجانے اس کے آنے پر کیوں اعتراض تھا۔
"وہ آپ رات کو ذرا جلدی آجایا کریں' بچے آپ کا بہت انتظار کرتے ہیں۔"
مریم کو نیند نہیں آرہی تھی اس نے بے وقت کا گلہ داغ دیا۔
"ہاں میں اتنا فارغ ہوں ناں جو محض بچوں کی انجوائے منٹ کے لیے لاکھوں کا بزنس چھوڑ کے آجایا کروں۔"
الیاس احمد نے آنکھیں کھول کے اس بے تکے گلے کا جواب دیا۔ مریم کو اس ٹیڑھے اور سفاک جواب پر قدرے غصہ آیا تھا۔
"بچے ہیں انہیں بھی تھوڑی توجہ چاہیے۔ اپنے باپ کے ساتھ آؤٹنگ پہ جانا چاہتے ہیں۔" اس نے تحمل سے جواز پیش کیا۔
"انہیں باپ کی مشکلات اور ذمہ داریاں سمجھانا' اچھی تربیت کرنا تمہارا کام ہے لیکن تم پھوہڑ عورتوں کی طرح معاملات کو سلجھانے کے بجائے میرے کان کھاؤ۔"
الیاس احمد نے اسے لتاڑتے ہوئے کروٹ بدل لی۔
یعنی اب انہیں مزید چھیڑنا' اپنی شامت بلوانے کے مترادف تھا۔
"ان کی صبح اسکولنگ سے لے کر' رات سونے تک' میں اکیلی ہی ہینڈل کرتی ہوں۔"

مریم کو بھی تھوڑا غصہ آیا لیکن لہجے پر از حد کمال حاصل تھا۔

"احسان نہیں کرتی ہو مجھ پہ اور اب پلیز اپنا منہ بند کر کے سوجاؤ مجھے بھی سخت نیند آرہی ہے۔"

الیاس احمد کے لہجے میں واضح بیزاری اور چھپی دھمکی تھی۔ مریم برا منہ بناتی لیٹ گئی اسی میں عافیت تھی۔

☆ ☆ ☆

عمیر باپ کو ہاتھ سے پکڑ کر ناشتے کی ٹیبل تک لایا تھا۔ انہوں نے بہن کی موت کا بہت اثر لیا تھا وہ ان کی بڑی بہن ہی نہیں بلکہ بالکل ماں جیسی تھیں۔ ان کا بی پی ہائی تھا اور پانچ گھنٹے ہسپتال میں رہ کر طبیعت قدرے سنبھلی تھی۔

نوال' دعا کو بازو سے گھسیٹ کر کمرے سے نکال لائی تھی۔

"دعا کدھر ہے؟" کرسی پر بیٹھتے انہوں نے سب سے پہلے اسی کا پوچھا۔

"اسلام علیکم ماموں جان۔" دعا نے جلدی سے قریب آکر سلام کیا۔

ریاض احمد نے اسے سینے سے لگالیا۔ آنکھوں سے آنسو' رواں ہو گئے۔ دعا بھی ان کی نرم آغوش میں سماتے ہی رودی۔

"پلیز دعا! پاپا جان کی طبیعت ٹھیک نہیں' پلیز روؤ مت۔" عمیر نے اسے بازو سے پکڑ کر ان سے الگ کیا۔ نوال کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ رابعہ احمد کچن سے نکل آئیں۔

"آپ کے لیے لائٹ سا ناشتہ بنا دوں۔" انہوں نے ٹشو پیپر نکال کے شوہر کو دیا۔

"ماما آپ بریڈ اور جیم' مجھے پکڑا دیں' میں خود ہی پاپا جان کو کھلا دیتا ہوں۔" وہ باپ کا یوں ہی بچوں کی طرح خیال رکھتا تھا۔

"دعا بیٹی! تم کھڑی کیوں ہو' بیٹھ جاؤ۔"

ریاض احمد کی اپنے گال صاف کرتی دعا پر نظر پڑ گئی۔ سب انہیں دیکھنے میں مصروف تھے اور وہ کھڑی روئے چلے جا رہی تھی۔

"بیٹھو دعا' میں تمہارے لیے بھی ناشتہ لاتی ہوں۔" رابعہ احمد اس کا کندھا تھپک کے کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

پانچ کرسیاں خالی تھیں۔ دعا کو ان ہی میں سے کسی کرسی پر بیٹھنا تھا اور اسے پتا تھا کہ اس میز پر اس کے حصے کی کرسی کون سی ہے۔ جو کئی برس سے اس کے مخصوص تھی۔ عمیر کے برابر والی کرسی اس کے نام کی تھی۔ وہ یہاں موجود ہو یا نہ اس کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا تھا۔

"دعا! اپنا رونا بند کرو۔ تم پاپا جان کی اور وہ تمہاری ڈھارس ہیں اگر تم دونوں روتے رہے تو ایک دوسرے کا سہارا کیسے بنو گے' ماما جان کا بی پی بھی شوٹ کر جاتا ہے۔ نوال کالج اور میں آفس میں ہوتا ہوں' اگر کسی کی طبیعت بگڑ گئی تو کون سنبھالے گا آپ لوگوں کو۔"

عمیر نے باپ اور دعا کو لیکچر دیا تاکہ اب وہ اپنے جذبات پر قابو پالیں۔

"تم مجھے آفس لے جاؤ عمیر! تاکہ میرا دھیان بٹ جائے' ورنہ مجھے لگتا ہے کہ میرا دل بند ہو جائے گا۔" ریاض احمد بہت مایوسی سے بولے۔

"پلیز پاپا جان' ایسا مت سوچیں' موت برحق ہے اس حقیقت کو تسلیم کریں' ہم سب جانتے ہیں کہ آپ کو پھپھو جان سے بے حد محبت اور انسیت تھی۔ ان کی اچانک ڈیتھ نے آپ کو شاک کیا ہے لیکن اپنی بھاری ذمہ داری "دعا" کا بوجھ بھی وہ آپ پر ڈال گئی ہیں۔ آپ اس کی خاطر ہی خود کو سنبھالیں۔"

عمیر نے بڑے آسان الفاظ میں انہیں سمجھایا۔ وہ پرسوں سے بھاگ دوڑ کر کر کے تھک چکا تھا۔ ریاض احمد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اور آفس کی آپ ٹینشن نہ لیں' میڈیسن لے کر ریسٹ کریں' پھپھو کی مغفرت کے لیے قرآن خوانی کریں' باقی کے سارے معاملات میں خود ہی دیکھ لوں گا۔"

عمیر نے سلائس پر جیم لگا کے ان کی طرف بڑھایا۔ جو انہوں نے خاموشی سے پکڑ لیا۔ عمیر دوسرے سلائس پر جیم لگانے لگا ابھی اسے آفس جانے سے قبل ماں کو بھی بہت سی ہدایات دینا تھیں۔

وہ کھڑکی کے اس پار دور دیکھتی اپنی ماں، گھر اور بھائی سے بچھڑنے کا سوگ منا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس کے لیے روئے اور کس پر صبر کرے۔

اس کے سوتیلے باپ کو وفات پائے تین سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ ثریا بیگم کو حماد کی طرف سے بہت سے خدشات تھے۔ کیونکہ جوانی کی دہلیز پر اس کا مزاج بہت لیا دیا سا ہو گیا تھا۔ اس کی سنجیدگی، ان ماں بیٹی کو کوئی سوال کرنے سے پہلے سوچنے پر مجبور کیے رکھتی۔ لیکن حماد نے ان کے ہر شکوک و شبہات کو غلط ثابت کر کے، تین سال میں ان کی ہر ضرورت حتی کہ خواہشات کا بھی احترام کیا تھا۔ پھر ثریا بیگم بیمار رہنے لگیں تو ان کے علاج میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ دعا کے دل میں حماد کے لیے احترام اور احسان مندی تھی۔
اس طرف ریاض احمد تھے۔ جو بچپن سے لے کر آج تک اس کے لیے سراپا محبت تھے۔ وہ ان کی محبتوں کی بہت مقروض تھی۔ یہ وہ واحد شخص تھے جن سے وہ اپنی ہر خواہش، فرمائش اور ضد منوا لیتی تھی۔ ثریا بیگم نے اسے کبھی ماموں جان سے کچھ لینے یا کہنے سے نہیں روکا تھا۔

وہ خود بھی اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتے۔ اگر وہ کسی ویک اینڈ پر نہ آتی تو وہ خود اسے لینے پہنچ جاتے۔ اسے ہر موسم کے کپڑے، جوتے، بیگز وغیرہ وہ مانگے اور کہے بغیر ڈرائیور کے ہاتھ بھجوا دیتے۔
اس کے پاس موبائل، لیپ ٹاپ اور شہر کے سب سے اچھے کالج میں داخلہ سب ریاض احمد کے مرہون منت تھا۔ انہیں نوال سے بڑھ کر وہ عزیز تھی۔ ان کی اس والہانہ محبت سے سب آگاہ تھے یہی وجہ تھی کہ اس گھر میں دعا کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ صرف ایک شخص تھا جسے باپ کی یہ محبت اور التفات بالکل نہ بھاتا تھا۔ اسے باپ کے ساتھ دعا سے بھی شدید چڑ تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ چادر لپیٹے پورچ کی سیڑھیوں پر ماتم کناں بیٹھی تھی۔ چہرے پر چھایا حزن و ملال اتنا گہرا تھا کہ کسی غیر کا وجہ جانے بغیر جی چاہے کہ وہ زور زور سے رونے لگے۔ آنکھوں کے گریہ و زاری سے سرخی مائل ہو کر اس کے حسن کو مزید سوگوار کر دیا تھا۔

وہ اپنی زندگی میں کبھی بھی نہیں روئی تھی کیونکہ زندگی کبھی اس پر تنگ نہیں ہوئی تھی۔ اس کے دامن میں ہزاروں خوشیاں تھیں جو صرف اسی کے لیے تھیں وہ ان خوشیوں کو اپنا حق سمجھ کر زندگی سے وصول کرتی آئی تھی۔
لیکن اس بار زندگی اپنا دامن سمیٹ کر اس پر تنگ ہو گئی تھی یا اس سے روٹھ گئی تھی۔ اسے زندگی سے بہت سے شکوے تھے۔ وہ اس کی بے رحمی پر ہکا بکا رہ گئی تھی۔
رات آدھی سے زیادہ بہت چکی تھی اور یہاں وہ تین گھنٹے سے بیٹھی تھی۔ اسے لمحوں اور وقت کا احساس نہیں تھا۔
"الغم ....!" احسن نے اس کے کندھے پر ہاتھ دھرا۔ وہ بالکل نہیں چونکی تھی کیونکہ یہ شخص اس کی روح کا حصہ تھا۔ اس کی رگوں میں خون کے ساتھ گردش کرتا تھا۔ اس کا آجانا اسے چونکا نہیں سکتا تھا کیونکہ اس کا لاشعور کبھی اس سے غافل نہیں ہوا تھا۔
"تم یہاں بیٹھی ہو، میں تمہیں سارے گھر میں

ڈھونڈ کے آیا ہوں۔" احسن کی عادت تھی کہ وہ رات کو جب بھی کروٹ بدلتا' ایک بار انعم کو ضرور دیکھتا۔
وہ انعم کے برابر بیٹھ گیا۔ وہ اس کے یہاں بیٹھنے کی وجہ جانتا تھا۔
"آپ جانتے ہیں ناں آج کی رات' مجھے نیند نہیں آنے والی۔ صبح میری تقدیر کا فیصلہ ہو جائے گا۔" اس کا لہجہ مایوس تھا۔
احسن نے لمبی سانس خارج کی' اس کے کندھے کے گرد بازو لپیٹ کے خود سے لگا لیا۔ یہ اس کا حوصلہ دینے کا انداز تھا۔
"مجھے اللہ ـــــ کی ذات پر پورا بھروسا ہے انو' وہ جو بھی ہماری تقدیر میں لکھے گا' وہی ہمارے لیے بہتر ہو گا۔ تمہارے یوں رونے دھونے سے لوح پر محفوظ فیصلہ بدل نہیں جائے گا۔ تم اللہ پر یقین رکھو وہ کبھی بھی اپنے بندوں کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا۔"
احسن نے اس کا ذہن ہلکا پھلکا کرنا چاہا تاکہ وہ مثبت سوچنا شروع کرے۔
احسن کا کندھا ملتے ہی وہ رونے لگی۔
"میں سب جانتی ہوں احسن! لیکن میرا دل اس وقت کسی بھی دلیل کو ماننے کو تیار نہیں۔ میرا دل صرف ایک ہی نقطے پر ڈوب رہا ہے کہ اگر میری رپورٹس نیگیٹو..."
احسن نے فوراً" اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔
"خدا کا واسطہ ایسا مت سوچو انو' میرا حوصلہ قائم رہنے دو۔"
انعم نے اس کا ہاتھ نرمی سے ہٹایا۔ اس کی نم سرخ آنکھیں' احسن کی مضطرب نگاہوں پہ جم گئی تھیں۔ احسن کا ان آنکھوں پر ایمان ڈگمگانے لگا۔ اس سوگوار حسن کا وہ ہمیشہ سے شیدائی تھا۔
"کیا تم ہمیشہ مجھ سے یونہی پیار کرو گے احسن' میرا ساتھ نبھاؤ گے۔" انعم کا دل متزلزل تھا۔
"تمہارا اور میرا جسم و روح کا ساتھ ہے انو' تم ایسے سوالات کر کے' میرے اعتبار کو ٹھیس مت پہنچاؤ' میری چاہتیں کبھی کم نہیں ہوں گی۔ تمہاری یہ محبت چار دن کا سودا نہیں' تمہارا اور میرا ازل سے ابد تک کا رشتہ ہے۔" احسن کے انداز میں شدت نمایاں تھی۔
انعم کو اس اقرار اور اعتبار کی قطعاً" ضرورت نہیں تھی۔ احسن یہ سب نہ بھی کہے وہ تب بھی جانتی تھی۔
"میرے بے قرار دل کو جانے کب قرار ملے گا۔"
انعم نے بے بسی سے آنکھیں موند کے' پھر سے اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔ احسن نے پیار سے اسے پچکارا۔
"اٹھو میری جان' چلو اندر چلیں۔"
وہ اسے مزید تنہا بیٹھنے نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے کندھوں سے تھام کے اسے کھڑا کیا اور آہستہ آہستہ چلتے اندر کی طرف لے گیا۔
"دیکھتا ہوں کیسے نیند نہیں آتی' میں تمہارے بالوں میں انگلیاں پھیروں گا' تم میٹھی اور پرسکون نیند سو جانا۔" شوہر کی اتنی محبت پر وہ نم آنکھوں سے مسکرا دی۔

☆ ☆ ☆

الیاس احمد اور ریاض دونوں بھائیوں کے گھروں کو ایک لمبی دیوار الگ کرتی تھی۔ ایک دوسرے کے گھر میں آمدورفت کے لیے لان میں راستہ رکھا گیا تھا۔
مریم ہاتھ میں ڈش اٹھائے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوئی تو رابعہ احمد لاؤنج کے سامنے والے صوفے پر بیٹھی مٹر چھیل رہی تھیں۔ اس نے ٹرے میز پر رکھ دی۔
"اسلام علیکم بھابھی جان!" مریم نے قریب ہو کر بڑے ادب سے سلام کیا۔ رابعہ احمد ہولے سے چونک گئیں۔
"وعلیکم اسلام کیسی ہو مریم؟ اتنے زور بعد چکر لگایا۔" رابعہ احمد کے چہرے پر رونق آ گئی۔
مریم اپنی جٹھانی کا بڑا ادب و احترام کرتی تھی۔ ساس اس کی شادی سے قبل ہی وفات پا چکی تھیں اور سسر شادی کے ایک سال بعد۔ مریم کی واحد سسرالی رشتے دار رابعہ احمد تھیں' ثریا بیگم اپنے گھر بار والی تھیں۔

مریم کو رابعہ احمد کا بہت آسرا تھا۔ ان کے درمیان روایتی دیورانی' جیٹھانی والا رشتہ نہیں تھا۔ مریم کا جب جی چاہتا وہ ان کے پاس آکر گھنٹوں بیٹھی رہتی اور اگر چند دن نہ آتی تو رابعہ احمد کو فکر ستانے لگتی وہ خود پہنچ جاتیں یا پھر مریم کو کال کرکے بلوا لیا جاتا۔

مریم کو کوئی مشکل درپیش آتی' مشورہ کرنا ہوتا یا الیاس احمد کی شکایتیں لگانا ہو وہ سیدھی رابعہ احمد کے پاس آجاتی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں آپ سنائیں' بھائی جان آفس گئے ہیں۔" مریم جیٹھ کا حال احوال پوچھنے آئی تھی۔

"کہاں مریم' ابھی تک ان کی طبیعت ہی نہیں سنبھلی' تم جانتی تو ہو کہ انہیں ثریا آپا سے کس قدر لگاؤ تھا۔ پھر ان کی یوں اچانک موت نے انہیں صدمہ میں دھکیل دیا ہے۔ لیکن اب دعا کو دیکھ کے تھوڑا سنبھل گئے ہیں۔" رابعہ احمد نند کا ذکر کرتی خود بھی دکھی ہو گئیں۔

"آپ لوگوں نے دعا کو اپنے پاس لا کر بہت اچھا کیا ہے' اس معصوم لڑکی کا ہم لوگوں کے سوا اور بھلا ہے ہی کون؟" مریم ان کے اس عمل سے متفق اور خوش تھی۔

"اللہ ہمیں اس ذمہ داری سے عزت و تکریم کے ساتھ سرخرو کرے۔" رابعہ احمد کو یہی فکر لگی ہوئی تھی۔

"بھابی جان! میں آپ کے لیے بریانی لائی ہوں۔" مریم کو میز پر دھری ڈش کا دھیان بھی آگیا۔

"تم نے یونہی زحمت کی' میں بھی دوپہر میں بریانی بنانے کا ہی سوچ رہی تھی۔" رابعہ احمد نے ڈش سے ڈھکن اٹھا کے دیکھا۔

"چلیں اب آپ پودینے کی چٹنی بنالیں' ہم سب مل کر لنچ کریں گے۔" مریم نے انہیں مشورہ دیا۔

"دعا نظر نہیں آرہی بھابی جان۔" مریم نے ادھر ادھر دیکھا۔

"وہ تھوڑی دیر قبل' مجھے سونے کا کہہ کر' اپنے کمرے میں گئی ہے۔ اگر تم نے ملنا ہے تو دیکھ لو۔" رابعہ احمد اسے بتاتے ہوئے اٹھنے لگیں۔

"نہیں اسے ریسٹ کرنے دیں' میں بھائی جان کو سلام کرکے آتی ہوں' آپ تب تک کچن میں لنچ بنانے کی تیاری شروع کریں' میں بھی آ کے ہیلپ کرواتی ہوں۔"

مریم بھی ان کی تقلید میں اٹھ کھڑی ہوئی اور رابعہ احمد کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

☼ ☼ ☼

رابعہ احمد شام کی چائے کا انتظام کر رہی تھیں۔ ریاض احمد لاؤنج میں عمیر کے ساتھ بیٹھے اس سے آفس کی تفصیلات پوچھ رہے تھے۔

"پاپا جان دیکھیں ناں دعا کو' صبح سے کمرے میں گھسی ہے اور ابھی تک نکلنے کا نام نہیں لے رہی۔" نوال اسے کلائی سے پکڑ کر زبردستی باہر لائی تھی۔

عمیر نے فائل بند کردی۔

"ادھر آؤ میرے پاس۔" ریاض احمد نے اس کے لیے بازو وا کیا۔ وہ ان کے پاس جا بیٹھی۔ عمیر اس کے کھلے چہرے کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

"کمرے میں اکیلے پڑے رہنے اور رونے سے' تم اس فیز سے باہر کیسے نکلو گی' کیا ہم سب کو اپنا نہیں سمجھتیں' ہمیں آپا جان کے چلے جانے کا دکھ نہیں؟؟" ریاض احمد نے اسے نرمی سے سمجھایا۔ اس کے چہرے پر چھائی اداسی ان کے کلیجے میں کھب رہی تھی۔

"ماما جان بھی چلی گئیں اور میرا گھر' حماد بھائی سب یوں اچانک' چند گھنٹوں میں سب کچھ چھن گیا۔ میرا دل نہیں ٹھہرتا۔" دعا پھوٹ پھوٹ کے رودی تھی۔

"دعا پلیز اس طرح سے مت روؤ' پاپا جان کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔" عمیر نے دعا کو فوراً ٹوک دیا۔

"پلیز دعا...." نوال نے اسے کندھوں سے تھام لیا۔

دعا نے اپنے گال رگڑ لیے۔ یوں بھی وہ صبح سے

اپنے کمرے میں بڑی وقفے وقفے سے رونے کا شغل ہی کر رہی تھی۔ یہ گھر اس کے خوابوں کا محل، جہاں وہ ماں سے آنے کی ضد کیا کرتی تھی۔ عمیر اور نوال اس کے بچپن کے دوست، جان چھڑکنے والے ماموں، دھیمی سی مسکان والی رابعہ ممانی، جو کھانا اس کی پسند کا پکاتی تھیں۔ سب کچھ ویسا ہی تو تھا بس وہ بدل گئی تھی۔

"دعا! تمہیں اسکالرشپ ملی تھی ناں لیکن آپا جان تمہیں خود سے اتنا دور نہیں بھیجنا چاہتی تھیں لیکن اب میرا خیال ہے کہ تم پھر سے اپلائی کر دو، اس طرح تمہارا دھیان بھی بٹ جائے گا۔"

ریاض احمد کو اس کی خوشی مقصود تھی۔ وہ دعا کو ہر پریشانی، تکلیف سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے لیے وہ کسی کانچ کی گڑیا سے بھی زیادہ نازک تھی۔

"نہیں ماموں جان، میری ماں کا ہر حکم، روک ٹوک اتنی ہی اہم ہے جتنی ان کی موجودگی میں تھی۔ ان کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد ان کی حکم عدولی کر کے ان کی روح کو تکلیف نہیں دے سکتی۔"

دعا نے صاف انکار کر دیا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا انکار تھا جو اس نے ریاض احمد کو کیا تھا۔ ورنہ وہ اس کے جو کپڑے، جوتے، بیگز لاتے وہ بخوشی رکھ لیتی۔ انہوں نے جس کالج میں ایڈمیشن کا کہہ دیا۔ اس نے لے لیا۔

غضنفر علی اس کے سوتیلے باپ اس کے حق میں بہت اچھے تھے لیکن دعا کی ذمہ داری شروع سے ریاض احمد نے اٹھائی وہ اس کے کسی معاملے میں ذرا سی بھی غفلت نہیں کرتے تھے۔

"ثریا پھپھو تم سے بہت محبت کرتی تھیں، تم ان کی اکلوتی اولاد تھیں، وہ تمہیں خود سے دور نہیں بھیجنا چاہتی تھیں لیکن اب اگر تم اپنی اسٹڈیز کنٹنیو کرنا چاہو تو یہ ان کی حکم عدولی نہیں ہوگی اور نہ ہی تمہارے اس عمل سے ان کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔"

عمیر نے اسے کافی نرمی سے سمجھایا۔ وہ خود چاہتا تھا کہ دعا، جیسی ذہین اور سلجھی ہوئی لڑکی کو آگے پڑھنا چاہیے، وہ اسے کسی اونچے مقام پر دیکھنے کا خواہش مند تھا۔

"نہیں عمیر! پلیز مجھ سے نہیں ہو گا، میرا ذہن بہت منتشر ہے، اسٹڈیز پر مرکوز نہیں کر پاؤں گی، ایم سوری آپ کو اور ماموں جان کو، مجھ سے بہت سی توقعات ہیں۔ میں آپ لوگوں کو ڈس اپوائنٹ نہیں کرنا چاہتی۔"

دعا کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔ وہ ہمیشہ سے پوزیشن ہولڈر رہی تھی اب ماں کی اچانک موت اور گھر بدر ہو جانے کا دکھ اس کے اندر جڑ پکڑ چکا تھا۔ اس کا دھیان کسی کام میں نہیں لگتا تھا۔

"تم اسے فورس مت کرو عمیر! مجھے خوشی ہے کہ دعا نے پہلی بار اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ یہ جس فیز سے گزر رہی ہے اسے خود سے فائٹ کرنے دو۔ تاکہ یہ خوب سوچ سمجھ کے اپنے لیے کوئی بہتر فیصلہ کر سکے۔"

ریاض احمد نے بات ختم کر دی تھی۔ باپ کے کہنے پر عمیر خاموش ہو گیا ــــ وہ باپ بیٹا خاموش ہو گئے تھے لیکن دعا شش و پنج میں پڑ گئی تھی کہ ماموں ناراضی کے طور پر یہ سب کہہ رہے تھے یا وہ اس کی بہادری کا اندازہ لگانا چاہ رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

اس نے آفس سے آ کے کپڑے تبدیل کیے۔ اور سیدھا نوال کے کمرے میں گیا۔ وہ دو دن سے اپنے ٹیسٹوں میں مصروف تھی اور عمیر کو اپنی لاڈلی بہن کو دیکھے بغیر چین نہیں آ رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے قریب کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔ عمیر کو شرارت سوجھی۔ اس نے بالکل قریب جا کے بھاری آواز نکالی۔

"ہاؤ۔۔۔!" وہ یکدم پلٹی عمیر کے سینے سے اس کے ہاتھ ٹکرائے۔ وہ اس کے بالکل نزدیک کھڑا تھا۔

"آئی۔۔۔ آئی۔۔۔ ایم سوری ایکسٹریملی، میں سمجھا کہ نوال۔" وہ ازحد شرمندہ تھا۔

دعا خفت زدہ سی تھوک نگلتی پیچھے ہٹی۔

"اٹس او، کے۔" اس کے ہاتھ واضح کانپ رہے تھے جو عمیر سے چھپ نہیں سکے تھے۔

"تم تو بہت اسٹرانگ ہو دعا' یاد ہے ہم جب چھپن چھپائی کھیلتے تھے تو تم بیس منٹ اور اسٹور کے اندھیرے میں چھپ جایا کرتی تھیں۔ میں نے کبھی بھی تمہارے اندر ڈر نہیں دیکھا۔"

عمیر نے اس کے کانپتے ہاتھوں کو دیکھا جن کی کپکپاہٹ پر وہ قدرے قابو پا چکی تھی۔

"میری ساری جرات امی جان اپنے ساتھ لے گئیں۔" اس کا لہجہ اور آنکھیں نم ہونے لگیں۔

عمیر نے افسوس سے سر ہلایا۔

"واٹ نان سینس دعا! تم ایک ایجوکیٹڈ اور سینس ایبل لڑکی ہو۔ تم اس حقیقت کو کیوں قبول نہیں کرلیتیں کہ موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ جو تمہیں بھی مقررہ وقت پر آنی ہے اور مجھے بھی' ہم اپنی مرضی سے اس دنیا میں آئے ہیں اور نہ ہی واپس لوٹ جانے پر ہمارا کوئی اختیار ہوگا۔ تمہاری ماں تم سے جتنی محبت کرتی تھیں۔ رب العزت اس سے ستر گنا زیادہ تمہیں چاہتا ہے۔ اس نے تمہیں تنہا ضرور کیا ہے لیکن تنہا چھوڑا نہیں' یہ رونا اس کی ہونی واپس نہیں موڑ سکتا۔ جو ہو رہا ہے اسی میں تمہارے لیے مصلحت اور بھلائی پوشیدہ ہے۔ تم اپنی ماں کی مغفرت اور اپنے لیے اللہ سے صبر مانگو' یوں بے وقوفوں کی طرح رو رو کے اس کی بارگاہ الٰہی میں خود کو گناہ گار مت کرو۔"

عمیر نے اسے بہت آسان الفاظ میں سب سمجھایا تھا۔

اپنے باپ کی طرح اسے بھی یہ لڑکی بہت عزیز تھی۔ اسے وہ روتا یا اداس دیکھنے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔

دعا نے اپنے آنسو رگڑ کر صاف کرلیے۔

"یہ سب باتیں تو مجھے امی جان بھی سمجھاتی تھیں۔ استغفراللہ سب جاننے کے باوجود میں نے فراموش کیے رکھا۔ امی جان مجھ سے بہت خفا ہوں گی۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں' میں تنہا نہیں ہوں' آپ سب مجھے امی جان جتنا ہی چاہتے ہیں' میں واقعی اپنے اللہ کے حضور گناہ گار ہو رہی ہوں' یا اللہ مجھے معاف کر دے۔"

وہ دونوں ہاتھ جوڑے آنکھیں بند کیے اللہ سے معافی مانگنے لگی۔ عمیر کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ جس نے اتنی جلدی اس کی باتیں سمجھ لی تھیں۔ وہ ہولے سے مسکرا دیا۔

☼ ☼ ☼

سب ناشتے کی ٹیبل پر موجود تھے۔ رابعہ احمد' صفیہ (ملازمہ) کی مدد سے فرمائشی ناشتہ بناتی اور ٹیبل تک منتقل کر رہی تھیں۔

"ہیلو ایوری ون..."

عمر اپنے مخصوص جملے کے ساتھ ڈائننگ روم میں داخل ہوا۔ وہ بہت کم ان لوگوں کے ساتھ گھل مل کر بیٹھتا تھا۔ عمیر سے دو سال چھوٹا تھا وہ کم ہی کسی کو خاطر میں لاتا تھا۔

"تم آج آفس نہیں جا رہے عمر؟" عمیر نے ساڑھے نو بجے بھی گھریلو حلیے میں دیکھ کر استفسار کیا۔

"میں نے جاب چھوڑ دی ہے۔" عمر کا اطمینان اور ٹیبل پر موجود باقی نفوس کی بے اطمینانی قابل دید تھی۔

"کیوں' وجہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں۔"

ریاض احمد کا منہ کے اندر جاتا نوالے والا ہاتھ رک گیا۔ ابھی دو ماہ قبل انہوں نے اپنے بہت عزیز دوست توقیر کے آفس میں اس کی نوکری لگوا کے سکون کا سانس لیا تھا۔ ورنہ وہ ہر پندرہ روز بعد نوکری بدلتا تھا اور گھر رہ کر نوکروں کی شامت آئی رہتی۔ اس کا مصروف رہنا ہی اچھا تھا۔

"وہ خبیث ایم ڈی جانے صبح صبح کس گھاٹ کا پانی پی کر آتا کہ میری چھوٹی اور معمولی سی غلطی پر انسلٹ شروع کر دیتا' مجھ سے اپنی ذلت برداشت نہیں ہوتی۔ میں نے بھی جی بھر کے بھڑاس نکالی۔ اینڈ تھینکس گاڈ کہ پٹنے سے بچ گیا۔" عمر کے لہجے میں انتہائی لاپروائی تھی۔ باقی تمام نفوس اس پر نظریں گاڑے حیران تھے۔

"تم جیسی نکمی' ناہنجار اولاد کی صبح و شام بے عزتی

ہوتی رہے تو وہ ٹھیک رہتی ہے۔" ریاض احمد کا پارہ ہائی ہو گیا۔

رابعہ احمد کو اسی غصے کا خوف تھا۔ عمر اپنا کارنامہ بیان کر کے فریش جوس گلاس میں انڈیل رہا تھا۔

"سن رہی ہیں ناں رابعہ بیگم! یہ میرے عزیز دوست اور اپنی باپ کے عمر کے شخص کے لیے کیسی زبان کا استعمال کر رہا ہے۔ اس کی گز بھر کی لمبی زبان نے مجھے ہر جگہ ذلیل کروا رکھا ہے۔"

وہ غصے سے بولتے کھڑے ہو گئے۔ ان کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو چکا تھا۔

"آپ اس کے کرتوتوں سے واقف ہیں ناں' اس نے کون سا پہلی دفعہ یہ حرکت کی ہے پلیز آپ بیٹھ جائیں۔"

رابعہ احمد کو کچھ نہ کچھ تو کہنا تھا۔ انہوں نے کافی محتاط الفاظ کا استعمال کیا۔ کیونکہ ہمیشہ عمر کی آدھی ڈانٹ ان کے حصے میں آتی تھی اور قصوروار بھی برابر کی ٹھہرائی جاتی تھیں۔

"نہیں بیٹھنا مجھے' ابھی آفس جاتے ہی قدیر کی کال آجائے گی' میں کس کس سے شرمندہ ہو کے معافی مانگوں۔ اس کی یہ گز بھر لمبی زبان اسے بہت خوار کرائے گی رابعہ بیگم۔" ریاض احمد غصے سے گرج رہے تھے اور عمر سب کو پریشان کر کے خود بڑے مزے سے ناشتہ کرنے میں جت گیا تھا۔

"آپ کی تو فیورٹ ہابی ہے' مجھ میں خامیاں نکالنا' اسی لیے دوسروں کو بھی مجھ پر انگلی اٹھانے کا موقع ملتا ہے۔ آخر آپ بلیو کیوں نہیں کر لیتے کہ اس سب میں میرا کوئی قصور نہیں۔"

عمر کا صفائی پیش کرتا لہجہ بہت سطحی اور لاپروا تھا۔

"بکواس بند کرو۔ تمہاری صلاحیتوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ جس طرح تم گھر کے ایجڈ ملازموں کے ساتھ سلوک کرتے ہیں۔ بڑے بھائی اور نوال کے ساتھ جو تمہارا ایٹی ٹیوڈ ہے۔ یہ سب مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔"

وہ چلا رہے تھے اور عمر آرام سے سلائس پر جیم لگا رہا تھا۔ ریاض احمد کا جی چاہا کہ اپنا سر دیوار پر مار لیں۔

"تمہاری موجودگی میں میرا اس گھر میں رہنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔" وہ کرسی گھسیٹ کر اٹھتے ہوئے مرکزی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں' ناشتہ بھی نہیں کیا۔" رابعہ احمد کو بہت دکھ ہو رہا تھا۔

"میں جہنم میں جا رہا ہوں' تم اپنے اس لاڈلے کو ناشتے کرواؤ۔" وہ مڑ کر کہتے ہوئے باہر کی طرف بڑھ گئے۔

عمیر بھی فوراً" اٹھ کر باہر کی طرف بھاگا۔ ریاض احمد نے آفس کے سوا کہاں جانا تھا۔ نوال بھی عمر کو خشمگیں نگاہوں سے گھورتی اٹھ گئی۔

"ماما! آپ رونے کا شغل پھر کسی وقت پورا کر لیجئے گا' ابھی پلیز میرے لیے چائے بنا کر لائیں اور جیم کی شیشی پکڑا دیں۔" عمر کو کسی کے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔

رابعہ احمد نے شکوہ کناں نگاہوں سے بیٹے کی کو دیکھا۔ لیکن اس سے کچھ بھی کہنا فضول تھا۔ دعا سر جھکائے خالی پلیٹ کو گھور رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

الیاس احمد آئینے کے آگے کھڑے بال بنا رہے تھے۔ مریم نے وارڈ روب میں سے ان کا استری کیا ہوا سوٹ نکال کر سیدھا کیا۔

"یہ آج کے لیے نکال دوں۔"

یہ سوال وہ روز کرتی تھی۔ ابھی اس نے دس سوٹ نکالنے تھے۔ الیاس احمد کو کبھی اس کی چوائس سے اتفاق نہیں رہا تھا۔

"چلو یہی نکال دو۔ یہ سوٹ یہیں رکھ دو ادھر میرے پاس آکے بیٹھو۔" وہ جلد ہی رضامند ہو گئے۔ مریم اس پر سکون کا سانس لے رہی تھی کہ ان کے اگلے مطالبے نے اسے حیران کر دیا۔

"کیوں..... کیا ہوا' کوئی ضروری بات ہے۔" مریم کے منہ سے از خود نکل گیا۔

الیاس احمد اپنی مرضی سے' اسے وقت دیتے تھے ورنہ ان کے مطابق ان کا لمحہ لمحہ بہت انمول اور قیمتی تھا۔ اسے وہ۔۔ بیوی کے ساتھ بیٹھ کر یا گھریلو معاملات پر بات چیت کر کے ضائع نہیں کر سکتے تھے۔

"ہاں۔۔۔ بس یونہی۔۔۔ تم سے باتیں کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔" وہ موقع سے فائدہ اٹھانے میں گھاگ تھے۔

مریم کسی حد تک معصوم اور ان سے دبتی تھی۔ ان کے دیے گئے چکروں میں جلد الجھ جاتی۔

"خدا خیر ہی کرے۔" مریم دل میں کہتی ان کے قریب جا بیٹھی۔

"جی کہیے۔" اس نے بھی اپنا موڈ خوشگوار کر لیا۔

شوہر کی محبت اور التفات کی اسے چاہ تھی۔ وہ انہیں دبے لفظوں میں احساس دلاتی رہتی تھی لیکن وہ بیوی کے ساتھ گھومنا پھرنا' بچوں کو سیر کروانے کو وقت کا ضیاع کہتے تھے۔

"ہر وقت کاموں میں جتی رہتی ہو۔ کبھی میرے پاس بھی دو گھڑی بیٹھ کے کوئی دل کی بات کہہ سن لیا کرو۔"

انہوں نے مریم کا ہاتھ تھام لیا' لہجہ شہد آگیں ہو گیا۔ وہ دس سالہ شادی شدہ زندگی گزارنے کے باوجود بھی شوہر کی فطرت میں بے ایمانی پکڑ نہیں پائی تھی۔

"مجھے بھی آپ سے ایک بات کرنی تھی۔" مریم کو بروقت یاد آگیا۔ شوہر کا موڈ بھی خوشگوار تھا۔

"آصف کے فٹس بڑھتے جا رہے ہیں۔ پچھلے دنوں اس نے سوسائیڈ کی بھی کوشش کی ہے۔ سائیکاٹرسٹ نے مشورہ دیا ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو' اس کی شادی کر دی جائے۔"

مریم کا دل بھائی کے ذکر پر دکھ سے بھر گیا۔

"وہ اپاہج ہے' دورے اسے پڑتے ہیں۔ مینٹلی ڈسٹرب ہے ایسے میں بھلا کون بے وقوف اسے اپنی بیٹی دے گا۔" الیاس احمد مریم کے مطالبے پر حیران رہ گئے۔

"نہیں الیاس' میڈیسنز سے کافی بہتر ہو رہا ہے وہ' ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اس کے آپریشن کے بعد 80٪ چلنے کے چانس ہیں۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے گا لیکن مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ کسی کی مانتا ہی نہیں' جو بھی ملازم یا اٹینڈنٹ رکھتے ہیں' وہ جلد ہی اس سے اکتا کے جاب چھوڑ دیتا ہے۔"

مریم نے اس کی صورت حال بتائی۔ وہ کبھی کبھار بچوں اور ڈرائیور کے ساتھ میکے کا چکر لگا لیا کرتی تھی لیکن الیاس احمد بہت کم وہاں جایا کرتے تھے۔

مریم بھائی کے صدمے میں چور پلکیں جھپک جھپک کے آنسو چھپا رہی تھی۔

"وہ تبریز بھائی صاحب نے جائیداد کے بٹوارے میں کیا فیصلہ کیا ہے۔"

الیاس احمد نے مطلب کی بات بمشکل کہہ ڈالی۔ اسی لیے تو وہ بیٹھے اس کے بھائی کی بیماری سن رہے تھے۔

"آصف کی شادی ہو جائے تو بھائی صاحب اسے اور اس کی بیوی کو لے کر لندن شفٹ ہو جائیں گے' وہیں اس کا آپریشن بھی ہو گا اور جانے سے قبل وہ جائیداد کے حصے کر جائیں گے۔" مریم کے پاس جو معلومات تھی اس نے بغیر شوہر پر شک کیے اسے بتا دی۔

مریم کے والد صاحب خاصی لمبی چوڑی جائیداد کے مالک تھے۔ الیاس احمد کی کل جائیداد جتنا تو مریم کا حصہ نکلتا تھا۔

شادی کے شروع دنوں میں وہ کافی لاابالی تھی۔ اسے شوہر سے بہت سی توقعات تھیں۔ الیاس احمد جب پورا نہ اترپاتے تو وہ رونے دھونے بیٹھ جاتی۔ ایسے میں انہوں نے اس کا حل ڈھونڈ لیا تھا۔ اسے زبردستی کچن کے کام سونپے تھے اور بچوں کی ذمہ داری بھی اسی پر تھی۔ تاکہ وہ فرائض میں الجھ کے ان پر کم توجہ دے سکے۔

"میں آپ سے کہہ رہی تھی کہ اگر آپ کے کسی فیکٹری ورکر یا پھر کسی اور غریب کی بیٹی ہو تو پلیز ضرور آصف کے رشتے کی بات چلائیں۔"

مریم نے انہیں نئی راہ سجھا دی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

"ہوں۔" الیاس احمد نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا۔ اب انہیں جلد از جلد لڑکی ڈھونڈنی تھی تاکہ مریم کے حصے کی جائیداد پر قابض ہو سکیں۔

☼ ☼ ☼

ریاض احمد آفس سے لوٹ کر کپڑے تبدیل کرکے اسٹڈی میں چلے گئے۔ ملازمہ کو آواز دے کر چائے وہیں لانے کا کہہ دیا۔ رابعہ احمد جانتی تھیں کہ اب ان کا موڈ کئی روز یونہی خراب رہے گا۔ اب وہ ان کی ناراضی کی زد میں تھیں۔ وہ عمر کو ماں کا لاڈلا کہتے تھے۔

انہیں خود ہی شوہر کو منانا تھا۔ وہ چائے کی ٹرے لیے اسٹڈی میں بغیر دستک دیے داخل ہو گئیں۔ ریاض احمد کتاب پڑھنے میں مشغول تھے۔ سر اٹھا کے بیگم کو دیکھا اور پھر سے کتاب میں منہ دے لیا۔

"یہ آپ کی چائے۔" انہوں نے ٹرے ٹیبل پر رکھ دی۔

"میں نے ملازمہ سے کہا تھا۔" ریاض احمد سنجیدہ تھے۔

"میں بھی آپ کی ملازمہ ہی ہوں۔" رابعہ احمد بے چاری سی بن گئیں۔

"آپ میری نہیں صرف اپنے بیٹے کی ملازمہ ہیں، اس کی چاپلوسی کریں، ناز نخرے اٹھائیں۔" ریاض احمد کا غصہ عود کر آیا۔

"وہ صرف میرا نہیں آپ کا بھی بیٹا ہے۔" رابعہ احمد دھیرے سے بولیں۔

"ہرگز نہیں وہ میرا بیٹا، عمیر میرا بیٹا، میرا فرماں بردار ہے۔" ریاض احمد نے ہمیشہ کی طرح عمیر کی طرف داری کی۔

"جو فرماں بردار ہے وہ آپ کا اور جو نافرمان ہے وہ میرا۔ عمیر کی تربیت بھی تو میں نے ہی کی ہے۔" انہوں نے جتلایا۔

"لیکن عمر کی طرح سر نہیں چڑھایا، ہر ضد اور فرمائش پوری نہیں کی، بے جا طرف داریاں اور غلطیوں پر پردے نہیں ڈالے۔" وہ ایک ہی سانس میں سب گنواتے چلے گئے۔

"تم نہیں جانتیں قدیر نے فون پر میری کتنی بے عزتی کی ہے۔ اب اس عمر میں یہی ذلت اٹھانے کو رہ گیا ہوں۔ ہر جگہ میری عزت کے جھنڈے گاڑ رہا ہے۔"

ریاض احمد بھرے بیٹھے تھے جب تک اندر کا ابال نہ نکال لیتے۔ ٹھنڈے ہونے والے نہیں تھے۔ رابعہ احمد چپ چاپ سب سنتی رہیں۔

"میرے لاڈ پیار کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ بگڑ جائے، آپ بھی تو جانتے ہیں کہ وہ شروع سے کتنا ضدی اور جھگڑالو طبیعت کا تھا۔ میں نے ہمیشہ اس کے ساتھ نرم رویہ رکھا تاکہ وہ سدھر جائے، میں نے اسے بدتمیزیاں نہیں سکھائیں۔"

رابعہ احمد رو پڑیں۔ انہیں ہر چند روز بعد ہی یہ صفائی اور وضاحتیں دینا پڑتی تھیں وہ ہمیشہ عمر کے ہر معاملے میں انہی کو قصوروار ٹھہراتے۔

"اچھا، اب تم، چپ تو کرو۔" ریاض احمد نے انہیں ہاتھ سے پکڑ کر کرسی پر بٹھا دیا۔

وہ سب جانتے تھے لیکن اپنے اندر کا غصہ بھی تو کسی پر نکالنا ہوتا تھا۔ اگر یہی سب وہ عمر سے کہتے تو وہ جواباً خاموش رہنے کے بجائے سو جواب دیتا۔ رابعہ احمد آسان ٹارگٹ تھیں۔ وہ آنکھیں صاف کرنے لگیں۔

"آپ کی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

انہوں نے گال صاف کرتے شوہر کی توجہ چائے کی طرف دلائی۔ ان کے درمیان عمر ہی جھگڑے کا سبب بنتا تھا ورنہ انہوں نے کبھی اف تک نہیں کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ نوال کے بیڈ روم میں صوفے کی پشت پر سر ڈالے بیٹھی تھی۔ شام کو نوال تھوڑی دیر کے لیے فارغ ہوتی تو اسے کمرے سے باہر نکال لیتی وہ اس معصوم لڑکی کی محبت کے آگے ہار مان لیتی۔

"ہیلو اداس لڑکی۔" عمیر کف الٹتا اسے ڈھونڈتا اس طرف نکل آیا تھا۔

"آپ آ گئے آفس سے۔" دعا جلدی سے سیدھی ہو گئی۔

"جی اور آپ اپنے اس مراقبے سے کب تک باہر نکل آئیں گی میڈم!" وہ اسے جان بوجھ کر چھیڑ رہا تھا۔

"کرنے کو کچھ بھی تو نہیں ہے۔ سارا دن فارغ ادھر سے ادھر۔" اس نے وجہ بیان کی۔

"اوہ تو یہ مسئلہ ہے۔"

"دیکھو دعا! میں تمہارے لیے گرما گرم کٹلس، کباب اور چائے لائی ہوں' یہ سب میں نے تمہارے لیے خود تیار کیا ہے۔"

نوال ٹرے پکڑے جتنی تیزی سے چل رہی تھی اتنی تیز زبان بھی چل رہی تھی۔

"دھیان سے نوال! گر جاؤ گی۔" عمیر نے اسے ٹوکا۔

"شکر ہے کہ آپ بھی میرے کمرے میں آئے۔" نوال ٹرے رکھ کے بھائی کی طرف لپکی۔

"تم سے ہی ملنے آیا ہوں اور یہاں آکر انکشاف ہوا ہے کہ تم نے کوکنگ شروع کر دی ہے۔" عمیر نے اسے سینے سے لگا کر ہلکی سی چپت لگائی۔

"دعا! ہر وقت کمرہ بند رہتی ہے۔ میں نے سوچا۔ تھوڑا انٹرٹین کر دوں' دل بہل جائے گا میری فرینڈ کا۔" نوال نے بڑا پن جتایا۔ دعا ہلکا سا مسکرا دی۔

"گڈ دعا کا یونہی خیال رکھا کرو' کیونکہ اب یہ ہماری ہی ذمہ داری ہے۔" عمیر نے بڑی اپنائیت سے دعا کو دیکھا۔

"آئیں ناں عمیر! آپ بھی ہمارے ساتھ چائے پئیں۔" دعا اس کی نظروں سے گھبرا کے موضوع بدل گئی۔

"نیکی اور پوچھ پوچھ' مجھے واقعی چائے کی شدید طلب ہو رہی ہے۔" اس نے جلدی سے کپ اٹھا لیا۔

"میں اپنا کپ ہرگز نہیں دوں گی' اس نیکی کے لیے دعا سے رابطہ کریں۔" نوال نے پھرتی سے اپنا کپ اٹھا لیا۔

"کیوں دعا۔" عمیر نے نوال کو گھور کے اس کی طرف دیکھ کے بھنویں اچکائیں۔

"میں آپ کو کبھی بھی کسی بھی چیز کے لیے ریفوز نہیں کر سکتی۔" دعا کے منہ سے بے اختیار نکل گیا اور ایسا ہمیشہ ہی ہوتا تھا۔

"دیکھا نا دعا میری کتنی پکی والی فرینڈ ہے۔" وہ دعا کے الفاظ پر نہال ہو گیا۔ نوال کو زبان چڑائی اور کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

"میں تمہارے لیے تیسرا کپ نہیں بناؤں گی دعا۔" نوال ان کے اعتماد پر خفا ہو گئی۔

"نہ بنانا' میں عمیر سے ہاف کپ لے لوں گی؟" دعا عمیر کو دیکھ کے مسکرا دی۔

"آپ عمیر کی جھوٹی چائے پی لیں گی۔" نوال حیران ہوئی۔ دعا کی نظریں جھکی رہیں اور ہونٹوں پہ مبہم سی مسکراہٹ تھی۔ عمیر نے گھونٹ بھرنے کے بہانے کپ منہ سے لگا لیا۔

"دعا میرا دل چاہ رہا ہے تمہیں ڈنر پہ لے جاؤں۔" نوال کو مزید چڑانے کی کوشش کی گئی۔

"آپ اپنے اس شاہی فرمان میں شاید میرا نام لینا بھول گئے ہیں۔"

نوال نے کپ رکھ کے 'فوراً' کباب اور کٹلس کی پلیٹ دونوں ہاتھوں میں اٹھا کے بھائی کے آگے کی۔

"ہمیں تمہاری یہ چاپلوسی پسند آئی ہے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ سارا بچا کھچا کھانا' تمہارے لیے پیک کروا کے لے آئیں گے۔"

نوال کی برداشت سے بڑھ کر ہو گیا تھا۔ اس نے پلیٹ ٹیبل پر پٹخ کے' عمیر پر مکے برسانے شروع کر دیے۔

"یو چیٹر....." وہ مارنے کے ساتھ بولتی جا رہی تھی۔ دعا ہنسنے لگی۔ نوال سے بچاؤ مشکل تھا۔

☆ ☆ ☆

رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے صبح آنکھ نو بجے کھلی تھی۔ وہ احسن کو زور سے جھنجھوڑ کے' خود بال سمیٹتی کچن کی طرف دوڑی۔ دودھ فریج میں سے نکال

کے وہ تازہ پھل کاٹنے لگی۔ احسن روزانہ تازہ پھلوں کا جوس ناشتے میں ضرور لیتا تھا۔

"تم کچن میں کیا کر رہی ہو؟"

وہ جوس کو جگ میں انڈیل رہی تھی۔ جب اس کی سوالیہ آواز کان میں پڑی۔

"بریک فاسٹ ریڈی کر رہی ہوں' آپ آل ریڈی لیٹ ہیں اور ابھی تک چینج بھی نہیں کیا۔"

اس کے ہر انداز میں عجلت تھی۔ فریج کھول کے جوس کا جگ رکھا اور انڈے' بریڈ نکال لیے۔

"یہاں کھڑے ٹائم کیوں ویسٹ کر رہے ہیں۔ لیٹ ہونے کا ارادہ ہے۔" اس نے سامان کاؤنٹر پر رکھ کے خفگی سے دیکھا۔

"چھوڑو یہ سارے کام اور چلو میرے ساتھ' بیڈ روم میں۔" اس نے انعم کا ہاتھ تھام لیا۔

"لیکن آپ کا ناشتہ اور.... آفس۔" اس نے الجھنے سے دیکھا۔ احسن شاذو نادر ہی آفس سے چھٹی کرتا تھا۔

"آفس کی فکر چھوڑو۔ اور ناشتہ ملازمہ بنالے گی۔" اس نے انعم کے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ سلیب پر رکھ دی اور اسے زبردستی باہر لے گیا۔

"بٹ یو نو ڈیئر احسن میں آپ کا ہر کام' خود کر کے مطمئن رہتی ہوں۔" وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

وہ حقیقتاً" ایک شوہر پرست عورت تھی۔ اپنے مجازی خدا کی ہر خواہش اور ضرورت کا بصد شوق احترام کرنا فرض سمجھتی تھی۔ ملازموں کے باوجود احسن کے جوتے پالش خود کرتی۔

"میں جانتا ہوں انو جان کہ تم میری ہر چیز کی بہت کیئر کرتی ہو لیکن ساری رات تم اتنی ڈسٹرب رہی ہو۔ آج صبح کا ناشتہ نہیں بناؤ گی تو تمہاری فرمانبرداری پہ کوئی آنچ نہیں آئے گی۔" اس نے انو کے ماتھے پر پڑے بال محبت سے پیچھے ہٹائے۔

"لگتا ہے جناب کا آفس جانے کا موڈ نہیں۔" اس نے فوراً" پیش گوئی کر دی۔ احسن نے مسکرا کے اثبات میں سر ہلا کے اعتراف کر لیا۔ وہ اس کی رگ رگ سے واقف تھی۔

"آف کورس کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ میری کیوٹ سی بیوی تنہا گھر میں روتی رہے' تم ڈپریس ہو گی تو میں آفس میں کام نہیں کر پاؤں گا۔" اس نے تفصیلا" وجہ بتائی۔

"میں بھلا کیوں روؤں گی' خود سے گیس کر رہے آپ؟" انعم نظریں چراتی صاف مکر گئی۔

"تم اس وقت بھی ڈپریس ہو' میرا دل کہہ رہا ہے اور میرا دل تمہارے بارے میں اور تمہارا میرے متعلق کبھی جھوٹی پیشن گوئی نہیں کرتا۔ کیوں ایسا کبھی آج تک ہوا ہے؟"

وہ بھی اس کی رگوں میں خون کے ساتھ دوڑتی تھی۔

وہ اپنے بیڈ روم کے وسط میں آرکے تھے احسن نے اسے دونوں کندھوں سے تھام کے اپنے سامنے کھڑا کیا اور اس کی آنکھوں میں جھانک کے جواب مانگا۔

انعم نظریں اور سر جھکا گئی۔

"آج شام کو تمہاری رپورٹس آنی ہیں۔ شام تک کے اس عذاب سفر کا ہر لمحہ' ہر پل میں تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔"

احسن کا انداز دھیما اور سچائی کی حدت لیے ہوئے تھا۔ نگاہیں اس کے صبیح اور شفاف چہرے پر ٹھہری گئی تھیں۔

"مجھے اتنی محبت اتنا مان مت دو احسن کہ میں ٹوٹ کے سنبھل....." اس نے سختی سے اپنا ہاتھ اس کے ہونٹوں پر جما دیا۔

"خدانخواستہ انو' چوبیس گھڑیوں میں سے ایک گھڑی قبولیت کی ہوتی ہے۔ اس قدر ڈس اپائنٹ ہو کے برے الفاظ منہ سے مت نکالو۔ میری محبت' تمہیں کبھی ٹوٹنے نہیں دے گی۔ تم تو میری گڑیا ہو جسے میں نے آج تک بہت سنبھال کے رکھا ہے۔" احسن نے نرمی سے اس کے ٹوٹتے حوصلے کو بحال کیا۔

"خدا کرے ہماری محبت کو کسی کی نظر نہ لگے۔" انعم نے اپنے اندر کے اضطراب پر قابو پاتے دعا کی۔

"ہوں ' ایسا کرتے ہیں ناشتے کے بعد اچھی سی مووی دیکھتے ہیں۔ پھر ڈھیر ساری شاپنگ اور آخر میں ڈاکٹر کے پاس۔" اس نے یہ سارا پروگرام ' انعم کا دھیان بٹانے کے لیے ترتیب دیا تھا۔ انعم کی آنکھوں میں نمی در آئی جسے چھپانے کے لیے وہ پھیکا سا مسکرا دی۔

☆ ☆ ☆

دعا بیڈ کراؤن سے سر ٹکائے ' دوپٹہ گود میں رکھے سوچوں میں غرق تھی۔ گھنٹہ بھر ٹی وی پہ چینل سرچنگ کرنے کے بعد ' اس نے آواز بند کر دی۔ دن بھر اپنے کمرے میں پڑی رہتی ' اس کا باہر جانے ' باتیں کرنے اور گھلنے ملنے کو دل ہی نہیں کرتا تھا۔ وہ صرف کھانا کھانے کے اوقات میں ٹیبل پر جا بیٹھتی۔ شام کو نوال اور عمیر اسے زبردستی کمرے سے باہر گھسیٹ لیتے یا پھر نوال آدھی رات تک اس کے بستر میں گھسی سر کھائے جاتی۔ دعا کو اس کی باتیں سننا اچھا لگتا تھا۔ اس کے اندر کی گھٹن کم ہونے لگتی۔

رابعہ احمد کو دن بھر اتنے کام ہوتے کہ اس کی خیر خبر لینے کی فرصت ہی نہ مل پاتی۔

حماد نے اسے ایک بار بھی کال نہیں کی تھی۔ اسے دن بھر میں بارہا اس کا دھیان آتا۔ وہ کھانا بازار سے لاتے ہوں گے ' کپڑے ' جوتے موبائل وغیرہ ' ثریا بیگم بیٹے کی ہر چیز کا دھیان رکھتی تھیں۔ اس کی سوچوں کا دائرہ حماد کے گرد گھومتا۔ جی چاہتا کہ وہ اڑ کے اپنے گھر واپس چلی جائے۔ گول ستون سے ٹیک لگا کے اونچی آواز میں روئے۔ عمر اپنی ہیوی بائیک کی کی رنگ انگلی میں گھماتا اس کے کمرے کے قریب سے گزرا تھا۔ دو قدم آگے جا کے وہ رک گیا۔ اسے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے ادھ کھلے دروازے سے مڑ کے جھانکا۔ دعا سوگوار بیٹھی تھی۔

"ہیلو دعا ! کیسی ہو؟" وہ بڑے دوستانہ انداز میں اسے پکارتا سیدھا اندر ہی چلا آیا۔

دعا یکدم چونک کے سیدھی ہو گئی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے گود میں پڑا دوپٹہ اوڑھ لیا۔ عمر نے دلچسپی سے اس کی احتیاط پسندی کو نوٹ کیا۔

"میں نے پوچھا ' کیسی ہو؟" اب کے وہ کافی زور سے بولا۔

دعا کو ہمیشہ کی طرح اس کی آمد پر گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اس کے زور سے بولنے پر وہ اندر سے سہم گئی۔

"ٹھیک..... ٹھیک ہوں۔"

"لگ تو نہیں رہیں ٹھیک۔" عمر کی آنکھوں میں شرارت چمکنے لگی۔

"آئی کب ہو؟" اب وہ اسے جان بوجھ کے پریشان کر رہا تھا۔

عمر جانتا تھا کہ وہ اسے سامنے پا کر سہم جاتی تھی۔ جب وہ عمیر اور نوال کے ساتھ بدتمیزی کرتا اونچی آوازیں بولتا تو وہ کپکپانے لگتی۔

"پچھلے چند روز سے....." اس نے بال کان کے پیچھے اڑسے۔ اسے بری طرح گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ عمر نے کبھی اسے نرمی سے مخاطب نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے باپ کی اس لاڈلی بھانجی کو اپنا دشمن سمجھتا تھا۔ جو اس کے حق کی غاصب تھی۔

"چند روز سے ' لیکن مجھے نظر کیوں نہیں آئیں۔ کہاں چھپی بیٹھی تھیں۔" عمر لحہ بھر کو حیران ہوا۔

دعا خاموش رہی۔ وہ اس کے نرم لہجے سے مطمئن نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ابھی پینترا بدل کے بے عزتی بھی شروع کر سکتا تھا۔

"کیا مستقل رہو گی۔" اس سوال پر دعا نے خفت سے سر جھکا لیا۔

"پاپا جان کو سارے جہان سے ہمدردی ہے سوائے میرے۔ اب تمہیں فضول میں اٹھا کے فیملی ممبر بنا لیا۔ اور اپنا سگا بیٹا برداشت ہوتا نہیں۔"

عمر بڑے پرزور انداز میں بولتا ' دعا کے احساسات مجروح کر رہا تھا اس گھر میں کسی اور کا رویہ اتنا ہتک آمیز نہیں تھا۔ دعا کا شرم سے برا حال ہو گیا۔

"خیر اب تو تمہیں یہاں ٹکنے کا سولڈ بہانہ مل گیا ہے۔ حالانکہ جب تمہاری ماں زندہ تھی تب بھی تم

آئے دن اسی گھر میں پائی جاتی تھیں۔"

دعا کی رنگت زرد پڑ گئی۔ عمر کو اس کی غیر ہوتی حالت دیکھ کے دلی سکون ملا تھا۔ اس کا باپ اس لڑکی کے لیے جتنی شفقت رکھتا تھا۔ اسے اتنی ہی یہ بری لگتی تھی۔

"مووی دیکھ رہی تھیں؟" اس نے بغیر آواز کے چلتے ٹی وی کو دیکھ کے اندازہ لگایا۔

"نن... نہیں۔" دعا کا سر تیزی سے نفی میں ہلا۔

"تو پھر بجلی — کیوں ضائع کرتی ہو۔ یہی کام اگر میں کروں تو پاپا مجھے ایک آدھ ہاتھ ضرور جڑ دیں۔"

بولتے ہوئے اس نے کھینچ کر ٹی وی کا پلگ نکال دیا۔ دعا کا جی چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

"ماما سو رہی ہیں۔ ملازمہ حسب معمول چھٹی پر ہے۔ تم ایسا کرو۔ میرے لیے کھانا گرم کر کے لاؤ۔ مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔" وہ شاہی حکم جاری کرتا' اس کی سنے بغیر باہر نکلنے لگا۔ وہ سراسر جھوٹ بول گیا تھا۔

"جج... جی۔" دعا گھبرا رہی تھی۔

"اور ہاں کھانا نکالنے سے پہلے' ہاتھ اچھی طرح دھو لینا' مجھے گندگی سے سخت چڑ ہے۔" وہ جاتے ہوئے پھر پلٹا تھا۔

"مجھ جیسے فارغ بندے کے لیے اچھی انٹرٹینمنٹ ہے۔" اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ بڑے خبیثانہ انداز میں مسکرایا۔

☆ ☆ ☆

آفس کا چکر لگا کے وہ اپنے اور باپ کے مشترکہ آفس میں آگیا۔ ریاض احمد صوفے کی پشت پر سر رکھے آنکھیں موندے ہوئے تھے۔ عمیر باپ کو اس حالت میں دیکھ کے خاصا پریشان ہو گیا۔ وہ اس عمر میں بھی خاصے متحرک تھے۔ عمیر کے برابر بیٹھ کر کام کرتے تھے۔

"پاپا' کیا ہوا پاپا جان' آپ ٹھیک تو ہیں؟" انہیں شوگر اور بلڈ پریشر تھا۔ عمیر ان کے لیے جلد پریشان ہو جاتا تھا۔ ریاض احمد آنکھیں کھول کے سیدھے ہو گئے۔

"میں ٹھیک ہوں' یونہی ذرا سا سر میں درد ہو رہا ہے۔" ریاض احمد کی آواز کی نقاہت اس سے چھپ نہ پائی تھی۔

اس نے ٹیبل پر پڑے پانی کے جگ میں سے گلاس بھر کے باپ کو دیا۔

"آپ کے چہرے سے لگ رہا ہے کہ یہ معمول کا سر درد نہیں۔ یقیناً" آپ نے کوئی ٹینشن لی ہے۔" عمیر کی تشویش کم نہیں ہو رہی تھی وہ ان کے برابر آ بیٹھا۔

"میں عمر کو لے کر بہت اپ سیٹ ہوں۔ اس لڑکے نے میرا ذہنی سکون تباہ کر دیا ہے۔ کب سے یہ یونہی آوارہ گردی کر رہا ہے۔ پتا نہیں کس قسم کی سوسائٹی میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔ کل کلاں کو اس نے کچھ الٹا سیدھا کر دیا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔" ان کے چہرے پر ٹوٹ پھوٹ کے آثار تھے۔

وہ اس کی سرگرمیوں کے متعلق بہت کم بات کرتے تھے۔ لیکن آج وہ پھٹ پڑے تھے۔ وہ کب تک اس سے بدظن اور لاپروارہ سکتے تھے۔ عمر کبھی ان سے تمیز اور لحاظ سے پیش نہیں آیا تھا۔ اگر وہ اسے نرمی سے سمجھاتے تو وہ کان نہ دھرتا۔ الٹا اپنے فرسودہ خیالات بیان کرنے میں لگ جاتا۔

"آئی تھنک پاپا جان! آپ اسے ابراڈ بھیج دیں۔ شاید اکیلا رہ کے اسے اپنے پیرنٹس اور دوسرے رشتوں کا احساس ہو۔ کوشش کریں کہ وہیں پہ اس کی جاب بھی ہو جائے۔" عمیر کو یہی مناسب سوجھا تھا۔

"کیسے بھیج دوں اسے ابراڈ' اتنا پیسہ لگا کے' اگر وہ وہاں بھی نہ ٹکا تو پھر' اس کی فطرت میں مستقل مزاجی ہے ہی نہیں۔ وہ اپنی زندگی صرف عیاشیوں کو گزارنا چاہتا ہے۔ میں اسے پھوٹی کوڑی نہیں دوں گا۔" ریاض احمد نے صاف انکار کر دیا۔ عمر کے بارے میں ان کا تجزیہ بالکل درست تھا۔

"اس کی روش سے تو آپ واقف ہیں' وہ ہمیشہ اپنی من مانی کرتا آیا ہے۔ آپ اپنے دل اور ظرف کو تھوڑا

وسیع کرلیں' آپ باپ ہیں' تھوڑا جھک جائیں وہ......"
"خاموش رہو عمیر۔" ریاض احمد زور سے گرجے۔ عمیر یکدم سہم گیا۔ یہ اس کے اندر کا احترام تھا۔
"تم بھی اپنی ماں کی زبان بولنے لگے" اس نے بھی یونہی بے جا طرف داریاں کرکے اسے بگاڑ دیا ہے۔ جو میں نے لاکھوں لگا کے' اسے ہائر اسٹڈی کروائی' مہنگی ترین یونیورسٹیز میں اس کا لاکھوں کے حساب سے خرچ بھرا۔ وہ اس کا تو کوئی فائدہ ہوا نہیں۔ اب مزید اسے عیاشیاں اڑانے کو دے دوں' جاؤ عیاشیاں کرو اور میرے سر پر سارے شہر کی خاک ڈالو...." عمیر نے جلدی سے باپ کے ٹھنڈے پڑتے ہاتھ تھام لیے۔
"پلیز بابا جان کول ڈاؤن' اتنا ہائپر ہونے سے آپ کی طبیعت بگڑ سکتی ہے۔" اس نے نرمی سے کہا۔
ریاض احمد کبھی اتنے غصے میں نہیں آئے تھے۔ وہ جو بھی کہہ رہا تھا وہ لفظ بہ لفظ سچ تھا۔
"ہاں کرو دعا کہ مجھے کچھ ہو جائے پھر تم لوگ میرے خون پسینے کی حلال کمائی کا بٹوارہ کرلینا' اپنی مرضی کرتے پھرنا' کوئی تمہیں روکنے والا نہیں ہوگا۔" ان کا غصہ سنبھل ہی نہیں رہا تھا۔
وہ عمر کو برداشت کرتے تھک چکے تھے۔
"اچھا آپ حوصلہ کریں۔ میں اسے سمجھاؤں گا' بات کروں گا' اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔" عمیر نے باپ کو جھوٹی تسلی دی۔
وہ جانتا تھا کہ عمر کبھی بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اس نے کبھی عمیر کو بڑے بھائی کا درجہ نہیں دیا تھا۔ وہ اسے اپنا دشمن کہتا لیکن عمیر باپ کی خاطر اس سے بات کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔

☼ ☼ ☼

رابعہ احمد نے دو دفعہ اس کے دروازے پر دستک دی۔ وہ بیڈ پر آڑا ترچھا لیٹا ہوا تھا۔ موبائل پر انگلش سونگ لگا تھا۔ اس کے پیر اس دھن پر مسلسل ہل رہے تھے۔
انہوں نے دستک کا جواب نہ پاکر ہینڈل گھمایا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ کمرے کا حلیہ دیکھ کے ان کے حواس مختل ہوگئے تھے۔ ہر چیز اپنی جگہ سے ہٹی یا گری ہوئی تھی۔ انہوں نے بیڈ پر پڑا موبائل اٹھا کے گانا بند کیا۔ عمر کی آنکھ فوراً کھل گئی۔
"واٹس رانگ ماما' اتنا مزہ آرہا تھا۔" سیدھے ہوتے اس نے ناک چڑھائی۔
"رات بھر تم کہاں تھے عمر؟" رابعہ احمد سنجیدہ تھیں۔
"یہاں اپنے بیڈ پہ اور کہاں ہونا تھا۔" وہ ٹھٹکا۔ اتنی جلدی وہ پکڑائی دینے والا نہیں تھا۔
"جھوٹ مت بولو عمر' میں ایک بجے کے قریب بھی تمہیں چیک کرنے آئی تھی' تم یہاں نہیں تھے۔" رابعہ احمد نے جرح کی۔
"لیکن تھوڑی دیر بعد آگیا تھا' اینڈ بائی داوے' آپ کیوں میری چوکیداری کررہی ہیں۔" عمر الٹا پڑا۔
"کیونکہ میں تمہاری ماں ہوں۔ تم جانتے ہو ناں' تمہارے پاپا جان تمہاری ان حرکتوں سے کتنے نالاں ہیں۔ تم رات بھر اپنے کس فرینڈ کے پاس تھے۔" رابعہ احمد ٹلنے والی نہیں تھیں۔
ریاض احمد کی طبیعت ناساز تھی اور وہ پہلے کی نسبت کافی خاموش تھے۔
"میں کے جی ون کا بچہ نہیں ہوں ماما' آپ مجھے ڈیل کرنے کے بجائے پاپا کو سمجھائیں۔" اس کا رویہ غیر سنجیدہ تھا۔
وہ باپ کے نام پر یونہی لاپروا بن جاتا تھا۔ اس کی نظروں میں نہ احترام تھا نہ ہی باپ کے لیے عزت۔
"تم نے کہیں جاب کے لیے اپلائی کیا؟" رابعہ احمد زچ آگئی تھیں۔ انہوں نے نیا نقطہ اٹھایا۔
"مجھے فی الحال کہیں بھی جاب نہیں کرنی' مجھ سے کسی کا رعب بالکل برداشت نہیں ہوتا۔" صاف جواب حاضر تھا۔
"عمر! تم کب...."

"اس شو پیس کو آپ کیوں اٹھا لائی ہیں۔" اس نے ماں کو ٹوک دیا۔ رابعہ احمد چپ کر گئیں۔

"کون سا شو پیس۔" انہوں نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔

"کیا نام ہے بھلا اس کا وہ جو آپ کی مرحومہ نند کی بیٹی ہے۔ میرے باپ کی لخت جگر' اس کا ذکر خیر کر رہا ہوں۔" عمر نے طنزیہ کہا۔

"دعا۔ اس کا کیوں پوچھ رہے ہو تم۔" رابعہ احمد کو استعجاب نے گھیرا۔

"کیونکہ مجھے اس لڑکی سے سخت چڑ ہے اور یہ آپ اچھے سے جانتی ہیں پھر کیوں اس واہیات کو گھر میں اٹھا لائی ہیں۔" عمر حد سے بڑھ رہا تھا۔

"اپنی زبان کا درست استعمال کرو عمر! تمہیں دعا سے کیا تکلیف ہے۔" رابعہ احمد نے اسے گھورا۔

"کوئی تکلیف نہیں' تکلیف کا باعث تو سب کے لیے میں ہی ہوں ناں۔ جائیں آپ مجھے ریسٹ کرنے دیں۔" عمر کو ماں کا اس کی طرف داری کرنا سخت برا لگا تھا۔ وہ پھر سے لیٹ گیا۔

"سدھر جاؤ عمر! ورنہ بہت نقصان اٹھاؤ گے۔" وہ روہانسی ہو گئیں۔

"میرے لیے کٹلس' کیچپ ود سوفٹ ڈرنک کی ٹرے بھیج دیں۔" اس نے موبائل پر میوزک لگا لیا۔ اب وہ کسی کی نہیں سننے والا تھا۔ اس نے ماں کا دھیان خود پر سے ہٹا کے' انہیں الجھا دیا تھا۔ وہ ہمیشہ یہی تکنیک استعمال کرتا تھا۔ وہ بے بسی سے سر ہلاتی نکل گئیں۔

☆ ☆ ☆

نوال کے ٹیسٹ چل رہے تھے۔ وہ کالج سے آکر' کمرہ بند ہو کر رات تک پڑھائی کرتی۔ رات کا کھانا اس کے کمرے میں ہی بھجوا دیا جاتا۔ دعا کی شامیں پھر سے اداس ہو گئی تھیں۔ عمیر اسے ڈھونڈتا ہوا پچھلے کوریڈور میں آنکلا۔ جہاں وہ سیڑھیوں پہ سر گھٹنوں پر رکھے بیٹھی تھی۔

"دعا۔" اس نے اسے پکارا۔

"جی۔" وہ ذرا سا چونک کے سیدھی ہوتی مڑی۔

"یہاں اکیلی بیٹھی کیا کر رہی ہو۔" انتہائی سنجیدگی سے سوال کیا گیا۔

"کچھ بھی نہیں' کمرے میں دل گھبرا رہا تھا تو یہاں چلی آئی۔" اس نے بتا کر سر جھکا لیا۔ چہرے پر زمانے بھر کی مسکینیت طاری تھی۔ "یہاں کون سی سہیلیاں بیٹھی ہیں جن کے ساتھ وقت پاس کیا جا رہا ہے۔"

اس نے یکدم عود کر آنے والے غصے کو کنٹرول کیا۔ عمیر کو یہ لڑکی دھیما دھیما مسکراتی اچھی لگتی تھی۔ کم گو تھی لیکن بہت اچھا بولتی' اپنے حق کی بات ضرور کرتی' ریاض احمد کے ساتھ سیاست پر بحث کرتی' ان کے نقطہ نظر ـــــ پر سنجیدگی سے اثبات میں گردن ہلاتی اور کبھی کبھار اسے ماموں کے نقطہ نظر سے اختلاف ہوتا تو وہ مضبوط دلیل دے کر' انہیں قائل کرتی۔

"اٹھو دعا۔" اس نے کہتے ہوئے نیچے جھک کر کلائی پکڑ لی۔

"کہاں جانا ہے؟" وہ ہکا بکا رہ گئی۔

"تمہارا بندوبست کرنے' تم گھر کی کسی فالتو چیز کی طرح کبھی اس کونے میں' کبھی اس کونے میں پڑی رہتی ہو۔ شکل دیکھی ہے اپنی۔ اتنے روز گزرنے کے بعد بھی ایسا لگ رہا ہے۔ جیسے ابھی ابھی پھپھو جان کا انتقال ہوا ہے۔ بچپن سے اس گھر میں کھیل کود کے جوان ہوئی ہو اور اب غیروں کی طرح سر گرائے' حجرے میں چھپی بیٹھی رہتی ہو۔ خود اپنے گرد' دکھوں اور غموں کا حصار کھینچ لیا ہے۔" وہ بولتا جا رہا تھا۔ دعا حیران سی اس کے ساتھ گھسٹتی جا رہی تھی۔

"ماما جان! پکڑیں اسے۔" اس نے کچن میں جا کے اس کا بازو چھوڑا۔

"کیا ہوا عمیر؟" رابعہ احمد کبھی عمیر اور کبھی زرد پڑتی دعا کو دیکھ رہی تھیں۔

"آپ اسے یہاں لا کے جیسے بھول ہی گئی ہیں۔

جب دیکھو سر نیہوڑائے کسی کونے میں پڑی ملتی ہے۔" وہ غصے میں تھا۔

"کیا کروں بیٹا! میری تو صبح ہی کام کرنے سے ہوتی ہے۔ کچن کی تینوں وقت کی ذمہ داری مجھ پر ہی ہے۔ ایک کے بعد دوسرا کام نکلتا رہتا ہے۔ دعا کے پاس بیٹھنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔" رابعہ احمد نے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا۔

"کیا یہ آپ کے ساتھ کچن میں ہاتھ نہیں بٹا سکتی۔ یا ساری زندگی بند کمرے میں بیٹھ کے سوگ منانے کا ارادہ ہے۔ اسے کوئی مصروفیت دیں تاکہ یہ بھی کمرے سے باہر آئے۔ اچھی خاصی پڑھی لکھی سمجھ دار ہے۔ جانے کیوں بے وقوف بنی پھر رہی ہے۔" وہ غصے سے بھرا بغیر سوچے سمجھے بولتا جارہا تھا۔

اس نے کبھی دعا کے ساتھ اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ وہ رودی۔

"اچھا اب بس کرو' کوئی ضرورت نہیں میری بیٹی کو ڈانٹنے کی' میں خود ہی اسے سمجھالوں گی۔"

رابعہ احمد اس کے آنسو دیکھ چکی تھیں۔ عمیر کو ٹالنے لگیں۔ دعا کے رونے میں تیزی آگئی۔ عمیر کے حواس یکدم گم ہوگئے۔ دعا کا رونا اس سے بھلا کب برداشت ہوتا تھا۔ اب اس کے رونے کی وجہ وہ خود تھا۔ وہ تاسف سے سرہلاتا باہر نکل گیا۔

✡ ✡ ✡

مریم کچن میں الیاس احمد کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ وہ خود لاؤنج میں چھوٹے چھوٹے چکر لگاتا کسی سے موبائل پر محو گفتگو تھا۔

"نیازی صاحب! مجھے اندازہ ہے۔ آپ کی ریپوٹیشن کا' لیکن میرا یہ سالوں سے اصول چلتا آرہا ہے۔ میں کیم کو مزدوروں کو پے منٹ کرد یتا ہوں۔ آپ مزید تین چار روز انتظار کرلیں' کچھ نہیں ہوگا۔"

الیاس احمد بات کرتے طائرانہ سی نگاہ مریم پر بھی ڈال لیتے۔ وہ بھی چائے بنانے کے دوران کان شوہر کی کاروباری گفتگو پر ہی لگائے ہوئے تھی۔

"جی' مجھے جیسے ہی رکی پے منٹ ملتی ہے۔ میں فوراً" آپ کو ٹرانسفر کردوں گا۔ مجھے بھی فکر ہے' مارکیٹ میں ایک نام ہے' ریکارڈ ہے۔ جو میں نے خراب تھوڑی کرنا ہے۔" وہ رک کر دوسری طرف سننے لگے۔

مریم چائے کی ٹرے لیے چلی آئی الیاس احمد نے چکر لگانا چھوڑ کے' صوفے پر بیٹھتے' جلدی سے بات سمیٹی۔

"چلیں جی' جیسے آپ کی مرضی' کل آفس کا چکر لگالیں فائنل کرلیتے ہیں۔ خدا حافظ۔"

فون بند کرکے' انہوں نے چہرے پر مزید پریشانی طاری کرلی۔

"حد ہوتی ہے بے اعتباری کی۔" وہ سر مسلسل نفی میں ہلا رہے تھے۔

"خیر تو ہے' کافی اپ سیٹ لگ رہے ہیں۔" مریم نے چائے کا کپ پکڑاتے پوچھ لیا۔

یہی تو وہ چاہ رہے تھے کہ وہ اس کی گفتگو کا پس منظر دریافت کرلے۔ یہ مسکین صورت' پورے گلے کا زور اسے ہی سنانے کے لیے لگایا جارہا تھا۔

"پوچھ کے کیا کروگی' تمہیں میری پریشانیوں سے کیا لینا دینا' صرف..... صرف دس لاکھ کے لیے' یہ شخص کل سے میری بے عزتی کررہا ہے۔ اوقات کیا ہے دس لاکھ کی۔" الیاس احمد نے مریم کو گھیٹتے سنجیدگی سے وجہ بتائی۔

"تو نہ کروائیں بے عزتی دے دیں پیسے۔" اس نے مشورہ دیتے چائے پکڑائی۔ وہ اصل بات کی تہہ تک نہ پہنچ پائی تھی۔

"ہاں' مجھے شوق چڑھا ہے' ان دو ٹکے کے لوگوں سے ذلیل ہونے کا' ملک میں بجلی ہے نہ گیس' بزنس مین دیوالیہ ہو رہے ہیں۔" الیاس احمد نے دل میں مریم کی کم عقلی کو کوسا۔

"آپ کے اکاؤنٹ میں اتنا پیسہ تو ہوگا کہ....."

"نہیں ہے میرے اکاؤنٹ میں کچھ بھی۔" انہوں نے بیوی کی بات پوری ہونے سے قبل ہی جارحانہ

انداز میں کاٹ دی۔

"دو ماہ سے مال نہیں نکلا گودام بھرے پڑے ہیں۔ بینک بیلنس صفر ہو گیا ہے' میری تو راتوں کی نیندیں اڑ گئی ہیں؟؟"

انہوں نے اپنی پر زور اور فکر مند آواز میں یقین کی بے شمار ملاوٹ کی لیکن مریم اب اتنی سیدھی بھی نہیں رہی تھی۔ اب صفر بینک بیلنس اور دیوالیہ ہونے کا ذکر کون سا رخ اختیار کرنے والا تھا۔ وہ جان گئی تھی۔ اسی لیے بات کا رخ بدل گئی۔

"اچھا چھوڑیں ساری ٹینشن' چائے پئیں ورنہ ٹھنڈی ہو جائے گی۔" الیاس احمد کو اس ردعمل کی امید نہیں تھی۔

انہوں نے گڑبڑا کے چائے کا کپ اٹھا لیا۔ ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔

مریم کا دل غصے اور خفت سے بھر گیا تھا اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس منظر سے ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائے۔

"تم... تم بھائی صاحب سے بات کرو ناں...." وہ بہت ڈھیٹ تھے' پہلے بھی کئی بار مریم کے ذریعے اپنے سالے سے لاکھوں کی رقم بٹور چکے تھے۔ اب مریم کو بھی مانگتے ہوئے شرم آتی تھی۔

"دس لاکھ بہت معمولی سی رقم ہے ان کے لیے۔" انہوں نے نگاہیں چراتے "معمولی" کو اتنا معمولی لہجے میں ادا کیا جیسے دھنیا مرچ مانگنے کا کہہ رہے ہوں۔

"یہ میرا بھائی بیچ میں کہاں سے آگیا۔" اس نے اپنے سخت غصے کو بہت ضبط کرکے لہجہ نارمل رکھا۔ شادی کو دس سال بیت گئے تھے اور وہ ہر سال بہانے بنا کر لاکھوں بٹور لیتے۔ جنہیں کبھی واپس کرنے کی نوبت نہ آئی۔

"ابھی چوبیس گھنٹے قبل آپ کا بزنس عروج پر تھا۔ مصروفیت اتنی کہ بیوی بچوں کے پاس گھنٹہ بھر بیٹھنے سے لاکھوں کا نقصان ہو جاتا تھا اور اب نوبت پھوٹی کوڑی تک کیسے آگئی۔" مریم نے کپ میز پر پٹخ دیا۔ اس کی برداشت ختم ہو رہی تھی۔

الیاس احمد اس کی جرات پر ہکا بکا کپ رکھتے کھڑے ہو گئے۔ اتنا اونچا لہجہ' کوئی اور معاملہ ہوتا تو وہ اس کا گال تھپیڑوں سے سرخ کر دیتے۔ فی الحال انہیں تحمل کا مظاہرہ کرنا مجبوری تھا۔

"اب دس لاکھ کے لیے تم اپنا گھر خراب کرو گی۔" انہیں اپنا فائدہ نکلوانے کے بہت سے طریقے آتے تھے۔ مریم نے بھی اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ جہاں مکاری کی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔

"دھمکی دے رہے ہیں۔" وہ ان کے بالکل مقابل آگئی۔ الیاس احمد کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ انہیں خود پر خاموشی کا جبر کرنا پڑا۔ مریم کے یہ تیور پہلی بار دیکھے تھے۔

"اگر ہمارے رشتے کی بنیاد آپ کے لالچ پر ہے تو اس کچے دھاگے کا ٹوٹ جانا ہی بہتر ہے۔"

وہ آہستہ سے کہہ کر انہیں ہکا بکا چھوڑ گئی۔ مریم کے اس نئے روپ نے انہیں خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

دعا کو غصے میں ڈانٹنے کے بعد وہ کھانے کے لیے ٹیبل تک نہیں جا سکا تھا۔ اس نے کبھی اتنا سخت لہجہ استعمال نہیں کیا تھا۔ وہ ٹیرس کی ریلنگ تھامے کھڑا شام سے اسی کے متعلق سوچ جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی اور خوف سمٹ آیا تھا۔

وہ ہمیشہ سے اس کے دل کے بہت قریب رہی تھی۔ وہ اس کی واحد بہترین دوست تھی۔ یوں تو نوال بھی ان دونوں کی دوست تھی لیکن وہ تھوڑی لاابالی طبیعت کی تھی۔ دعا کو سامنے پا کر' وہ اپنے مسائل' وسوسے' خوش فہمیاں' راز غرض ہر احساس اور محسوسات شیئر کر لیتا۔ دعا ایک اچھی سامع تھی۔ تھوڑی خاموش طبیعت مگر بولتی بہت مضبوط دلائل اور وضاحت کے ساتھ۔ دھیما سا مسکراتی' اس کی باتیں سنتی سر جھکاتی اور پھر ایک جھٹکے سے سر اٹھاتی۔ اسے لگتا کہ دنیا اس کے چہرے پر سمٹ آئی ہے۔

یہ محبت تھی یا انسیت' اس نے کبھی فرصت میں یہ سوچنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

دعا نے بھی کھانا نہیں کھایا تھا بلکہ وہ عمیر کی باتوں پر غور کر رہی تھی۔ اس کے غصے نے وقتی طور پر دعا کو حیرت اور خوف میں مبتلا کیا تھا لیکن بعد میں ٹھنڈے دل سے سوچنے پر اسے سب سمجھ میں آ گیا۔ وہ پورچ کی سیڑھیاں اترتی لان میں آ گئی۔ عمیر کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ ہلکا سا مسکراتے جلدی سے مڑ گیا۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی عمیر کے متعلق ہی سوچے جا رہی تھی۔ وہ شروع سے ہی اس کے لیے بہت حساس تھا۔ اس کی ہر بات، ہر چیز اور خوشی کا خیال رکھتا۔ اس کا بھی کوئی کام عمیر سے مشورہ کیے بغیر پایہ تکمیل تک نہیں پہنچتا تھا۔ اس نے سر اٹھا کے آسمان کو دیکھا۔ چاند کہیں پر نہیں تھا۔ تاروں بھرا فلک اس کی تلاش پر مسکرا دیا۔

"دعا..." شناسا آواز نے اسے پکارا تھا۔

"جی..." وہ پلٹی۔

"تم اس وقت یہاں..." عمیر نے اس کا چہرہ کھوجا۔

"جی نیند نہیں آ رہی تھی، میں اس لیے باہر نکل آئی۔"

"میرے دل پہ بہت زیادہ بوجھ تھا اس لیے مجھے بھی نیند نہیں آ رہی۔" اس نے کہہ کر سر جھکایا۔

"بوجھ... کیسا بوجھ عمیر۔"

وہ انجان تھی۔ عمیر نے اسے بغور دیکھا۔ لیکن اس کے تاثرات نارمل تھے۔ شام کی ڈانٹ کے آثار غیر واضح تھے۔

"ایم سوری دعا، میں نے تم پہ اتنا شاؤٹ کیا۔ بٹ بلیومی دعا مجھ سے تمہاری اداس اور غمگین شکل بالکل برداشت نہیں ہوتی۔" عمیر بہت شرمندہ تھا۔

"جب آپ نے ڈانٹا تھا مجھے۔ تب بھی برا نہیں لگا تھا عمیر اور آپ ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہیں۔ کہ میں آپ کے کسی ردعمل کا برا مانوں گی، مجھے آپ پر خود سے بھی زیادہ اعتماد ہے۔ آپ کبھی بھی میرا برا نہیں چاہ سکتے۔ آپ میرا مان ہیں۔ میرا بھروسا کبھی نہیں ٹوٹے گا۔" دعا کہہ رہی تھی۔

"ان شاء اللہ..." عمیر نے آہستہ سے سلامتی کی دعا مانگی۔

"ان شاء اللہ..." اس کے دل نے بھی یہ دعا سن لی تھی۔

✡ ✡ ✡

دعا کچن میں آئی تو رابعہ احمد پیاز سنہری کر رہی تھیں۔

"السلام علیکم ممانی جان۔" اس نے ادب سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام، جیتی رہو، خوش رہو، کیسی ہے میری بیٹی؟" رابعہ احمد نے چولہا آہستہ کر کے اس کے گال پر پیار کرتے اسے دعائیں دیں۔ "ناشتے پر کیوں نہیں آئیں۔"

"صبح آنکھ دیر سے کھلی تھی۔" اس نے مسکراتے وجہ بتائی۔ اسے ممانی جان ہمیشہ سے ممتا کا روپ لگتی تھیں۔

"تمہارے لیے ناشتے میں کیا بناؤں۔" انہوں نے چمچ ہلایا۔

"میں سلائس پہ جیم لگا کے کھاؤں گی اور چائے کا کپ بھی خود ہی تیار کر لوں گی۔" دعا نے اپنی ذمہ داری اٹھائی۔

"چلو تم سلائس کھاؤ، میں چائے بناتی ہوں۔" رابعہ نے ٹماٹر ہنڈیا میں ڈالے۔

"نہیں میں اپنا کام خود ہی کر لوں گی بلکہ آج سے آپ کی کچن میں ہیلپ بھی کیا کروں گی۔" دعا کا انداز بڑا دوستانہ تھا۔

"کیوں اپنے ماموں سے مجھے پٹواؤ گی، انہوں نے تمہیں کام کرتے دیکھ لیا تو سمجھیں گے کہ میں نے یتیم بچی پہ تشدد شروع کر دیا ہے؟" رابعہ احمد نے الیکٹرک کیٹل آن کی۔

"میں ماموں جان سے خود بات کر لوں گی، وہ ہرگز ناراض نہیں ہوں گے۔ کیا میں پہلی دفعہ آپ کے کچن میں کام کروں گی۔" وہ اسٹول پر بیٹھ کے سلائس

کھانے لگی۔

"پہلے کی بات اور تھی۔ تب تم سب مل کے ایڈونچر کیا کرتے تھے، پریکٹیکل لائف میں رسپانسبلٹی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔" انہوں نے ساری کٹی ہوئی سبزیاں دیگچی میں ڈالیں۔

"آپ جانتی ہیں میں کافی رسپانسبل ہوں۔" دعا نے منہ پھلالیا۔

"کہیں تم نے عمیر کی ڈانٹ کا برا تو نہیں مان لیا۔" ان کے ذہن میں کل والی شام آئی تھی۔

"نہیں..... نہیں ممانی جان، بالکل نہیں۔" وہ سلائس پلیٹ میں رکھ کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے ان کی غلط فہمی دور کرنا تھی۔

"ایسا کچھ بھی نہیں اور میں عمیر سے کبھی بدگمان نہیں ہوسکتی اور آپ تو جانتی ہیں کہ میں امی جان کے ساتھ کچن سنبھالا کرتی تھی بلکہ پچھلے چھ ماہ سے میں مکمل طور پر خود ہی کھانا تیار کرتی تھی۔"

دعا نے تفصیل سے انہیں مطمئن کیا۔ یوں بھی وہ بے چاری سارا دن اکیلی ہی کچن میں لگی رہتی تھیں۔

"میں نہیں چاہتی کہ کوئی یہ کہے کہ اپنی بیٹی کو تو انڈا تک ابالنا نہیں آتا اور اس یتیم بچی پر ذمہ داریاں ڈال رکھی ہیں۔" رابعہ احمد ابھی بھی کشمکش کا شکار تھیں۔

"آپ مجھے نوال سے کیوں کمپیئر کررہی ہیں۔ وہ تو ابھی پڑھ رہی ہے اور پھر میں سارا دن فارغ رہ کر کیا کروں۔ کس چیز میں دھیان لگاؤں۔ ہر وقت امی جان، حماد بھائی اور گھر کی یاد ستاتی رہتی ہے۔ یہ تو عمیر نے فورس کیا ہے کہ مجھے مصروف رہنا چاہیے تاکہ ان پریشان یادوں سے میرا ذہن ہٹے۔" اس نے اپنے لیے چائے کپ میں انڈیلی۔ اس نے نرمی اور تحمل سے رابعہ احمد کو بھی اپنا ہمنوا بنالیا تھا۔

وہ عمیر کی بات کبھی نہیں ٹال سکتی تھی۔ وہ اس کے لیے یہ سب کرتی تھی۔ اس کی چھوٹی سی خواہش اور بات کا احترام کرکے، اس جذبے کو دوستی کے کھاتے میں ڈال دیتی۔

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری خوشی۔"

وہ رضامندی دے کے پھر سے اپنی سبزیوں کی طرف متوجہ ہوگئیں۔

☼ ☼ ☼

احسن نے اسے دن بھر اتنا مصروف رکھا کہ تفکر کا ایک لمحہ بھی اس کے ذہن میں نہ ٹھہر سکا۔ اپنے محبوب شوہر کا ساتھ اس کے لیے خوشی و اطمینان کا باعث تھا۔ احسن نے بہت لمبے عرصہ بعد صرف اسی کی خاطر آفس سے چھٹی کی تھی۔ وہ اپنی محبوب بیوی کی رگ رگ سے واقف تھا۔ اسے علم تھا اسے کس وقت، کیسے اور کس طرح منانا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو چلتی سانسوں کی طرح عزیز تھے۔

دل آرا بیگم اور عزیز آفندی کا شادی کے پانچ برس بعد ایک بیٹا احسن پیدا ہوا تھا۔ انعم احسن کی چچازاد اور اس سے چار برس چھوٹی تھی۔ وہ دو برس کی تھی۔ جب اس کی والدہ کا ٹریفک حادثے میں انتقال ہوگیا۔ دل آرا نے اس بن ماں کی بچی کو اپنی ممتا بھری گود میں سمیٹ کر، اپنے دل میں پلتی بیٹی کی خواہش کو تسکین دی۔ شاہد آفندی اتنی چھوٹی بچی کو اکیلے نہیں سنبھال سکتے تھے پھر اپنی ماں جیسی بھابھی پر بہت اعتبار تھا۔ اسی لیے وہ کچھ عرصہ بعد اپنی کولیگ سے شادی کرکے کینیڈا شفٹ ہوگئے اور انعم ہمیشہ کے لیے ان کی بیٹی بن گئی۔

انعم اور احسن کی بچپن کی دوستی شدید محبت میں ڈھل گئی۔ اور انہوں نے اپنی ازدواجی زندگی کے لیے بھی ایک دوسرے کا انتخاب کرلیا۔

شادی کے دو سال بعد تک وہ دونوں مکمل اور خوش جوڑا تھے۔ دل آرا ان کی شادی کے پانچ ماہ بعد ہی عزیز آفندی کے پاس سڈنی شفٹ ہوگئیں۔ جہاں ان کا اپنا بزنس تھا۔ شادی کو تیسرا سال لگتے ہی دل آرا نے ذومعنی الفاظ میں انعم کا دھیان فیملی بنانے کی طرف لگایا۔ انعم واقعی ناسمجھ تھی۔ وہ ہنس کر بات بدل دیتی۔

وہ احسن کی رفاقت میں زندگی کو بہت قریب سے محسوس کررہی تھی۔ پھر احسن نے بھی کبھی اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ لیکن شادی کی

تیسری سالگرہ پر دل آرا بیگم خود پاکستان آگئیں۔ انہیں انعم اور احسن کی لاپروائی کھلنے لگی تھی۔ ان کا ارادہ انعم کو سب تفصیل سے سمجھانے کا تھا پھر انہیں شک سا ہو گیا کہ شاید وہ دونوں کوئی پلاننگ کیے ہوں۔

دل آرا نے دس روز قیام کر کے انعم کو بہت اچھی طرح سب سمجھایا تھا اور ان کے واپس جاتے ہی انعم نے احسن پر زور دینا شروع کر دیا۔

"پلیز احسن! آپ اس میٹر کو سیریس کیوں نہیں لیتے۔" وہ صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس نے انعم کا ہاتھ تھام کے اپنے بالکل قریب بٹھالیا۔ ماتھے پر پڑے بالوں کو بڑی چاہت سے پیچھے ہٹاتے اس کے صبیح و شفاف چہرے کو گہری محبت سے تکتے وہ بہت دھیما سا بولا تھا۔

"کیونکہ میں بہت پوزیسو ہوں تمہارے لیے انو! میں اپنے اور تمہارے درمیان کسی تیسرے شریک کو برداشت نہیں کر سکتا، میں ہر گز نہیں چاہتا کہ میرے علاوہ کوئی اور بھی تمہاری توجہ اور محبت کا حصہ دار بنے۔"

وہ انعم کا دھیان بٹانے کو، بڑی محبت جتا رہا تھا۔ وہ سانس روکے، بہت حیرانی سے اس کا والہانہ پن دیکھ رہی تھی۔

"میں نہیں مانتی، تم جھوٹ بولتے ہو۔"

انعم کے تیور دیکھ کر کھڑے ہونے کی باری احسن کی تھی۔ بچپن سے لے کر اس لمحے تک ان دونوں نے کبھی ایک دوسرے سے مصلحتاً بھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ انعم کا اتنا شدید رد عمل، آنکھوں میں بھری بے یقینی، وہ اسے جھٹلا رہی تھی۔

"میں نے جب بھی بچے کے متعلق بات کی، تم مجھے ٹال گئے۔" انعم کا چیختا لہجہ، آنکھیں اور چہرے کی متغیر رنگت۔ احسن کی سانس سینے میں رک گئی۔ ان کی محبت کی بنیاد اعتبار پر رکھی گئی تھی۔

"کچھ ایسا ہے جس سے میں بے خبر ہوں۔ تم نے مجھ سے کیا چھپا رکھا ہے احسن! سچ بتاؤ، تم کیوں اولاد کے خواہش مند نہیں ہو۔"

اس کے اندر پکتا لاوا ابل پڑا۔ اس نے احسن کا گریبان تھام لیا۔

"بس۔" احسن نے پوری طاقت سے اس کی کلائیاں پکڑ کر اپنا گریبان چھڑایا۔

احسن کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ اسے پورچ تک کھینچتا ہوا لے گیا۔ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کے زور سے دھکا دے کر پھینکا اور خود اگلی نشست سنبھال کے گاڑی فل اسپیڈ پر چھوڑ دی۔

انعم کے سارے الفاظ اور آواز تک حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ گاڑی ایک پرائیویٹ اسپتال کے سامنے رکی تھی۔ اس بار وہ خود جلدی سے دروازہ کھول کے نیچے اتر آئی اور اس کے پیچھے اندر کی طرف بڑھنے لگی۔ احسن کے انتہائی تیز اٹھتے قدموں کا ساتھ وہ تقریباً "بھاگ" کر دے رہی تھی۔

وہ دستک دے کر ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔ احسن نے سلام دعا کے بعد جو کچھ کہا۔ اس نے انعم کے اوسان خطا کر دیے۔

"ہماری شادی کو تین سال سے زیادہ عرصہ بیت گیا ہے۔ لیکن ہم ابھی تک بے اولاد ہیں، مجھے اسی سلسلے میں اپنے ٹیسٹ کروانے ہیں۔"

وہ ہکابکا سر اٹھائے اسے دیکھ رہی تھی۔ جو بغور ڈاکٹر کی ہدایات سن رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس کی فرسٹریشن کا یہ مطلب لے گا۔

وہ اپنی کرسی سے اٹھ کے ڈاکٹر کے ساتھ باہر چلا گیا۔ وہ تنہا شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں گری بیٹھی تھی۔

وہ اسے گیٹ پر اتار کے، بنا بتائے اسلام آباد چلا گیا تھا۔ رپورٹس اگلے روز آئی تھیں اور تب تک رو رو کے اس نے اپنی طبیعت خراب کر لی تھی۔ ملازم نے اس کی رپورٹس لا کر تھمائی تھیں جو پازیٹو تھیں۔ اس میں کوئی نقص نہیں تھا۔ انعم اپنے الفاظ اور رویے پر نادم، احسن کو بار بار کال ملائے جا رہی تھی۔ اس کا نمبر بند تھا۔ وہ پہلی بار اس سے ناراض ہوا تھا۔ انعم نے اس کی ناراضی کا گہرا اثر لیا تھا۔ اس کا بی پی شوٹ کر گیا اور چکرا کے گر گئی۔

☆ ☆ ☆

الیاس احمد بیرونی برآمدے میں رکھی گئی کرسیوں پر سفید کرتے ڈی کے جوڑے کے ساتھ بلیک واسکٹ اور براؤن کھیڑی پہنے بڑی شان سے اکڑے بیٹھے تھے۔ یہ لباس ان کے والد صاحب زیب تن کیا کرتے تھے۔ جب وہ گھر میں ہوتے شلوار سوٹ ہی منتخب کرتے۔ ملازم دینوان کے کندھے دبا رہا تھا۔

"بہت سکون ہے تمہارے ہاتھ میں دینو' ساری تھکاوٹ اتر جاتی ہے۔" انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

"معاف کرنا صاحب! میں.... میں نے آپ سے اپنے میٹرک پاس بیٹے کی نوکری کی درخواست کی تھی' بڑی مہربانی ہوگی آپ کی صاحب۔"

دینوان کا موڈ خوشگوار دیکھ کر اپنا بھولا ہوا مدعا یاد کرانے لگا۔

"دیکھ دینو' تیرے بیٹے کو کرسی یا دفتر ملنے سے تو رہا' ہاں میں اسے اپنی فیکٹری میں ملازم رکھ لوں گا اور باقی مزدوروں سے ہزار' دو ہزار زیادہ دے دیا کروں گا۔" الیاس احمد نے اسے وضاحت سے بتا دیا۔

"ٹھیک ہے صاحب' بڑی مہربانی' میں کل ہی اسے گاؤں سے بلوا لیتا ہوں۔" دینو بہت خوش ہو گیا تھا۔

"کیسے ہیں چاچو؟"

عمر درمیانی رستے سے گزر کر آیا تھا۔ وہ چھٹی والے روز کافی وقت اپنے چاچو کے ساتھ گزارا کرتا۔ الیاس احمد کا بھی وہ لاڈلا بھتیجا تھا۔

"میں بالکل فٹ ہوں' تم سناؤ آج کل کیا ہو رہا ہے بھتیجے۔" الیاس احمد آنکھیں کھول کے ایک دم سے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ان کا چہرہ اسے دیکھ کے کھل گیا تھا۔

"فرصتیں ہی فرصتیں۔" عمر نے کہہ کر انگڑائی لی۔

"نوکری چھوڑ دی۔" پرانا استفسار کیا گیا۔

"ہاں' لات مار دی ایم ڈی کے منہ پر۔" عمیر کے چہرے کے خدوخال کھنچ گئے۔

"یہ لات تم نے نہیں ایم ڈی نے تمہارے منہ پر ماری ہے۔" الیاس احمد نے بات کا رخ ہی بدل دیا۔

"کیا مطلب؟" عمر کے ماتھے پر پرسوچ بل پڑ گئے۔

"دینو جاؤ خانساماں سے کہو کہ میرے بیٹے کے لیے اچھا سا کھانا لے کر آئے۔ کتنے روز بعد اس نے ہمارے گھر کا چکر لگایا ہے۔" انہوں نے خاصے جھڑکنے والے انداز میں ملازم کو بھگا دیا۔

"تیری قسمت میں تیرے باپ نے دھکے لکھ دیے ہیں۔ اتنا تو خوب صورت اور ویل ایجوکیٹڈ ہے۔ تیرے لیے یہ ٹکے ٹکے کی نوکریاں ہی رہ گئی ہیں۔ خود تیرے باپ کا وسیع بزنس ہے۔"

الیاس احمد ہمیشہ اسے بڑھاوا دیا کرتے تھے۔ وہ معمولی سی بات کو بڑھا کر اسے بدظن کرنے کی کوشش کرتے۔

"میں پاپا جان کے آفس میں نوکری نہیں کروں گا۔" عمر نے دوبدو وجہ پیش کی۔

"تو نہ کرو۔ میں کون سا تمہیں مشورہ دے رہا ہوں اور پھر بھائی جان کا رویہ تمہارے ساتھ کتنا ہتک آمیز ہے۔ کیا میں نہیں جانتا۔" یہ ان دونوں کا پسندیدہ موضوع تھا۔

"ان کے لیے تو صرف عمیر ہی اول و آخر ہے۔ انہوں نے کبھی میری حیثیت کو اہمیت ہی نہیں دی۔ ہر وقت مجھ سے ناراض۔ ہر ایکٹویٹی پر اعتراض ہوتا ہے۔"

عمر بھی ان کے سامنے دل کی بھڑاس نکالنے لگا یہی سب وہ اس کی زبان سے سننا چاہتے تھے۔

"میں تمہیں صحیح مشورہ دوں تو اس بار تم بھی ڈٹ جاؤ۔ ایک انچ بھی پیچھے مت ہٹنا۔" الیاس احمد اس کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔

"کس بات پہ' میں سمجھا نہیں۔" عمیر نے ابرو اچکائے۔

"اس ساری جائیداد میں' تم آدھے کے وارث ہو' جس پہ عمیر اکیلا ہی قابض ہوا بیٹھا ہے۔ تم بھی اپنا حصہ طلب کرو' الگ سے اپنا بزنس اسٹارٹ کرو۔ مجھے

تمہاری ابیلٹیز پر پورا بھروسہ ہے۔ تم لاکھوں کو کروڑوں میں بدل دو گے۔ تم بہت کچھ کر سکتے ہو' بس تھوڑی سی ہمت پکڑو اور قدم اٹھاؤ۔"

الیاس احمد نے اس کے لیے ایک نئی سوچ کا در وا کر دیا تھا اور ایسا وہ ہمیشہ سے کرتے تھے اسے ہر بار کوئی نئی اور انوکھی پٹی پڑھاتے۔ عمر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☼ ☼ ☼

وہ ملازمہ کے بلانے پر کمرے سے باہر آئی تھی۔ رابعہ احمد لاؤنج کے صوفے پر ساری شاپنگ ڈھیر کیے بیٹھی تھیں۔ عمیر دوسرے صوفے پر بڑے ڈھیلے ڈھالے انداز میں لڑھکا ہوا تھا۔

"اسلام علیکم ممانی جان۔" اس نے قریب آکر ادب سے سلام کیا۔

"وعلیکم اسلام' آجاؤ میری بیٹی۔"

رابعہ احمد بہت خوش تھیں۔ اس خوشی کی وجہ ان کا اتنے عرصہ بعد بازار جانا تھا۔ انہوں نے خود کو گھر اور گھر داری میں اس قدر الجھا لیا تھا کہ ان کی سوشل لائف بالکل ختم ہو گئی تھی۔ جب سے دعا نے ان کی مدد کرنا شروع کی تھی۔ ان کا ذہن بہت حد تک آزاد ہو گیا تھا۔ وہ انہیں جو کام' جس طرح کرتا دیکھ لیتی' دوسری دفعہ خود بخود اسے بالکل اسی طریقے سے اپنی ذمہ داری پر نبٹا دیتی۔ کھانا بھی وہ بہت اچھا بناتی تھی رابعہ احمد پر سے کاموں کا بوجھ بٹ گیا تھا۔ پھر دعا کے ہاتھ میں پھرتی کے ساتھ صفائی اور سلیقہ بھی بہت زیادہ تھا۔

آج بہت عرصہ بعد وہ کچن کی ذمہ داری' اس پر ڈال کے خود عمیر کے ساتھ بازار گئی تھیں۔

"تم نے کھانے کی تیاری کر لی۔"

رابعہ احمد نے پوچھا۔ وہ جب سے بیاہ کر آئی تھیں۔ کبھی کچن کے لیے خانساماں یا ملازمہ وغیرہ نہیں رکھی تھی۔

"جی' میں نے میٹھا بنا کے فریج میں رکھ دیا ہے' رائتہ اور سیلڈ بھی تیار ہے۔ سالن کا مسالا تیار ہے' آپ سالن پکائیں گی اور میں کباب تل کے' روٹی ڈال لوں گی۔"

دعا نے بیٹھتے ہوئے بڑے رسان سے سب ترتیب دے کر بتایا۔

"ماما جان' آپ نے اسے اچھا خاصا ٹرینڈ کر دیا ہے۔" عمیر نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

"یہ دیکھو' میں نے تمہارے لیے تین سوٹ خریدے ہیں' وہ بھی تمہارے فیورٹ کلرز کے' آگے ڈیزائن دیکھو' پسند آتا ہے کہ نہیں۔" انہوں نے شاپر میں سے کپڑے نکال کر اس کے آگے پھیلائے۔ کالا' پیازی اور ہلکا پیلا رنگ وہ بھی اتنے خوب صورت ڈیزائنز کے ساتھ وہ حیرت سے منہ کھولے رہ گئی۔

"یہ سب میرے لیے...." اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

"بالکل تمہارے لیے۔"

اس کے چہرے پر پھیلی خوشی اور حیرت نے رابعہ احمد کو بھی محظوظ کیا تھا۔

"آپ کو پتا ہے' مجھے امی جان کے خریدے ہوئے کپڑے بہت کم پسند آتے تھے لیکن آپ نے تو سارے میری پسند...."

"میں نے نہیں' عمیر نے' تمہارے لیے کلرز اور ڈیزائن تک کی سلیکشن عمیر نے کی ہے۔ شکریہ بھی اسی کا ادا کرو۔" وہ بولتے ہوئے دوسری چیزیں الٹ کر گننے لگیں۔

"آپ...." عمیر کی طرف دیکھ کے اس کے ہونٹوں سے محض یہی نکل سکا۔

"ہاں بھئی' میرا خیال ہے کہ یہ کلرز تم پہ سوٹ کرتے ہیں۔" اس نے دعا کی آنکھوں کی نرمی اور بڑھتی چمک کو اپنے سینے میں ہمیشہ کے لیے مقید کر لیا۔

دعا سر جھکائے سوٹ پر ہاتھ پھیرتی اپنی خوشی کو چھپا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

الیاس احمد اپنی کرسی کو دائیں سے بائیں گھماتے'

پنسل کا پچھلا حصہ ہونٹوں میں دابے ' بڑے پرسوچ انداز میں بیٹھے تھے۔ آج کل ان کا ذہن آصف کی شادی ' جائیداد کے بٹوارے میں ملنے والی رقم میں اٹکا رہتا۔ نئی فیکٹری لگانے کے لیے زمین بھی دیکھنی شروع کردی تھی۔ وہ پچھلے دس برس سے اس پر اپنی پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ بزنس کی دنیا میں نام بنانا ان کا دیرینہ خواب تھا۔ لیکن ان کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے۔ اگر انہیں مریم کی وراثت میں آنے والی رقم مل جاتی تو وہ اچھی خاصی بہتر پوزیشن میں آجاتے۔

"سر! میں اندر آسکتا ہوں ؟" چپڑاسی رمضان دروازے میں کھڑا اجازت طلب تھا۔

"ہاں آجاؤ رمضان۔"

الیاس احمد خیالوں سے چونک کے ' کرسی پر آگے کو ہو کر بیٹھے ' بغور پرانی سی شلوار قمیص والے رمضان کو دیکھا جس کے چہرے پر بھی غربت ٹپکتی تھی۔

"جی سر ' آپ نے مجھے بلوایا تھا۔" وہ مؤدب کھڑا تھا۔

"ہاں یار! مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔" الیاس احمد کا لہجہ خاصا دوستانہ ہو گیا۔

"سر جی ضروری بات اور وہ بھی مجھ سے۔" اس کو اپنے غصیلے مالک کا اتنا نرم رویہ ہضم نہیں ہوا تھا۔ وہ تو معمولی سی خطا پر ملازموں کو دھنک کر رکھ دیتے تھے۔

"ہاں تم سے ' اتنے پرانے شناسا ہو نا۔" انہوں نے مزید دانہ ڈالا۔

رمضان احمد نے بغیر سمجھے دو دفعہ اثبات میں سر ہلانا ضروری سمجھا۔

الیاس احمد کو یاد تھا کہ چھ ماہ قبل رمضان نے ان سے اپنی بڑی بیٹی کی شادی کے لیے قرض لیا تھا۔ اور ان کے پوچھنے پر بتایا تھا کہ وہ چھ بیٹیوں کا باپ ہے۔

"جی... جی سر۔" اس کی زبان بل کھا گئی۔

"تمہارے..."

انہوں نے تمہارے کو خاصا کھینچا ' دراصل خود کو تمہارے گھر میں کہنے سے بمشکل روکا تھا۔

"تمہارے محلے یا اردگرد جاننے والوں میں کوئی ضرورت مند بیٹیوں کا گھر نہیں ہے۔"

بڑے محتاط الفاظ کا استعمال کیا گیا۔ کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ وہ خود ہی اپنی بیٹی کا نام لے ' بلکہ منت و سماجت کرے۔

"بہت ہیں سر جی ' کیوں آپ نے کسی غریب کی بیٹی کو جہیز دینا ہے۔"

وہ اپنے طور پر اندازہ لگا کے خوش ہوا۔

انہیں رمضان کے اس بے تکے پن پر اچھا خاصا جھٹکا لگا۔ وہ تو سالوں پرانے گھریلو ملازموں کو عید شب برات اور شادی بیاہ جیسے موقع پر بھی تنخواہ کے علاوہ اضافی رقم بطور قرض دیا کرتے تھے۔ باقی کی وضاحت خاصے نے تلے لہجے میں کی گئی۔

"جہیز نہیں دینا بلکہ بیٹی لینی ہے۔" انہوں نے فوراً سے قبل ہی سچ اگل دیا۔ اب حیران ہونے کی باری رمضان کی تھی۔

"بیٹی ' کس کے لیے سر جی ؟" اس کا لہجہ دھیما اور پر تجسس ہو گیا۔

"اپنے ذہنی معذور اور اپاہج سالے کے لیے۔"

الیاس احمد نے غصے سے دانت کچکچائے۔ وہ ملازموں کو منہ لگا کر سر چڑھانے کے قائل نہیں تھے۔ لیکن ابھی بات کرنا مجبوری تھی۔

"توبہ توبہ کریں سر جی ' مجھے کسی لڑکی کے والدین سے اپاہج مرد کی شادی کی بات کر کے مار کھانی ہے۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگانے شروع کر دیے۔

"رمضان! تیری بھی تو بیٹیاں ہیں ناں..." الیاس احمد ہلکی سی جھجک سے مطلب کی بات پہ آگئے۔ اس کو بلانے کا خاص مقصد بھی یہی تھا۔

"جی... کیا کہنا چاہتے ہیں آپ سر جی۔" وہ بدکا۔ اس کے تیور بگڑ گئے۔ جو الیاس احمد کی زیرک نگاہوں نے پڑھ لیے۔

"فرض کر ' بلکہ سچ سمجھ کہ وہ لولا لنگڑا ' کروڑوں کا مالک ہے۔ پھر تو کیا فیصلہ کرے گا۔" انہوں نے ذرا

سنبھل کے چارہ ڈالا۔

"کروڑوں کا مالک ہو یا اربوں کا' میری بیٹی نے تو دو وقت کی روٹی کھانی ہے اور پھر میں روز قیامت اپنے رب اور آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا منہ دکھاؤں گا کہ میں نے دنیاوی لالچ میں آ کے اللہ کی بھیجی ہوئی رحمت کا سودا کر دیا۔"

یہ سب کہتے ہوئے رمضان کا چہرہ لال سرخ ہو گیا۔ اگر اسے نوکری کا خیال نہ ہوتا تو اس گھٹیا مشورے پر مالک کا گریبان ضرور پکڑ لیتا۔

"اور اگر تمہاری باقی بیٹیوں کا جہیز اور بیٹے کو کاروبار کے لیے چند لاکھ مل جائیں تب..." انہوں نے ہمت نہ ہاری اور مزید پیشکش کی۔

"میری بیٹیاں ابھی مجھ پر اتنی بھاری نہیں سرجی اور نہ ہی اکلوتا بیٹا اتنا عزیز کہ اس کے بہتر مستقبل کی خاطر' پانچ بیٹیوں کی زندگی کا سودا کر لوں۔ اجازت دیں صاحب' ابھی مجھے کوریڈور کی صفائی بھی کرنی ہے۔"

رمضان اپنی کہہ کر ان کی مزید سنے بغیر ہاتھ اور سر ہلاتا باہر نکل گیا الیاس احمد سخت بدمزہ ہوئے تھے۔ پہلے ہی موقع پر منہ کی کھانی پڑی تھی۔ اب آئندہ معاملات سنبھل کے طے کرنے تھے۔

☼ ☼ ☼

"ماما... ماما... ماما جان..." وہ سیڑھیوں سے ہی چیختا چلاتا اتر رہا تھا۔

دعا ناشتے کے دھلے برتن خشک کر رہی تھی۔ رابعہ احمد پھل کاٹ رہی تھیں۔

"یا اللہ خیر..." عمر کی اونچی پکار نے ان کا دل دہلا دیا۔

"کیا ہو گیا..."

"میرا بریک فاسٹ کس نے بنایا ہے؟" اس نے ماں کی سنے بغیر اپنی کہی۔ رابعہ احمد نے طائرانہ سی نگاہ ساکت کھڑی دعا پر ڈالی۔

"میں نے... کیوں کیا ہوا؟"

رابعہ نے مصلحت آمیز جھوٹ بولا۔ حالانکہ وہ جانتی تھیں کہ عمر احمد کو ٹالنا آسان نہیں۔ اس کے کسی بھی کام میں ذرا سا نقص نکل آتا وہ یونہی واویلا مچاتا۔

"جھوٹ مت بولیں ماما..." اس کے ماتھے کے بلوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔

"آواز نیچی رکھو عمر..." انہیں بیٹے کا یوں جھٹلانا برا لگا تھا۔ دعا نے تھوک نگلا کیونکہ عمر کا ناشتہ اس نے بنایا تھا۔

"میرے ملک شیک میں شوگر آپ نے ڈالی تھی۔ فل فرائی ایگ اور مکس چائے۔ بہت تھک گئی ہیں میرے کام کر کر کے یا اکتا گئی ہیں مجھ سے۔"

اس کی آواز نیچی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے غصے میں مزید اضافہ ہو گیا۔ رابعہ احمد نے نظریں چرائیں۔ عمر کا ناشتہ دعا نے بنایا تھا۔ رابعہ احمد کے سر میں درد تھا۔ وہ صبح ٹیبلٹ کھا کر لیٹ گئی تھیں۔ جب ملازمہ نے آ کر ناشتے کا پیغام دیا تو دعا ہی کچن میں تھی۔ اس نے اپنی طرف سے ذمہ دار ہونے کا ثبوت دیا تھا جو اسے خاصا مہنگا پڑ گیا تھا۔ وہ شوگر کا استعمال کم کرتا تھا۔ چائے صرف سپیریٹ پسند تھی۔

"اچھا تم چلو' میں تمہارے بیڈ روم میں دوسری ٹرے بنا کر لاتی ہوں۔" انہوں نے نرم روی سے ٹالنا چاہا۔

"آپ اس لڑکی سے کہہ دیں کہ یہ آئندہ میرے کسی بھی کام کو ہاتھ نہ لگائے' یہ بابا کی چہیتی صرف انہی تک رہے..."

"اسٹاپ اٹ عمر' اب تم اپنی لمٹ کراس کر رہے ہو۔" رابعہ احمد نے کپکپاتی' خوفزدہ کھڑی دعا کا دفاع کیا۔

"آپ بھی بابا کی طرح' اس لڑکی کی خاطر' مجھے غلط ٹھہرائیں گی۔ نہیں کرنا مجھے ناشتہ' اور نہ ہی مجھے آپ سے کوئی بات کرنی ہے' آپ اس یتیم و مسکین کو سینے سے لگائیں۔"

وہ چیختا ہوا' وہاں سے نکل گیا۔ اس کا غصہ سوا نیزے پر تھا۔

اسے شروع سے دعا سے چڑ تھی۔ اپنے گھر میں اس کی حیثیت سے چڑ تھی۔ عمیر' دعا اور نوال کی دوستی

سے چڑ تھی۔
رابعہ احمد اس کی نفرت سے بخوبی آگاہ تھیں۔ وہ اپنے اندر کی فرسٹریشن صرف انہی سے تو شیئر کیا کرتا تھا۔
"رُکو عمر... بات سنو۔"
وہ اسے لاؤنج تک آوازیں دیتی آئی تھیں لیکن وہ لمبے ڈگ بھرتا پورچ میں کھڑی اپنی بائیک اسٹارٹ کر کے نکل چکا تھا۔ وہ وہیں صوفے پر سر پکڑے بیٹھ گئیں۔

☆ ☆ ☆

انعم نے رو رو کر احسن سے معافی مانگی تھی۔ اس نے قسم اٹھائی تھی کہ جو بھی جذبات کی رو میں اس کے منہ سے نکلا وہ بالکل غیر ارادی تھا۔ احسن نے اس کے الفاظ کا غلط مطلب لیا ہے۔ اس کے ذہن میں کبھی بھی شبہ نہیں ابھرا تھا۔
ٹھیک پندرہ روز بعد اس نے اپنے ٹیسٹ بھی کروالیے تھے۔ اب وہ ڈاکٹر شائستہ کے سامنے بیٹھی اپنے کپکپاتے ہاتھوں پر قابو پا رہی تھی۔
"مسز احسن..." ڈاکٹر شائستہ نے کافی دیر رپورٹس پڑھنے کے بعد اسے پکارا۔
اس میں "جی" کہنے کی ہمت بھی مفقود تھی۔ اس کے لیے یہ لمحات بہت بھاری تھے۔ موت اور زندگی کے مترادف۔ اس نے سر اٹھا کے ڈاکٹر کے بجائے شوہر کو دیکھا۔ جو اس کا حوصلہ بڑھانے کو ہلکا سا مسکرا دیا۔
"آئی ایم سوری... آپ... آپ کبھی بھی ماں نہیں بن سکتیں۔"
اس کے تین سال کے ڈر کے پیچھے یہی الفاظ چھپے تھے۔ جو کھل کر سامنے آگیا تھا۔ اس کا جسم سر سے لے کر پاؤں تک بالکل خالی اور بے جان ہو گیا۔ احسن کو اس بری خبر پر پریشان ہونے کے بجائے انعم کی فکر تھی۔ جس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ احسن نے اس کے گود میں دھرے سرد ہوتے ہاتھوں کو تھام لیا۔

"آر یو اوکے انو' آر یو فیلنگ ویل' پلیز بولو ناں۔"
اس کی پتلیاں ساکت تھیں۔
"ایکسکیوز می۔" ڈاکٹر شائستہ معذرت کرتی اپنی جگہ سے اٹھ گئیں وہ انہیں اس نازک مرحلے پر سنبھلنے کا موقع فراہم کر گئیں۔
"انو پلیز ایسے مت کرو۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گا' میری زندگی کا مقصد' حاصل صرف تم ہو' پلیز کنٹرول یور سیلف۔"
احسن نے اسے کندھوں سے پکڑ کر زور زور سے جھنجھوڑا۔ انعم کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی اور بازو بے جان ہو کر اطراف میں گر گئے۔

☆ ☆ ☆

"ماما جان' کیا آج کچھ خاص ہوا ہے؟" عمیر سامنے والے صوفے پر آکے بیٹھ گیا۔ رابعہ احمد اس کی نئی شرٹس کے بٹن مضبوط کر رہی تھیں۔
"نہیں... تو۔" ان کے کام کرتے ہاتھ رک گئے۔
"دعا کے روم کا دروازہ لاک ہے اور آپ بھی خاموش ہیں۔" عمیر کا تجزیہ بالکل درست تھا۔
"ماما... میری بلیک والی شرٹ..." عمر بولتا ہوا اندر سے نکلا تھا۔ شام کو گھر سے نکلتا اور رات گئے لوٹتا۔
"یہ کس کی شرٹ ہے۔" عمر نے قریب آکر بات ادھوری چھوڑ کے ماں کے ہاتھ سے شرٹ پکڑ لی۔
"عمیر کی شرٹس ہیں۔" رابعہ احمد نے اس کے ہاتھ سے شرٹ چھین کے دوسری دو شرٹس بھی صوفے سے اٹھا کے گود میں رکھ لیں۔ انہیں عمر کی دعا کے ساتھ بدتمیزی کرنے پر بہت غصہ تھا۔ دعا روتی ہوئی وہاں سے گئی تھی۔
"میری بھی بلیک والی نہیں مل رہی' آپ یہ مجھے دے دیں کیونکہ میری وارڈ روب میں یہ کلرز نہیں ہیں۔" اس نے جان بوجھ کر قبضہ کرنا چاہا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ عمیر کی ہیں۔
"نہیں ہیں تو بازار سے لے آؤ' یہ میں تمہیں نہیں دوں گی۔" رابعہ احمد نے اس کے بڑھے ہاتھ کو

پرے کیا۔ اگر عمیر سامنے موجود نہ ہوتا تو شاید وہ اسے یہ شرٹس دے دیتیں اور اس کے لیے بالکل ایسی نئی لا کر رکھ دیتیں لیکن وہ اس کے سامنے اس کی چیز عمر کے سپرد نہیں کر سکتی تھیں۔

"آپ دوبارہ پر چیز کر لیجئے گا' مجھے یہی چاہئیں۔"

اس کا لہجہ ضد سے بھر گیا۔

"پلیز ماما جان' آپ اسے یہ شرٹس دے دیں' مجھے فی الحال نئے کپڑوں کی ضرورت نہیں۔"

عمر نے بات سمیٹ دی' عمر ہمیشہ سے اس کی کاپیوں' بیگ' جوتوں حتیٰ کہ یونیفارم تک پہ قبضہ کرتا آیا تھا۔ رابعہ احمد نے بے دلی کے ساتھ شرٹس اس کی طرف بڑھائیں۔

"چھوڑیں ماما جان! دل پر مت لیں' مجھے صرف آپ کی دعائیں اور محبت چاہیے۔"

وہ اٹھ کے ماں کے قریب آگیا اور انہیں خود سے لگا کے ان کا غم ہلکا کرنے کی کوشش کی۔

"کچھ دعائیں آپ میرے لیے بھی بچا کے رکھ لیں۔ پہلے ہی اس نے میری حیثیت اور کرسی پر اپنا قبضہ جما رکھا ہے۔"

عمر کہہ کر یہ جا وہ جا۔ عمیر اور رابعہ احمد اس کے الفاظ پر حق دق رہ گئے۔ اس نے آج سے قبل کبھی ایسی بات نہیں کی تھی۔

☼ ☼ ☼

رابعہ احمد پلیٹ میں دودھ کا گلاس رکھے کمرے میں داخل ہوئیں۔ ریاض احمد تکیے سے ٹیک لگائے کوئی کتاب پڑھنے میں مگن تھے۔

"کتاب بعد میں پڑھ لیجئے گا' پہلے ــــ دودھ پی لیں۔" یہ ان کا روز کا جملہ تھا۔

"رابعہ بیگم' مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔"

انہوں نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھی اور عینک اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی۔

"خیر تو ہے ناں۔" ان کے دل میں سب سے پہلے عمر کا خیال آیا۔ شاید وہ اس کی کوئی شکایت کرنے والے ہوں۔

"بیٹھ جاؤ۔" انہوں نے ٹانگیں سمیٹ کر بیوی کے لیے جگہ بنائی۔ وہ ذرا سہمی ہوئی سی تھوڑی سی جگہ پر ٹک گئیں۔

"میں دعا کے لیے فکر مند ہوں' پرائی بیٹی ہے۔ شادی کے بھی قابل ہے۔ ہمارا جوان بیٹوں کا گھر ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کے فرض سے جلد از جلد سبکدوش ہو جاؤں۔"

ریاض احمد کو یہی فکر لگی رہتی تھی۔

"تو پھر کیا سوچا ہے آپ نے دعا کے مستقبل کے بارے میں۔" رابعہ احمد کا ذہن بھی ہلکا پھلکا ہو گیا۔

"جیسا کہ تمہیں بھی معلوم ہے کہ آپا جان کی خواہش تھی کہ وہ ہمارے گھر کی بیٹی بنے' آگے تم زیادہ بہتر سمجھتی ہو۔ بچوں سے ان کی رضا مندی لینا بھی ضروری ہے۔"

ریاض احمد نے بظاہر تمام معاملات ان کے سپرد کر دیے۔

"میرے خیال سے ہمیں تھوڑا عرصہ مزید انتظار کرنا چاہیے تاکہ دعا اپنی ماں کے صدمے سے مکمل طور پر باہر نکل آئے۔"

دعا ان کے ساتھ وقت گزارتی تھی۔ انہیں اس کی فیلنگز اور دلی تکلیف کا علم تھا۔ وہ ابھی بھی چھوٹی سی بات پر ماں کا ذکر کر کے رو دیا کرتی۔

"یہ دودھ دیں میں دوبارہ گرم کر دوں۔" رابعہ احمد نے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ وہ نیم گرم دودھ پیتے ہیں۔

"نہیں ــــ نہیں رہنے دو' آج میں ایسے ہی پی لوں گا۔" انہوں نے دودھ اٹھا کے گلاس منہ سے لگا لیا۔

☼ ☼ ☼

موسم سہانا تھا' ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ وہ کیاریوں کے قریب لگے چھوٹے سنگی بینچ پر آ بیٹھی۔ نئی کھلی کونپلوں اور پھولوں کو انگلیوں کی پوروں سے چھو کے وہ انوکھی سی خوشی محسوس کر رہی تھی۔

عمر سیٹی کی دھن بجاتا مرکزی دروازہ کھول کے لاؤنج میں آیا۔ اس نے جینز کے اوپر عمیر کی نئی شرٹ پہن رکھی تھی۔ بائیں ہاتھ پر رسٹ واچ' دائیں پر بینڈز اور بریسلٹ لپیٹے' اسٹائلش کٹے بالوں پر جیل لگائے' برانڈڈ گلاسز' ہیوی بائیک کو کک لگا کے' وہ روش پر دوڑانے لگا۔ اچانک اس کی نگاہ بینچ پر بیٹھی دعا پر پڑی۔ اس نے نم بالوں کو ہلکا سا کیچر لگایا تھا' جو ہوا سے اڑ اڑ کے' چہرے سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ وہ بار بار انہیں ہاتھ سے پیچھے ہٹاتی۔

یہ منظر اتنا خوب صورت تھا کہ عمر کا پاؤں خود بخود بریک پر جا پڑا۔ وہ بائیک کھڑی کر کے لان میں اتر گیا۔ تبھی دعا کی اڑتی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کے اس کی ہتھیلیاں پسینے میں بھیگنے لگیں۔ ان کے درمیان فاصلہ اتنا کم تھا کہ اسے یہاں سے نکلنے کے لیے دوڑ لگانی پڑتی۔ ایسی کوئی بزدلانہ حرکت وہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"مجھے دیکھ کے اتنا گھبرا کیوں رہی ہو۔ میں کوئی بھوت ہوں۔" اس نے دعا کے چہرے سے گھبراہٹ پڑھ لی تھی۔

"نن.... نہیں.... نہیں تو۔" اس کا خود پر کنٹرول نہیں رہا تھا۔ وہ جب ماتھے پر بل ڈال کے تلخی سے بولتا تو اس کی جان کانپ جاتی۔

"تم جھوٹ بھی بول لیتی ہو' حالانکہ شکل سے تو بڑی معصوم دکھتی ہو اور سر ایسے جھکایا ہے جیسے میں کوئی سخت گیر بیلے اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہوں۔"

دور سے وہ اسے جتنی خوب صورت لگی تھی قریب آنے پر اتنی ہی بری لگ رہی تھی۔

"نن.... نہیں.... ایسا کچھ بھی نہیں۔" اس نے بڑی مشکل سے آدھا ادھورا جملہ بولا۔

وہ انتہائی حد تک بدتمیز تھا۔ بڑے بھائی اور باپ تک کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔

"مجھے زہر لگتی ہیں ایسی چیپ حرکتیں' تم کوئی چک 12 کی پیداوار ہو۔" یہ اس کی خود اعتمادی پر چوٹ کی گئی تھی۔ وہ بولڈ لڑکیوں کا مداح تھا۔

"آپ کو کوئی کام تھا۔"

دعا نے ہمت کر کے سر اٹھا کے اسے دیکھا۔ وہ اسے جلد از جلد یہاں سے ٹالنا چاہتی تھی۔

"مجھے بھلا تم جیسی نکمی اور پھوہڑ سے کیا کام پڑ سکتا ہے۔ گھر میں شاہی محل جتنے ملازم ہیں اس کے باوجود' مجھے سب اپنا کام خود ہی کرتے نظر آتے ہیں۔ مڈل کلاس مینٹلیٹی۔"

اب وہ غائبانہ گھر والوں کو کوس رہا تھا۔ دعا اس کی بے سروپا باتیں سننے پر مجبور تھی۔

"تم کیا بدروح کی طرح گھر کے کسی نہ کسی کونے میں گھسی رہتی ہو' جانتی نہیں ہو ریاض احمد صاحب کو فارغ لوگوں سے خاصی سخت چڑ ہے۔ تم کوئی جاب وغیرہ کیوں نہیں کر لیتیں۔" دعا نے حیران ہوتے اس مفید مشورے پر اسے گھورا۔

"کیسی جاب؟" اب اسے کچھ نہ کچھ تو کہنا تھا۔

"جاب۔" عمر نے لفظ "جاب" کو خاصے پر سوچ انداز میں لمبا کھینچا۔

"کوئی کوکنگ شوارینج کر لو۔ ویسے تو خاصی پھوہڑ ہو' چلو ڈوئی گھمانی تو آتی ہو گی۔ ویسے تو مجھے بھی ایک ذاتی ملازمہ کی ضرورت ہے میں تمہیں بحیثیت ملازمہ رکھنا افورڈ کر سکتا ہوں۔"

وہ اسے جاب بتا رہا تھا یا بے عزت کر رہا تھا۔ دعا نافہم نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ اسے عمر کے الفاظ پر نہ حیرانی ہوئی نہ ہی شرمندگی' کیونکہ وہ اس سے خاص چڑ رکھتا تھا اور اس کا اظہار وہ کئی بار کر چکا تھا۔

"ایکسکیوزمی۔" دعا خاصی سنجیدگی سے کہتی اس کی سائیڈ سے ہو کر نکل گئی۔ مزید اس کے منہ لگنا سراسر بیوقوفی تھی۔

☆ ☆ ☆

انعم کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے بانجھ پن کا گہرا صدمہ لیا تھا۔ دل آرا اور عزیز آفندی پہلی فلائٹ سے پاکستان پہنچ گئے تھے۔ عزیز آفندی آخری بار پاکستان انعم اور احسن کی شادی [illegible]

کے لیے پانچ روز قیام کرنے آئے تھے۔ اس بار وہ انعم کے ہسپتال سے گھر آنے تک اس کے پاس رہے تھے۔ انہیں اپنے اکلوتے بیٹے سے زیادہ عزیز انعم تھی۔ ان کی جان اس میں بند تھی۔ وہ ان کی اکلوتی' لاڈلی بیٹی اور ان کے بھائی' بھابھی کی نشانی تھی۔ وہ اس کے لیے بہت حساس تھے۔

گھر آ کے اس کی ذہنی حالت خاصی ابتر تھی۔ سارے دن خاموش پڑی رہتی یا پھر چیخنا چلانا شروع کر دیتی۔ دل آرا پورا ایک ماہ اس کے پاس رہیں۔ سب کو اس کی فکر تھی۔ جس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ انعم بانجھ تھی' کبھی ماں نہیں بن سکتی' ان کی نسل کو آگے نہیں بڑھا سکتی۔ انہیں وارث نہیں دے سکتی' اس اتنے بڑے صدمے کو چھوڑ سب انعم کی ذہنی حالت اور رونے پر تڑپ جاتے۔

دل آرا گاؤں سے پرانی ملازمہ کو بلا کر انعم کی نگرانی کے لیے چھوڑ گئیں۔ انعم نے اسے بھی ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا۔ دل آرا آدھے سے زیادہ وقت نیٹ پر بیٹھی رہتیں۔ احسن کو بزنس میں کافی نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا لیکن اسے پروا نہیں تھی۔

احسن کمرے میں داخل ہوا تو وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے' ٹانگیں پھیلائے' بے سدھ' آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔

''انعم' کیا ہوا؟ آر یو او کے۔'' وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھا۔ انعم کی ساکت پتلیوں میں ذرا سی حرکت ہوئی۔ احسن نے اسے کندھوں سے پکڑ کر سیدھا کر کے خود سے لگا لیا۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں انو جان' ایسے کیوں بیٹھی ہو؟'' ایک بے تکا سوال۔

''تو کیا کروں' کیسے بیٹھوں؟'' وہ اس سے الگ ہو کر ویران آنکھوں اور کھوکھلے لہجے سے سوال کر رہی تھی۔

''میں نے تمہیں صبح کہا تھا کہ شاور لے کے اپنے کپڑے چینج کرو۔ دو دن سے یہی سوٹ پہن رکھا ہے۔ تم نے میری بات پر عمل نہیں کیا۔'' اس نے نرمی سے ٹوکا۔

''مجھے نہیں نہانا دھونا' نہ میرا دل کپڑے بدلنے کو کرتا ہے' میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔'' انعم ٹھنکی۔

''تم گندی بچی ہو۔'' احسن نے پیار سے اس کے گال پر چٹکی بھری۔

''پلیز احسن؟ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔'' وہ بے زار ہوئی۔ احسن کا ہاتھ بھی جھٹک دیا۔ اس پر بہت کم محبت بھرے التفات کا اثر ہوتا تھا۔

''کیوں چھوڑ دوں انو' میں خیال نہیں رکھوں گا تو کون کرے گا یہ سب' میں تم پر جان نچھاور کرتا ہوں اور تم مجھ سے اتنا روڈلی بی ہیو کرو گی' میری نرمی اور محبت کا جواب بد تمیزی سے دو گی۔''

احسن نے جان بوجھ کر سنجیدگی اختیار کر لی۔

انعم کے ذہن میں کچھ کلک ہوا۔ اس نے بہت گہری نگاہوں سے شوہر کو دیکھا۔ چہرے پر ناراضی صاف پڑھی جا سکتی تھی۔

''میں تمہیں بہت تنگ کرتی ہوں۔ کوئی بات نہیں مانتی' بہت بری اور.... اور منحوس ہوں میں۔''

''فار گاڈ سیک انو....'' وہ خاصی سختی سے بولا۔

''تم کیا خود سے اول فول بولتی رہتی ہو' میں نے نہ تو ایسا کچھ کہا ہے نہ ہی سوچا ہے۔ مرے ہوئے کا سوگ بھی' تین دن منایا جاتا ہے اور تم....'' اس نے نفی میں سر جھٹک کر جملہ ادھورا چھوڑا۔ وہ اپنے جذبات کو بمشکل کنٹرول کر رہا تھا۔

''تمہاری یہ قیاس آرائیاں تمہیں برباد کر دیں گی انعم۔'' وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ انعم نے فوراً اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''تم.... تم مجھ سے ناراض نہیں ہو احسن' میں تمہاری ناراضی برداشت نہیں کر پاؤں گی۔''

اس کے لہجے میں پسپائی تھی۔ اس کے شعور نے احسن کے غصے اور ناراضی کو محسوس کیا تھا۔

''چھوڑ دو' میں آفس جا رہا ہوں۔'' وہ رخ موڑ گیا۔

انعم فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر اپنی طرف موڑا۔

"سوری۔ اب میں بالکل ریفوز نہیں کروں گی اور نہ ہی بری بات زبان سے نکالوں گی۔"

انعم نے شرمندگی سے کہتے دونوں کان پکڑ لیے۔ احسن کے لیے یہی کافی تھا۔

"گڈ گرل، پہلے ہاتھ لے کے فریش ہو جاؤ، میں ٹیبل لگواتا ہوں ہم دونوں مل کر بہت سارا لنچ کریں گے اور اس کے بعد میڈیسن۔"

انعم سب سنتی اور اثبات میں سر ہلاتی جا رہی تھی احسن نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کے لیے وہ قیمتی متاع تھی۔

☼ ☼ ☼

اس روز چھٹی تھی عروہ اور زین دعا کو زبردستی اپنے گھر لے آئے۔ اب وہ ان کی فرمائش پر ان کے ساتھ کرکٹ کھیل رہی تھی۔ گیند کے پیچھے بھاگ بھاگ کر وہ تھک تو گئی تھی۔ لیکن اس پر خوشی حاوی تھی۔ بہت عرصہ بعد اس نے کسی ایکٹیویٹی میں حصہ لیا تھا اور وہ اتنا مسکرائی تھی۔

"بس کرو بچوں، گیم از اوور، لنچ تیار ہے۔ جلدی سے ہاتھ منہ دھو کے ٹیبل پہ آجاؤ۔"

مریم نے پورچ میں کھڑے ہو کر آواز لگائی۔ دونوں وہیں گیند اور بیٹ پھینک کے اندر کی طرف دوڑے کیونکہ لنچ ان کی پسند کا تھا۔ دعا بھی دوپٹے کی گرہ کھولتی ان کے پیچھے گئی۔

"تھینک گاڈ ممانی جان! آپ آگئیں، ورنہ آپ کے بچوں نے تو میرے سارے پرزے ہلا دیے تھے۔" اس نے مسکراتے ہوئے شکایت لگائی۔

"میرا بھی ہر ویک اینڈ پر یہی حال کرتے ہیں۔ چلو آؤ تم بھی ہمارے ساتھ لنچ کرو۔" مریم نے بڑے خلوص سے دعوت دی۔

"کہاں ہو تم مریم؟" الیاس احمد نے پکارتے دروازہ کھولا۔

"تمہارے بچوں نے سارا گھر سر پر اٹھا رکھا ہے۔ اتنے بدتمیز بچے ہیں، تم انہیں منع کیوں نہیں کرتیں۔

کوئی تمیز کیوں نہیں سکھاتیں۔ الیاس احمد سانس لیے بغیر بولتے جا رہے تھے۔

"ہفتے بعد تو انہیں کھیلنے کا موقع ملتا ہے اور وہ۔۔۔"

"اور مجھے بھی ہفتہ بھر بعد ہی ریسٹ کرنے کا موقع ملتا ہے اور بدتمیز بچوں کو پورے گھر میں میری ونڈو کا باہر والا حصہ ہی دوڑیں لگانے اور شور مچانے کو ملتا ہے۔"

الیاس احمد کا غصہ سوا نیزے پر تھا۔

"میں جاتی ہوں ممانی جان۔"

دعا نے وہاں سے کھسکنا چاہا۔ وہ الیاس احمد کے ڈانٹنے اور غصے کرنے کی عادت سے خائف ہو کر ہی یہاں نہیں آتی تھی۔

"نہیں ٹھہرو دعا، تم پہلی بار آئی ہو۔ کھانا کھا کر جانا' اس طرح اچھا نہیں لگتا۔" مریم نے کمزور سا دباؤ ڈالا۔ تب ہی الیاس احمد نے بھی اب تک قریب کھڑی دعا پر نگاہ ڈالی۔

"نہیں۔۔۔ نہیں، مجھے بالکل بھوک نہیں، میں نے ناشتہ لیٹ کیا تھا۔ اب جا کے چائے پی کے ریسٹ کروں گی' کھانا پھر کسی وقت سہی ابھی اجازت دیں۔۔۔ اللہ حافظ۔"

وہ کہہ کر مزید سنے بغیر تیزی سے نکل گئی۔ الیاس احمد کی نگاہیں اس کی پشت پر جمی تھیں۔

"یہ دعا اتنی بڑی ہو گئی ہے۔" وہ بڑبڑائے۔

"بہت جلدی پتا چل گیا۔۔۔" مریم کہہ کر سر نخوت سے جھٹک کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔ اسے شوہر کا بچوں پر چلانا برا لگتا تھا۔ جبکہ الیاس احمد ابھی بھی دعا کے متعلق سوچ رہے تھے۔ اس کے ذہن میں نئی فلم چلنے لگی تھی۔ ان کا ارادہ اور منصوبہ بندی بدلنے لگی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ)

معصومہ اقبال

"ارے بہن! تم مردوں کے کپڑے گھر میں کیوں سینے بیٹھ گئیں۔ یہ تو بازار کے کام ہیں۔" پانی کا گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر ایک اکتائی ہوئی نظر سلائی مشین کے پھیلاوے پر ڈالی۔

"شاہینہ باجی!" رانیہ نرمی سے مسکرائی۔ "جو کام گھر میں فری میں ہو جاتا ہے۔ اسے بازار سے کرانے کی کیا ضرورت ہے' پورے پانچ سو کا سل کر آتا ہے مردانہ کرتا بازار سے۔"

"ہاں مگر ہمارے تمہارے ہاتھ میں وہ صفائی کہاں۔"

"وہ بھی تو ہم جیسے انسان ہی ہوتے ہیں شاہینہ باجی! میں تو شادی سے پہلے ابا اور بھائی کے کرتے بھی سی لیا کرتی تھی۔ کوئی فرق نہیں کرپاتا تھا کہ گھر کا سلا ہے یا بازار کا۔"

"وہ شاہینہ باجی۔" اس نے ان کے ہاتھ سے خالی گلاس لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے ایک نظر ان کی پرنٹڈ جدید انداز میں سلی لان کی قمیص پر ڈالی جو یقیناً انہوں نے درزن سے سلوائی تھی۔ ان کو اتنی اچھی سلائی اور ایسے گلے بنانے کہاں آتے تھے۔

"ایک چھوٹی سی فیور چاہیے تھی آپ سے۔"

"بولو۔"

"شام اور کشمیر کے لیے اپنی مسجد میں فنڈ جمع کر رہی ہوں۔ جنگ کی وجہ سے وہاں کے حالات بڑے خراب ہیں نا۔ تو آپ بھی ایک آدھ رسید کٹوالیں۔"

"ارے ہم تو خود پیسے پیسے کے محتاج ہیں۔" اس نے ایک نظر سامنے دروازے سے بہو کے بیڈ روم میں داخل ہوتے ہوئے خالہ کو دیکھا تو بیڈ پر تھوڑا کھسک کر ان کے لیے جگہ بنائی۔

وہ اس وقت رانیہ کے کمرے میں بیٹھی تھی صائمہ بیگم کا ڈیڑھ کمرے کا گھر تھا۔ چھوٹا سا اگر کوئی خاص مہمان آئے تو بطور ڈرائنگ روم اسی کا کمرہ استعمال ہوتا تھا۔

"اور شاہینہ!" انہوں نے مسہری پر بیٹھ کر ذرا دم لیا۔ "گھر میں سب خیریت تو ہے ناں۔ بڑے دنوں کے بعد چکر لگا ہے؟"

"بس کیا بتاؤں خالہ! اپنی مصیبتوں سے فرصت نہیں ملتی۔"

"کیا ہوا؟"

"میرا بچہ بے چارہ رافع بڑا بیمار ہے اور علاج کے لیے پیسا نہیں ہے۔ اس خون نچوڑنے والے ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی جاپانی اسپتال۔ کھڑے کھڑے سات سو کی پرچی بنادی۔ صرف چیک کرنے کے۔ اوپر سے آٹھ سو کی دوائیاں الگ لکھ دیں۔ 35 روپے کی ایک گولی ہے خالہ۔ مجھے اپنی مسجد کے بیت المال سے دس ہزار دلوادیں۔ آج میں خاص آپ کے ہاتھوں سے بیت المال میں درخواست جمع کرانے آئی ہوں۔ تاکہ ڈاکٹر کی فیس بھروں۔"

رانیہ نے فیتے سے فٹنگ ناپتے ناپتے رک کر بھنویں اچکا کر خالہ زاد بہن کی شکل دیکھی۔ وہ دوسروں سے پیسے اینٹھنے والی ان کی عادت سے واقف تھی۔ ان کی خریدی ہوئی ہر چیز کی قیمت کپڑے فرنیچر زیورات قیمت میں دوسروں کو مات کرتے تھے۔ ضرورت کے علاوہ بلاوجہ کے خرچے ان کے گھر والوں کی عادت تھی۔ ہر کام بازار سے ہوتا تھا مگر پھر بھی...

"جامانی اسپتال تو بہت مہنگا ہے شاہینہ باجی! آپ وہاں کیوں لے گئیں رافع بھائی کو۔"

"معدے کی تکلیف میں مبتلا ہے بے چارہ۔ مجھ سے اس کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی ناں۔ صائمہ خالہ۔" شاہینہ نے دوپٹا آنکھوں پر رکھ لیا۔

"دوا کی بات تو میں مانتی ہوں' چلو الگ ہے مگر شاہینہ باجی! آپ رافع بھائی کو کسی اور کلینک میں دکھادیتیں۔ جس کی فیس رینج میں ہوتی۔" وہ انچی ٹیپ رکھ کر کپڑا صفائی سے قطع کرنے لگی۔

"کہہ تو یہ ٹھیک رہی ہے۔" صائمہ بیگم نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی تائید میں سوچا۔

"وہ ہمارا فیملی ڈاکٹر ہے۔ اچھی دوائی دیتا ہے۔ ہمیں اس کے علاوہ کسی اور سے آرام نہیں آتا۔ اب مجھے کیا دنیا والے بتائیں گے' کس ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے اور کس کے پاس نہیں۔" وہ منہ ٹیڑھا کر کے بولیں پھر مڑیں۔

"خالہ میں تو محتاج ہوگئی ہوں سچ میں۔ معراج (شوہر) کی روزی بھی بس ہوائی ہے۔ مل گئی تو قسمت 'ورنہ مہینوں ـــ چارپائی پر پڑے رہتے ہیں۔"

"اور سامع بھائی کا کیا ہوا۔ شاہینہ باجی کماتا تو وہ بھی ہے۔" سب ایک ہی خاندان کے تو تھے۔ کسی کا کسی سے کوئی پردہ نہ تھا۔

"مین مارکیٹ میں اپنی دکان ہے اس کی۔ چھوٹی سی سہی مگر چلتی تو ہے ناں۔"

اس نے ایک نظر امی (ساس) پر ڈالی۔ جو انگلی ٹھوڑی پر رکھے غور سے ان دونوں کی بات سن رہی تھیں۔

"ایک لاکھ روپے کا قرضہ چڑھا ہوا ہے۔ اس پر۔ آپ کو تو پتا ہے صائمہ خالہ!" ان کی طرف مڑیں۔

"ایک سال پہلے اس کی ویگن ٹھک گئی تھی بچوں کو اسکول چھوڑتے ہوئے۔ بس ویگن کے مالک نے ایف آئی آر کٹوادی تھی۔ ایک لاکھ مانگے تھے نقصان بھرنے کا تخمینہ لگا کر۔"

"تو ایک سال میں ایک بھی قسط نہ ادا کر سکیں آپ۔" اس نے سلائی مشین روک کرنا سمجھی سے انہیں دیکھا۔

"دیکھیں خالہ! اپنی بہو کو' کیسے تھانیداروں کی طرح تفتیش کر رہی ہے۔ اسے کیا حق ہے ہاں۔"

"شاہینہ باجی میں اور امی مل کر بیت المال کا نظام سنبھالتے ہیں۔" اس نے نرمی سے سمجھایا۔ "اور یہ ہمارا طریقہ ہے جانچ پڑتال کرنے کا۔ تاکہ زکوۃ اور خیرات کی رقم صحیح مستحق تک پہنچے۔"

"دیکھیں خالہ! کیسے بے عزتی کر رہی ہے۔"

"رانیہ! تم اپنے کرتے کی سلائی پر دھیان دو۔ جمعہ کو پہننا ہے معیز نے۔" انہوں نے ایک نظر بھانجی پر ڈالی جو دوپٹے کے پلو سے (نادیدہ) آنسو پونچھ رہی تھی۔

وہ چپ ہوگئی۔ "ہاں تو خالہ میں کہہ رہی تھی کہ قرضہ اتر نہیں سکا۔ اب تو وہ گھر تک آجاتا ہے قرضہ لینے' محلے میں ایسی بے عزتی ہوتی ہے کیا بتاؤں۔"

"قرض تو بہت بری چیز ہے۔ دن میں ذلت اور رات میں تکلیف۔ تم نے آڑے وقتوں کے لیے جو بچا کر رکھا تھا اسے بیچ باچ کر پہلے اپنا قرض کیوں نہیں چکا دیتیں۔" انہوں نے بہو کے سامنے محتاط الفاظ استعمال کیے۔ اشارہ شاہینہ کے سسر کی ورثہ میں چھوڑی ہوئی زمین کی طرف تھا جو ان کو ملی تھی۔

"اس کے بعد بھی جو اخراجات نکلیں گے اس کے لیے میں مدد ضرور کروں گی۔ مسجد کے بیت المال سے۔"

"اے اس پر میرے بچوں کا حق ہے اور پھر ڈر لگتا ہے اللہ اس سے برا وقت نہ لے آئے' خالہ آپ کو مشورہ دیتے وقت سوچنا تو چاہیے تھا۔ مجھے آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"امی! ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ آج کل تو ویسے ہی زمین کی قیمتیں تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔" یہ کہنے کے ساتھ رانیہ نے ایک شکایتی نظر ساس پر ڈالی۔

(آپ مجھے گھر کی بیٹی نہیں سمجھتیں جو چھپا رہی ہیں) ''آپ کا سارا قرض اتر جائے گا۔''

''تم خاموش رہو۔ رانیہ۔'' شاہینہ تپ چکی تھیں۔

''تمہاری نظر تو ہے ہی ہماری زمین پر۔ ہمارے حالات تو نظر آ نہیں رہے۔''

انہوں نے عجیب سا منہ بنایا۔

''خالہ میں زمین بیچنا نہیں چاہتی۔''

''چھوڑو رانیہ! ہوگی بے چاری کی کوئی مجبوری۔''

انہوں نے ایک نظر شاہینہ کے بگڑے زاویے دیکھے۔

''خالہ! پوچھیں اس سے 'کیا یہ مجھے اپنے پاس سے دے رہی ہے۔ نہ میں اس سے مانگ رہی ہوں ارے میں تو مسجد کے بیت المال سے لینے آئی ہوں۔ جہاں سارا کچھ لوگ ______ دیتے ہیں۔ ہم جیسوں کی مدد کے لیے۔ اور خالہ آپ بھی' زمین کی بات بیچ میں لا کر مجھے خالی باتوں سے نہ ٹرخایئے گا' میں یہاں سے خالی ہاتھ لے کے گئی ناں تو قیامت کے دن آپ کا اور میرا آمنا سامنا ہو جائے گا ہاں۔''

''اچھا کھانا! اچھا پہننا' اچھے گھر میں رہنا' وہ افسوس سے سر ہلاتے ہوئے سلائی مشین چلانے لگی۔ ''کیا یہ ہے غربت۔''

''ارے شاہینہ! تم برا نہ مانو میں نے تو صرف صلاح دی تھی۔ اصل میں درخواستیں اتنی آئی ہوئی ہیں شہر بھر سے کہ'' وہ نادم ہو گئیں مرحومہ بہن کی اکلوتی نشانی تھی۔ اس کو ناراض کرنا ان کو قطعاً گوارا نہ تھا۔

''اچھا یہ بتاؤ کتنے چاہئیں تم کو۔''

''ایک لاکھ قرضہ۔ دس ہزار علاج معالجے کے لیے دیکھیے۔ خالہ! ٹھنڈی سانسیں نہ بھریں۔ انکار نہیں سنوں گی' سارے جہاں کو بیت المال سے ہر ماہ راشن' خرچا دلواتی ہیں آپ آپ۔ آپ کی بھانجی ہوں اور پہلا حق رشتے داروں کا ہوتا ہے۔ یہ مت بھولیے گا۔ ہاں اور رشتے دار بھی وہ' جو بازو میں رہتی ہے۔''

''اچھا مجھے کچھ سوچنے دو شاہینہ! ایک لاکھ دس ہزار اتنی بڑی رقم ہے کچھ وقت تو لگے گا ناں۔ ابھی تو بیت المال میں زکوۃ و خیرات کی رقوم بھی کم ہیں۔ فی الحال میں دس ہزار ارینج کر دیتی ہوں کسی طرح مگر ایک لاکھ۔ اس کے لیے مجھے کچھ سوچنا پڑے گا۔'' وہ دماغی جوڑ توڑ میں لگ گئیں۔

☼ ☼ ☼

''تمہارے سسر آ رہے ہیں نماز پڑھ کر روٹی ڈال دو۔'' خالدہ بیگم نے زیورات واپس پوٹلی میں رکھے اور زکوۃ کی کاپی کو ذرا ترچھا کر کے کچھ لکھنے لگیں۔

''امی روٹی تو میں ڈال چکی۔'' وہ سر پہ دوپٹا ٹھیک کرتی ان کے برابر تخت پر آ بیٹھی۔ ہاتھ میں سوئی دھاگا اور معیز کا کرتا تھا' سکون سے بیٹھ کر وہ کاج بنانے لگی۔

''تم نے زکوۃ نکال لی اس سال کی تو لے آؤ۔ میں اپنی طرف سے بھی نکال رہی تھی۔''

''امی۔'' وہ ٹھنڈی سانس بھر کر انہیں تخت پر جائے نماز بچھاتے دیکھنے لگی۔ ''میں نے زکوۃ نکال بھی لی۔ اور مستحق تک پہنچا بھی دی۔''

''میں جانتی ہوں کہاں پہنچائی ہوگی۔'' انہوں نے ایک ناراضی بھری نظر اس پر ڈالی۔ ''لگتا ہے تمہاری قریب کی نظر کمزور ہے۔ میری ایک گلی چھوڑ کر رہتی ضرورت مند بھابھی نظر نہیں آتی۔ کوسوں دور کشمیر اور شام کی فکر پڑ گئی۔''

''امی مانگنے والوں میں اور مستحق میں بڑا فرق ہوتا ہے۔'' ہونہہ

''امی! وہاں کشمیر کے مسلمانوں پر بڑا ظلم ہو رہا ہے' میں نے فیس بک پر پکچرز دیکھی تھیں۔ میری تو سچ مچ آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ پیلٹ گن سے لوگوں کی آنکھیں ضائع کر رہے ہیں۔ خاص کر نوجوانوں اور بچوں کی اور امی ان کے پاس خوراک خریدنے کے لیے پیسے تک نہیں ہیں' دوا تو دور کی بات' وہاں آئے روز کرفیو اور فائرنگ کی دہشت نے سارا نظام زندگی ہی معطل کر دیا ہے۔ ہمارے بیت المال کے فنڈ سے ان

کے لیے دوائیں جائیں گی' خوراک جائے گی ان شاء اللہ بہت جلد۔ اب اس کے لیے پیسے تو چاہیے تھے ناں۔" اس نے پہلا کاج مکمل کر کے دانت سے دھاگا توڑا۔ "ابا کی گاؤں کی زمین سے جو عشر آیا تھا وہ بھی ابا نے یہیں جمع کروایا ہے۔"

"مگر رشتے داروں کا پہلا حق ہے۔" ان کو اس کا اس طرح اگے سے کھاتا کھول لینا بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ "اور یہ موئی جو فیس بک ہے۔ یہ بھی تو کسی عیسائی وسائی نے کھول رکھی ہے۔ استغفر اللہ۔"

"امی۔ وہ نیوٹرل ہے' غیر جانبدار ہے تب ہی تو اربوں روپے کما رہی ہے۔" وہ ناگواری سے اسے دیکھنے گئیں۔

"اور جو تم نے رمضان میں صدقہ کرنے کے پیسے سنبھال رکھے تھے وہ بھی تو شاہینہ کو دے سکتی تھیں۔"

"امی! ان کے گھر تین کمانے والے اور دو کھانے والے ہیں۔ ان کو چاہیے ناں ہاتھ پاؤں ہلالیں۔ اب تو رافع بھائی بھی بھلے چنگے ہو گئے۔"

"مگر جاب تو نہیں ملی ناں۔"

"امی وہ اتنے پڑھے لکھے ہیں۔ جاب بھی مل جائے گی اگر ڈھونڈنا چاہیں گے۔ گھر بیٹھ کر وہ اپنی قابلیت کو صرف زنگ لگا رہے ہیں۔" اس نے نرمی سے وضاحت کی "مانا کہ جاب کے رولز ہارڈ ہیں گھر چلانا ہے تو تھوڑا بہت سمجھوتہ تو کرنا پڑتا ہے۔ اگر بیت المال سے لے کر ہم ایسے لوگوں کو دیتے رہے تو یہ مستحق غریب لوگوں کا حق مارنے والی بات ہے ناں۔"

"ہائے کتنا مان لے کر آئی تھی خالہ کے پاس۔" ان کی سوئی وہیں اٹکی تھی۔

"امی! برا نہ مانیے گا مگر آپ ان کی عادتیں خراب کر رہی ہیں ایسا نہ ہو ان کو مانگنے کی عادت پڑ جائے' خود داری ختم ہو جائے ان کی۔ وہ میری بھی خالہ زاد بہن ہیں مگر میں تو صرف حق بات ہی کہتی ہوں چاہے میری اپنی بہن ہی کیوں نہ ہو۔"

"اس نے پہلے دو چار بار ہی تو آئی ہے میرے پاس اور اپنی پریشانی خالہ سے نہیں کہے گی تو اور کس سے کہے گی۔" وہ اس کے خوب لتے لینے لگیں تو اس نے کان لپیٹ لیے۔

✡ ✡ ✡

"ارے بہو! معیز کی جو کمیٹی کھلی وہ کیا ہوئی۔ معیز صبح ذکر کر رہا تھا۔"

انہوں نے ترچھی نظر رانیہ کے چہرے پر ڈالی۔ شاہینہ والی بات کو لے کر ان کا دل اس سے صاف نہیں ہوا تھا۔

"خرچے تو بہت ہیں اس کے بارے میں کیا سوچنا۔" وہ کریلے کی ٹوکری اور چھری لے کر تخت پر آ بیٹھی۔

"معیز چھوٹی سی گاڑی لینے کا سوچ رہے تھے سیکنڈ ہینڈ پرانا ماڈل۔ تاکہ ہول سیل سپلائی کا کام بھی شروع کر سکیں۔ الگ سے۔" "پورے تین لاکھ روپے کی کمیٹی کھلی ہے اس کی باقی جو بچے ہیں ان کا کیا حساب کتاب ہے؟"

انہوں نے سرہانے تخت پر دھری ایک رجسٹر نما کاپی کھولی۔ جس میں سالانہ و ماہانہ بچت کا اندراج تھا۔ کیا خریدنا ہے کیا بیچنا ہے۔ کتنے کی بچت کر کے کیا خریدنا ہے۔ شادی بیاہ میں کتنے کا لفافہ رکھنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ سب ان کی ذاتی گھریلو کاپی میں درج تھا۔

"امی! باقی جو بچے وہ معیز نے جو پلاٹ خریدا تھا ناں ڈھائی سو مربع گز کا۔ اس کی کچھ قسطیں ادا کرنی ہیں۔ ایک ساتھ ادا ہو جائیں گی تو فوراً قبضہ مل جائے گا۔"

"مگر ہمیں فی الحال کوئی ضرورت تو نہیں زمین خریدنے کی۔" انہوں نے ناراضی کے اظہار کے طور پر دھپ سے کاپی پٹخنے کے انداز میں رکھ دی۔

اس لڑکی کی باتیں ان کی سمجھ میں بالکل نہیں آتی تھیں۔ "یہاں کون سے اللہ نہ کرے لالے پڑے ہیں جو فی الفور خالی زمین خریدنے کی حاجت پڑ گئی' کون سا وہاں کوئی چھت ڈالنی ہے یا عمارت کھڑی کرنی ہے۔"

"اس پلاٹ کی ضرورت فی الحال نہیں ہے مگر۔ پھر بھی ہمارے ہاتھ تلے اتنا تو ہونا چاہیے کہ اللہ نہ کرے برے حالات آجائیں تو ضرورت کے وقت کسی کی سامنے ہاتھ نہ پھیلانے پڑیں۔"

"تم کو تو بس اپنے مطلب کی بات ہی آتی ہے۔ اپنے کام ہی نکلوانے آتے ہیں۔ ابھی کون سا ہم سڑکوں پر بیٹھے ہیں۔ میں آج ہی معیز سے بات کرتی ہوں۔ غضب خدا کا نہ ماں سے مشورہ نہ صلاح بس بیوی نے جو کہا آمنا صدقنا۔"

وہ تسبیح کے دانے زور زور سے گراتی غصے سے بڑبڑانے لگیں۔ وہ ان کا غصہ دیکھ کر مصلحتاً چپ ہوگئی۔ اتنا بھی نہ کہہ سکی کہ بے شک کمیٹی کے پیسے معیز بھرتا تھا مگر کمیٹی کے پیسے کی (قسط ادا کرنے کے لیے) ایک ایک روپے کی بچت تو وہ ہی کرتی تھی۔ بالا ہی بالا انہوں نے معیز سے بات کر کے پلاٹ کی قسطوں کے پیسے لے کر (اللہ کی راہ میں) اور کچھ بیت المال سے ملا کر شاہینہ کا ایک لاکھ روپے کا قرضہ بھی اتروادیا۔ کچھ دن تو سکون رہا مگر پھر۔

"خالہ! آپ ذرا خالو سے کہیں کہ ہمارے گھر کا فریج خراب ہوگیا ہے۔ دوسرا لینے کا سوچ رہی ہوں۔ آپ ذرا انیس ہزار دے دیں۔"

"ایک بات بتائیں شاہینہ باجی۔" وہ سبزی کی ٹوکری اٹھائے خالدہ بیگم کے برابر تخت پر آبیٹھی۔ اب تو خالدہ بیگم کو بھی معلوم ہوچکا تھا کہ اس کے حالات اتنے بھی خراب نہ تھے۔

"رافع بھائی جاب پر جانا کیوں شروع نہیں کردیتے۔"

"ارے بیمار ہے بے چارہ۔" وہ ذرا کھسیا گئیں۔

"اچھا جب آئے تھے تو بالکل بھلے چنگے لگ رہے تھے۔ شاہینہ باجی! ایک عرصہ گزر گیا ہے جب وہ بیمار پڑے تھے۔"

"دیکھ رہی ہیں خالہ۔" اس نے ہار مان کر خالہ کو حمایتی بنانا چاہا۔ "آپ کی بہو گھر آئی مہمان سے کیا سلوک کررہی ہے۔"

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔" انہوں نے بے زاری سے درخواستوں سے لدی ہوئی فائل اٹھائی۔

اور نظر کا چشمہ لگا کر صفحے پلٹنے لگیں۔ "غریب سے غریب لوگ بھی مسجد آکر ——— کبھی ہزار کبھی دو ہزار مانگ لیتے ہیں بس اور تم نے تو حد ہی کردی پہلے ہی جھٹکے میں ایک لاکھ کا مطالبہ کرڈالا اور اب پھر۔"

"مجبوری تھی خالہ۔"

"اب تو نہیں ہے ناں۔ اور رافع کو بھی کام پہ لگادو تو اچھا ہے' اچھا پڑھا لکھا ہے ڈگری بھی لے رکھی ہے' اور گاڑی چلانی بھی آتی ہے یعنی ہنر بھی ہاتھ میں ہے۔"

"کیا کریں کہیں نوکری نہیں ملتی خالہ۔"

"دو سال سے فارغ ہے اب تک نوکری ہی نہیں ملی؟" ان کو درحقیقت شاہینہ پر بڑا غصہ تھا جب سے انہیں معلوم ہوا کہ اس کا خاندان کے ایک کھاتے پیتے گھرانے سے بھی ہر ماہ کا خرچہ بندھا ہوا ہے۔ ان کا دل کھٹا ہوچکا تھا۔

"اور ابھی تم نے اس کی شادی بھی کرنا ہے۔ بیوی آئے گی تو یہ ہڈ حرامی برداشت نہیں کرے گی۔" ان کا لہجہ ٹھنڈا ٹھار تھا۔ "کچھ نہ کچھ ذمہ داری کا احساس تو ہونا چاہیے نا۔ اس میں۔" "ضرورت مند کے ساتھ ایسا کررہی ہیں نا خالہ۔" انہوں نے آنکھوں پہ دوپٹا رکھ لیا۔

"جب تک ضروت تھی تب تک ساتھ دیا تھا شاہینہ! سچ پوچھو تو مجھے لگ رہا ہے کہ تمہاری عادت ہی خراب کردی میں نے۔ مگر میرے پاس ابھی اور بھی بہت درخواستیں ہیں اور بیت المال میں وسائل بھی محدود ہیں۔ جتنی تیزی سے آنہیں رہا۔ اتنی تیزی سے جارہا ہے۔ اگر میں صرف تم کو ہی دیتی رہی تو ان لوگوں کا کیا ہوگا۔ اور ویسے بھی۔"

انہوں نے ایک نظر خاموشی سے سبزی چھیلتی بہو پر ڈالی۔ "شام اور کشمیر کے حالات بہت خراب ہیں۔

لوگ بھوک پیاس اور دوائیں نہ ملنے پر تکلیف سے مر رہے ہیں۔ میرے نزدیک وہ زیادہ مستحق ہیں۔ ویسے بھی مبین بھائی ہر ماہ دبئی سے جو لفافہ بھجواتے ہیں تم کو۔ اس میں اتنا تو ہوتا ہے کہ مہینے بھر کا خرچا باآسانی چل جائے۔ میرا مشورہ مانو تو تھوڑا اپنے خرچے کم کرو۔ اپنی چادر دیکھ کے پاؤں پھیلاؤ۔" وہ ابھی عصر کی نماز پڑھ کر فارغ ہی ہوئی تھیں کہ دکان سے فون آیا۔

"امی! ہماری مارکیٹ میں آگ لگ گئی ہے۔" معیز بہت جلدی میں تھا۔ میری دکان بھی لپیٹ میں آگئی ہے۔"

"اللہ رحم!" خالدہ بیگم نے دل پکڑ لیا۔ اور زمین پر بیٹھتی چلی گئیں۔ "میں چھ سات لڑکوں کے ساتھ مل کر دکان سے سامان باہر نکلوا رہا ہوں۔ دعا کریں جلدی آگ بجھ جائے۔ اچھا رکھتا ہوں۔"

انہوں نے مردہ ہاتھوں سے فون کریڈل پر رکھا اور گھسٹ گھسٹ کر تخت تک آئیں۔

"اے اللہ! ایک معیز ہی ہے بے چارہ میرا بچہ گھر کا کرتا دھرتا۔ اللہ رحم۔" وہ رانیہ کو پکارتے ہانپتے ہوئے تخت پر بیٹھ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگیں۔ ویسے ہی سفید پوش گھرانا تھا اور اب ان سب پر تو جیسے قیامت ٹوٹ پڑی۔

ہزاروں کا مال جل گیا تھا۔ زوال کا دور شروع ہو چکا تھا فی الحال سات ہزار روپیہ ماہوار پر ملازم لگ گیا تھا معیز۔

ذات کے سید تھے۔ بیت المال سے چونی بھی لینی گوارا انہیں تھی! باورچی خانے سے سل بٹے پر چٹنی پیسنے کی آواز آرہی تھی۔ بجلی کا بل بچانے کے لیے گرینڈر چلانے سے گریز کر رہی تھی ظہر کی نماز پڑھ کر رزق میں اضافہ کا وظیفہ پڑھ رہی تھیں۔ یا رزاق یا رزاق۔ وہ ہاتھ پھیلائے۔ تسبیح سے خشوع خضوع سے دعا مانگنے میں لگی تھیں۔

تب ہی پڑوس کے گھر سے اٹھتی بکرے کے قورمے کی خوشبو نے انہیں بے چین کر دیا۔ دعا سے دھیان ہٹنے لگا۔ "یا رزاق۔" انہوں نے دوبارہ دعا میں دھیان لگانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ تب ہی رانیہ ٹرے میں ثابت لال مرچوں کی چٹنی اور کچی پیاز کتر کر تخت پر آبیٹھی۔

"آئیں امی روٹی کھالیں۔"

"جمعہ تھا، آج کچھ اچھا بنا لیتیں۔" وہ دھیمے سے بولیں۔ "کتنے دنوں سے گھر میں مرغی نہیں بنی۔"

"امی اگر مرغی بنا لیتی تو بجلی کے بل ادا کرنے کے لیے پیسے نہیں بچتے اس ماہ کے یونٹ بھی زیادہ تھے۔ ویسے بھی آج آخری تاریخ تھی ابھی جب معیز کو پہلی تنخواہ ملے گی تو چکن منگانے کے لیے پیسے الگ رکھ لوں گی۔"

"کاش وہ آخری چار قسطیں ادا کر کے زمین پر قبضہ مل گیا ہوتا تو میرا بچہ گرتا ہوا کاروبار دوبارہ کھڑا کر لیتا آج یوں ترسنا نہ پڑتا اچھے کھانے کو۔" وہ برداشت نہ کر سکیں۔ رو پڑیں۔

"امی" اس نے اٹھ کر انہیں شانے سے لگا لیا۔

"کیسے نہ روؤں۔"

سہارا کیا ملا وہ تو بوسیدہ عمارت کی طرح ڈھے گئیں۔ "سب میرا قصور ہے' اگر وہ کمیٹی کے پیسے ہوتے تو میرا بچہ نیا کاروبار شروع کر سکتا تھا۔ ایک ایک پیسے کے لیے دوسروں کی چاکری نہ کرتا پھرتا۔"

"امی! پلیز خود کو سنبھالیں۔" وہ کھانا بھول کر ان کو سنبھالنے لگی۔

"میں نے تمہاری بات نہیں سنی' مجھے لگا کہ یہ تمہاری کوئی چال ہے" وہ ایک لمحے کو رک گئیں۔ "میں نے تمہیں غلط سمجھا' مجھے لگا تم پیسوں میں غبن کرنا چاہتی ہو' میں نے تمہیں غلط سمجھا رانیہ۔"

"امی! آپ نے یہ سوچا بھی کیسے آپ کو تو پتا تھا ناں شیطان جھگڑے کو پسند کرتا ہے۔ تب ہی وہ انسان کے اندر وسوسے اور برے گمان پیدا کرتا ہے تاکہ گھر میں جھگڑے ہوں۔ پھر آپ نے گمان کی پیروی کیوں کی' میں نے تو ہمیشہ اس گھر کے فائدے کے لیے ہی سوچا تھا۔" اسے واقعتاً" دکھ ہوا تھا۔ "اچھا چلیں' چھوڑیں

جو ہو گیا سو ہو گیا۔" اس نے نرمی سے ان کے سر سے پھسلتا دوپٹا واپس جمایا۔

"اب آگے کی فکر کرنی چاہیے ہم کو۔ آپ کھانا کھائیں۔ نہیں تو بی پی لو ہو جائے گا آپ کا۔"

اس نے بڑی مشکل سے انہیں کھانے پر آمادہ کیا۔ پھر خود بھی بے دلی سے چھوٹے چھوٹے نوالے توڑنے لگی۔ مستقبل کا سوچ کر دل الگ ڈوبا جا رہا تھا۔ کاروبار شروع کرنے کے لیے بھی اچھا خاصا سرمایہ چاہیے ہوتا ہے اور آج کل ضمانت کے بغیر قرض کون دیتا ہے کسی کو۔ نہ بینک نہ لوگ' ساٹھ ستر ہزار رقم کوئی چھوٹی تو نہیں ہوتی۔ اور پھر۔"

شاہینہ نے صائمہ بیگم سے ناراض ہو کر جو باتیں پھیلا رکھی تھیں خاندان بھر میں' وہ الگ کہانی تھی۔

☆ ☆ ☆

"السلام علیکم!" ثمرین نے اٹھ کر انہیں سلام کیا۔

"خیریت سے آئی ہو؟"

خالدہ بیگم کا موڈ پہلے ہی خراب تھا۔ ابھی شاہینہ نے خاندان کے کسی بڑے کو بھیجا تھا' خود تو اس دن کے بعد آئی نہیں اور ان کو خوب غصہ آیا تھا' نہ خالہ کے نقصان کا کچھ خیال' نہ حال چال۔ بس اپنا مطلب عبدالسمیع بھائی کو انہوں نے صاف جواب دے دیا تھا۔ ارے غریبوں کے گھر کھانے کے لیے کچھ نہیں' اس کو اپنے نئے فریج کی پڑی تھی اور اب ثمرین کے ہاتھ میں پرچی تھی۔ لوگ اپنی ضرورتیں پرچیوں پر لکھ کر جمع کراتے تھے درخواست کی صورت ان کے پاس۔

"لگتا ہے میرا یہاں آنا ان کو پسند نہیں آیا۔" ثمرین کی آنکھیں بھیگنے لگیں پہلے ہی خلیق (شوہر) کی حادثاتی موت سے دل ٹوٹا ہوا تھا ان کی سرد مہری دیکھ کر اور کرچی کرچی ہونے لگا۔

"ثمرین یہ لو پانی۔" اتنے میں رانیہ نے آکر گلاس اسے تھما دیا۔ "اب رونا مت۔"

"کیا ہوا۔" انہوں نے ناسمجھی سے بہو کو دیکھا۔

"ثمرین کے شوہر جس بلڈنگ میں ویلڈنگ کا کام کر رہے تھے اس کی چھت گر گئی۔"

"بس ایک ہی کمانے والا تھا اور وہ بھی مجھے میرے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ اکیلا چھوڑ کر۔" وہ آنسو پونچھنے لگی۔

خالدہ بیگم نے بے اختیار ٹھنڈی سانس بھری۔

"ہم دیکھتے ہیں ہم کیا کر سکتے ہیں۔ فی الحال تم اپنے کسی رشتے دار سے مدد طلب کر لو۔"

"آنٹی۔" وہ بے بسی سے انگلیاں مروڑنے لگی۔ صاف لگ رہا تھا۔ خالہ ٹال رہی تھیں۔ اس نے ایک مدد طلب نظر ان کی بہو پر ڈالی جو اسی کو بغور دیکھ رہی تھی۔

"آنٹی رشتے داروں سے مانگتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ساری زندگی اپنی عزت بچا کے رکھی ہے۔"

خالدہ بیگم کی بے زاری سوا ہونے لگی۔ جب سے شاہینہ سے دل برا ہوا تھا۔ ہر چیز سے دل اچاٹ گیا۔

"پڑوسی ہوں آپ کی' پڑوسیوں کے حقوق تو بہت ہیں۔" اس نے سر سے سرکتا دوپٹا واپس سر پہ جما کر اٹھنا چاہا تھا مگر بچوں کے معصوم چہرے سامنے آگئے اس نے ایک بار پھر کوشش کی۔ "آنٹی پلیز آپ تو بڑی ہیں مسجد کی' مولوی صاحب (شوہر) سے کہہ کر کچھ انتظام کرا دیں۔"

"دیکھو پھر تم لپٹ لپٹ کر مانگنے لگیں۔ کیسے یقین کروں تمہارا۔" انہوں نے ایک نظر بہو پر ڈالی "فی الحال ہماری ساری توجہ شام اور کشمیر کی طرف ہے اور ہم وہیں کے لیے فنڈ جمع کر رہے ہیں۔ وہاں کے حالات بہت خراب ہیں۔ تم جانتی ہو۔" رانیہ بے بسی سے ہاتھ مروڑتی آنکھوں میں ہمدردی لیے ثمرین کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

"آنٹی پلیز میں بھی مجبور ہوں۔"

اس نے پھر ایک امداد طلب رانیہ پر ڈالی تھی۔

"دیکھو' میں نے تم سے کہا نا' بیت المال میں۔"

"آنٹی بس پندرہ ہزار کی تو بات ہے۔ جاپان کی نئی سلائی مشین لینی ہے بازاری ٹانکے لگانے والی۔ پہلی سلائی سے رقم آتے ہی آپ کا قرض اتار دوں گی۔"

"قرض" وہ دونوں اچنبھے سے اس کی شکل دیکھنے لگیں۔

"قرضہ دینا تو بڑا ثواب ہے صدقے کا ثواب دس گنا اور قرض کا ثواب اٹھارہ گنا ہے۔ (حدیث کا مفہوم)"

ساس بہو حیرت سے تخت پر بیٹھی پرانے مگر صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس وہ دبلی پتلی چوبیس سالہ لڑکی کو حیرت سے تکے گئیں۔ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ وہ بیت المال سے قرض لینے آئی تھی۔

"چھوٹا بڑا پرانا نیا ہر طرح کے فیشن کے کپڑے صفائی سے سینے کا ہنر ہے' مجھ میں' وہ اصل میں میں نے سیکھ رکھی ہے سینٹر سے بس جب تک خلیق (شوہر) زندہ تھے تب تک بس شوق کی حد تک ہی مشین کا ڈھکن اٹھاتی تھی۔ کبھی نوبت ہی نہیں آئی مگر اب۔۔۔" اس نے سر جھٹکا "بازاری ٹانکے اور کڑھائی ہوگی کپڑوں پر تو دوگنی قیمت میں۔" رانیہ نے ایک نظر ساس کو دیکھا "اب تمہیں اتنی جلدی کام کہاں ملے گا۔"

"نہیں باجی ریڈی میڈ کپڑے کی کچھ دکانوں میں بات کی تھی میں نے۔ کام بھی مل گیا۔ کچھ گھر کے کپڑے سی لوں گی' لوگوں کے بس رانیہ باجی گھر میں کپڑے سی کر عزت سے پیسے کمانا چاہتی ہوں میں۔۔۔ آپ چاہیں تو مجھ سے اپنا اپنی بہو کا سوٹ سلوا کر دیکھ لیں۔"

ثمرین نے نرمی سے ان کی بات کاٹ دی۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے ایک منٹ رکو۔" تجوری سے 15 ہزار روپے نکال لائی۔ "یہ لو اپنے ہنر کو کام میں لاؤ۔" اس نے خالدہ بیگم کی تیوری نظر انداز کرتے ہوئے پیسے اس کے ہاتھ پر دھر دیے "شکریہ رانیہ باجی۔ آج ہی ہول سیل مارکیٹ سے کپڑے اٹھا کر آرڈر پہ کام شروع کرتی ہوں منافع کما کر آپ کو آپ کے پیسے واپس کردوں گی' بہت جلد۔"

"کوئی جلدی نہیں ہے آرام سے دے دینا۔" وہ مسکرائی "اور نمونے لا کر مجھے دکھانا ضرور۔ کسٹمرز لگوادوں گی تمہارے لیے۔"

"بہت شکریہ رانیہ باجی۔" ثمرین پر نم آنکھوں سے اس شفاف آنکھوں والی لڑکی کے گلے لگ گئی۔ کتنا بڑا بوجھ اتار دیا تھا۔

"دینے کو تو تم نے تھما دیے بغیر کسی جانچ پڑتال کے اس کے ہاتھ میں دس ہزار مگر مشکل ہی ہے۔ جو وہ واپس کرے۔ جو لوگ مسجد میں آکر بھی اللہ کے نام پہ قرضہ مانگتے ہیں وہ کم ہی واپس کرتے ہیں۔"

"امی آپ نے اس کی شکل دیکھی تھی۔" اس نے افسوس سے انہیں دیکھا۔ وہ دل کی بری نہیں تھیں مگر وقتی طور پر ہر کسی سے بدظن ہو چکی تھیں۔

"وہ شکل سے ضرورت مند لگ رہی تھی۔ زرد رنگت' آنکھوں کے نیچے حلقے' ماتھے پر فکر کی لکیریں رقم تھیں امی۔"

"لپٹ لپٹ کر تو وہ بھی مانگ رہی تھی جیسی وہ نامراد شاہینہ۔"

"وہ صدقہ خیرات نہیں' قرض مانگ رہی تھی۔" وہ دھیمے سے بولی۔ "یاد کریں وہ وقت جب ہمیں بھی قرضے کی ضرورت تھی اور۔۔۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے۔ مگر شام اور کشمیر فنڈ کا کیا ہوگا۔ ابھی تک ہم اتنی رقم جمع نہیں کرسکے کہ وہاں فنڈ بھیج سکیں اور وہاں اشد ضرورت ہے۔" "امی ہم اپنی پوری کوشش تو کررہے ہیں ناں ہم لوگ مل کر۔"

"خاک جمع ہوسکیں گے۔ اگر اس طرح بیت المال کی رقم ادھر ادھر لٹاتی رہیں تو ممکن ہے یہ کھاتا بند ہی ہو کر رہ جائے۔"

وہ بے زاری سے کہہ کر عصر کی نماز کے لیے وضو کرنے چل دیں۔ مگر جاتے جاتے اس کو واپس اسی فکر میں دھکیل دیا جسے وہ وقتی طور پر فراموش کرچکی تھی۔

"اے اللہ۔" اس نے فکر مندی سے وہیں دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھائے۔ "اے اللہ! میری نیت صاف تھی۔ ایک بیوہ کی مدد کرتے وقت' اے اللہ تو ہمارے لیے اسباب بنادے۔ تو قادر ہے تو ہی اپنی جناب سے فنڈ بھیجنے والے اس کار خیر میں حصہ ڈالنے والے بھیج دے۔" منہ پر ہاتھ پھیر کر اس نے ایک نظر کھڑکی سے

نظر آتے کھلے آسمان پر ڈالی جہاں آسمان کی بلندی پر پرندے پر کھولے اڑ رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

"ماشاء اللہ ثمرین۔ تمہارے کام کی اسپیڈ تو بہت زیادہ ہے۔" رانیہ شاپرز میں سے کپڑے نکال کر ڈیزائن کی صفائی اور سلائی دیکھنے لگی۔ ایک جگہ سے آرڈر لے کر اس نے ثمرین کو دے دیا تھا۔ وہ ہفتہ بھر میں ہی سی کر لے آئی۔

"بس باجی رانیہ! بندے کو کوئی نہ کوئی ہنر آنا چاہیے۔ بُرا وقت پڑ جائے تو کام آتا ہے۔" ثمرین نے طمانیت سے مسکرائی۔

"ہاں ویسے بڑی تعریف ہے محلے میں تمہارے ہنر کی۔ تمہاری سلائی کی۔"

"کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانے پڑے۔ اللہ نے بڑا انتظام کر دیا روزی کا شکر ہے' عزت نفس بھی مجروح نہیں ہوئی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" رانیہ نے کپڑے واپس تہ کر کے شاپر میں ڈالے۔

"اچھا ہاں ثمرین یاد آیا وہ میری چھوٹی بہن کی شادی آ رہی تھی اس کے لیے ساڑھی سلوانی تھی مجھے تم سے۔"

"دے دیں رانیہ باجی' سب سے پہلے آپ کی ساڑھی ہی سیوں گی میں۔"

"یہ تو بتاؤ کتنے پیسے لوگی سینے کے۔" وہ مسکرا کر پرس اٹھانے لگی۔ لیکن ثمرین نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر روک دیا۔

"یہ جو میری زندگی کی گاڑی چلنی شروع ہوئی ہے رانیہ باجی' یہ آپ کی مہربانی اور پیسے سے ہی تو ممکن ہوا۔ نہیں باجی میں آپ کے کپڑے سینے کے پیسے نہیں لوں گی۔ ویسے ہی آپ کا بڑا احسان ہے مجھ پہ۔"

"یہ تو تمہاری ذرہ نوازی ہے ثمرین! ورنہ آج کل تو کوئی کسی کا احسان بھی نہیں مانتا۔" ایک دم کسی کا سایہ رانیہ کی اداس آنکھوں میں لہرایا۔ "اور پھر جو میں نے قرض تم کو دیا تھا وہ بھی تم نے لوٹا دیا تھا۔"

"قرض نہ لوٹاتی تو سکون سے نہ مرتی۔ یہ سامان کیسا ہے باجی؟" اس نے ایک نظر کمرے میں دھرے بڑے بڑے ڈبوں پر ڈالی۔

"بس وہ شام کی حالت تو تمہیں پتا ہے۔ وہیں بھیج رہے تھے۔ ہر مہینے جاتا ہے۔ ان کے لیے مہم چلائی تھی ناں۔ یہاں سے کئی گنا زیادہ حالات خراب ہیں وہاں کے۔ بمباری کے نتیجے میں وہاں دوائیں اور خوراک بھی کم پڑ گئی تھی۔"

"اچھا رانیہ باجی۔ اگر میری طرف سے اس نیکی و بھلائی کے کام میں حصہ ڈال دیں تو۔" اس نے بٹوہ کھول کر پانچ سو کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ "فی الحال پانچ سو کی رسید کاٹ دیں۔ باقی اگلے مہینے باقاعدگی سے بھجواؤں گی ان شاء اللہ۔۔۔ اللہ شام کے حالات پر رحم کرے۔"

ثمرین کیا کہہ رہی تھی وہ سُن کہاں رہی تھی۔ وہ تو بس نم ہوتی آنکھوں سے کچھ تڑا مڑا سا پانچ سو کا نوٹ ہاتھ میں لیے اسے تکے گئی۔ وہ خالی ہاتھ' کسمپرسی کے حالات میں پسی اونچے قد کی بیوہ۔ جو کل تک محتاج تھی' آج صرف اور صرف اپنے ہنر کی بدولت دوسروں کی مدد کرنے کے قابل ہو چکی تھی۔

اسے شاہینہ باجی یاد آ گئیں۔ جنہوں نے یہاں سے انکار سن کر دوسری مسجد کے بیت المال سے رابطہ کر لیا تھا۔

"اللہ تمہیں اور نوازے ثمرین۔ وہ پرندے جنہوں نے خدا پر بھروسہ کر کے اونچی اڑانیں بھری تھیں۔ اللہ نے ان سب کو تھام لیا تھا۔ اللہ تمہاری عزت بڑھائے' تمہاری محنتوں کا صلہ دے۔ تمہیں ہر قسم کی محتاجی سے دور رکھے۔"

وہ آنکھیں پونچھتی اس دھان پان سی مگر مضبوط اعصاب والی خوددار لڑکی کے گلے لگ گئی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو بلاشبہ پورے معاشرے کے لیے ایک نمونہ ہوتے ہیں۔

☆

عابدہ احمد

ادھر تائی اماں نے کچن میں پیر رکھا۔ ادھر ان کے دل پہ ہاتھ پڑا اور ایک عجیب و غریب سی چیخ ان کے منہ سے برآمد ہوئی تھی۔ جو جہاں تھا اور جس حال میں تھا کی بنیاد پہ دوڑا بھاگا، لنگڑاتا (شبنم کے پاؤں میں موچ آئی ہوئی تھی) چلا آیا۔

"کچھ خراب ہو گیا؟"

"کوئی ہوائی چیز دیکھ لی" جتنے سر کچن کے دروازے سے اندر گھس سکتے تھے۔ پوچھ رہے تھے۔ تائی اماں بس منہ پہ ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے پڑی صاف شفاف پتیلی کو گھورے جا رہی تھیں۔

"ارے کچھ بولو بھی" امی (صابرہ بی) نے اکتا کر کہا

ناولٹ

تھا دیکھ کیا گوتم بدھ کا مجسمہ بنی کھڑی ہیں۔"

"ہائے! ہونا کیا ہے بس قسمت کا پھیر ہے۔ جو اس چڑیا گھر میں پھنسی ہوں۔ مجال ہے یہاں کچھ بچ جائے۔" وہ تڑپ کر گویا ہوئی تھیں گو کہ ان کو جٹھانی کا "چڑیا گھر" کا لقب کچھ خاص پسند نہیں آیا تھا کہ اس گھر میں دو ہی تو فیملیز مقیم تھیں۔ ایک وہ اپنے شوہر اور چار عدد لڑکیوں کے ساتھ اور دوسرے جیٹھ (رفاقت ملک) اپنے دو عدد بچوں اور بیوی کے ساتھ۔ اور اشارہ یقیناً ان ہی کی طرف تھا۔ چاہتی تو غل مچا دیتیں ایسے دل آزار جملے پہ لیکن وہ بڑی معقول خاتون واقع ہوئی تھیں۔ اپنی جٹھانی کی عادت اور فطرت سے اچھی طرح آگاہ تھیں کہ وہ غصے میں صرف بولا کرتی تھیں۔ سوچا نہیں... اس لیے ان کی کئی باتیں وہ ہنس کر جھیل جاتیں۔

"امی! اب بولیں بھی کیا ہو گیا؟" اکتاہٹ سے بھرپور یہ آواز ان کی چہیتی شبنم کی تھی جو ایک ٹانگ پہ اپنا توازن قائم رکھنے میں نڈھال ہوئی جا رہی تھی۔ اور اسے جاننے کی بھی جلدی تھی کہ آخر ہوا کیا ہے؟ لیکن تائی اماں تو ساکت فلم کی ہیروئن کی طرح کھڑی تھیں۔

"ارے ایک بار پھر کھا گئی... چٹ کر گئی میرا گجریلا... یہ دیکھو" وہ بولتے بولتے چمکتی دمکتی پتیلی اٹھا کر ثبوت کے طور پر جملہ ناظرین کو دکھانے لگیں۔

"اوہو! اتنی سی بات... شور اتنا مچا رکھا ہے آپ نے جیسے دجال کے ظہور کی پکی خبر ملی ہو آپ کو۔" شبنم ناک بھوں چڑھاتی، لنگڑاتی ہوئی وہاں سے چل دی۔ باقی سب نے بھی اس کی تقلید کی۔ مجمع چھٹنے لگا۔

"دیکھو' دیکھو۔ یہ اولاد ہے میری۔ مجال ہے جو اس گھر میں کبھی کوئی میرے ساتھ کھڑا ہو۔ ہمیشہ "نچور" کی ہی مٹھی چانپی ہوتی ہے یہاں۔" شبنم کا ان کے ساتھ تازہ تازہ ہونے والے حادثے کو اہمیت نہ دینا انہیں پتنگے لگا گیا۔ وہ چور پہ خاصا زور دے کر بولی تھیں۔ اور پاس ہی کھڑی "نچور" کی والدہ محترمہ اس لقب پہ تڑپی تھیں۔

"خدا کا خوف کرو۔ ذرا سا کجریلا ہی کھایا ہے نا۔ تم تو ایسے اسے چور ثابت کرنے پہ تلی ہو جیسے اس نے مسلم کمرشل بینک میں ڈاکا ڈالا ہو۔" وہ ہاتھ نچا کر بولی تھیں۔ مسلم کمرشل بینک کا نام اس لیے بروقت یاد آیا تھا کہ شوہر نامدار کا اکاؤنٹ اسی بینک میں تھا۔

"ڈاکے تو روز پڑتے ہیں۔ جو بھی رکھو کچن میں منٹوں میں کھا جاتی ہے۔ اور کوئی پوچھنے' ٹوکنے' روکنے والا نہیں۔" ان کا تو صدمہ ہی کم ہونے میں نہیں آرہا تھا' پتیلی دیورانی کی آنکھوں کے آگے لہرا لہرا کر بول رہی تھیں۔

"تو کیا کروں؟ نہیں رکتا اس کا ہاتھ کھانے کی چیز دیکھ کر۔ کتنا سمجھاؤں۔ کتنا روکوں۔ کتنا روکوں۔ کوئی ماں کی انگلی پکڑ کر تو چلتی نہیں ہے۔ جو اس کی گردن پکڑ کر کہیں اور موڑ دوں۔ کہ نہ بچہ ادھر نہیں جانا۔ ادھر چلی جا۔" لگتا تھا وہ اپنی بیٹی کی حرکتوں سے خود بھی عاجز آئی ہوئی تھیں۔

"پورا آدھا کلو کجریلا کھا گئی۔ کھا کھا کے گھڑا بن گئی ہے وہ بھی چکنا۔ کسی بات کا اس پہ اثر نہیں۔ سوچا تھا آپا آنے والی ہیں۔ ان کے لیے رکھ لوں۔ انہیں میٹھے میں کجریلا بہت پسند ہے نا۔ پہلے بھی کھا گئی۔ اب بھی صفایا کر دیا۔" نصرت بیگم ایک بار اسٹارٹ لے چکی تھیں۔ اب کوئی مائی کا لال انہیں روک کر دکھاتا۔

"بس بھی کرو اب۔ بنا دوں گی تمہیں تمہارا کجریلا۔ آج ہی منگواتی ہوں سامان خلیل صاحب (شوہر) سے۔" صابرہ بیگم کو ان کا یوں بڑھ بڑھ کر بولنا ذرا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ چھوٹی سی بات کا فسانہ بنا کر اپنی ہی رام لیلا شروع کر دیتی تھیں وہ۔ یہ اور بات کہ انہیں اپنی لاڈلی پہ بھی غصہ آرہا تھا۔ جو ندیدوں کی طرح دوسری بار بھی ان کی اپنی بہن کی آمد کے لیے چھپا کر رکھا گیا کجریلا چٹ کر گئی تھی۔

"ہاں۔ تم بنا ہی نہ دو گی۔" وہ استہزائیہ ہنسی تھیں۔ جب سے صابرہ بیگم کی لڑکیاں جوان ہوئی تھیں۔ انہوں نے کچن اور گھر کے ہر طرح کے کاموں کو خیرباد کہہ رکھا تھا۔ نصرت بیگم اپنی دیورانی کی کام سے جان چرانے کی عادت سے خوب واقف تھیں۔ اسی لیے ان کا دعویٰ ایک ہی لمحے میں زمین بوس کر دیا۔

☆ ☆ ☆

"شرم تو نہیں آتی یوں چرا کر دوسروں کی چیزیں کھاتے ہوئے۔" وہ رسالے میں سر دیے بیٹھی تھی جب امی نے چھاپا مارا تھا۔

"کون۔ کس کی؟" وہ انجان بنی۔ تو لماں نے ایک تھپڑ کس کے اس کی کمر پہ لگایا تھا۔

"تیری تائی کا کجریلا نہیں کھایا تو نے۔" انہوں نے کمر مسلتی ہانیہ کو تیز نگاہوں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا تو وہ بات کر رہی ہیں آپ۔" اس کی یادداشت واپس آئی تھی۔

"کیا ضرورت تھی ایسی گھٹیا حرکت کرنے کی۔" اب وہ کمر پہ ہاتھ جما کر کھڑی ہو گئی تھیں۔

"تو کیا غلط کیا؟ ان کی بہن نے کون سا آجانا تھا۔ جیسے پہلے دو بار نہیں آئیں وعدہ کر کے۔ تو میں نے سوچا یونہی پڑا خراب نہ ہو جائے۔" کمال کا بہانہ گھڑا تھا اس نے۔

"بہت ڈھیٹ ہو چکی ہے تو۔ صحیح کہتی ہے تیری تائی۔" وہ اسے پیچھے دھکیلتے ہوئے اس کے ساتھ بیٹھی تھیں۔

"تائی اماں کا تو پتا ہے آپ کو۔ غصے میں کچھ بھی کہہ دیتی ہیں۔ بیچ میں تھوڑا کہتی ہیں۔" وہ ماں کے ساتھ چپک کر بولی تھی۔

"تو گنگی ہے تو پوری۔ ماں کو اتنی باتیں سنوا ڈالیں۔" ان کا غصہ اتنے لاڈ سے ہی اڑن چھو ہو چکا تھا۔

"اب جا کر معافی مانگ۔ اور اپنے باپ کو بھی فون کر کہ آتے ہوئے کجریلے کا سامان لیتے آئیں۔" انہوں نے اسے خود سے علیحدہ کیا تھا۔

"اوکے باس۔" وہ چھلانگ لگا کر اٹھی تھی اور انہیں سیلوٹ جھاڑا تھا۔ تائی اماں کو منانا کون سا مشکل تھا۔ ادھر وہ معصوم شکل بنا کر ان کے گلے کا ہار بنتی۔ ادھر وہ اپنی ہار مانتیں۔

☆ ☆ ☆

صبح نو کا پیغام دیتا سورج اپنی نرم سی حدت سے بھرپور کرنیں سارے میں پھیلا رہا تھا۔ وہ پانچوں اس وقت چھت پہ بیٹھی مختلف کاموں میں مشغول تھیں۔

صائمہ اور شبانہ دونوں زمین پہ چادر بچھائے بیٹھی اماں کے زبردستی انہیں تھمائے گئے لحاف میں نگندے ڈال رہی تھیں۔ اکتاہٹ اور بے زاری ان کے چہروں پہ نمایاں تھی۔ ان سے کچھ فاصلے پہ دھری چارپائی پہ لیٹی عظمٰی اس وقت خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی۔ کم بخت کو نیند بہت آتی تھی۔ جہاں دل کرتا لیٹ کر سو جاتی۔ اس سے کچھ فاصلے پہ رکھی دوسری چارپائی پہ شبنم اور ہانیہ دونوں خواتین کے مشہور ڈائجسٹ کے تازہ شمارے میں سر دیے بیٹھی تھیں۔

"بس کرو موٹی۔ اور کتنا کھاؤ گی۔" شبنم نے بلا مبالغہ ساتواں کینو اٹھاتی ہانیہ کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ مار کر اسے روکنے کی ناکام کوشش کی تھی۔

"کینو کھانے کا فائدہ ہے۔ نقصان کوئی نہیں۔ اس سے اسکن گلو کرتی ہے۔" تیزی سے کینو چھیلتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"بس کرو میری ماں۔ ساری ٹوکری تم کھا گئیں۔ مجھے تو ایک کے علاوہ دوسرا نصیب نہیں ہوا۔" شبنم نے اس کی کھانے کی رفتار دیکھ کر اس کے سامنے باقاعدہ ہاتھ باندھے تھے۔

"دانے دانے پہ لکھا ہے کھانے والے کا نام۔" کینو کھاتے ہوئے وہ لہک کر گانے لگی۔

"لگتا ہے صرف تمہارا ہی نام ہے سارے اناج پہ۔ اپنا رقبہ دیکھو۔ کتنا پھیل چکا ہے۔" اس نے ہانیہ کے ہاتھ سے باقی ماندہ کینو چھینتے ہوئے کہا۔

"پانچ فٹ سات انچ پہ سوکھے بانس جیسی جسامت نہیں جچتی۔ لیکن تم کیا جانو۔ پانچ فٹی۔" کینو چھینے جانے پہ وہ جل کر بولی تھی۔

"مردوں کی طرح لمبے قد آج کل ان نہیں ہیں۔ بوٹا سا قد اور دبلا پتلا جسم ہی لڑکوں کا آئیڈیل ہے۔" شبنم آسانی سے کبھی ہار نہیں مانتی تھی۔

"ہاہاہا! تم جیسی ٹھنگنیاں ایسے ہی اپنے دل کو تسلی دیتی ہیں۔" ہانیہ نے دل کھول کر قہقہہ لگایا تھا اور کپڑے جھاڑتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ٹھنگنی کسے بولا؟ خود کا پتا نہیں۔ جن جیسی لمبی اور ہاتھی جتنی موٹی۔" اپنے قد پہ چوٹ شبنم کبھی بھی برداشت نہیں کر پاتی تھی۔

"او۔ بس کرو تم دونوں۔" اس سے پہلے کہ وہ آستینیں چڑھا کر میدان میں اترتی۔ شبانہ ان کی نوک جھونک سے تنگ آ کر بولی تھی۔

"ایک تو پہلے ہی سر اور ہاتھوں میں درد ہو رہا ہے۔ یہ مصیبت لحاف تو کمبل ہی ہو گیا ہے۔ جان ہی نہیں چھوڑ رہا۔" صائمہ نے اکتا کر لحاف پرے پھینکا تھا۔

"خود تو دونوں نیچے بیٹھی ڈرامے دیکھ رہی ہیں۔ ہمیں اس عذاب میں پھنسا دیا۔" شبانہ نے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں دباتے ہوئے ناک چڑھائی تھی۔ اس کا اشارہ نصرت اور صابرہ بیگم کی طرف تھا۔ دونوں منٹ میں لڑتی، دوسرے منٹ ساتھ بیٹھی قہقہے لگا رہی ہوتی تھیں۔ یہی خوبی شبنم اور ہانیہ میں بدرجہ اتم موجود

تھی۔

"اسے دیکھو لاش کو۔ سارا دن جمائی بنی رہتی ہے۔" شبانہ نے ابھی تک سوئی پڑی عظمیٰ کے پاؤں کا انگوٹھا موڑا تھا۔

"کیا ہوا۔ کون ہے۔" وہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی۔

"کچھ نہیں بس سوجاؤ۔ یہی دیکھنے کے لیے تمہیں ہلا دیا تھا کہ زندہ ہو یا نیند میں ہی عالم بالا پہنچ گئیں۔" شبانہ نے حیرت سے آنکھیں ملتی عظمیٰ کو تسلی دی تھی۔

"سب چھوٹی ہونے کی وجہ سے میرا استحصال کرتے ہیں۔ بتاؤں گی ابو کو۔" اسے شبانہ کا مذاق اڑانا اچھا نہیں لگا تھا۔ ٹھنک کر بولی۔

"نہ نہ میرا بچہ۔ چوسنی لادوں کیا؟ ابو کو بتاؤں گی۔" شبانہ نے اسے پچکارتے ہوئے اس کی نقل اتاری تھی۔

"بیس کی ہونے کو آئی ابھی بھی چھوٹی ہے۔" اس نے غصے سے گھورتی عظمیٰ کی پھیلی ہوئی ٹانگیں پرے دھکیلی تھیں۔ عظمیٰ کی درگت پہ وہاں موجود وہ سب ہنسنے لگیں تو وہ چارپائی سے اتر کر سب کو گھورتی سیڑھیاں اتر گئی۔

"اے! تم وہاں کیا دیوار سے لنگور کی طرح لٹکی ہو۔" صائمہ نے اپنے لمبے قد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سارے پانچ فٹ کی دیوار سے پار جھانکتی ہانیہ کو مخاطب کیا تھا۔

"لگتا ہے نئے ہمسائے آئے ہیں۔" ہنوز دیوار کے پار جھانکتے ہوئے وہ بولی تھی۔

"ہانیہ! یہاں کوئی آئے جائے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہماری زندگیاں تو اسی چولہا ہانڈی اور رشتوں کی پریڈ میں گزر رہی ہیں۔" صائمہ کے لہجے میں محسوس کی جانے والی تلخی تھی۔

وہ اور شبانہ سب سے بڑی تھیں۔ کب کی بی۔ اے اور پرائیویٹ ایم اے کر کے بیٹھی رشتوں کے لیے آئے ہوئے مہمانوں کی اتوار منڈی میں سج سنور کر پیش ہو رہی تھیں۔ ابھی تک دھان سوکھے ہی پڑے تھے۔ آنے والے جانے کیا سوچ کر آتے تھے۔ ابھی تک کہیں بھی بات آگے نہیں بڑھ سکی تھی۔ جاب کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن خواب دیکھنے کے لیے تو کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ خواب پال لیے تھے۔ اب ان کا عذاب بھگتنا گراں لگا کرتا۔ شکل و صورت کی دونوں ہی کوئی اتنی بری نہیں تھیں۔ باپ اور تایا کی شہر کے بیچ میں ماربل کی چلتی دکانیں تھیں۔ رزق کا کوئی گھاٹا نہیں تھا۔ بس نصیب ہی ٹھنڈے تھے۔

"او ملکۂ جذبات۔ اللہ کے لیے اب رونا نہ شروع ہو جانا۔ شادی نہ ہوئی جنت میں داخلے کا ٹکٹ ہو گیا۔ نہ ملا تو زندگی بیکار۔ مل گیا تو بیڑا پار۔" ہانیہ چڑ کر بولی تھی۔ ان دونوں کو یہ خود ساختہ محرومی اسے بڑا تاؤ دلاتی تھی۔

"تم تو رہنے ہی دو۔ اونٹ کی طرح لمبی ہو۔ عقل ٹخنوں میں بھی نہیں۔ سوائے کھانے کے اور کچھ آتا بھی ہے۔" شبانہ نے اپنے سے چار سال چھوٹی ہانیہ کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ ان سب بہنوں میں دو دو سال کا فرق تھا۔

"تم سب ٹھنگنیاں بھی اگر جلنے کڑھنے کا ٹھیکہ کسی اور کو دے دو تو شاید رنگت میں نمایاں فرق پڑ جائے۔ اب قد تو اس عمر میں بڑھنے سے رہا۔" ہانیہ نے کسی کا ادھار رکھنا سیکھا ہی کب تھا۔ مزے سے کہتی سیڑھیاں اتر گئی۔ سب لڑکیوں میں صرف ہانیہ ہی اچھے قد بت کی تھی اسی لیے اتراتی پھرتی۔

"چھوڑو اس بھینس کو۔ چلو اس کمبل مطلب لحاف سے تو پیچھا چھڑائیں۔ دھوپ ڈھلنا شروع ہو گئی ہے۔ جلدی کرو۔" ہانیہ کے لیے کوئی جلا کٹا جملہ اچھالنے کو منہ کھولتی شبانہ کو صائمہ نے بروقت ٹوکا تھا۔ وہ بھی سر جھٹک کر دوبارہ سے لحاف پہ جھک گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ بڑے مزے سے صحن میں لگے پیپل کے درخت کے ساتھ بندھا جھولا جھولنے میں مصروف

تھی۔ شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔ فضا میں خنکی کافی بڑھ چکی تھی۔ لیکن وہ ایک پتلا سا سوئیٹر پہنے اپنی پینگ اونچی سے اونچی کرنے میں ساری توانائیاں صرف کر رہی تھی۔ گھر کے داخلی دروازے سے اندر آتے بلال نے اپنی موٹر سائیکل دیوار کے ساتھ کھڑی کرتے ہوئے اس کی معصومیت کو لبوں پہ دھیمی سے مسکراہٹ سجا کر دیکھا تھا۔

"السلام علیکم" وہ اس کے قریب جا کر بولا تھا۔

جھولا جھولتی ہانیہ ایک دم سے چونکی تھی۔

"وعلیکم السلام" بڑے خشوع و خضوع سے اس کے سلام کا جواب دے کر وہ پھر سے جھولا جھولنے لگی۔

"یار ٹھنڈ کافی بڑھ گئی ہے... باقی کا جھولا کل جھول لینا... چلو ابھی اندر۔" بلال نے ہاتھ بڑھا کر اس کا جھولا روکا تھا۔

"اندر جا کر کیا کروں؟ سب خواتین کوئی بور سا سوپ لگا کر بیٹھی ہوئی ہیں..." اس نے منہ بنا کر اپنی وہاں موجودگی کا جواز بتایا تھا۔ خواتین کے رونے دھونے ڈرامے اس کی برداشت سے باہر کی چیز تھے۔

"اوہو! یہ تو بڑی زیادتی ہے تمہارے ساتھ۔ اسی لیے میں ڈیموکریسی کے خلاف ہوں... اکثریت کے سامنے اکائی کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔" وہ شرارت بھری آنکھوں میں اس کا لال سرخ چہرہ سجا کر بولا تھا... ایک ہاتھ ابھی بھی اس کے جھولے پہ تھا۔

"ہاں! اکیلا تو جن بھی نہ ہو... لیکن کیا کر سکتی ہوں..." وہ چہرے پہ دنیا بھر کی معصومیت سجا کر بولی تھی۔ انداز بالکل اپنی ماؤں جیسا تھا۔

"کر تو تم بہت کچھ سکتی ہو۔" وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"مثلاً؟" اس نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"مجھ سے دوستی۔" وہ اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا تھا۔

"منہ دھو رکھیں۔" وہ اس کا بڑھا ہاتھ نظر انداز کرتے ہوئے جھولے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اتنا غرور۔" اسے اس کا ردعمل مزہ دے رہا تھا۔
"حسن اور غرور میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔" وہ اک ادا سے بولی تھی۔
"عاشق کے بغیر حسن بے معنی ہے۔" اسے اس مکالمے میں مزہ آنے لگا۔
"حسن کبھی بھی عاشق کا محتاج نہیں رہا۔ جہاں نظر ڈالے دو چار دیوانے کھنچے چلے آتے ہیں۔"
"ادھر بھی ایک دیوانہ کھڑا ہے... اک نظر ادھر بھی۔" وہ بیساختہ اظہار کر گیا۔
ہانیہ بری طرح گڑبڑائی تھی۔ کزن تھا۔ بچپن کا ساتھ تھا... ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے وہ اس کے کسی جذبے سے بے خبر نہیں تھی۔ کھانے پینے کے معاملے میں بے شک وہ بے شرم تھی لیکن اس معاملے میں نہیں۔
"مجھے نہیں پتا... تائی سے بات کریں۔" وہ کہہ کر اڑنچھو ہوگئی۔ بلال نے بے ساختہ ایک گہری سانس خارج کی تھی۔ مسکراہٹ اس کے لبوں پہ مچل مچل جاتی تھی۔ کسی کام سے باہر آتی شبانہ نے اسے یوں اکیلے کھلے آسمان تلے کھڑے اپنے آپ مسکراتے دیکھا تو ٹھٹک کر رکی تھی۔
"کیا کوئی خزانہ مل گیا ہے، جو یوں بیچ چوراہے میں کھڑے مسکرا رہے ہو۔" اپنے خیالات کو الفاظ کا پیراہن پہناتے ہوئے اسے ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت لگا تھا۔
"ہاں! خزانہ ہی ملا ہے... بلکہ سیدھا سیدھا این۔ او۔ سی۔" وہ کھل کر مسکرایا تھا۔
"این۔ او۔ سی۔" شبانہ نے حیرت کا برملا اظہار کیا تھا۔
"دل تک جانے کا۔" وہ اس کے نزدیک سے اس کے بال بکھیرتے گزرا تھا۔ کچھ دیر تو وہ بھنویں سکیڑے سمجھنے کی کوشش کرتی رہی پھر کندھے اچکا کر جس کام سے آئی تھی وہ کرنے چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

صحن میں بڑی اچھی دھوپ آئی تھی۔ گھر کی ساری خواتین تین چارپائیوں میں سلائی دھوپ سینک رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ نمک پاروں اور دودھ پتی سے بھی شغل کیا جا رہا تھا۔ لائٹ آف تھی۔ اس لیے راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ ورنہ یہ وقت تو وہ سب مارننگ شوز دیکھنے میں ضائع کرتی تھیں۔ گھر میں کل تین مرد تھے۔ جو سب کے سب اس وقت اپنے کاموں پہ جا چکے ہوتے تھے۔ سو فراغت ہی فراغت تھی۔
"ہائے ماں!" اچانک صحن میں کچھ گرنے اور تائی اماں کے چیخنے کی آواز ایک ساتھ آئی تھی۔
"کم بخت' سر پھاڑ دیا میرا۔" وہ سر پہ ہاتھ رکھے کراہی تھیں۔ ایک لمحے کو تو کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ ہوا کیا؟ لیکن کچھ ہی سیکنڈ میں صحن کے بیچوں بیچ لڑھکتی گیند سب کو نظر آچکی تھی۔
"کچھ نہیں ہوا تائی اماں... ہارڈ بال نہیں تھی... اس لیے بچت ہوگئی ہے۔" ہانیہ ہی سب سے پہلے لپک کر ان کے پاس پہنچی تھی اور ان کا اپنے سر پہ رکھا ہاتھ ہٹا کر جائزہ لیتے ہوئے انہیں تسلی دی۔
"ارے! کم بخت کیسے شرارتی بچے ہیں ہمسایوں کے... ابھی میرا سر پھٹ جاتا تو۔" وہ دانستہ دیوار کی طرف منہ اونچا کر کے بولی تھیں۔
"ابھی آجائیں گے بال لینے... وہ جانا لگا ہی دینا۔ پتا تو چلے کم بختوں کو۔" تائی اماں نے پیش گوئی کرنے والے انداز میں کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا تھا۔ لگتا تھا کافی زور سے لگی تھی گیند۔
"جمعہ جمعہ چار دن ہوئے نہیں یہاں آئے ہوئے... لگے قذافی اسٹیڈیم سمجھ کر ادھم مچانے۔" وہ چائے پیتے ہوئے اپنی عادت کے مطابق مسلسل بڑبڑا رہی تھیں۔ تب ہی گھر کے بیرونی دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔
"لو دیکھو! شیطان اب بال لینے آبھی پہنچے۔" تائی اماں تیکھے لہجے میں یوں بولی تھیں۔ جیسے دیکھا کہا تھا نا میں نے۔ "جانے دو بچے ایسا ہی کرتے ہیں... ہانی یہ بال اٹھا کر دے آ... کم بخت مارے دروازہ ہی توڑ

ڈالیں گے۔" صابرہ بیگم نے جیٹھانی کو ٹھنڈا کرتے ہوئے ساتھ ہی مسلسل ہوتی دستک پہ جھنجلا کر کہا تھا۔ ہانیہ بال اٹھائے ہوا میں اچھالتی دروازہ کھولنے چلی۔

"اب اگر پھینکی نا تو۔" اپنے تئیں وہ کسی شرارتی بچے کو دھمکا رہی تھی لیکن جیسے ہی دروازہ کھلا اور سامنے کھڑی ایک گریس فل سی خاتون پہ نظر پڑی اس کی زبان کو فوراً" بریک لگا تھا۔ خاتون نے بڑے بیٹھے انداز میں سلام کیا اور اندر آنے کی اجازت چاہی تو ہانیہ نے گڑبڑا کر گردن گھما کر اپنے پیچھے دیکھا تھا۔ سب کی نظریں دروازے کی طرف ہی لگی ہوئی تھیں۔ صابرہ بیگم نے فوراً" سر ہلا کر اسے خاتون کو اندر لانے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

"میرا نام عاقلہ سعید ہے۔ کچھ دن پہلے ہی آپ کے ساتھ والے گھر میں شفٹ ہوئے ہیں۔" سلام دعا کے بعد وہ خاتون انتہائی شیریں لہجے میں اپنا تعارف کروانے لگیں۔

"بیٹھیں نا۔ شبانہ جاؤ، کوئی چائے پانی کا انتظام کرو۔" نصرت بیگم نے آداب میزبانی نبھاتے ہوئے کہا۔ شبانہ کا کوئی موڈ نہیں تھا کچن میں گھس کر ایک بار پھر چائے بنانے کا کہ ابھی جو چائے نوش فرمائی جارہی تھی اسی کی مہمانی تھی۔ وہ کچھ دیر تو مہمان خاتون کی طرف سے حسب روایت "ارے چائے کا تکلف رہنے دیں۔" جیسا کچھ سننے کی منتظر رہی لیکن وہ تو مزے سے ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کر بیٹھ گئی تھیں۔

"چلو شبنم اور صائمہ چائے بناتے ہیں۔" مایوس ہو کر بظاہر اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ورنہ تو جی چاہ رہا تھا پاؤں پٹختی وہاں سے چلی جائے۔ لیکن اب اگر تائی اماں نے اسے پھنسا ہی دیا تو وہ اکیلی کیوں پھنستی۔

"ہاں ہاں جاؤ تم لوگ اس کے ساتھ۔" تائی اماں نے ٹکر ٹکر ایک دوسرے کا منہ تکتی شبنم اور صائمہ کو مخاطب کیا۔ دل ہی دل میں اسے بے شمار گالیوں سے نوازتی وہ دونوں اس کے پیچھے چل دیں۔

"کافی دن سے سوچ رہی تھی کہ آپ کے ہاں چکر لگاؤں لیکن آپ کو تو پتا ہے کہ نئی جگہ شفٹ ہونا کوئی آسان کام کہاں ہے۔ دو سو کام کرو چار سو منتظر ہوتے ہیں۔ بس آج کل کرتے کرتے پورا ہفتہ ہو گیا۔" خاتون بولنے کی کافی شوقین تھیں۔

"ارے اچھا کیا آپ آگئیں۔ میرے تو جوڑ ہی کام نہیں کرتے ورنہ ایک دیوار ہی تو پھلانگنی تھی۔" صابرہ بیگم نے خوش اخلاقی سے کہا تھا۔

"ایک ہی بات ہے۔ آپ آتیں یا میں۔" دوسری طرف بھی تکلف عروج پر تھا۔

"ویسے کہاں سے آئے ہیں آپ لوگ۔" صابرہ خاتون نے معلومات لینے اور بات آگے بڑھانے کی غرض سے پوچھا۔

"ابھی تو ہم لوگ کراچی سے آئے ہیں۔ سالوں پہلے جھنگ سے وہاں شفٹ کر گئے تھے۔ کبھی واپس آنے کی سوچ بھی ذہن میں نہیں آئی تھی۔ لیکن اللہ غارت کرے ان دہشت گردی کرنے والوں کو۔ پورے شہر کا سکون کھا گئے۔ گھر بیٹھے لوگ بھی محفوظ نہیں رہے۔ بس سوچا اب تو ہجرت کرنے کا مقام ہے۔ سو سب سمیٹ اور جانیں بچا کر یہاں چلے آئے۔" انہوں نے خاصا لمبا بیان دیا۔ دونوں خواتین "چچ چچ" کرتے ہوئے افسوس سے سر ہلانے لگیں۔ یہ افسوس عاقلہ خاتون کے ان کے پڑوس میں آکر بسنے کا نہیں بلکہ کراچی کے حالات پر تھا۔

"اچھا کیا۔ یہاں سکون سے رہیں۔ کم از کم کراچی والا حال تو ابھی بھی نہیں ہے۔ ویسے تو امن پورے ملک سے رزق میں برکت کی طرح سے اٹھ سا گیا ہے۔" نصرت بیگم کے لہجے میں افسوس گھلا تھا۔ ویسا ہی جیسا اس خطے میں رہنے والے ہر حساس انسان کو ہوتا تھا۔

"ارے چھوڑیں! ہم بھی کن باتوں میں پڑ گئے۔ ماشاء اللہ آپ کے گھر میں کافی رونق لگی رہتی ہے۔ میں سنتی رہتی ہوں آپ لوگوں کی دلچسپ باتیں۔" عاقلہ خاتون نے بوجھل ہوتے ماحول کے سبب موضوع بدلنا مناسب سمجھا تھا۔

"ارے رونق کی بھی اچھی کہی آپ نے۔۔۔ ویسے اللہ کا کام ہے جیتے جاگتے جی بستے ہیں۔" صابرہ بیگم کے لہجے میں سادگی تھی۔

"ویلیں۔۔۔ میں باتوں میں بھول ہی گئی۔۔۔ یہ میں ایک چھوٹا سا گفٹ لے کر آئی تھی۔ آپ دونوں کے لیے۔" ماتھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے انہوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ایک شاپنگ بیگ نصرت کی طرف بڑھایا تھا۔

"ارے یہ کیا تکلف کیا آپ نے۔" صابرہ بیگم تو حیران رہ گئیں۔ پہلے کبھی کسی ہمسائے نے تو کیا ان کے کسی سگے رشتے دار نے ایسی سخاوت نہیں دکھائی تھی۔ پاس موجود موبائل پہ گیم کھیلتی لڑکیوں کو بھی مہمان خاتون میں یک دم دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔

"نہیں نہیں۔۔۔ یہ کیسے۔" نصرت بیگم کو بھی یہ کچھ مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

"میں بہت خلوص سے یہ چھوٹا سا گفٹ لے کر آئی ہوں۔۔۔ اب چاہے تو اسے باہر کوڑے کے ڈھیر پہ پھینک دیں۔۔۔ میں واپس نہیں لے کر جاؤں گی۔" خاتون کے لہجے میں اب خفگی کا عنصر شامل ہو چکا تھا انہیں یوں اپنا تحفہ ٹھکرانا اچھا نہیں لگا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق نصرت بیگم کو تحفہ وصولتے ہی بنی۔

"یہ تو زیادتی ہے آپ کی۔۔۔ ہمیں زیر بار کر دیا آتے ہی۔" انہوں نے شاپنگ بیگ میں جھانکتے ہوئے انکساری دکھائی تھی۔

"ارے شرمندہ تو نہ کریں۔۔۔ پہلی بار کیسے خالی ہاتھ آ جاتی۔۔۔ دیکھیں تو ذرا کھول کے۔۔۔ اگر پسند نہیں تو بدل لیں گے۔" وہ ایک دم سے خوش ہو گئیں۔

"دکھائیں تائی امی!" پاس ہی کافی دیر سے نوکیا پہ سانپ والی گیم کھیلتی ہانی کو تحفہ دیکھنے کا اشتیاق ہوا تھا۔ نصرت بیگم نے شاپنگ بیگ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"ارے لڑکیو! چائے کو اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟" صابرہ بیگم نے کچن کی طرف منہ کر کے اونچی آواز میں پوچھا تھا۔ شبانہ نے "آ رہے ہیں" کی صدا جواباً لگائی۔

"واؤ! یہ تو بہت خوب صورت ہیں۔" ہانیہ نے شاپنگ بیگ سے دو شالیں برآمد کرتے ہوئے بے ساختہ سراہا تھا۔ سیاہ رنگ کی کشمیری پشمینہ پہ بلاک پرنٹ میں بہت خوب صورت کڑھائی کی گئی تھی۔ دونوں ایک ہی کلر میں تھیں۔ تھوڑے سے ڈیزائن میں فرق کے ساتھ۔ نصرت اور صابرہ بیگم بھی متاثر ہوئے بنا رہ نہ سکیں۔

"یہ تو کافی مہنگی لگ رہی ہیں۔" شال پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے صابرہ بیگم نے اپنے چہرے پہ میٹھی سی مسکراہٹ سجا کر بیٹھی عاقلہ بیگم کو مخاطب کیا تھا۔ ان کے چہرے پہ اتنا مہنگا تحفہ پا کر پریشانی تھی۔ وہ تو سمجھیں کوئی عام سی چیز ہو گی۔

"ہٹائیں بھی۔۔۔ کوئی خاص نہیں۔۔۔ بس اچھی سی چاہیے ہی اس کی قیمت سمجھیں۔" وہ لاپروائی سے بولی تھیں۔ اسی وقت تینوں لڑکیاں چائے کے لوازمات اٹھائے چلی آئیں۔

"واہ بڑی اچھی خوشبوئیں آ رہی ہیں۔۔۔" عاقلہ بیگم چہکی تھیں۔۔۔ یہ ایک دانستہ کوشش تھی اس شرمندگی کو زائل کرنے کی جو ان دونوں خواتین کے چہرے پہ تھی مہنگا تحفہ وصولتے ہوئے۔

"ہوں۔۔۔ زبردست۔۔۔ کس نے بنائی ہے چائے اور یہ سموسے۔" بے تکلفی سے چائے کا پہلا گھونٹ بھرتے اور سموسہ کترتے ہوئے انہوں نے تعریف کی تھی۔

"چائے تو میں نے بنائی ہے۔۔۔ سموسے صائمہ نے تلے ہیں صرف تلے۔ بنائے ہانیہ نے تھے اور شبنم نے حسب عادت باتوں کا بگھار لگایا ہے۔" شبانہ نے نصرت اور صابرہ بیگم کو چائے کے کپ پکڑاتے مسکرا کر تفصیل سے بتایا تھا۔ وہ بے ساختہ ہنس پڑیں۔۔۔ تعارف تو سب سے ہو چکا تھا۔ انہیں یہ فیملی بہت دلچسپ لگی تھی۔ ان سب کی نظریں ہانیہ کی چارپائی پہ پڑی خوب صورت شال پہ جمی تھیں۔ سب تیزی سے

ہانیہ کی چارپائی کے گرد جمع ہو گئیں۔

"ماشاء اللہ، پیاری بچیاں ہیں آپ کی۔" وہ چائے کا دوسرا کپ نوش فرماتی نصرت بیگم کی طرف مڑی تھیں۔

"اے اللہ نہ کرے جو میرا اتنا نوکرا ہو لڑکیوں کا۔۔۔ یہ بس ایک میری ہے نکمی۔ شبنم۔" وہ ناگواری سے بولی تھیں۔ عاقلہ خاتون نے گھبرا کر صابرہ بیگم کی طرف ان کا ردعمل دیکھنے کے لیے دیکھا تھا۔ جن کے چہرے پر کسی ناگواری کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ ایک دم سے تجمل شرمندگی محسوس کرنے لگیں۔ کیسی جلد بازی سے کام لیا تھا انہوں نے۔۔۔ ہانیہ کے علاوہ سب کا ناک نقشہ حتیٰ کہ قد بھی نصرت بیگم پر پڑے تھے۔ سو انہوں نے خود ہی فرض کر لیا کہ وہ چاروں ان کی بیٹیاں ہیں۔

"معاف کیجیے گا۔۔۔ میں سمجھی۔۔۔" عاقلہ خاتون کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیسے اس صورت حال کی وضاحت کریں۔

"آپ کی کیا غلطی۔۔۔ ہر نیا بندہ یہی سمجھتا ہے۔ دراصل میری تینوں بھی اپنی تائی پہ چلی گئی ہیں۔ قد اور رنگت میں۔۔۔ بس یہ ہانیہ پڑی ہے مجھ پہ۔۔۔ لمبی گوری چٹی۔" سکون بھرے انداز میں مسکراتے ہوئے صابرہ بیگم نے عاقلہ خاتون کے ہوش اڑائے تھے۔ انہیں لگا کہ اب طبل جنگ بجا کہ تب۔ وہ عجیب صورت حال میں پھنس چکی تھیں۔ لڑکیاں بڑے مزے سے شالز باری اوڑھ کر صحن میں کیٹ واک کر رہی تھیں جبکہ ان کی مائیں آپس میں چونچیں لڑانے کو تیار بیٹھی تھیں۔

"اے چھوڑو بھی صابرہ۔۔۔ اب کیا مہمان کے سامنے لڑوں تم سے۔۔۔ ویسے شالز ہیں بہت پیاری۔۔۔ بہت شکریہ۔" نصرت بیگم نے صابرہ کا طنز ہنسی میں اڑایا تھا۔ عاقلہ خاتون نے بے اختیار شکر کا سانس خارج کیا تھا۔ ورنہ تو انہیں ڈر تھا کہ کہیں مہابھارت نہ شروع ہو جائے۔

"بہت دلچسپ فیملی ہے آپ کی۔" انہیں واقعی یہ زندہ دل لوگ اچھے لگے تھے سو برملا کہہ ڈالا۔

"آپ خود جو اتنی اچھی ہیں۔۔۔ اب آپ نے آتے جاتے رہنا ہے۔۔۔" صابرہ بیگم کو اپنی فیملی کی تعریف بہت اچھی لگی تھی۔ بڑی خوش اخلاقی سے بولیں۔

"کیوں نہیں۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔ ابھی تو آپ میری دعوت قبول کریں۔۔۔ اس اتوار کو ڈنر ہمارے ہاں پکا ہے آپ کل۔" عاقلہ خاتون نے محبت سے کہا تھا۔

"یہ کیا بات کردی آپ نے۔۔۔ پہل کر کے ہمیں بالکل ہی شرمندہ کر دیا۔۔۔ اوپر سے دعوت بھی آپ کی اڑائیں۔۔۔ یہ نہیں ہو گا۔۔۔ اب آپ لوگ آئیں گے ہمیں مہمان نوازی کا شرف بخشنے۔۔۔ بلکہ ہم خود چل کر آئیں گے آپ کے ہاں دعوت دینے۔۔۔ کیوں نصرت۔" صابرہ بیگم کو ان کا اتنا زیر بار کرنا اچھا نہیں لگا تھا۔ آخر میں اپنی جٹھانی کی بھی تائید چاہی۔

"ہاں بالکل بالکل۔" انہوں نے فوراً سر ہلا کر کہا تھا۔

"ارے۔۔۔ چلیں جیسے آپ کی مرضی۔" عاقلہ خاتون کہتے کہتے رکی تھیں۔

"اب اجازت۔۔۔ اچھا بھئی بچیو۔۔۔ چائے سموسوں کا بہت شکریہ۔" اب وہ کھڑی ہو چکی تھیں۔ سب لڑکیوں نے بڑی شریفانہ مسکراہٹ سجا کر شکریہ وصول کیا تھا سوائے ہانیہ کے جو بچے ہوئے سموسوں پر نظر جمائے بیٹھی تھی۔

"ویسے دیکھیں ذرا۔۔۔ جس کام کے لیے آئی تھی وہ تو کیا نہیں۔۔۔ باقی سارے جہان کی باتیں کر ڈالیں۔" الوداعی کلمات کہہ کر وہ اچانک کچھ یاد آنے پہ ماتھے پہ ہاتھ مارتی واپس پلٹی تھیں۔ یہ شاید ان کی عادت تھی۔ ماتھے پہ ہاتھ مارنے والی۔ ان کے پیچھے انہیں دروازے تک رخصت کرنے کو باجماعت چلتی خواتین ٹھٹک کر رکی تھیں۔

"میرے بیٹے کرکٹ کھیل رہے تھے تو غلطی سے بال آپ کے صحن میں آ دھمکی۔۔۔ بس اسی کی معذرت یہاں آنے کا بہانہ بنی تھی۔۔۔ اور میں اب تک بھولی بیٹھی تھی۔" وہ چہرے پہ شرمندگی سجا کر بولی تھیں۔

"ارے تو کیا ہوا۔۔۔ کھیل میں بچوں سے ایسا ہوجاتا ہے۔۔۔ ہمیں تو اتنی اچھی بہن مل گئی اسی بہانے۔" نصرت بیگم نے بڑھ کر ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا۔ وہ اپنا کچھ دیر پہلے کا ہر بیان بھول چکی تھیں جو انہوں نے گیند لگنے کے بعد دیا تھا۔

"حد ہے تائی اماں کو سیاست میں ہونا چاہیے تھا۔" ہانیہ نے شبنم کے کان میں گھس کر کہا۔

"بچوں کی بھی خوب کہی آپ نے۔" وہ ایک دم ہنسی تھیں۔ وہ سب بھی کورس میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی ہنس پڑی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"ہائے ہائے! توبہ بھئی۔۔۔ کتنا پالا پڑ رہا ہے باہر تو۔۔۔ مانو میرے تو ہاتھ پاؤں اپنے جسم کا حصہ ہی نہیں لگ رہے۔" صابرہ بیگم نے آتے ہی شاپنگ بیگز صوفوں پہ پھینکتے ہوئے کہا تھا۔۔۔ خود بھی وہ صوفے پہ ڈھے سی گئیں۔ نصرت بیگم نے بھی ان کی تقلید میں ہاتھ میں پکڑے بیگز ادھر ادھر پھینکے تھے۔ وہ سب ابھی باجماعت بازار سے شاپنگ کر کے لوٹی تھیں۔

"ہانی ذرا ہیٹر تو چلا۔" صابرہ بیگم نے اپنے پاؤں اوپر کر کے انہیں اپنی شال میں چھپاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ اور شبنم گھر میں ہی تھیں۔

"چلاتی ہوں۔۔۔" وہ جو صوفے پہ کمبل میں لپٹی بیٹھی تھی، منہ بنا کر کھڑی ہوئی تھی۔ شبنم نے اپنے پاس سے گزرتی ہانیہ کو دیکھ کر دانت باہر نکالے تھے جو کہ فوراً ہی اندر ہوئے تھے کیونکہ وہ اس کا پاؤں کھینچتے ہوئے جا چکی تھی۔

"کمینی۔۔۔ بھینس۔" اپنا پاؤں اوپر اٹھا کر مسلتے ہوئے اس کا جی چاہا تھا اس بھینس کو بھی مسل کر رکھ دے۔

"ارے شبو! نکمی۔۔۔ چل اٹھ چائے بنا کر لا۔۔۔ دیکھ بھی رہی ہے۔۔۔ کیسے ماں اور چاچی سردی سے ٹھٹھر رہی ہیں۔ پھر بھی پسر کر بیٹھی ہے۔ چل اٹھ میرا بچہ۔" نصرت بیگم نے اسے ایک ہی جملے میں لتاڑنے

اور پچکارنے کا کام سرانجام دیا تھا۔ اسے ان کا یہ آئیڈیا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا لیکن اگر وہ ذرا بھی چوں چراں کرتی تو اماں نے جوتی اتار لینی تھی۔ "آتے ہی حکم چلانا شروع کر دیتی ہیں۔" وہ پاؤں پٹختی ہوئی کچن کی طرف چل دی۔

"سیدھی طرح چل ورنہ ایک بار پھر لنگڑا کر دوں گی تجھے۔" نصرت بیگم نے اپنی چپل اٹھا کر اس کے پیچھے پھینکی تھی۔ انہیں اس کے تیور یوں کے بل تاؤ دلاتے تھے۔ ابھی کچھ دن پہلے وہ ان کے حکم پر کچن کے جالے صاف کرتی اپنے پاؤں میں موچ لے کر بیٹھی تھی۔ جو کہ اللہ اللہ کر کے ابھی ٹھیک ہونا شروع ہوا تھا۔

"چھوڑو نا بچی ہے۔" صابرہ بیگم نے شبنم کی حمایت کی تو وہ سر جھٹک کر بڑبڑاتے ہوئے خاموش ہو گئیں۔

"دکھائیں تو۔۔۔ کیا کیا خرید ڈالا۔" ہانیہ نے اشتیاق سے کہتے ہوئے ایک شاپنگ بیگ میں منہ ڈالا تھا۔

"میں تو ذرا کمر سیدھی کر لوں۔۔۔ تھک گئی بہت۔" شبانہ تھکے تھکے لہجے میں بولتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے عظمیٰ اور صائمہ بھی ہو لیں۔

"دکھائیں تو کیسی شاپنگ کی ہے۔" ہانیہ دھپ سے تائی اماں کے برابر بیٹھتے ہوئے بولی تھی اور ایک بیگ اٹھا کر اس میں جھانکنے لگی۔

"یہ کس کے لیے ہے؟" مختلف بیگز کھولتے ہوئے اس کے ہاتھ میں ایک سوٹ آیا تھا۔

"ارے چھوڑو اسے۔۔۔ رکھو واپس۔۔۔" تائی اماں نے فوراً سوٹ اس کے ہاتھ سے جھپٹا تھا۔ ہانیہ نے منہ بنا کر ماں کو دیکھا انہوں نے آنکھ کے اشارے سے اسے کچھ بھی کہنے سے باز رکھا تھا۔

"کمال ہے۔۔۔ سارے گھر کو دکھا کر مجھ سے چھپانے کا مقصد۔" وہ دل ہی دل میں بڑبڑائی تھی۔

"عاقلہ آنٹی اور ان کے بیٹوں کے لیے کیا خریدا؟" نروٹھے لہجے میں اس نے صابرہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ مطلب تائی اماں سے ناراضی ہو چکی

تھی۔ اسی وقت شبنم ہاتھوں میں چائے کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی تھی۔

"دو سوٹ عاقلہ کے اور دو دو اس کے بیٹوں کے..." صابرہ بیگم نے شبنم کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے اسے جواب دیا۔

"لیکن یہ باقی ساری شاپنگ کس کے لیے ہے؟" ہانیہ نے حیرانی سے اپنے سامنے پڑے دس' بارہ شاپنگ بیگز کو دیکھتے ہوئے کہا۔ کیونکہ گھر سے تو وہ پڑوسیوں کے لیے تحائف خریدنے نکلی تھیں... اب چار سوٹ تو دس تھیلوں میں سمانے سے رہے۔

"باقی تمہاری تائی اماں کی بہن فیملی کے لیے۔" صابرہ بیگم نے اس کی الجھن دور کی۔

"کچھ ہمارے لیے بھی خرید لاتیں۔" ہانیہ نے منہ بنایا تھا۔

"کیا لاتی؟ سارے سیزن کی شاپنگ تو تمہارے باپ نے کروادی تھی۔ اور کیا چاہیے تھا تمہیں۔" چائے کی چسکیاں بھرتے ہوئے وہ تیز لہجے میں بولی تھیں۔ ہانیہ کچھ بڑبڑا کر رہ گئی۔

"واؤ... کتنا شان دار ہے۔" مختلف شاپنگ بیگز کھول کر دیکھتی شبنم نے وہی سوٹ برآمد کیا تھا۔ جو اب سے کچھ دیر پہلے وہ دیکھ چکی تھی۔

"رکھو... رکھو اسے واپس۔" تائی اماں نے شبنم کے ہاتھ پر چپت لگاتے ہوئے ڈریس واپس کھینچا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ سہلاتے ہوئے شکوہ بھری نگاہوں سے ماں کو دیکھنے لگی۔

ہانیہ کے چہرے پہ "فوراً" ہی مسکراہٹ پھیلی تھی۔

"واہ تائی اماں! انصاف ہو تو ایسا۔" تائی اماں سے ناراضی بھلا کر اب وہ خوش ہو چکی تھی۔

"کیوں... یہ کس ہوتی سوتی کے لیے ہے اگر نہ میرے لیے اور نہ آپ کے لیے۔" شبنم نے تیکھے لہجے میں استفسار کیا تھا۔

"ارے کالے چور کے لیے ہے... تم سے مطلب... چلو سب سمیٹ کر میرے کمرے میں رکھو۔" تائی اماں نے اسے گھر کا تھا۔

"میں تو نہیں جارہی... پہلے بتائیں کس کا ہے۔" وہ اڑ چکی تھی۔

"کیوں ماں سے بحث کررہی ہو... لیا ہے کسی خاص بندی کے لیے۔ شاید اپنی بہو کے لیے... کیوں نصرت۔" شبنم کو تادیبی انداز میں گھورتے ہوئے صابرہ بیگم نے کہا تھا۔ ہانیہ نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔ "کیا اس کے لیے خریدا تھا تائی اماں نے۔" اس نے خود سے سوال کیا۔ جواب میں کئی شکوک کے ناگ اس کے دماغ میں لہرائے تھے۔ اتنی تخی تو نہیں تھیں تائی اماں۔

"اوہو اب پیچھے ہی پڑ گئے ہیں... لگ جائے گا پتا جب وقت آئے گا... ابھی تو سمیٹو سب۔" وہ لاپروائی سے بولی تھیں۔ شبنم منہ بناتے ہوئے سب سمیٹنے لگی۔

"کتنا دل تھا میرا کہ کچھ گواچی اور عمرانی سے نوشی (بہن) اور عرشی (بھانجی) کے لیے کچھ لوں... لیکن اس چھوٹے سے شہر میں کہاں یہ بڑی دکانیں۔" نصرت بیگم نے چائے کا بڑا سا گھونٹ بھرتے جملہ حاضرین سے حسرت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ "گواچی اور عمرانی" ہانیہ اور شبنم نے زیر لب دہراتے ہوئے ایک دوسرے کو نا سمجھنے کے انداز میں دیکھا تھا۔

"ہاہاہا" کچھ دیر غور کرنے کے بعد ہانیہ کے منہ سے نکلنے والا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ شبنم ابھی بھی نصرت بیگم کے کہے گئے الفاظ سمجھنے کی کوشش کررہی تھی۔

"ہاہاہا... تائی اماں... ہاہاہا... گواچی۔" وہ اپنا پیٹ پکڑے ہنسے جارہی تھی۔

"اے بس کرو لڑکی... کیا ہوگیا... جو اتنا ہنس رہی ہو..." وہ اسے ہنستے دیکھ کر تیوری چڑھا کر بولی تھیں۔

"ہانی۔" صابرہ بیگم نے بھی اسے گھر کا تھا۔

"سوری۔ سوری لیکن تائی اماں گواچی نہیں کوچی ہوتا ہے اور عمرانی نہیں ارمانی۔" ہنسی کے بیچ میں اس نے ان کی تصحیح کی تھی۔

"ہاہاہا" اب کی بار شبنم کا قہقہہ گونجا تھا۔ ہانیہ اور صابرہ بیگم نے اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ کچھ دیر تو نصرت بیگم سب کو گھورتی رہیں پھر خود بھی ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے لگیں۔

☆ ☆ ☆

گیٹ پہ گھنٹی کافی دیر سے بجائی جارہی تھی۔ عاقلہ خاتون جھنجلا کر واش روم سے نکلی تھیں۔ سر پہ تولیہ لپٹا ہوا تھا۔ انہوں نے مسلسل بجتی بیل پہ اکتا کر کام والی کو پکارا تھا۔

"باجی اختر... باجی اختر۔"

"جی باجی جی۔" وہ شاید کچن میں تھی۔ اپنے دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے چلی آئی۔

"سنائی نہیں دیتا... گیٹ پہ کب سے بیل ہو رہی ہے... جاؤ دیکھو کون بدتمیز ہے... بندہ تین بار ٹرائی کر کے واپس چلا جاتا ہے لیکن نہیں... کوئی تمیز نہیں لوگوں میں۔" کام والی کو انہوں نے اپنی عادت کے برخلاف جھاڑ ڈالا تھا۔ وہ بڑے سکون سے نہانے کی عادی تھیں۔ کوئی بھی مداخلت انہیں انتہائی گراں گزرتی تھی۔ ابھی بھی مسلسل بجتے گیٹ کو سن جلدی میں نہا کر نکل آئی تھیں۔

"باجی میں تو سرمد بھائی کے لیے مالٹوں کا جوس نکال رہی تھی... نہیں پتا چلا شور میں۔" کام والی کافی منہ چڑھی معلوم ہوتی تھی۔ ان کی ڈانٹ پہ منہ بنا کر بولی تھی۔

"اچھا جاؤ دیکھو کون ہے۔" انہوں نے اکتا کر کہا تھا۔ وہ سرہلاتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

"توبہ ہے... آدھا گھنٹہ ہو گیا یہاں کھڑے... ابھی تک گیٹ نہیں کھلا۔" نصرت بیگم کے لہجے میں بے زاری تھی۔ وہ لوگ کافی دیر سے عاقلہ خاتون کے گیٹ پہ کھڑے گھنٹی بجارہے تھے لیکن ابھی تک کسی چرند پرند کی وہاں موجودگی کا شائبہ تک نہ گزرا تھا۔

"اوہو... چلیں واپس... کب تک یوں جلوس کی شکل میں یہاں کھڑے رہیں گے۔" شبانہ یوں پاگلوں کی طرح منہ اٹھائے کھڑے کھڑے تھک چکی تھی۔ اس لیے بھرپور بے زاری اس کے ہر انداز سے نمایاں تھی۔

"صبر بھی کوئی چیز ہے کہ نہیں... ابھی کھول دیں گے۔" نصرت بیگم نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ نچایا تھا وہ بڑبڑا کر چپ کر گئی۔

"لو کھل گیا گیٹ... کہا تھا نا صبر۔" نصرت بیگم نے گیٹ کی کنڈی کھلنے کی آواز پہ فاتحانہ مسکراہٹ چہرے پر سجا کر شبانہ کو ٹھوکا دیا تھا۔

"کیا ہے بھئی اتنی دیر لگادی۔" گیٹ کھلتے ہی کام والی کا چہرہ برآمد ہونے پہ نصرت بیگم نے رعب سے کہا تھا جیسے وہ ان کی نوکرانی ہو۔

"باجی جی سے ملنا ہے۔" اس نے حیرت سے ادھ کھلے گیٹ سے اندر داخل ہونے والے اس جلوس کو دیکھا تھا۔

"نہیں ٹرنک (ٹرمپ۔ امریکن صدر) سے ملنا ہے... ہٹو پیچھے۔" صابرہ بیگم نے منہ بگاڑ کر راستے میں کھڑی نوکرانی کو پرے دھکیلا تھا۔ سب لڑکیاں باجماعت قہقہہ لگا کر ہنسی تھیں۔ صابرہ بیگم نے سب کو گھورا تھا۔

"ہر وقت ماؤں کا مذاق اڑاتی ہیں... ہٹو پیچھے۔" صابرہ بیگم کی زبان پہ ابھی تک نئے امریکی صدر کا نام نہیں چڑھ سکا تھا۔

"چلو لڑکیوں۔" اپنے پیچھے سب کو آنے کا اشارہ کرتی وہ اندر گھستی چلی گئیں۔

"کمال ہے..." نوکرانی نے ان کے پیچھے گیٹ بند کرتے ہوئے اپنا سر جھٹکا تھا۔ گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی ایک چھوٹا سا گیراج تھا۔ جس میں اس وقت ایک ہنڈا سوک بمشکل پھنسی کھڑی تھی۔ وہ سب کار کی سائیڈ سے نکلتی برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتی چلی گئیں۔

"واؤ! کافی باذوق لوگ ہیں۔" ہانیہ نے اپنے ساتھ چلتی شبنم کے کان میں گھس کر سرگوشی کی تھی۔ اس کی نظریں راہداری کے دونوں طرف رکھے گئے موسمی

پودوں پہ تھیں۔

"ارے گھر تو بڑا پیارا سجا رکھا ہے عاقلہ نے۔" صابرہ بی نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی اس کی آرائش دیکھ کر بہ آواز بلند تبصرہ کیا تھا۔

"واقعی۔" سب نے سرہلا کر ان کی بات کی تائید کی۔

"ارے واہ! کیسے بڑے بڑے لوگ چلے آئے آج تو۔" ابھی وہ لوگ بیٹھے ہی تھے کہ سامنے سے عاقلہ خاتون خوش اخلاقی سے بولتی چلی آئیں۔ وہ کافی فریش لگ رہی تھیں۔ کندھوں سے ذرا نیچے آتے کھلے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ مطلب ابھی وہ نہا کر نکلی تھیں۔ صابرہ اور نصرت دونوں اٹھ کر ان سے گلے ملی تھیں۔

"بہت اچھا کیا آپ لوگ آگئیں۔ میں بہت مس کر رہی تھی آپ کو۔" ان دونوں کے ہاتھ پکڑے ان کے درمیان میں بیٹھتے ہوئے بولتی عاقلہ خاتون کی خوشی دیدنی تھی۔

"ہم یہ مہربانیاں اب اکثر آپ پہ کیا کریں گے۔" ہانیہ کی زبان میں کھجلی ہوئی تھی۔ "ہاہاہا" عاقلہ خاتون کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"یہی چیز تو میں مس کر رہی تھی۔" انہوں نے پیار بھری نظروں سے ہانیہ کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ جواب ماں اور تائی کی گھورتی نظروں سے دبکی بیٹھی تھی۔

"بھئی بڑا انتظار کروایا آپ نے گیٹ پہ۔" صابرہ بیگم نے شکوہ کیا۔

"بہت معافی چاہتی ہوں... میں دراصل واش روم میں تھی... کام والی کچن میں جو سر کے شور میں سن نہ سکی۔" ان کا ہاتھ محبت سے اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے وہ صفائی دینے لگیں۔

"آپ لوگ بیٹھیں، میں ابھی آئی۔" کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"بہت اچھی خاتون ہیں... شکر ہے اس بار اچھے ہمسائے تو ملے۔" ان کے جاتے ہی صابرہ بیگم نے اپنے ساتھ بیٹھی نصرت بیگم کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

"بے شک۔" وہ تو خود ان کی گرویدہ ہو چکی تھیں۔

"شبانہ بیٹا! کبھی مسکرا کر دانتوں کو ہوا بھی لگوا لیتے ہیں..." صابرہ بیگم نے دانت کچکچا کر بے زاری سے گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھتی شبانہ سے کہا تھا۔

وہ جب سے آئی تھی مارے باندھے بیٹھی تھی۔ اول تو وہ کہیں آتی جاتی ہی نہیں تھی۔ آج بھی سب اس کے پیچھے پڑ کر اسے یہاں لائے تھے۔ جب سے اس کے رشتے دیکھنے کا سلسلہ چل رہا تھا۔ وہ ہمہ وقت آدم بے زار رہنے لگی تھی۔ وہ اس کی ماں تھیں۔ سب دیکھتی اور سمجھتی تھیں۔ لیکن کیا کرتیں، خاندان میں تو کوئی اس لائق تھا نہیں کہ بیٹی کا پلو اسے تھما کر چلتا کرتیں۔ اب رشتے لانے والی کو کہ دیکھ بھال کر ہی لاتی تھی۔ پھر بھی تماش تماش کے لوگوں سے پالا پڑ چکا تھا۔ لوگ آتے 'کھاتے' 'پیتے' منہ کھول کر بھرے کرتے لڑکی پر۔ عجیب سوال پوچھے جاتے... چاروں اور گھومتی نگاہیں اسے بڑی اذیت میں مبتلا کر دیتیں... اب تو کچھ عرصے سے وہ کسی بھی رشتے کو لانے کے لیے صاف منع کر چکی تھی۔ اور نہ ہی کسی کے سامنے آتی تھی۔

صابرہ خاتون بڑی اللہ توکل عورت تھیں۔ کبھی بے صبری نہ دکھائی۔ اپنی سی کوشش کرتیں باقی سب اللہ پہ چھوڑ دیتی تھیں۔ جبکہ شبانہ ان کے برعکس تھی۔

"اب میں ان لوگوں کی طرح اسٹیج ڈرامے تو دیکھتی نہیں جو جگتیں مارتی رہا کروں... اور دانت نکالتی رہوں۔" اس نے جلے کٹے انداز میں سامنے صوفے پہ جڑ کر بیٹھی اور کھی کھی کرتی ہانیہ اور شبنم کی طرف اشارہ کیا تھا۔ صابرہ بیگم نے افسوس سے سرہلایا تھا۔ یعنی کہ اس کا کوئی علاج نہیں تھا ان کے پاس۔

"دھیرے جلنا... دھیرے جلنا" ہانیہ نے شرارت سے اس کے بے زار چہرے کو دیکھتے ہوئے تان اڑائی تھی۔ شبانہ نے اپنے پاس رکھا کشن کھینچ کر اسے مارا تھا۔ جسے فوراً کیچ کیے وہ اب اپنے دانتوں کی نمائش کر رہی تھی۔

"سوری... مجھے پھر دیر ہو گئی کچن میں۔" اسی لمحے

عاقلہ بیگم اندر داخل ہوئی تھیں۔ اب ان کے بال پہلے کے مقابلے میں سلیقے سے بندھے تھے۔ کلئی رنگ کے گرم سوٹ میں وہ کافی سوبر لگ رہی تھیں۔

"کتنی پیاری ہیں نا آنٹی یہ۔ بالکل ہیما مالنی جیسی۔" صائمہ شبانہ کے کان پہ جھکی تھی۔

"تم تو چپ ہی کرو۔۔۔ تیری مہانی کا دوسرا ایڈیشن۔۔۔ کان کا پردہ پھاڑ ڈالا۔" شبانہ نے انگلی سے اپنے کان میں خارش کرتے ہوئے اسے پیچھے دھکیلا تھا۔ صائمہ کی آواز کافی بھاری تھی اور سرگوشی کرتے ہوئے عجیب پھٹ سی جاتی تھی۔ وہ کھسیائے انداز میں اسے گھورنے لگی۔

"ولیں نہ تکلف نہ کریں۔۔۔ تم بھی لو بچیوں شبانہ! کیا ہوا بچے؟ شرماؤ نہیں، لو نا۔" نوکرانی لوازمات سے بھری ٹرالی لے آئی تھی اور اب سب کو فرداً فرداً پیش کر رہی تھی۔ عاقلہ خاتون خود بھی چیزیں اٹھا اٹھا کر انھیں پیش کرنے لگیں۔

"آپ تو بیٹھ جائیں۔۔۔ صابرہ بیگم نے انہیں ہاتھ سے پکڑ کر بٹھایا تھا۔

"یہ دیکھیں ذرا۔۔۔" نصرت بیگم نے قالین پہ رکھا شاپنگ بیگ اٹھا کر عاقلہ خاتون کے حوالے کیا تھا۔

"یہ تو غلط بات کر دی آپ نے۔" انہوں نے خفگی سے نصرت بیگم کو گھورا تھا۔ وہ بیگ تھامنے میں متامل جبکہ نصرت بیگم تھمانے پہ مصر۔۔۔ جیت نصرت بیگم کی ہی ہوئی۔

"ویسے ضرورت بالکل نہیں تھی اس کی۔" شاپنگ بیگ کھول کر انہوں نے سوٹ باہر نکالتے ہوئے کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا تھا۔

ہلکی امبیرائڈری سے سجا کیمل کلر کا گرم سوٹ اور اس کی ہم رنگ شال۔۔۔

"بہت پیارا ہے۔" انہوں نے دل سے تعریف کی تھی۔

"شبانہ کی پسند ہے۔" نصرت بیگم فوراً بولی تھیں۔

"شبانہ خود اتنی پیاری ہے تو چوائس بھی اچھی ہی ہو گی نا۔" وہ پیار سے اپنے سامنے والے صوفے پہ بے زار شکل بنائے بیٹھی شبانہ کو دیکھ رہی تھیں۔

"اور یہ آپ کے بچوں کے لیے۔۔۔ ہمیں سائز کا کچھ علم نہیں تھا۔ بس اندازے سے لے لیا۔" اب کی بار صابرہ بیگم نے ایک بیگ نکال کر ان کی طرف بڑھایا تھا۔

"ارے! اتنا تکلف کس لیے۔۔۔ نہیں بھئی یہ بہت ہو جائے گا۔" وہ اپنے ہاتھ اٹھاتے ہوئے مسلسل انکار میں سر ہلا رہی تھیں۔

"ہمارے دل کی خوشی ہے یہ۔۔۔ قبول تو کرنا پڑے گا۔" صابرہ بیگم نے نصرت والا فارمولا آزمایا تھا اور زبردستی ان کے ہاتھ میں بیگ تھما دیا۔ وہ مجبوری میں بیگ پکڑ کر یوں بیٹھ گئیں کہ جیسے ہی موقع ملا چھوڑ کر بھاگ جائیں گی۔

"دیکھیں تو سہی۔۔۔ سائز وغیرہ کا سلسلہ ہو تو چینج کروا لیں گے" صابرہ بیگم نے کہا تھا۔ وہ بے بسی سے کندھے اچکا کر رہ گئیں۔ اور بیگ کھول کر دیکھنے لگیں۔

"یہ۔۔۔ یہ تو چھوٹے بچوں کے کپڑے ہیں۔" ان کی آواز میں حیرت تھی۔

"ہاں تو آپ کے بیٹے چھوٹے ہی ہیں نا۔" صابرہ کو ان کی حیرت پہ حیرت ہوئی تھی۔

"اوہ۔۔۔ ایک منٹ۔۔۔ میرا خیال ہے کہ کوئی غلط فہمی ہے ہمارے درمیان۔" سب کو الجھن بھری نظروں سے اپنی طرف تکتے پا کر عاقلہ خاتون کو کسی "غلط فہمی" کا اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا۔

"ایک منٹ۔۔۔ میں ابھی آئی۔" وہ کچھ سوچ کر اٹھی تھیں۔۔۔ سب انہیں حیرت سے جاتا دیکھتے رہے۔

"شاید پسند نہیں آئے۔" صابرہ خاتون نے ہونٹ لٹکا کر کہا تھا۔ کسی نے تبصرہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ دفعتاً" عاقلہ خاتون اپنے جلو میں ایک اونچے لمبے، شان دار سے بندے کو لیے چلی آئیں۔ جس نے آتے ہی تپاک سے حاضرین محفل کو سلام جھاڑا تھا۔

"یہ میرا بیٹا ہے سہد۔ یہ وہی نالائق ہے جس نے اس دن بال آپ کے گھر پھینکی تھی اور دوسرا اسد وہ ہاسٹل میں ہوتا ہے آج کل۔ ورنہ آپ سے ضرور ملواتی۔ ویسے وہ بھی کوئی اتنا چھوٹا نہیں' میڈیکل کا طالب علم ہے اور سہد سے تین سال چھوٹا۔" بمشکل اس کے کندھے تک آتی عاقلہ خاتون نے مسکراتے ہوئے نوجوان کا تعارف کروایا تھا۔

حقیقت جان کر ان سب پہ گھڑوں پانی پڑا تھا....

☆ ☆ ☆

"حد ہی ہوگئی یہ تو۔" سب اس وقت لیونگ روم میں ہیٹر کے سامنے بیٹھے آج کے واقعے پہ ایک بار پھر سے تبصروں میں مصروف تھے۔

"تو آپ پوچھ لیتی نا اماں! ان کے بچوں کی عمریں۔" قالین پہ بیٹھے بلال نے مفت مشورہ دیا تھا۔ وہ اس وقت اپنے سامنے لیپ ٹاپ کھولے تیزی سے کچھ ٹائپ کرنے میں مصروف تھا۔

"تو بھلا ایسے کیسے منہ پھاڑ کر پوچھ لیتے کہ بھیا آپ کے گھر میں کرکٹ کھیلنے والے لڑکوں کی عمریں کیا ہیں۔ کیا پتا اگلا برا مان جاتا۔" نصرت بیگم کو اس کے مشورے سے اختلاف ہوا تھا۔

"اور کون سے لڑکے گھر کے صحن میں کرکٹ کا ہلا مچاتے ہیں۔ ہم یہی سمجھیں کہ ہوں گے کوئی آٹھ دس سال کے شیطان۔ یاد نہیں صابرہ! کچھ سال پہلے آنے والے ہمسایوں کے بچوں نے کیسا تگنی کا ناچ نچایا ہوا تھا پورے محلے میں۔ ڈوڈو کرتے بیٹ لہراتے پھرتے تھے۔" نصرت بیگم کی تشفی ایسے ہی کسی طویل بیان سے ہونے والی تھی۔ عاقلہ خاتون کے سامنے ہونے والی ہزیمت مٹانے کو وہ ایسے ہی بہانے ڈھونڈ ڈھونڈ کر لا رہی تھیں۔ صابرہ ان کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں۔ کہ دماغ کے گھوڑے جو یوں تو سرپٹ بھاگتے دوڑتے رہتے تھے... یہاں آکر مات کھا گئے تھے۔

"چلیں، ہو جاتی ہے غلط فہمی۔ اب جانے دیں اس قصے کو اور کھانے کا انتظام کریں۔" وہ لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے بولا تھا۔ ایک ہی ذکر سن سن کر وہ اکتا سا گیا تھا۔

"چلو لڑکیوں! اٹھو کوئی کام دھندہ کرو۔ جہاں پاؤں کو بیٹھا دیکھا۔ وہیں اپنی چارپائی بچھالی۔" صابرہ بیگم نے رسالوں اور موبائل میں سر دیئے بیٹھی ان پانچوں کو لتاڑا تھا۔

"آج کھانا پکانے کی باری صائمہ اور عظمیٰ کی تھی اس لیے کھانا لگائیں گی بھی وہی' میں کہیں نہیں جا رہی اتنی سردی میں۔" شبانہ نے اپنے ہاتھ کھڑے کیے تھے۔ وہ دونوں بڑبڑاتے ہوئے اٹھی تھیں۔

"اماں! آج جب آپ لوگ ہمسایوں کے ہاں گئی ہوئی تھیں نا تو خالہ نوشی کا فون آیا تھا کہہ رہی تھیں' اس جمعہ کو وہ آ رہی ہیں۔" بلال کو اچانک یاد آیا تھا۔

"اچھا واقعی۔" وہ ایک دم سے خوش ہوئی تھیں۔

"لو بھئی تین ہفتے تو ہوگئے سنتے اب آئیں کہ تب۔ اب بھی دیکھو۔" صابرہ بیگم کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ نصرت جز بز ہوئی تھیں۔ ویسے کہہ تو ٹھیک رہی تھیں وہ ان کی چھوٹی بہن جو کہ اب کچھ دنوں میں کینیڈا شفٹ ہو جانے والی تھیں بیٹی سمیت۔ (ان کی ایک ہی بیٹی تھی) کب سے ان کی طرف آنے کا ہر ہفتے پکا ارادہ بنتا تھا لیکن پھر عین وقت پہ وہ کسی سسرالی عزیز کی طرف نکل کھڑی ہوتیں۔ معذرت کا ایک پھیکا سیٹھا فون آجاتا۔ نصرت بیگم ان کی آمد کی خاطر کیے گئے اپنے انتظامات لپیٹ لپاٹ کر رکھ دیتیں۔ پھر آنے کا سندیس ملتا تو پھرکی کی مانند سارے گھر میں گھومتی پھرتیں۔

"اے تو کیا ہمارے تمہارے جیسی ہیں۔ سالوں سے ایک ہی کنویں کے مینڈک بنے بیٹھے ہیں۔ بہت سے بہت کمرے سے صحن، صحن سے چھت یا بازار ہو آئے۔ دنیا الف سے شروع کر کے ے کو پیچھے چھوڑ کہاں پہنچ گئی۔ ہم وہیں کے وہیں۔" نصرت بیگم کو دیورانی کا جملہ کس کر لگا تھا۔ کتنے ہی شکوے کر ڈالے نروٹھے لہجے میں۔

"لو تم تو برا مان گئیں۔ خدا لگتی کہنے کا تو دور ہی

نہیں رہا۔۔۔ اور بی نصرت دور کے ڈھول ہمیشہ ہی سہانے لگتے ہیں۔ نزدیک جاؤ تو کان پھٹنے کا اندیشہ جان کو لاحق ہو جاتا ہے۔ بھئی ہم تو خوش باش ہیں۔ جہاں ہیں۔" صابرہ بیگم اپنی صاف گوئی کی عادت سے مجبور بولے گئیں۔

"اے ہٹاؤ! جس کا ہاتھ نہ پہنچے وہ "تھو کوڑی" بولے ہے۔۔۔" انہوں نے سر جھٹکا تھا۔

"او ہو! بھئی اماں اور چاچی! آپ لوگ کس بحث میں پڑ گئیں۔ چلیں کھانا کھاتے ہیں' چھوڑیں ساری باتیں۔" کافی دیر سے ان کو بحث کرتے دیکھ کر بلال کو ہی میدان میں کودنا پڑا تھا۔

"اماں! کھانا لگ گیا ہے اور ابا' تایا بھی آچکے ہیں۔" عظمیٰ نے کمرے میں جھانک کر اطلاع پہنچائی تھی۔ دونوں خواتین تیزی سے اٹھی تھیں۔ اپنے اپنے مزاجی خداؤں کا استقبال کرنے کے لیے۔ بلال نے ان کے پیچھے "شکر ہے" کا اشارہ کرتے ہوئے ایک لمبا سانس لیا تھا۔ ایک اور معرکہ ہوتے ہوتے بچا تھا۔

☆ ☆ ☆

یہ بلا مبالغہ چوتھا سموسہ تھا جو وہ چٹنی سے بھری پیالی میں ڈبو ڈبو کر کھا رہی تھی۔ اس کے عین سامنے بیٹھے بلال نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"یار بس کرو اب۔" وہ مسکین سے لہجے میں اس کے کھانے کی رفتار دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ وہ دونوں اس وقت شہر کی مشہور فوڈ اسپاٹ پہ موجود تھے۔ نکلے تو وہ گھر سے صابرہ بیگم کے جوڑوں کی دوائی لینے تھے لیکن راستے میں پڑتے اس فوڈ اسپاٹ کو دیکھ کر ہانیہ حسب عادت مچل گئی تھی کچھ کھانے کو۔ اور اسے انکار کرنا کم از کم اس کے نصاب میں شامل نہیں تھا۔ اب وہ بے بسی سے کبھی اسے اور کبھی ہاتھ میں بندھی گھڑی کو دیکھ رہا تھا۔

"صبر تو کرو۔۔۔ اب یہ سب ضائع تو نہیں کرنا ناں۔" وہ بمشکل بھرے منہ سے بولی تھی اور اپنے سامنے پڑے سموسوں اور سوڈے کی بوتل کی طرف اشارہ کیا۔

"غلطی ہو گئی جو تمہارے کہنے میں آگیا۔۔۔ آئندہ سے ایسی عیاشی ختم سمجھو۔" وہ ہلکا سا جھنجلا کر بولا تھا۔ سوچا تھا چلو اسی بہانے اپنے دل کا تازہ تازہ حال اس تک پہنچائے گا۔ لیکن وہ تو سموسوں کو ایسی پیاری ہوئی تھی کہ اس کی طرف دیکھنے سے بھی گئی۔۔۔ سارے رومانٹک موڈ کا ستیاناس ہو گیا تھا۔

"اب اٹھو میری ماں!" اس کا ضبط ختم ہوا تھا۔ اس نے آخری بچ جانے والے سموسے کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہانیہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے زبردستی اٹھایا تھا۔ وہ سموسہ اٹھانے کی کوشش میں ناکام برے برے منہ بناتی اس کے پیچھے گھسٹنے لگی۔

"چلو بیٹھو۔" پارکنگ ایریا میں کھڑی موٹر سائیکل کے پاس لا کر ہی اس نے اس کا ہاتھ چھوڑا تھا۔ جہاں روشنی کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں تھا۔ ارد گرد کی عمارتوں سے آتی روشنی سے ہی کام چلایا جاتا تھا۔

"اسٹارٹ تو کرو پہلے۔" اپنے دونوں ہاتھ سینے پہ لپیٹتے ہوئے ہانیہ نے منہ بنایا تھا۔ بلال کو روشنی اور اندھیرے کے سنگم پہ کھڑی ہانیہ اپنے حواسوں پہ چھاتی محسوس ہوئی تھی۔

"اب چلو بھی۔۔۔ یہیں قلفی بنوانی ہے میری کیا۔" اس کی پیغام دیتی نگاہوں سے گھبرا کر ہانیہ نے خواہ مخواہ اپنی شال کو ٹھیک کیا تھا۔

"اے۔۔۔ خبردار۔" اسے ایک دم اپنی طرف جھکتے دیکھ کر وہ بدکی تھی۔ بلال نے بڑے سکون سے اس کے لبوں کا کنارہ اپنے ہاتھ کے انگوٹھے سے صاف کیا تھا جہاں کچھ دیر پہلے کھائی جانے والی چٹنی ابھی تک اپنے جلوے دکھا رہی تھی۔

"ہو گیا۔" وہ لاپروا سے لہجے میں بولا تھا۔ ہانیہ ایک دم کھسیائی تھی۔ وہ جانے کیا سمجھی تھی۔ بلال نے کک لگا کر موٹر سائیکل اسٹارٹ کی وہ تھوڑا سا فاصلہ رکھتے ہوئے اس کا کندھا پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"تم کیا سمجھی تھیں کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔" بائیک چلاتے ہی اس نے اپنی گردن پیچھے موڑ کر اسے دیکھا تھا۔

"اوہو! میں کچھ نہیں سمجھی تھی۔ تم جانے کیا سمجھ رہے ہو۔" اپنے چہرے پہ بے نیازی سجاتے ہوئے اس نے کہا تو بلال کے لبوں پہ مسکراہٹ رینگی۔

"لیکن تم وہ تو سمجھ رہی ہو نا جو میرا دل تمہیں سمجھانا چاہ رہا ہے۔" وہ کسوٹی کھیلنے لگا۔

"پتا نہیں تم کیا بول رہے ہو۔" وہ کنی کترانے لگی۔

"میں اماں سے تمہاری بات کرنے والا ہوں ایک دو دن میں..... مجھے تمہارا ساتھ ..... چاہیے ..... بولو منظور ہے۔" وہ کوئی یقین کا سرا تھامنا چاہ رہا تھا۔

"دل تمہارے ساتھ ہے لیکن زبان میرا خود کا ساتھ نہیں دے گی..... سمجھو تم میری مجبوری۔" وہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولی تھی۔ بلال نے اطمینان کی سانس لی تھی..... کم از کم اس کا دل تو اس کی مٹھی میں تھا۔ باقی وہ اماں کو مٹھی میں کرنے کے فن سے خوب آشنا تھا۔

☆ ☆ ☆

دروازے پہ کب سے دستک ہو رہی تھی اور وہ چاروں آرام سے بیٹھی مونگ پھلی کھاتے ہوئے "ٹی وی" دیکھنے میں مگن تھیں۔

"ہڈ حرام عورتوں! باہر نکل کر دیکھو کون ہے دروازے پہ۔" شبانہ آٹے سے لتھڑے ہاتھ لیے لیونگ روم میں کڑے تیوروں کے ساتھ داخل ہوئی تھی۔

"کوئی شرارتی بچہ ہوگا..... کیونکہ ہماری مائیں۔ تو پانچ منٹ میں رشتے داروں کے ہاں سے واپس آنے والی نہیں..... اس لیے تم بھی سکون سے کام کرو۔ اور ہمیں آرام سے فلم دیکھنے دو..... کیسا کلائمکس چل رہا ہے..... ہائے میرا شیرو..... دشمن کے ہاتھ آگیا۔" صائمہ نے ٹی وی اسکرین سے نظریں ہٹائے بغیر سب کے جذبات کی ترجمانی کی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی دونوں خواتین اپنے کسی سسرالی عزیز کی عیادت کو نکلی تھیں۔ مردوں میں سے اگر کوئی اس وقت آتا بھی تو فون کر کے۔ اس لیے سب کو کامل یقین تھا کہ یہ کوئی بچہ ہی ہے۔ کوئی بھی ٹس سے مس ہونے کو تیار نہیں تھا اور دستک دینے والا ہار ماننے کو۔

"مو تم ساری کی ساری۔" غصے میں ہاتھ سے ان پہ لعنت بھیجتے ہوئے وہ پاؤں پٹختی دروازے کی سمت بڑھ گئی۔

"صبر کرلو..... کیا لوہے کے ہاتھ ہیں تمہارے جو ابھی تک تھکے نہیں۔" وہ غصے میں بھری ہوئی تھی۔ ایک تو یہ محلے والے روز کچھ نہ کچھ لینے اپنے شیطانوں کو ان کے ہاں دوڑائے رکھتے تھے۔ وہ تو اماں اور تائی ہی ان کو بھگتاتی تھیں۔ ورنہ وہ لوگ تو کسی کو دروازہ پار ہی نہیں کرنے دیتی تھیں۔ اور پھر ایسے ہر موقع پہ انہیں "حقوق العباد" کے لیکچر زپلائے جاتے۔ جنہیں وہ ایک کان سے سن دوسرے سے نکال یہ جا وہ جا۔

"کیا ہے؟" دروازہ جھٹکے سے کھولتے ہوئے وہ پھاڑ کھانے والے انداز میں بولی تھی۔

"جی..... وہ میں..... مجھے ممی نے بھیجا تھا آپ کے ہاں کسی کو بلانے کے لیے۔" سامنے کھڑا سعد اس زبانی حملے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے گڑبڑا کر رہ گیا۔

"او سوری! وہ میں سمجھی شاید محلے کا کوئی بچہ ہے۔" اپنے سامنے غیر متوقع طور پر سعد کو دیکھ کر ایک پل کو تو وہ بھی ٹھٹکی تھی۔

"کوئی بات نہیں..... آپ شاید مصروف تھیں۔" اب وہ دلچسپی سے اس کے سراپے کا جائزہ لے رہا تھا۔ آٹے سے سنے ہاتھ۔ براؤن کرشمہ کا پلین سوٹ براؤن ہی شال' فرنچ چوٹی میں بندھے بال اور نازک سے ناک و نقشے کی مالک شبانہ "ٹھاہ" کر کے اس کے دل میں اتری تھی۔

"اگر میرا جائزہ مکمل ہو گیا ہو تو وہ بات بتائیں جس کے لیے یہاں جے کھڑے ہیں۔" اسے یوں محویت سے اپنی طرف تکتا پا کر وہ ناگواری سے بولی تھی۔

"وہ! ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ مجھے ممی نے بھیجا ہے شبانہ۔۔ باجی کو بلانے کے لیے..... انہیں شاید ان سے

کچھ کام ہے۔" اب کی بار اس کی آنکھوں میں شرارت صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ خود کو اپنی عمر سے بڑے مرد کے منہ سے "باجی" سن کر اسے تپ چڑھی تھی۔

"سرد انکل۔۔۔ آپ آنٹی سے کہیں کہ شبانہ ابھی آجاتی ہے۔" دانت کچکچا کر اس نے بدلہ اتارا تھا۔

"ہاہاہا۔" سرد کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ شبانہ نے دھاڑ سے دروازہ بند کیا تھا۔ بند دروازے کے پیچھے کھڑا سرد دیر تک ہنستا رہا۔

☆ ☆ ☆

"کیا ہو گیا آنٹی آپ کو۔" اس وقت وہ عاقلہ خاتون کے بیڈ روم میں موجود تھی۔ وہ اب سے کچھ دیر پہلے والے حلیے میں ہی تھی لیکن اب آنکھوں میں کاجل کی ہلکی سی دھار اور ہونٹوں پہ نیچرل پنک کلر کی لپ اسٹک سج چکی تھی۔

"بس بیٹا! شاید ٹھنڈ لگ گئی بوڑھی ہڈیوں کو۔ راتوں رات بخار چڑھا۔ صبح تک میں اٹھنے کے قابل نہ رہی۔۔۔" وہ نڈھال سے لہجے میں بولی تھیں۔

"کوئی میڈیسن لی آپ نے۔" اس نے محبت سے اس پر خلوص سی خاتون کا بخار میں تپتا ہاتھ تھام کر پوچھا تھا۔

"ہاں! سرد نے چائے کے ساتھ کھلادی تھی صبح میں۔۔۔ معاف کرنا تمہیں تکلیف دی۔"

"اوہو! ایسی باتیں نہ کریں آپ پلیز۔ پڑوسی ہونے کے ناتے آپ کا حق ہے۔۔۔ بتائیں کیا بناؤں آپ کے لیے اور جو جو کچھ کرنا ہے۔" وہ ہلکی سی خفگی سے بولی تھی۔

"ارے بیٹا! کچھ بھی بنادو۔۔۔ سارا گھر تمہارے حوالے ہے۔۔۔ میرا تو سر گھوم رہا ہے کچھ آرام کروں گی۔۔۔ آج کام والی بھی چھٹی کر کے بیٹھ گئی۔۔۔ ورنہ وہی تمہاری مدد کردیتی۔" وہ شاید اب غنودگی میں جارہی تھیں۔ اس لیے بولتے بولتے ان کی آواز کافی بھاری ہوگئی۔

"میں کرلوں گی۔۔۔ آپ فکر نہ کریں۔ بس آرام کریں آپ۔" وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ان کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ مطلب وہ سوچکی تھیں۔ وہ ان کے بیڈ روم کا دراوزہ بند کرتی باہر نکل آئی۔ گھر میں اس وقت اس کے اور عاقلہ خاتون کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ شاید سرد اور انکل اپنے اپنے آفس پہ روانہ ہوچکے تھے۔ وہ کچھ دیر کھڑی لونگ روم میں اُدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ پھر کچن سے صفائی شروع کرنے کے خیال سے وہاں گھس گئی۔

☆ ☆ ☆

وہ چھت پہ صبح میں دھو کر ڈالے گئے کپڑے اتارنے میں مصروف تھی، جب یکدم اس کی پشت پہ کوئی چیز آکر لگی تھی۔ اس نے مڑ کر آس پاس کی چھتوں پہ نگاہ دوڑائی۔ کوئی بندہ' پرندہ اس کی نظر کی گرفت میں نہ آسکا۔ پھر دفعتاً" اس کی نگاہ اپنے قدموں میں گرے کاغذ کے گولے پہ پڑی تھی۔ اس نے حیرت سے اٹھا کر اسے کھولا تھا اور پڑھنا شروع کیا۔

"کیسی ہیں شب! (ہیں شب۔۔۔ یہ کون ہے اتنا بے تکلف)۔" اس کے ماتھے پہ بل پڑے۔

"آپ کو بے تکلفی سے مخاطب کرنے پہ میں ہرگز معذرت خواہ نہیں ہوں۔ کیونکہ یہ میرا حق ہے جیسے آپ نے بلا اجازت میرے دل پہ قبضہ کیا ہے۔ اب مجھے حق ہے آپ کو اپنی پسند کے نام سے پکاروں (اچھی غنڈہ گردی ہے) کل کے پلاؤ اور زرا تقل نے مجھے ساری رات آپ کی یاد میں تارے گننے میں مصروف رکھا۔ امید ہے کہ بہت جلد تمہیں اپنے کچن میں بھی لانے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔ (ہیں اتنی جلدی آپ سے تم) دل میں تو پہلے ہی آچکی ہو (اس کی آنکھیں پوری کھل چکی تھیں) ویسے یہ آوٹ ڈیٹڈ طریقہ اظہار اپنانے پہ تھوڑی سی شرمندگی ہے۔ اب اسی کاغذ کی پچھلی طرف اپنا سیل نمبر گھسیٹ ڈالیں تاکہ آئندہ کے لیے گفت و شنید میں مسّی کو آسانی رہے۔

تمہارا اپنا سعد۔

پورا متن پڑھ کر اس نے غصے سے سر اٹھا کر عاقلہ خاتون کی چھت کی طرف دیکھا تھا جہاں وہ بڑے اشتیاق سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شبانہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً" ہاتھ میں پکڑا کاغذ ہوا میں اسے دکھانے کو لہرایا تھا اور چار پرزے کر کے پھینک دیا۔

اس منظر کی تاب نہ لاتے ہوئے سعد دل پہ ہاتھ رکھے اپنی چھت پہ لڑکھڑانے کی شاندار ایکٹنگ کر رہا تھا۔

اس نے ہاتھ کی پانچوں انگلیوں اسے دکھا کر "لعنت" کا اشارہ کیا اور مڑ کر دھڑا دھڑ سیڑھیاں اترنے لگی۔

یہ الگ بات کہ اس کے چہرے پہ میٹھی سی مسکان پھیلی ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"اچھا اب بستر چھوڑ بھی دیں۔۔۔ آپ تو ایسے آرام سے سب چھوڑ کر بیٹھی ہوئی ہیں جیسے آپ کی بہو آ گئی ہو۔" سعد نے مزے سے شبانہ کے ہاتھ کی بریانی اڑاتے ہوئے عاقلہ خاتون پہ جملہ کسا تھا۔ جواب پہلے سے بہت حد تک صحت یاب ہو چکی تھیں۔ جب سے وہ بیمار پڑی تھیں۔ دونوں وقت کا کھانا شبانہ ہی آ کر بنا جاتی۔ کیونکہ پہلے دن اس کے ہاتھ کا کھانا کھا کر گیلانی صاحب (عاقلہ کے شوہر) اور سعد دونوں ہی نوکرانی کے ہاتھ سے پکا کھانے کے بجائے زہر کھانے کو ترجیح دینے کا اعلان کر چکے تھے۔ اس لیے عاقلہ خاتون کو صابرہ سے اسے روز اپنے گھر بلوانے کی خصوصی اجازت لینی پڑی۔

"ویسے آئیڈیا برا نہیں ہے۔" انہوں نے شوخی سے آنکھیں گول گول گھمائی تھیں۔

"کون سا آئیڈیا؟" وہ انجان بنا۔

"بچو! بنو نہیں۔۔۔ مجھے سب خبر ہے۔ پہلے دن سے جب وہ آئی تھی اپنے گھر والوں کے ساتھ۔۔۔ تب سے تم بدلے بدلے سے ہو۔" اس کا کان پیار سے موڑتے ہوئے وہ بولی تھیں۔

"ہائے مر گیا۔" اس کا ڈراما عروج پہ تھا۔

"خبیث ہو پورے۔" انہوں نے ہنستے ہوئے اس کا کان چھوڑا تھا۔

"ویسے کیسی لگی۔" اپنا کان مسلتے سعد کی طرف وہ رازداری سے جھکی تھیں۔

"ہائے۔۔۔ ٹھاہ کر کے۔" سینے پہ ہاتھ رکھ کر اس نے اک لمبی سانس خارج کی۔

"بڑے بے حیا ہو۔۔۔" انہوں نے ہنستے ہوئے اس کے کندھے پہ ہاتھ مارا تھا۔

"ویسے ہے بڑی سڑیل۔۔۔ میرے خط کے پرزے پرزے ایسے کیے جیسے قصائی مرغی کا گوشت بناتا ہے۔" وہ مصنوعی آہیں بھرنے لگا۔

"ہیں۔۔۔ تم نے اسے خط لکھا تھا۔" اس انکشاف پہ وہ حیرت سے بولی تھیں۔

"تو اور کیا کرتا۔۔۔ محترمہ کے ہاں شاید موبائل رکھنے کا رواج نہیں۔ اب کوئی نہ کوئی سبیل تو کرنی تھی اس تک حال دل پہنچانے کی۔۔۔" وہ اپنے چہرے پہ بھرپور بے چارگی کے تاثرات لاتے ہوئے بولا تھا۔

"ہاں ان کے ہاں کافی چیزیں نہیں ہوتیں جو آج کل کے خانہ خراب میں ہو رہی ہیں۔" عاقلہ خاتون نے وضاحت کی۔

"مجھے تو ان کا گھرانہ بہت پسند ہے۔ ٹیکنالوجی کے نام پہ کوئی خرافات نہیں۔۔۔ یہ لوگ ایسے ہی زندگی گزار رہے ہیں جیسے موبائل اور دوسری آفات آنے سے پہلے کوئی بھی نارمل گھرانہ گزارا کرتا تھا۔"

"ہوں۔۔۔ تو کیا خیال ہے۔۔۔ کچھ آگے بھی بات چلائیں گی آپ یا یہاں سے ہی تعریفوں کے ٹوکرے ان کے ہاں بھیجتی رہیں گی۔" وہ جلد ہی مطلب کی بات پر آ گیا۔

"بڑی جلدی ہے۔" وہ شرارت سے مسکرائی تھیں۔

"کبھی کبھی دیر سے بہتر جلدی ہوتی ہے۔ کیا خیال ہے۔" وہ اپنے تئیں بڑا مدبر بنا تھا۔ عاقلہ خاتون نے اس کے بال بگاڑے تھے اور پھر دونوں ہی ہنس دیے۔

☆ ☆ ☆

"ویسے میں اب سوچ رہی ہوں کہ سعد کی شادی نہ کردی جائے۔ ستائیس کا ہونے والا ہے۔" عاقلہ خاتون نے اپنے ہاتھوں پہ لوشن کا مساج کرتے ہوئے گیلانی صاحب کو مخاطب کیا تھا جو لیپ ٹاپ میں سر دیے بیٹھے اپنے بزنس کا کوئی حساب کتاب کر رہے تھے۔

"بڑی دیر کی مہاں آتے آتے۔" وہ لیپ ٹاپ سے سر اٹھائے بغیر بولے تھے۔

"دیر کہاں۔ جب اچھی لڑکی ملتی تب ہی کرتی نا۔"

"یہ اچھی لڑکی کی کیا تعریف ہوتی ہے۔" وہ ذرا کی ذرا سر اٹھا کر بولے تھے۔

"اچھی لڑکی شبانہ جیسی ہوتی ہے۔ کیسی لگے گی وہ ہمارے سعد کے ساتھ۔" ان کے سوال کا جواب دے کر وہ پوچھنے لگیں۔

"اچھا! اسی لیے ساتھ والوں سے اتنی گاڑھی چھنتی ہے آپ کی۔" وہ ایسے بولے جیسے سب سمجھ میں آگیا ہو۔

"ہاں تو ایسا گھرانہ آج کے دور میں ملے گا کہاں؟"

"واقعی بڑے اچھے لوگ ہیں۔ ملنسار۔ سادہ۔" گیلانی صاحب بھی اس فیملی کے متاثرین میں شامل تھے۔

"اور خاص کر بچی کھانے بہت اچھے بناتی ہے۔ میرا خیال ہے اب آپ کو کچن سے ریٹائر ہو ہی جانا چاہیے۔" وہ کھانا کھلانے کے خاصے شوقین تھے۔ عاقلہ خاتون کی بیماری کے دنوں میں شبانہ کے بنائے گئے مزے مزے کے کھانوں کا ذائقہ ابھی بھی ان کی زبان پہ تھا۔

"چلیں پھر اس ویک اینڈ پہ چلتے ہیں ان کے ہاں۔" انہوں نے فٹافٹ پروگرام بنایا تھا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" وہ مسکراتے ہوئے پھر لیپ ٹاپ پر جھکے تھے۔

"میرا دل تو تھا کہ سعد کے ساتھ ساتھ اسد کے لیے ان کی چھوٹی بیٹی صائمہ کا ہاتھ مانگ لوں، لیکن اسد اس بار کہہ گیا ہے کہ اس کی اپنی کسی کلاس فیلو سے کمٹمنٹ ہے۔" وہ اداسی سے کہہ رہی تھیں۔ انہیں شبانہ اور صائمہ دونوں بہت پسند تھیں، لیکن مسئلہ اسد کا تھا جو سعد سے مختلف طبیعت اور سوچ کا مالک تھا۔

"بھئی اب اس کی مرضی، آپ پریشان نہ کریں خود کو اور سعد کی تیاری کریں۔" گیلانی صاحب نے انہیں ہلکے پھلکے لہجے میں تسلی دی تھی۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" انہوں نے گیلانی صاحب کی بات سے اتفاق کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

بالآخر وہ مبارک گھڑی آن ہی پہنچی تھی۔ جب نصرت بیگم کی چھوٹی بہن نوشابہ عرف نوشی نے ہمراہ اپنی صاحبزادی کے ان کے غریب خانے کو عزت بخشی تھی۔ نصرت بیگم تو ہڑبڑ سارے میں گھومتی پھر رہی تھیں۔

"اور سناؤ کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی نا آنے میں۔" بہن کے بالکل ساتھ جڑ کر بیٹھی نصرت بیگم جانے کس چیز کی تسلی چاہ رہی تھیں۔

"ارے نہیں آپا تکلیف کیسی۔ اپنی گاڑی میں آئے ہیں۔" انہوں نے معقول لہجے میں بہن کو تسلی کروائی تھی۔

"اور کچھ لاؤں کھانے پینے کو۔"

"آپا! ابھی تو بہت فل ہیں۔ بس آپ بیٹھیں یہاں باتیں کریں، جانے پھر کب ملنا ہو۔" وہ نصرت بیگم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھپتھپاتے ہوئے بولی تھیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی ان کی آمد پہ ریفریشمنٹ کے نام پہ ڈھیروں لوازمات زبردستی انہیں کھلائے جاچکے تھے۔

"کافی ماڈرن ہیں یہ نوشی آنٹی۔" ہانیہ نے حسب عادت شبنم کے کان میں گھستے ہوئے کہا تھا۔ وہ بغور ان کا جائزہ لے رہی تھی۔ سیاہ اور سلور رنگ کے امتزاج سے سجا پرنٹ پہنے ہوئے، کندھوں سے ذرا نیچے آتے رنگے ہوئے بال اور ہلکا سا میک اپ کیے وہ اپنی عمر سے

کچھ سال کم ہی دکھتی تھیں۔ جب کہ ان کے برابر میں بیٹھی نصرت اور صابرہ بیگم انتہائی سادہ اور کسی بھی قسم کے تصنع سے پاک۔

"ہوتی رہیں۔۔۔ ہمیں کیا۔۔۔ بس مجھے تو ان کے ساتھ آیا وہ بڑا سا کیک اچھا لگا ہے اور کچھ نہیں۔" شبنم نے ناک چڑھا کر اپنی ناپسندیدگی واضح کی تھی۔

اسے کبھی بھی اپنی خالہ میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بڑا اوپری پن ہوتا تھا ان کی محبت میں اور پھر ان کی بیٹی جو مصنوعی پن کی دوڑ میں شاید چیمپئن بننے کا ارادہ رکھتی تھی۔ وہ سب سے الگ تھلگ اپنے آئی پیڈ پہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ انتہائی تنگ جینز اور چنی منی سی ٹائٹ شرٹ میں وہ ہانیہ کو زہر لگی تھی۔ وہ تو شکر ہے کہ بلال گھر میں نہیں تھا ورنہ اس کے دعوت نظارہ دیتے وجود کی کشش شاید اسے بھی جکڑ لیتی۔۔۔۔

"آپ شاید بور ہو رہی ہیں۔" وہ اٹھ کر عرشیہ کے پاس چلی آئی۔ شبنم نے اس کی تقلید کی۔

"نو وے۔" وہ ذرا کی ذرا گردن اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

"اچھا۔۔۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ انسانوں کے بجائے مشینوں کے ساتھ زیادہ انجوائے کرتی ہیں۔" وہ بڑی فرصت سے اس سے تھوڑا فاصلہ رکھ کر بیٹھ گئی اور شبنم بالکل اس کے ساتھ جڑ کر۔ عرشیہ نے دونوں کو ناگواری سے دیکھا تھا۔ اسے یہ لوگ کبھی بھی پسند نہیں رہے تھے۔ یہاں آکر اسے لگتا تھا کہ وہ انیس سو نوے کے دور میں داخل ہو گئی ہے۔

"میرے نزدیک مشینیں انسان سے زیادہ کار آمد ہیں۔" وہ ماتھے پہ بل ڈال کر بولی تھی۔ اسے ان دونوں کا بغیر اجازت مخاطب کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"چمگادڑ۔" شبنم نے اس کے کان میں گھس کر سرگوشی کی تھی۔ اسے ایک دم ہنسی آئی تھی۔ عرشی نے دونوں کو گھورا تھا۔ بولی کچھ نہیں۔

"درست کہا۔۔۔ کچھ انسانوں سے بہتر مشینیں ہی ہوتی ہیں۔" ہانیہ نے طنزیہ لہجے میں اسے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"میرا خیال ہے۔ ہماری گفتگو ختم ہوئی اب آپ جاسکتی ہیں۔" عرشیہ کا انداز نخوت سے پر تھا۔ اس کا صبر جواب دے چکا تھا۔

"بندے کی ناک ہو تو نخرہ بھی اچھا لگتا ہے۔ آپ فضول میں اپنی انرجی ضائع کر رہی ہیں۔" ہانیہ نے اس کی چپٹی ناک پر حملہ کیا تھا۔

"ایڈیٹس۔" وہ تن فن کرتی وہاں سے اٹھی تھی اور واک آؤٹ کر گئی۔ پیچھے وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ پہ ہاتھ مار کر ہنسی تھیں۔

☼ ☼ ☼

سب رات کے پر تکلف کھانے اور اپنے اپنے من پسند مشروب' چائے' کافی اور سبز چائے پی کر اپنے اپنے کمروں میں سدھار چکے تھے۔ کچن سمیٹنے کا کام کیونکہ اس کے ذمہ تھا اس لیے وہ اس سردی میں ٹھٹھرتی برتنوں سے دو دو ہاتھ کرتی باقی سب کو کوسنے میں مصروف تھی۔ جو مزے سے اپنے اپنے حصے کا کام بھگتا کر گرم بستر میں گھسی ہوئی تھیں۔

"اے حسینہ! ایک کپ چائے کا ملے گا۔" بلال کچن کے دروازے سے اندر جھانکتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا تھا۔

"زہر نہ پلا دوں اس وقت۔" وہ اس بے وقت کی فرمائش پہ دانت کچکچاتی بولی تھی۔

"توبہ۔۔۔ توبہ۔۔۔ بالکل ڈریکولا کی جانشین لگ رہی ہو اس وقت۔" وہ مصنوعی تاسف سے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا تھا۔

"دیکھو مجھے کام کرنے دو۔۔۔ خود تو سب مزے میں گرم کمروں میں بیٹھے ہیں' مجھے اس عذاب میں ڈال رکھا ہے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا برتن واپس پٹخا تھا۔

"چلو میں خود ہی بنا لیتا ہوں۔" وہ اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھتا ادھر ادھر کیبنٹ میں ہاتھ مار کر چولہا جلانے کے لیے ماچس ڈھونڈنے لگا۔

"ہٹو پرے' بنا دیتی ہوں۔" وہ چیخ کر بولی تھی۔

"جو حکم۔۔۔ سرکار۔" وہ زیر لب مسکراتا فوراً" وہاں

سے کیا بلکہ کچن سے نکلا تھا۔

"ہاں دو کپ بنانا۔۔۔ اماں کو بھی طلب ہو رہی ہے۔" اسے چائے کا پانی چڑھاتے دیکھ کر وہ واپس پلٹا تھا اور نیا حکم صادر فرمایا۔

"کہو تو پوری بارات کے لیے چائے چڑھا دوں۔" وہ عین اس کی توقع کے مطابق تڑخ کے بولی تھی۔

"بس دو کپ ہی فی الحال۔" وہ مزے سے کہتا چلتا بنا۔ ہانیہ نے بڑبڑاتے ہوئے کیبنٹ کھول کر چائے کی پتی کا ڈبہ باہر نکالا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اماں کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔۔۔ میرا اور عرشی کا کوئی جوڑ بھی بنتا ہے۔" وہ دو کپ چائے ٹرے میں دھرے تائی اماں کے کمرے کے دروازے کے پاس آئی تو بلال کی تیز آواز سن کر رک گئی۔

"تمہیں کیا پتا۔۔۔ تمہارا جوڑ کس سے بنتا ہے۔ یہ تمہارے ماں باپ کے کرنے کے کام ہیں، تمہارے نہیں۔" تائی اماں نے تیکھے لہجے میں کہا تھا۔

"مجھ سے بہتر کون جانتا ہو گا میرے دل کا حال۔" بلال ان سے بحث پہ اتر آیا۔ ویسے بھی اس کی پسند کا سوال تھا وہ اس بات پہ تو کوئی کمپرومائز نہیں کر سکتا تھا۔

"میں بھی تو سنوں تمہارے دل کا حال۔" تائی اماں کا انداز حد درجہ طنزیہ ہو چکا تھا۔

"میری پہلی اور آخری پسند ہانیہ ہے۔ اس کے علاوہ آپ کسی اور کا سوچیں بھی نہیں۔" وہ مضبوط لہجے میں بول رہا تھا۔ باہر کھڑی ہانیہ کا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ اب جانے تائی اماں کیا کہنے والی تھیں۔ اندر کی خاموشی سے اسے ہول سا اٹھنے لگا۔

"اچھا۔۔۔ یہ بات ہے۔۔۔ شک تو مجھے تھا، خیر۔۔۔ ہانیہ بھی اچھی بچی ہے، لیکن میں اپنی بھانجی پہ اسے ترجیح نہیں دوں گی۔" تائی اماں کی پرسوچ آواز ابھری تھی اور اس کا دل سینے میں کہیں ڈوبا تھا۔

"لیکن کیوں۔" وہ دبی دبی سی آواز میں چیخ اٹھا۔

"بے وقوف ہی رہنا باپ کی طرح ساری عمر۔۔۔ ارے تمہارے بھلے کا ہی فیصلہ ہے یہ۔" انہوں نے جیسے اس کی عقل پہ ماتم کیا تھا۔ ہانیہ کو پتا ہی نہ چلا کب اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ اس نے پلٹنا چاہا، لیکن شاید اس کے قدم پتھر کے ہو چکے تھے۔ وہ بے بسی سے آنسو بہاتی تائی اماں کے نادر فرمودات سننے لگی۔

"کیسے بھلا۔" بلال کی جھنجلائی ہوئی آواز اس کے کانوں میں پڑی تھی۔

"باہر چلا جائے گا۔ تیرے بچوں کا مستقبل بن جائے گا۔۔۔ یہاں کیا رکھا ہے؟" وہ اسے سمجھانے لگیں۔

"آپ کو کیا لگتا ہے اماں کہ میں کینیڈا کی شہریت کا پٹہ گلے میں ڈال کر آپ کی بھانجی کا "ٹوئی" بننے کو تیار ہو جاؤں گا۔" بلال کا اشارہ عرشی کی الجھی ہوئی اور آزاد خیال شخصیت کی طرف تھا۔

"تو کیا ہوا۔۔۔ دودھ دینے والی بھینس کی دو چار لاتیں پڑ بھی جائیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔" ان کا اپنا فلسفہ تھا۔

"آپ ہی کھائیں لاتیں اور پائے۔۔۔ مجھے ہانی کے علاوہ کوئی اور لڑکی قبول ہی نہیں ہے اور اگر آپ نے مجھ سے پوچھے بغیر عرشی کے سلسلے میں کوئی بات کی تو میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔" بلال نے دھمکی دی۔

ہانیہ کے ہاتھوں میں پکڑی چائے کب کے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ دفعتاً دروازہ کھلا تھا اور بلال تیزی سے باہر نکلا۔ اپنے سامنے آنسوؤں کے دریا میں بہتی ہانیہ کو دیکھ کر اس نے اپنے لب بھینچے تھے۔ وہ سب کچھ سن چکی تھی۔ یہ خیال ہی روح فرسا تھا۔ فی الوقت وہ اس کے کسی سوال جواب یا شکوہ بھری نگاہیں سہنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے اسے نرمی سے دھکیلتا اس کے پہلو سے نکلتا چلا گیا۔ ہانیہ کے آنسوؤں میں ایک بار پھر سے روانی آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ہم! کتنا منع کیا تھا میں نے آپ کو کہ مجھے یہاں نہ لائیں۔"

آئی ہیٹ پیپل فرام دا کور آف مائی ہارٹ (مجھے ان لوگوں سے شدید نفرت ہے)۔" یہ عرشی تھی۔ ان کے کمرے میں داخل ہونے کے لیے دروازے کی طرف بڑھتا ان کا ہاتھ رکا تھا۔ وہ عرشی کا انگلش میں کہا گیا جملہ سمجھ نہ سکی تھیں۔

"کم آن عرش! ایک رات ہی کی تو بات ہے اور پھر تمہارے ڈیڈ کی خاص تاکید تھی کہ تمہیں اکیلا بالکل نہ چھوڑوں۔ پچھلی بار یہ غلطی میں کرچکی ہوں اور نتیجہ بھی بھگت لیا۔" وہ اکتاہٹ بھرے انداز میں بولی تھیں۔ جیسے ایک ہی بات سن سن کر عاجز آچکی ہوں۔

"ایسا کیا کردیا تھا میں نے جس کا طعنہ دیتی رہتی ہیں۔ صرف ٹائم پاس کرنے کے لیے اپنے چند دوست ہی تو بلائے تھے۔" عرشی کے لہجے میں محسوس کی جانے والی بدتمیزی کی جھلک تھی۔ نصرت بیگم کو ان ماں بیٹی کی اتنی پرسنل باتیں سننا کچھ مناسب نہیں لگ رہا تھا وہ وہاں سے ہٹ جانا چاہتی تھیں، لیکن کچھ تھا جس نے ان کے پیروں کو باندھ دیا تھا۔

"وہ ہپی ٹائپ کے لڑکے اور لڑکیاں... وہ تو انسان کہلانے کے بھی لائق نہیں اور تم نے انہیں دوست بنا رکھا ہے۔" ان کے لہجے میں ناگواری سی ناگواری تھی۔

"Oh! my love!" (اوہ میرے خدا)... آپ اتنی بیک ورڈ اور ڈومینیٹ کیوں ہیں... میری مرضی جسے چاہے دوست بناؤں..." وہ مزید بدتمیزی پہ اتر آئی تھی۔

نصرت بیگم کے لیے اپنی بھانجی کا یہ روپ نیا تھا۔ ان کے دماغ میں چھم سے ہانیہ کا سراپا لہرایا تھا... مؤدب، حیا والی۔ انہوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے اس ہاٹ پنک ڈریس کو دیکھا جو انہوں نے اپنی ہونے والی بہو کے خیال سے عرشی کے لیے خریدا تھا۔

"بہت بدتمیز ہو تم..." اندر سے انہیں اپنی بہن کی تھکی تھکی سی آواز آئی تھی۔ شاید وہ بھی اپنی منہ زور بیٹی سے ہار مان چکی تھیں۔

"ویسے یہ آپ کی بہن ہیں کن چکروں میں... جب سے آئی ہوں، میرے پیچھے پیچھے پھر رہی ہیں... عرشی بیٹا یہ کھالو... وہ لے لو۔" اس کا انداز سراسر تمسخرانہ تھا... شاید منہ بگاڑ کر اس نے ان کے خلوص کا مذاق بھی اڑایا تھا۔

"ایک ہی چکر ہے آج کل تو جہاں بھی جاؤ... جب سے لوگوں کو ہمارے کینیڈا جانے کا پتا چلا ہے۔ سب اپنے نکمے بیٹوں کو ہاتھوں میں اٹھائے پھرتے ہیں کہ میں کسی کا رشتہ لے لوں... حد ہے لالچ کی اور خود کو گرانے کی۔" اب کی بار وہ بولیں تو ان کے لہجے میں بے پناہ غرور سمایا ہوا تھا۔ نصرت بیگم نے خود سے ہی نظریں چراتے ہوئے اپنے ہاتھوں میں پکڑے سوٹ کو سینے سے لگایا تھا۔ انہیں لگا نوشی نے انہیں کھینچ کر جوتا مارا ہے۔ ان کی آنکھیں یک دم دھندلائی تھیں۔

"ہاہاہا! وہ کیا کہتے ہیں مام! مخمل میں ٹاٹ کا پیوند۔" عرشی کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ نوشی کی دبی دبی ہنسی کی آواز وہ بخوبی سن سکتی تھیں۔ انہوں نے کپڑوں کو کسی متاع حیات کی طرح اپنے سینے سے لگایا اور وہاں سے ہٹ گئیں۔

☆ ☆ ☆

کیسی بوجھل سی صبح اس کی زندگی میں اتری تھی۔ وہ کافی دیر سے اپنے بھاری پپوٹے جو رات بھر رونے کی وجہ سے سوج چکے تھے کھولنے کی کوشش کررہی تھی۔ اس کے ساتھ سوئی ہوئی سب لڑکیاں کب سے اٹھ کر کام دھندوں پہ لگ چکی تھیں... یہ بھی غنیمت تھا کہ ابھی تک کسی نے حسب روایت اسے کھینچ کر بستر سے نہیں نکالا تھا۔ ورنہ وہ اپنی دگرگوں حالت کا کسی کو کیا جواب دیتی۔

"ہانی! بیٹا اٹھ جا اب... دس بج گئے۔" تائی اماں کی آواز اس کے اعصاب پہ کوڑے کی طرح لگی تھی۔ وہ فوراً لحاف کے مزید اندر گھسی تھی۔

"ناراض ہے۔" انہوں نے لحاف اس کے چہرے سے ہٹایا تھا۔ اس نے بے ساختہ آنکھوں پہ ہاتھ دھرا تھا۔

"مجھے پتا ہے تو روتی رہی ہے۔ میری باتیں سن لی تھیں نا۔" اس کا ہاتھ آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے وہ افسردگی سے بولی تھیں۔ ہانیہ کوئی راہ فرار نہ پا کر اٹھ بیٹھی۔

"آپ کو کیسے پتا چلا۔" اسے حیرت ہوئی تھی اور شرمندگی بھی۔ کیا سوچتی ہوں گی کہ میں کن سوئیاں لیتی پھرتی ہوں۔

"بلال نے بتایا ہے۔" وہ اس کے چہرے پہ بکھری لٹیں ہٹانے لگیں۔

"یہ دیکھ، کیا لائی ہوں تیرے لیے۔" انہوں نے اپنے دوسرے ہاتھ میں پکڑا شاپر میں لپٹا وہی سوٹ اس کی طرف بڑھایا تھا۔ ہانیہ کی آنکھوں میں بے پناہ حیرت اتر آئی۔

"لیکن یہ تو۔۔۔" وہ اپنی بات پوری نہ کر سکی۔ کیونکہ تائی اماں اس کی بات کاٹ چکی تھیں۔

"ہاں میری بہو کے لیے۔۔۔ جو تو ہے۔"

"لیکن کل رات تک تو آپ۔۔۔" اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ ایک ہی رات میں کیا انقلاب آگیا۔

"ہاں! وہ رات تھی جو میری عقل کا اجالا کھا گئی تھی۔۔۔ یہ دن ہے روشن، چمک دار۔۔۔" ان کے لہجے میں تیقن تھا۔ ہانیہ نے میکانکی انداز میں سوٹ ان کے ہاتھ سے لے لیا۔

"اپنی تائی اماں کو معاف کر دینا۔۔۔ کبھی کبھی ہم بڑے بہت ہی چھوٹی حرکتیں کر جاتے ہیں۔۔۔" وہ ایک اور گہری بات کر رہی تھیں۔ ہانیہ کے پاس پوچھنے کو کوئی سوال نہ رہا۔

سب سوالوں کے جواب تائی اماں کے اس ایک جملے میں سمائے ہوئے تھے۔ وہ بے اختیار ان کے گلے لگی تھی۔

✡ ✡ ✡

نیچے صحن میں قہقہوں اور خوشیوں کی بہار آئی ہوئی تھی۔ اب سے کچھ دیر پہلے عاقلہ خاتون اور انکل گیلانی ایک پر تکلف دعوت اڑا کر ان کے گھر سے رخصت ہوئے تھے۔ سعد اور شبانہ کی بات پکی ہو چکی تھی۔ صابرہ بیگم کو کوئی نادیدہ بوجھ سا سر سے اترتا محسوس ہوا تھا۔

"اللہ صائمہ کا نصیب بھی کھولے گا۔" وہ نصرت بیگم سے مخاطب ہوئیں جو مزے سے گلاب جامن کھا رہی تھیں۔

"ان شاء اللہ۔۔۔ کیوں نہیں۔" انہوں نے بڑے تیقن سے سر ہلایا تھا۔ ابا اور تایا شطرنج کی بساط بچھا کر بیٹھ گئے تھے۔ شگفتہ، شبنم اور صائمہ سب کی مصروفیت کا فائدہ اٹھاتی، ٹی وی پہ کوئی نئی انڈین مووی دیکھنے میں مگن ہو چکی تھیں۔ ہانیہ اور شبانہ اس وقت چھت پہ موجود نیچے صحن میں جھانک رہی تھیں۔ بلال جانے کہاں تھا۔۔۔ مہمانوں کو رخصت کرنے باہر نکلا تو ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ ہانیہ کی بے چین نظریں اسے تلاش کر رہی تھیں۔

"کیسا لگ رہا ہے تمہیں۔" چھت سے صحن میں جھانکتی ہانیہ نے اپنے ساتھ کھڑی شبانہ سے پوچھا تھا۔

"ظاہر سی بات ہے' اچھا ہی لگ رہا ہے۔" اس نے چہرے پہ خود ساختہ بے نیازی سجائی تھی۔

"گھنی ہو پوری۔" وہ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر ہنس دی تھی۔

"اور تم چھپی رستم۔" شبانہ کا جواب ترنت تھا۔

"وہ کیسے؟" وہ چھت کی منڈیر سے اپنی کمر ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔ شبانہ ہنوز نیچے جھانک رہی تھی۔ جہاں سب اہل خانہ مہمانوں کی لائی گئی مٹھائی سے بھرپور انصاف کرنے میں مصروف تھے۔

"کب سے بلال سے چکر چل رہا تھا تمہارا۔" شبانہ نے اپنی آنکھیں گول گول گھمائی تھیں۔

"بکو مت! بڑوں کا فیصلہ ہے یہ اور مجھے قبول ہے۔" ہانیہ نے اسے مصنوعی آنکھیں دکھائی تھیں۔ شبانہ بے اختیار ہی ہنس دی۔ آج تو خوشی اس کے روم روم سے نکلتی کسی رنگین تتلی کی طرح سارے میں اڑتی پھر رہی تھی۔

"اووووو۔" شبانہ ہونٹوں کو گول کیا۔

"ہیلو لیڈیز۔" دفعتاً انہیں اپنے قریب سے بلال کی آواز آئی تھی۔

"یس لیڈ۔" ہانیہ کی شوخی عروج پر تھی۔ اس کا دل یک دم جھوما تھا۔

"واؤ! تمہیں لیڈی کا مذکر معلوم ہے۔" بلال کے آنکھیں حیرت کے اظہار میں پھیلی تھیں۔

"تو کیا تم نے مجھے اتنا جاہل سمجھ رکھا ہے۔" اس نے بھنویں سکیڑتے ہوئے بلال کو گھورا تھا۔

"میری یہ مجال۔" بلال نے اپنے کانوں کی لوئیں چھو کر کہا۔

"نوٹنکی ہو دونوں پورے۔" شبانہ نے ہنستے ہوئے بلال کے کندھے پہ دھپ لگائی تھی۔

"اب آپ تو نکلیں یہاں سے۔"

بلال نے بے چارگی سے کہتے ہوئے شبانہ کو دھکیلا تھا۔

"مجھے یہ سب اتنا آسان نہیں لگا تھا۔ کل رات بہت پریشان ہو گیا تھا میں۔" بلال نے اس کے پہلو میں کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی یہی لگا کہ ہمارے درمیان شروع ہونے سے پہلے ہی سب ختم ہو گیا۔" ہانیہ دھیرے دھیرے اس سے حکایت دل کہنے لگی۔

"شکر ہے وہ بلا ٹلی۔" ہانیہ نے ناک چڑھا کر کہا تھا۔ اس کا اشارہ عرشی کی طرف تھا جو صبح ہوتے ہی اپنی ماں کے ساتھ وہاں سے جا چکی تھی۔ ویسے وہ ابھی تک اس کے تاثرات کو انجوائے کر رہی تھی۔ جب صبح میں تائی اماں نے ان کے وقت رخصت ہانیہ اور بلال کی متوقع منگنی کا سندیسہ دیا تھا تو دونوں ماں بیٹی کے منہ کتنی دیر تک کھلے ہی رہ گئے۔ صابرہ خاتون بھی جٹھانی کے اس اعلان پہ خوشی سے ساکت سی ہو گئی تھیں۔ ان کا کتنا من تھا کہ ان کی بیٹیوں میں سے کسی ایک کا بلال سے ہو جائے۔ پڑھا لکھا' برسر روزگار..... آنکھ میں حیا کا پانی..... اللہ بڑا کارساز ہے۔ کیسے نصرت بیگم نے ان کا مان رکھا تھا۔ وہ دل ہی دل میں ان کی ممنون تھیں۔

"ہاں' لیکن ایک بلا عمر بھر کے لیے میرے گلے پڑ گئی۔" بلال کے لہجے میں شرارت ناچ رہی تھی۔ ہانیہ نے اس کے کندھے پہ ایک زوردار دھپ لگائی تھی۔

"تم بھی کسی جن سے کم نہیں۔" ہانیہ نے جوابی حملہ کیا تھا۔

"ہاہاہا۔" بلال نے دل کھول کر قہقہہ لگایا تھا۔

"آج کی رات کتنی حسین ہے نا۔" ہانیہ نے دھند سے پاک آسمان پہ جگمگاتے تاروں کو دیکھا تھا اور ایک بے فکری کا سانس ہوا کے سپرد کیا تھا۔

"اور تم اس رات کے دامن میں جگمگاتا چاند۔" وہ اس کے کان میں جھکا فسوں پھونک رہا تھا۔ ہانیہ نے اس کی سرگوشیوں سے تنگ آ کر اسے دونوں ہاتھوں سے پرے دھکیلا تھا۔ وہ دونوں ہنس دیے تھے۔

اور ان کے اوپر تنی رات کی سیاہ چادر میں چاندی کے نگوں کی طرح روشن ستارے بھی مسکرائے تھے۔

✡

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی اس طرح اپنی بھابھی سے بات کرنے کی؟ کبھی دیر کی ہے اٹھنے میں اس نے؟ ناشتا کبھی دیر سے لگایا ہے؟ جس دن سے آئی ہے کسی کام سے جی چرایا ہے؟ پھر آج اگر وہ نہیں اٹھی تو تم اس کی خیریت معلوم کرنے کے بجائے الٹا اس پر نازک مزاجی کا الزام لگا رہی ہو اور یہ تم کو تمیز نہیں سکھائی کسی نے، بڑوں سے اس طرح بات کی جاتی ہے۔۔۔ یا بات کرنا ہی بھول گئی ہو؟ بڑے بھائی کی بیوی سے اس لہجے میں بات کی جاتی ہے؟ چلو نکلو۔ نکلو کمرے سے۔ شکل گم کرو فوراً" اور جاؤ جا کر کچن میں ناشتا بنا کر مجھے یہیں کمرے میں لا کر دو۔" شدید بخار میں تپنے پر بھی شوہر صاحب کو پہلی بار اس طرح اپنی چھوٹی بہن کو ڈانٹتے سن کر میں ہکا بکا رہ گئی تھی۔ زویا کی حالت تو مجھ سے بھی زیادہ خراب تھی۔ اس کے چہرے پر اچانک کئی رنگ آ کر جا رہے تھے اور ہونٹ سوکھ گئے تھے۔ عام حالات ہوتے تو ابھی تک وہ چیخ چیخ کر ساس صاحبہ، دیور، سسر صاحب سب کو بلا چکی ہوتی، مگر آج کچھ اس طرح بڑے بھائی سے ڈانٹ پڑی تھی کہ وہ لاجواب ہو کر دبک سی گئی تھی۔

کل رات ہی تو ولیمہ ہوا ہے، ابھی گھر میں ہزاروں کام ہوں گے۔ مہمان بھی آئے ہوئے ہیں۔ میرا ہونا ضروری تھا۔ زویا کے خاموشی سے کمرے سے نکلتے ہی میں نے ایک بار پھر بستر سے اٹھنے کی پوری کوشش کی۔

"لیٹی رہو۔ خود پر رحم کرو تھوڑا۔ کوئی ضرورت نہیں ہے بستر سے اٹھنے کی۔ آج پورا دن آرام کرو گی سمجھیں تم؟"

شوہر صاحب نے مجھے کندھے سے پکڑ کر واپس لٹاتے ہوئے نرم لہجے میں ہدایات دیں۔ میں یقیناً ایک بہت ہی سہانا خواب دیکھ رہی ہوں۔ میں نے دل میں سوچا اور جلدی سے آنکھیں بند کر لیں کہ کہیں خواب ٹوٹ نہ جائے۔

"کیا ہوا؟ طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے کیا؟"

شوہر صاحب نے مجھے اس طرح اچانک آنکھیں بند کرتے دیکھ کر گھبرا کر میری پیشانی پر ہاتھ پھیرتے پوچھا۔ میں نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔ شوہر صاحب کو غور سے دیکھا۔

"تو کیا واقعی میں اس لمحے۔ اس وقت میں۔ یہ سب کچھ اپنے ساتھ ہی ہوتے دیکھ رہی ہوں؟" خود سے کیا گیا ہمیشہ کا سوال اس بار میرے منہ سے بے اختیار بہ آواز بلند نکل گیا۔ شوہر صاحب میری بات سن کر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"آرام کرو۔ ذہن سے ٹینشن نکال دو ساری۔ فکر نہیں کرو، سکون سے سو جاؤ اب پلیز۔" واقعی مجھے آرام کی ہی ضرورت ہے، کیونکہ اس وقت میرے اردگرد جو کچھ ہو رہا ہے۔ حقیقت اور خواب آپس میں گڈمڈ ہو کر اس قدر پیچیدہ صورت حال اختیار کر چکے ہیں کہ مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔ سر ایک بار پھر سے چکرانے لگا۔ میں نے گہری سانس لے کر سر تکیے پر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ شوہر صاحب کا وجود میرے اردگرد پھیلا ہوا تھا جیسے انہوں نے مجھے اپنے مضبوط حصار میں بہ حفاظت محفوظ کر لیا تھا۔ شادی کے بعد پہلی بار شاید پہلی بار شوہر صاحب اس طرح میرے قریب تھے۔۔۔ کہ باقاعدہ ان کی قربت محسوس ہو رہی تھی۔ بستر پہ میں خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ

دوں اور میں کر بھی کیا سکتی ہوں۔ ہمیشہ ایسا ہی تو کرتی آئی ہوں۔ شادی کے ان تین سالوں میں اور کر بھی کیا سکی ہوں۔ ہاں جب خود کو حالات کے حوالے کرتی تو ایک سوال خود سے ضرور پوچھ لیتی۔

"تو کیا واقعی میں اس لمحے... اس وقت میں... یہ سب کچھ اپنے ساتھ ہی ہوتے دیکھ رہی ہوں؟"

کیونکہ میں خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ تو دیتی تھی، مگر خود پر یقین نہیں کرپاتی تھی۔ کس طرح میں ایک پڑھی لکھی... سمجھ دار... اچھے خاندان اور گھر کی لڑکی ہو کر بھی اس طرح ہار مان لیتی ہوں۔ اس طرح خود کو سمیٹ کر سب کچھ سہ لیتی ہوں۔ اصولاً "تو مجھے اس وقت ایک ہنگامہ کھڑا کر دینا چاہیے۔ یہ سب میرے ساتھ کیوں ہو رہا ہے۔ کیوں ہوا ہے۔ رو رو کر لوگوں کے سامنے ایسے حالات کرنے چاہئیں، تاکہ ان

کو بھی تو بھی احساس ہو کہ میں دکھی ہوں۔ افسردہ ہوں' جب تک اپنا دکھ' اپنی افسردگی کا اعلان' پر چار نہیں کروں گی لوگوں کو کیسے سمجھ میں آئے گا۔ مگر میں تھی کہ ایسا کچھ کرنے کے بجائے خاموشی اور بزدلی سے اپنے آپ میں سمٹ جاتی۔ خود میں گم ہو جاتی۔۔۔ اور خود کو یقین دلاتی کہ یہی صحیح ہے۔ شادی کے بعد عورت پر ہی فرض ہے کہ وہ اپنا گھر بچائے۔ اس کی حفاظت میں اپنا آپ مٹا ڈالے۔۔۔ مجھے یہ تعلیم کسی یونی ورسٹی یا کتاب سے نہیں۔۔۔ اپنی ماں سے ملی تھی اور سب سے زیادہ یہی تعلیم عزیز تھی۔ مگر خود کو مٹانا کیسا جان لیوا ہوتا ہے۔ اس کا احساس مجھے شادی کے بعد ہوا تھا اور جان۔۔۔ جگر۔۔۔ دل سب لے گیا تھا۔ شادی کی پہلی ہی رات شوہر صاحب نے گھونگھٹ اتارنے یا کسی اور قسم کے چونچلے کرنے کے بجائے کھردرے پن سے اپنے گھر والوں کا تعارف کرایا تھا' پھر مجھے تاکید کی تھی کہ کیونکہ ان کی والدہ یعنی میری ساس صاحبہ پڑھی لکھی نہیں تو میں اپنی پڑھائی کا ان پر کبھی بھول کر بھی رعب نہ ڈالوں۔۔۔ اکلوتی نند (زویا) سے اسی لاڈ پیار سے پیش آؤں' جس طرح گھر کے دوسرے پیش آتے ہیں۔ دیور کو پڑھی لکھی بھابھی کا بہت شوق تھا۔ یہ اس کی ہی ضد تھی کہ اس نے شوہر صاحب کے لیے دیکھی گئی اپنے ہی ماموں اور خالہ کی کم پڑھی لکھی کزنز کو شوہر صاحب کے لیے بالکل ناپسند کر دیا تھا اور ضد باندھ لی تھی کہ اس گھر کی پہلی بہو تو کم از کم ماسٹرز ہونی چاہیے۔۔۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اس پڑھائی کو اپنے لیے کوئی تمغہ یا انوکھا پن سمجھ کر سسرال میں نخرے دکھانے لگوں۔ شوہر صاحب اچھا کماتے ہیں' مگر اپنی کمائی میں سے بہت کم حصہ وہ اپنے پاس رکھ کر باقی سب ساس صاحبہ کو تھما دیتے ہیں۔۔۔ میں خرچا شوہر صاحب کے بجائے ساس صاحبہ سے لوں۔۔۔ اپنے میکے آنے جانے سے ہر ممکن گریز کروں۔۔۔ موبائل فون ہو سکے تو بند کر دوں اور اپنی ذاتی مصروفیات کو بھول جاؤں۔

میں خاموشی سے سنتی رہی تھی۔ گھونگھٹ کا بوجھ کیا کم تھا کہ شوہر صاحب نے احکامات کا بوجھ ڈال کر میرا سر بالکل ہی جھکا دیا تھا۔

اور پھر یہ سر جو جھکا تو جھکا ہی رہ گیا تھا۔ میں کر بھی کیا سکتی تھی۔ میکے میں ایک بوڑھی ماں کو چھوڑ کر آئی تھی۔ شادی کی پہلی رات کا ایسا احوال ان کو سنا کر کرتی بھی کیا؟ باقی رہ گئے بھائی' بہن تو وہ سالوں بعد چند دنوں کے لیے پاکستان میری شادی کے بہانے گھومنے پھرنے' مزا کرنے آئے تھے' ان سے اب کون سی انسیت باقی رہی ہے کہ گھنٹوں بیٹھ کر اپنے نئے نویلے شوہر صاحب کے احکامات کا تذکرہ کرتی۔۔۔ میں خود کو ہمیشہ کی طرح حالات کے دھارے پر چھوڑ کر خاموشی سے سمٹ گئی۔۔۔ اور دوسرے ہی دن سے سسرال میں ہر کام میں ساس صاحبہ کا ہاتھ بٹانے لگی۔

شوہر صاحب کے ہر حکم پر مکمل پیرا تھی' مگر کچھ احکامات ایسے تھے جن کے لیے مجھے ان سے بات کرنی پڑی۔ جیسے میں اپنا موبائل بند نہیں کر سکتی' میں نوکری کرتی ہوں۔ جس پوزیشن پر کام کرتی ہوں مجھے موبائل کی اشد ضرورت ہے۔

اپنی بات کی اہمیت جتانے کے لیے میں نے دیور صاحب سے بھی درخواست کر دی کہ وہ ساس صاحبہ کو سمجھائے' آخر وہ میرے ہی آفس میں چھ مہینے انٹرن شپ کر چکا تھا۔ اسے تو میری نوکری اور اس کے تقاضوں کا اندازہ تھا۔ ساس صاحبہ نے دیور صاحب کے سامنے تو کچھ نہ کہا' مگر بعد میں شوہر صاحب نے اکیلے میں۔۔۔ لتاڑنا شروع کر دیا۔

"اب تم میری ہی ماں کے خلاف میرے چھوٹے بھائی کو استعمال کرو گی؟ ہمارے درمیان تفرقہ ڈالو گی؟"

شوہر صاحب کا الزام سن کر میں ہکا بکا رہ گئی۔

"نہیں۔۔۔ میں نے ایسا کچھ نہیں سوچا۔۔۔ میں تو صرف۔۔۔ اس لیے کہ آپ کی والدہ کو اندازہ نہیں' آفس میں' میں کیا کرتی ہوں۔۔۔ نوکری کے کیا تقاضے ہیں' اس لیے سوچا کہ ذیشان اگر کہے گا تو ان کو میری بات زیادہ بہتر سمجھ آجائے گی۔۔۔ میرا مقصد۔۔۔"

"اماں صحیح کہہ رہی تھیں۔۔۔ تم ان کی جہالت یاد دلا

رہی ہو؟ یہ جتا رہی ہو کہ وہ اس قدر بے وقوف ہیں' جان ہی نہیں سکتیں کہ نوکری کی کیا ڈیمانڈ نہ ہوتی ہیں۔۔۔ کیوں؟؟"

شوہر صاحب میری بات کاٹ کر بھڑکتے ہوئے گویا ہوئے۔ میں جز بز ہو کر رہ گئی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس وقت شوہر صاحب اپنی زبان بول رہے ہیں یا ساس صاحبہ کی۔۔۔ اپنے دماغ سے سوچ رہے ہیں یا ساس صاحبہ کے۔۔۔ کیونکہ اگر شوہر صاحب اپنے دماغ کو کام میں لا رہے ہوتے تو ان کو یہ بات بہ آسانی سمجھ جانی چاہیے تھی کہ میرے لیے موبائل فون محض ایک شوق نہیں' نوکری کی ضرورت ہے۔۔۔ اور ایسے میں جبکہ شوہر صاحب اپنا دماغ کہیں کھوئے بیٹھے ہیں' میں دنیا کے تمام الفاظ جمع کر کے بھی ان کو سمجھا نہیں سکتی تھی۔ میں نے زیر لب خود سے سوال دہرایا۔

"کیا واقعی یہ سب کچھ میرے ساتھ ہی ہو رہا ہے؟؟"

میں نے شوہر صاحب کے تمام الزامات کو بہت خندہ پیشانی سے سنا۔۔۔ اور اسی وقت جا کر ساس صاحبہ سے معافی مانگ لی۔۔۔ میں بات نپٹا دینا چاہتی تھی۔ طول دے کر اپنی معصومیت کو جتانے کا یہاں کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جہاں آپ کی بات کو سمجھا ہی نہ جائے یا سمجھنے کی کوشش بھی نہ کی جائے وہاں زبان کھولنے کا بھی کیا فائدہ۔۔۔ بس خاموشی بہتر ہے۔

"آپ سب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔۔۔ میں ہی غلط ہوں۔ میں ہی خطاکار ہوں۔۔۔ برائے مہربانی مجھے معاف کر دیجیے۔"

مگر شاید خود کو سمیٹ لینے سے۔۔۔ خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دینے سے فائدہ نہیں' نقصان ہوتا ہے۔ کم از کم مجھے اپنے لیے یہی لگا کہ میں جس قدر درگزر کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کرتی اسی قدر میری پکڑ ہو جاتی۔ نوکری چھوڑ دینے کا سوچتی۔۔۔ مگر بات کس سے کرتی۔۔۔ شوہر صاحب میرے لیے اپنا دل تو کیا دماغ تک بند کیے بیٹھے تھے۔ پھر سوچتی کہ اگر ان

لوگوں کو میری نوکری سے مسئلہ ہوتا تو شادی کی پہلی ہی رات احکامات میں یہ حکم بھی آجاتا۔

حالات کا دائرہ میرے اردگرد تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ فجر سے دن شروع ہوتا اور رات گئے جا کر سونا نصیب ہوتا۔ صبح کا ناشتا میرے ذمہ تھا۔ ایک ساتھ سب بیٹھ کر ناشتا کرتے نہیں تھے۔ ناشتا بنا کر میز پر لگا دیتی تو "ٹھنڈا ناشتا دیا۔ آج یہ نہیں کھانا تھا" مگر پروا کون کرے۔ بس اپنا بوجھ اتار پھینکوں۔" جیسے طعنے سنتی۔ لہٰذا نماز پڑھ کر لاؤنج میں ہی بیٹھی رہتی۔ ایک کے بعد ایک ناشتے کی میز پر آتا۔ کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے بیرے کی طرح ناشتے کی فرمائش لیتی' پھر پورا کرتی۔

شوہر صاحب اور ساس صاحبہ ایک ساتھ ناشتا کرتے تھے۔ شروع کے چند دن میں نے ساتھ دینے کی کوشش کی تو "ایک ناشتا بھی بیٹے کو اکیلے ماں کے ساتھ کرنے نہیں دیتی۔" جیسا طعنہ سن کر میں نے اپنا ناشتا الگ کر لیا۔

آفس سے واپس آکر اکثر کوئی نہ کوئی سسرالی رشتہ دار آیا ہوا ہوتا تو اس کو ناشتا پانی کرواتا۔۔۔ نہیں تو کسی اور کام میں لگے' رہ کر رات کا کھانا بنانا۔۔۔ میز پر لگا کر اٹھانا۔۔۔ کھانے کے بعد سب کے لیے چائے پانی کرنا۔۔۔ رات گئے کچن سمیٹ کر آخر کار اپنے کمرے کی راہ لیتی۔۔۔ اور ایسی بے سدھ سو جاتی کہ صبح فجر پر ہی ہوش میں آتی۔

چھٹی کے دن ساس صاحبہ کسی نہ کسی رشتہ دار کی دعوت کا اہتمام رکھتیں۔۔۔ یہ نہیں تو میں خود گھر کی اچھے طریقے سے صفائی ستھرائی میں لگتی۔ ہفتے بھر کے شوہر صاحب اور اپنے کپڑوں کی دھلائی استری کرتی۔

اتفاق سے شادی کے فوراً" بعد امی کو بڑے بھائی نے اپنے پاس کینیڈا بلا لیا تھا۔ وہ بے چاری وقت سے بے نیاز اکثر رات گئے فون کرتیں' جب میں اس قدر نیند میں دھت ہوتی کہ چند ایک منٹ بات کر کے بند کر دیتی۔ کام کرنے کی عادت تو ہمیں بچپن سے امی نے ڈالی تھی۔ بلکہ امی تو ڈٹ کر ہم تینوں بہنوں سے کام لیتی تھیں۔ مگر احساس بھی برقرار تھا۔ انسان کے درجے پر

فائز رکھا گیا تھا۔ جو کبھی بیمار ہو سکتا ہے۔ کبھی اس کا دل نہیں چاہ رہا ہوتا ہے۔ کبھی اس سے کسی کام میں کوتاہی۔۔۔ غلطی ہو سکتی ہے۔ مگر سسرال میں اس طرح کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

میری غلطیوں کو میری چالاکی کہا جاتا۔ میری بیماری کو سستی کاہلی اور آرام طلبی کہا جاتا اور سب کچھ کہہ سن کر بھی کام پورا لیا جاتا۔ اس پر شوہر صاحب کی لاتعلقی۔۔۔ بے رخی نے ایک الگ قسم کے دکھ میں مبتلا کر دیا تھا۔ مجھے رہ رہ کر اپنی واجبی شکل کا خیال آتا۔ صحیح ہی ہے میری شادی، تو بس میری تعلیم اور شاید نوکری کی وجہ سے ہو گئی، ورنہ کہاں میں، کہاں شوہر صاحب جیسا اسمارٹ ہینڈسم انسان۔۔۔ میں تو خواب میں بھی ان سے شادی کا سوچ نہیں سکتی تھی۔

وہ تو بھلا ہو دیور صاحب کا جو میرے آفس میں چھ مہینے کی انٹرن شپ پر آئے تو اتفاق سے میرے ہی زیر اختیار آ گئے۔ اکثر ہی ہمارے آفس میں نئے گریجویٹس کے تربیتی پروگرام رکھے جاتے تھے۔۔۔ اور میں اپنے ڈپارٹمنٹ میں سب سے اعلا درجے پر فائز ہونے پر تربیت کا پورا پروگرام بنایا کرتی تھی۔ دیور صاحب ایک خوش مزاج۔۔۔ کھلنڈرے اور خوش اخلاق سے لڑکے کے طور پر سامنے آئے تھے۔ ذہانت میں بھی سب سے بڑھ کر تھے۔

دو چار بار ان کو سمجھایا اور انہوں نے اچھا کام کر دکھایا تو میرے دل میں ان کے لیے جگہ بن گئی۔ ان کو میری پتا نہیں کیا بات بھا گئی تھی کہ مجھ سے اپنی ذاتی۔۔۔ گھر کی باتیں بھی کرنے لگے۔ ویسے بھی مجھ سے عمر میں کافی چھوٹے تھے۔ لہٰذا میں نے چھوٹا بھائی بنا لیا تھا۔

باتوں باتوں میں میرے بارے میں تمام معلومات لے کر انہوں نے ایک دن مجھے اپنے بڑے بھائی کے بارے میں بتایا کہ ان کے لیے رشتہ بڑے زور و شور سے دیکھا جا رہا ہے اور وہ میری اجازت سے اپنے گھر والوں کو بھیجنا چاہ رہے ہیں۔

رشتے تو امی بھی میرے تلاش کر رہی تھیں، مگر اس طرح کا کوئی قدم میری طرف سے کبھی نہیں اٹھایا گیا تھا۔ مجھے تھوڑا احتمال ہوا، کہیں امی یا کوئی بھائی بہن یہ نہ سمجھ لے کہ میں یہ سب پسند سے کر رہی ہوں، مگر دیور صاحب بضد رہے۔

بہرحال وہ لوگ میرے گھر آ گئے۔ ایک دو ملاقات کے بعد مجھے پسند کر لیا گیا۔ مگر اس وقت تک مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ شوہر صاحب کی والدہ اپنی بہن کی بیٹی بیاہ کر لانے پر تیار بیٹھی تھیں۔ مگر دیور صاحب اور سسر صاحب کو ضد تھی کہ گھر میں پڑھی لکھی بہو آئے گی۔ وجہ شاید یہی تھی کہ ساس صاحبہ اپنے ان پڑھ رویے کے باعث کافی مشکلات پیدا کرتی رہتی تھیں۔

ساس صاحبہ کے ساتھ چند دن گزار کر ہی مجھے اندازہ ہوا تھا کہ ان پڑھ اور جہالت میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اس پر ستم یہ کہ وہ سمجھنا بھی نہیں چاہتی تھیں۔ اپنے شوہر اور چھوٹے بیٹے کی ضد مان کر انہوں نے اپنے بڑے بیٹے کو شادی کے شروع دن سے ہی جتانا شروع کر دیا تھا کہ کہیں ان کی پڑھی لکھی بیوی، ماں کی بے عزتی نہ کرے۔۔۔ اور شوہر صاحب والدہ کا دل رکھنے کے لیے اپنا دل و دماغ سب بیچ کر بیٹھے تھے۔

میں ہر ممکن کوشش کر رہی تھی کہ کسی کو کوئی شکایت نہ ہو اور اسی وجہ سے میں نے اپنی تنخواہ بھی آدھی سے زیادہ ساس صاحبہ کو دینی شروع کر دی تھی۔ جو بچاتی، اس سے کبھی دیور صاحب یا نند کو کچھ دلا دیتی۔ کبھی گھر کے لیے کچھ سامان وغیرہ لے آتی۔ خود پر خرچ کرنے کا نہ شادی سے پہلے شوق تھا، نہ ہی بعد میں ہوا۔ پھر بھی تشنگی تھی کہ چین لینے نہ دیتی تھی۔ کتنا مشکل ہے اس دنیا میں لوگوں کو خوش کرنا۔۔۔ خاص طور سے سسرال والوں کو۔۔۔ میں خود کو دلاسے دیتی۔۔۔ خود کو سمجھاتی۔ دکھ درد اپنے ہی دل میں چھپائے رکھتی۔ مگر پھر بھی میرے چہرے سے سب کچھ عیاں ہونے لگا تھا۔

صحت گر گئی تھی اور اکثر ہی سردرد، مائیگرین کے شدید دورے پڑنے لگے تھے۔ مگر میں اپنا خیال رکھنے پر بھی مجبور تھی کیونکہ ایسے بیمار ہونے پر کام میں کوئی

کمی نہ ہوتی تھی' بلکہ بیماری میں کام کرنے سے خود کے لیے ہی مشکلات بڑھ جاتی تھیں۔ ان تین سالوں میں زویا کی شادی بھی ہوئی اور شادی کے دوران اور شادی کے بعد اس کے سسرال سے آنے جانے پر گھر میں جو اہتمام اور انتظام ہوتا ان سب کے لیے مجھے ہی وقت دینا پڑتا۔

میں زویا کے آنے پر خوش ہونا چاہتی تھی' جیسے ایک چھوٹی بہن کے شادی کے بعد گھر آنے پر ہوتا چاہیے۔ مگر اس کے آنے پر پہلے تو میں ڈٹ کر کام کرتی' پھر ساس صاحبہ اس سے جو میری شکایتیں کرتیں' وہ بھی صبر سے سنتی۔

اب تو زویا نے بھی مجھ سے باقاعدہ بدتمیزی کرنی شروع کردی تھی' وہ ادھر ساس صاحبہ سے سنتی' ادھر مجھے سناتی۔

زندگی مشکل سے مشکل ہوتی جارہی تھی۔ پہلی ہی بار موبائل فون کے لیے جو دیور صاحب کی بددلی تھی اور جو ہنگامہ سا تھا۔ دوبارہ ہمت نہیں ہوئی تھی کہ ان سے کچھ کہتی۔ ویسے بھی اب وہ اپنی نوکری اور پھر دوستی یاری میں مصروف رہتے تھے۔

زویا کی شادی کے چند مہینوں بعد دیور صاحب کے لیے لڑکی کی تلاش شروع ہوئی۔ اب ایک اور مشکل... مجھے دیکھے جانے والی کسی بھی لڑکی کے گھر تو نہ لے جایا جاتا' مگر ان لوگوں کے گھر آنے پر تمام انتظام مجھ پر ڈال دیا جاتا۔ اس کے بعد دن اور وقت بھی نہ دیکھا جاتا۔ اکثر آفس کے دوران ہی ساس صاحبہ فون کرکے حکم سنا دیتیں کہ جلدی آجاؤں مہمان آرہے ہیں اور تمام انتظام کرنا ہے۔

ان سے یہ کہنا ہی بے کار تھا کہ ابھی چند مہینوں پہلے میں نے زویا کی خاطر کافی چھٹیاں لی ہیں۔ آفس سے کئی بار جلدی آئی ہوں۔ کئی بار دیر سے گئی ہوں کہ اب اس طرح کی درخواست دیتے ہوئے مجھے خود ہی شرمندگی ہوتی ہے۔ بہر حال مرتا کیا نہ کرتا... یہ سب تو کرنا ہی تھا۔ دیور صاحب ویسے ہی لاڈلے اور اپنی مرضی کے مالک تھے۔ انہوں نے والدہ کو پہلے ہی اپنی پسند بتادی کہ کس قسم کی لڑکی تلاش کی جائے۔ جس میں تعلیم سرفہرست تھی۔

ساس صاحبہ نے چند ایک بار ان کو میری مثال دے کر ڈرانا چاہا' مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ایک بار پھر سے ساس صاحبہ اپنی بہن یا بھائی کی بیٹی لانے سے محروم رہ گئی تھیں اور نہایت غضب ناک انداز میں سارا غصہ مجھ پر ہی اتارتی تھیں۔ ساتھ دینے کے لیے زویا بھی آموجود ہوتی۔ مشکلوں سے ایک لڑکی پسند کرلی گئی اور شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ دیورانی صاحبہ نے دیور صاحب سے فون پر بات چیت شروع کردی تھی۔ ساس صاحبہ کے ان کے گھر جانے سے پہلے یا ان لوگوں کے ہمارے گھر آنے سے پہلے ہی دیور صاحب کو تمام تر ہدایات مل جاتیں اور دیور صاحب بذات خود ساس صاحبہ کے سر پر کھڑے ہوکر تمام کام اپنی ہونے والی بیوی کے حسب منشا کرواتے... ساس صاحبہ ان کو تو کچھ نہ کہہ پاتیں۔ مجھ پر اپنا غصہ اتارتیں اور شوہر صاحب کو اپنا دکھڑا سناتیں... مگر ان دکھڑوں کے سنانے میں وہ یہ یکسر بھلا بیٹھی تھیں کہ شوہر صاحب ان کے دکھڑوں کو سن کر جیسے سوچ میں پڑ جاتے تھے۔

"یار! تم اماں کی ہر بات کو اس طرح رد کردیتے ہو... ان کو دکھ ہوتا ہے۔ اب یہ بری میں دیے جانے والے کپڑوں کے رنگ میں بھی تم اپنی مرضی لگا رہے ہو' یہ تو عورتوں کا کام ہے۔ کرنے دو اماں اور... زویا کو... آخر کو میرے لیے بھی سب ان لوگوں نے ہی پسند کیا تھا؟"

ایک دن شوہر صاحب نے ناشتے کی میز پر دیور صاحب کو اکیلا دیکھ کر سمجھانے کی کوشش کی... میں چھٹی پر تھی کہ آج دیور صاحب کے سسرال والوں کو آنا تھا اور اس سلسلے میں ناشتے کے فوراً" بعد سے مجھے کھانے کا انتظام کرنا تھا... اور دونوں کو ناشتا دے کر اپنی چائے لیے ان کے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ دیور صاحب نے پہلے اپنے بھائی کو دیکھا' پھر مجھے... چائے کا گھونٹ بھرا... پھر مجھے دیکھا... پھر بھائی کو سخت

نظروں سے دیکھتے گویا ہوئے۔

"بھابھی کی حالت پر غور کیا ہے کبھی... نہیں نا؟ مانا کہ ماں کا بڑا درجہ ہے مگر بیوی بھی انسان ہوتی ہے۔ شوہر کی ذمہ داری ہوتی ہے اور اس کی بھی پکڑ ہوتی ہے۔ اگر آپ سمجھیں تو... میں بس اپنی ذمہ داری نبھا رہا ہوں۔ اماں کا درجہ کم نہیں کر رہا۔"

میرے تو ہاتھ سے چائے کا کپ چھوٹتے بچا تھا اور شوہر صاحب پر بھی کافی گہرا اثر ہوا تھا' وہ ناشتا چھوڑ کر اٹھ گئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے کبھی ساس صاحبہ کے دکھڑوں پر دیور صاحب سے بات کرنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ بلکہ اکثر وہ اپنی والدہ کو سمجھا بجھا کر ان کا موڈ بحال کرنے میں لگے رہتے۔ اچانک تو نہیں' مگر مجھے محسوس ہوا تھا کہ شوہر صاحب غیر محسوس طریقے سے مجھ پر' میری عادات پر... اٹھنے بیٹھنے پر غور کرنے لگے تھے۔

پہلے کبھی وہ مجھے سنگھار میز کے سامنے بیٹھے تیاری کرتے نہیں دیکھتے تھے۔ نہ ہی کسی محفل میں میرے ساتھ ہی براجمان ہوتے تھے۔ اب تو یوں بھی ہونے لگا تھا اور تو اور تصاویر بنتے وقت وہ خود سے ہی میرے برابر میں آکر کھڑے ہو جاتے۔ میں جانتی تھی کہ یہ سب بہت معمولی باتیں تھیں' مگر کیونکہ آج تک شوہر صاحب کی طرف سے ایسا کچھ نہیں ہوا تھا اور اب جب ہونے لگا تھا تو مجھے اور بے چین کر گیا تھا۔ پتا نہیں ساس صاحبہ کیا کہیں... کیا کریں... مگر شکر ہے ان دنوں وہ دیور صاحب اور ان کی ہونے والی بیوی کے سلسلے میں ایسا پھنسی ہوئی تھیں کہ ہم دونوں پر توجہ نہیں دے سکی تھیں۔

شادی کی رات گھر آکر تمام رسموں اور لوازمات سے فارغ ہوتے ہی چائے کا دور چل رہا تھا' پھر مہمان بھی موجود تھے۔ لہٰذا میں ویسے ہی کچن اور تمام کمروں میں بھاگ دوڑ کر رہی تھی۔ دیکھا کہ ساس صاحبہ کے کمرے میں شوہر صاحب... زویا اور دیور صاحب بیٹھے ہیں... اور دیور صاحب زور و شور سے اپنی والدہ کو سنا رہے ہیں۔ اس طرح یہ سب اکیلے بیٹھے تو مجھے اجازت نہیں تھی کہ کمرے میں جاؤں۔ لہٰذا میں دروازے سے ہی چائے کی ٹرے تھما کر اپنے باقی کے کام نپٹانے لگی۔

رات گئے اپنے کمرے تک آتے آتے تھکن سے اس قدر طبیعت بوجھل تھی کہ بے سدھ سو گئی۔ شوہر صاحب کب کمرے میں آئے مجھے کچھ خبر نہیں ہوئی۔

دوسرے دن ولیمہ کی تیاری اور اپنی دیورانی کے ناشتے پانی کے دوران معلوم ہوا تھا کہ دیور صاحب اپنی بیگم کو لے کر دو ہفتوں کے لیے ہنی مون پر جا رہے ہیں اور ساس صاحبہ کا موڈ اس بات پر کافی خراب ہے۔ مگر دیور صاحب نے اس بار اپنی ماں اور بہن کے سامنے بھی اپنے بڑے بھائی کی بدرنگ اور بوجھل ازدواجی زندگی کو نشانہ بنا کر جواز پیش کیا تھا کہ وہ جو بھی کر رہے ہیں اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے کر رہے ہیں اور یہ ان کو حق ہے۔ ان کی نئی نئی بیوی ہے' بیوی کو خوشی دیں گے تو وہ ساری زندگی انہیں عزت دے گی۔

میں جانتی تھی کہ ساس صاحبہ کچھ نہ کر سکی ہوں گی... گھر کے ہزاروں کام تھے۔ لہٰذا میں مصروف ہوئی تو وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ ولیمہ کے دوران ہال میں ادھر ادھر بھاگتے دوڑتے مجھے اچانک مائیگرین کا درد اٹھا اور مجھے خود پر قابو کرنا مشکل لگنے لگا۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح خود کو لگائے رکھا۔ کھانے کے وقت میں ہال کے بالکل آخر میں ایک خالی میز دیکھ کر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا؟"

شوہر صاحب کو اچانک اپنے اس قدر پاس دیکھ کر مجھے یہی خیال آیا کہ شاید میری کہیں ضرورت پڑ گئی ہے۔ میں گھبرا کر کھڑی ہوئی اور پھر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ شوہر صاحب اور قریب آگئے۔ انہوں نے زندگی میں پہلی بار محفل میں موجود لوگوں کی پروا نہ کرتے ہوئے میری پیشانی چھوئی۔

"اوہ ہو... تمہیں تو بہت تیز بخار ہو رہا ہے۔ اسی لیے چہرہ اترا ہوا لگ رہا ہے تمہارا۔" شوہر صاحب نے نرمی سے کہا۔

"ہیں جی؟"

میں تو حیران ہی نہیں پریشان بھی ہو گئی۔ طبیعت تو میری خراب ہے 'ان کو کیا ہوا؟' میں ابھی شوہر صاحب کی اس اچانک تبدیلی پر غور کر رہی تھی کہ وہ مجھے باقاعدہ سہارا دے کے اٹھا کر گھر کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ میں نے دبے لفظوں میں ساس صاحبہ کی ناراضی کا بتایا۔

"میں سمجھا دوں گا امی کو، تم فکر نہ کرو۔"

کہہ کر شوہر صاحب نے مجھے دلاسا دے دیا۔ میں ویسے بھی بہتر یہی سمجھ رہی تھی کہ گھر چلی جاؤں 'بلاوجہ میں ہال میں کہیں گر جاتی یا بے ہوش ہو جاتی تو لینے کے دینے پڑ جاتے۔

گھر آتے ہوئے راستے سے ہی شوہر صاحب نے میرے لیے طے شدہ مائیگرین کی دوائی بھی لے لی اور گھر آتے کے ساتھ ہی مجھے کپڑے بدل کر سکون سے لیٹ جانے کو کہا۔ دودھ کے ساتھ دوائی دی۔ میں تو پورے جسم سے کانپ رہی تھی۔

پتا نہیں یہ بخار کی شدت تھی یا پھر شوہر صاحب کی اس قدر مہربانی وجہ تھی۔ بہرحال میں جلدی ہی سو گئی۔ رات میں کچھ شور ہنگامے سے آنکھ کھلی تھی۔ مگر شوہر صاحب جو کمرے میں ہی موجود تھے 'مجھے سکون سے سو جانے کی سختی سے ہدایات کرنے لگے۔

دوسری صبح ہمیشہ کی طرح میں ناشتا بنانے کے لیے جب کچن میں نہ پہنچی تو زویا غصے میں بلانے آگئی۔ مگر پھر شوہر صاحب نے الٹا اس کی اچھی خاصی تواضع کر کے اسے چلتا کر دیا۔ مجھے کبھی نیند آجاتی 'کبھی جاگ جاتی۔۔۔ اور ہر بار شوہر صاحب کو اپنی طرف متوجہ دیکھتی۔ اور سمجھ نہیں پاتی کہ آنکھیں حقیقت میں کھول چکی ہوں یا ابھی بھی خواب میں جاگی ہوئی ہوں۔ شوہر ایک دوبار باہر نکلے۔ ایک بار میرے لیے تھوڑا سا ناشتا لے کر آئے۔۔۔ پھر سوپ۔۔۔

رات تک مجھے کافی بہتر لگنے لگا۔ پھر بھی مجھے بستر سے اترنے کی اجازت نہیں ملی۔ میں اب بستر پر تکیے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی اور شوہر صاحب ہلکی آواز میں ٹی وی دیکھ رہے تھے۔

کمرے میں ہلکی دستک دے کر دیور اور دیورانی چلے آئے۔ سلام دعا ہوئی 'میرا حال احوال پوچھا گیا۔ دیورانی مجھ سے عزت سے پیش آئی۔ گو مجھے یقین نہیں تھا 'کیونکہ ساس صاحبہ کو اکثر میرے اوپر طنز کرتے یا میری برائی کرتے اس کے گھر والے سن چکے تھے۔ بہت ممکن تھا کہ دیور صاحب نے ہی اسے ہدایت دی ہو۔ ان لوگوں نے اپنے ہنی مون کے لیے کل نکلنے کا بتایا اور یہ کہ وہ لوگ خدا حافظ کہنے آئے ہیں کہ دوسری صبح وہ جلدی نکل جائیں گے۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی بات کر کے وہ دونوں جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ شوہر صاحب بھی ان دونوں کے قریب کھڑے ہو کر ان دونوں کو دعائیں دینے لگے۔ اچانک دیورانی شرارت سے چہکی۔

"بھائی جان۔۔۔ آپ اپنے چھوٹے بھائی کو بھی سمجھائیں کہ اپنی بیوی کا اس طرح احساس کرنا چاہیے جیسے آپ بھابھی کا کرتے ہیں۔"

اپنی بیوی کی شرارت بھری بات سن کر میری طرف دیکھتے ہوئے دیور صاحب ہنس پڑے۔

"تو اور کیا۔۔۔ خوش نصیب ہوں میں کہ ایسا بھائی ملا ہے۔ اس قدر احساس کرنا ان سے ہی تو سیکھا ہے۔ تم فکر ہی نہ کرو۔ میری ٹریننگ مکمل ہے۔"

❁

Downloaded From Paksociety.com
فرزانہ کھرل
کہاں اس کا ذکرِ سفر
مکمل ناول
WWW.PAKSOCIETY.COM

"ایک سیلانی سا پنچھی جانے کیسے راستہ بھول کر کوہ قاف جا پہنچا۔ وہاں ایک بہت ہی خوب صورت پری اسے بھا گئی۔"

سفیر بے ارادہ ہی دروازے کے پاس ٹھہرا۔ وہ یقیناً "موی کو کہانی سنا رہی تھی"۔ وہ چپکے چپکے اسے دیکھتا رہتا۔ یوں ہی کئی برس بیت گئے۔" غیر ارادی طور پر کہانی سننے والے شخص کے ہونٹوں پہ بے ارادہ مسکراہٹ رینگی۔

"ایک دن وہ پنچھی ایک ظالم جن کی نظر میں آ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ جن اس کی گردن مروڑ دیتا' وہ پری اس پنچھی کو واپس جنگل میں چھوڑ گئی۔ ہاں مگر جنگل سے جاتے جاتے وہ اسے پتھر کا بنا کر گئی تھی۔"

"کیوں پھپھو؟" موی نے پری کی زیادتی پہ بے ساختہ ٹوکا۔ اسے اپنا یوں کھڑے رہنا غیر مناسب سا لگا تو قدموں نے دہلیز پار کی۔

"کیوں کہ وہ حسین پری اسے ہمیشہ زندہ دیکھنا چاہتی تھی۔" اس نے موی کو کروٹ کے بل کر کے تھپکا۔

"ایک تو اس بچی کو ہزار کہانیاں سنا لو' مجال ہے جو اسے نیند آ جائے۔" وانیہ نے منہ پہ ہاتھ رکھ کے جمائی روکی۔

"تو کیا اب وہ ہمیشہ پتھر کا رہے گا؟ وہ کبھی اڑ نہیں سکے گا؟" سوال در سوال۔۔۔

وہ جھنجلائی۔ "اگر وہ بے چاری پری ایسا نہ کرتی تو وہ بے وقوف پنچھی پھر کوہ قاف چلا جاتا اور جن کے ہاتھوں مارا جاتا۔ اب کہانی ختم۔۔۔ چلو سو جاؤ۔ میری استانی!"

اس نے ہنستے ہوئے کروٹ بدلی اور اسے اندر آتے دیکھ کر وہ فوراً "سیدھی ہوئی۔ تب ہی موی کی نظر بھی سفیر پر پڑی۔

"بھلا بتائیں چاچو! ابھی تو وہ پتھر کا ہی تھا اور کہانی ختم ہو گئی۔" موی نے منہ بسور کے شکوہ کیا۔

"ہاں کوئی پتھر کا ہی رہتا ہے اور کہانی ختم ہو جاتی ہے۔" ان گہری سرد آنکھوں نے کہانی کار سے خاموشی کی زبان میں تائید چاہی تھی۔

"اور انہوں نے یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ پنچھی طوطا تھا۔ کبوتر تھا کہ چڑیا۔"

اور وانیہ جو مومی کی تکرار سے عاجز ہو رہی تھی ایک دم ہی منہ پہ ہاتھ رکھ کے ہنس دی پھر جوتے کی تلاش میں نگاہ ادھر ادھر دوڑائی۔ مومی بھاگ کے سفیر کی گود میں چڑھی جو قریبی صوفے پہ بیٹھ چکا تھا۔

"تم زیادہ دکھی مت ہو۔ جب بھی پری کا دوبارہ اس جنگل سے گزر ہو گا تو وہ اس پنچھی کو بلکہ پاگل پنچھی کو پھر سے اڑنا سکھا دے گی۔" وہ سات سالہ بھتیجی کو ڈانٹتی وضاحت کرتی چپل اڑس کر کپڑے درست کرتے ہوئے کھڑی ہوئی۔

"چاچو! ان سے پوچھیں تو سہی کہ وہ پری دوبارہ جنگل میں کب آئے گی۔" مومی کو یہی فکر ستا رہی تھی۔

وہ جو رخ پھیرے بوا کا بستر درست کر رہی تھی۔ اس نے پلٹ کے مومی پہ کڑی نظر ڈالی مگر نظر بھٹک کر پھسل کر اس سے ٹکرائی جو محظوظ سا ہو کے زیر لب مسکرا رہا تھا۔ وہ فوراً رخ پھیر گئی۔

"میری کٹی۔ آپ سے کوئی کہانی نہیں سنوں گی۔ آپ کبھی مکمل نہیں کرتیں۔" سرگوشی میں ڈھلی اس نرم آواز نے وانیہ کا وجود مٹھی میں لیا کیونکہ جملے کا آخری حصہ مومی کے لبوں سے ادا نہیں ہوا تھا جو ذو معنی تھا جو بھر بھرا سا سرکتا ہوا سا تھا۔ تب ہی بوا اندر آئیں ان کے ہاتھ میں جائے نماز تھی۔ بڑی راتوں میں بھی وہ عشاء کی نماز برآمدے میں ادا کرتی تھیں۔

وہ نگاہ جھکائے لاؤنج سے ملحق چھوٹے سے کچن کی جانب بڑھی۔

"بوا کے لیے چائے بنائیں تو ایک کپ میرے لیے بھی۔" عقب سے اس کی بھاری اور سنجیدہ آواز ابھری۔

"کھانا نہیں کھائیں گے؟" بے ساختہ رک کے پوچھا۔ یہ وانیہ کے معمول میں شامل تھا۔

"نہیں۔۔۔!" یک لفظی جواب کچھ ٹھہر کر دیا گیا۔

"کیوں نہیں کھاؤ گے؟" بوا نے اس کی گود سے اونگھتی مومی کو اٹھا کر فکر مندی سے پوچھا۔

"آج چائے کچھ زیادہ ہی پی چکا ہوں۔" اس نے تھکاوٹ بھری انگڑائی لی۔

"تو اب مت پیو بلکہ دودھ کا گلاس پی کر سو جاؤ۔" بوا نے قریب بیٹھتے ہوئے نرمی سے اس کا ہاتھ تھاما۔

"خاندان کے سب لڑکے کاروبار پہ عیش کر رہے ہیں۔ گئے تو گئے نہیں تو لمبی تان کر موج کی کہ چلو آج در کر سنبھال لیں گے۔ پتا نہیں ایک تمہیں یہ خوار کرنے والی پولیس کی نوکری کی کیوں سوجھی' دن رات خود کو ہلکان کیا ہوا ہے۔"

وہ تمام باتوں کے باوجود آنکھیں موندے بس مسکرائے گیا۔ "آپ جانتی تو ہیں' میں ذرا مہم جو سا ہوں۔" وہ بوا کے سنہری رخساروں پہ نظر ٹکا کر دھیرے سے گویا ہوا۔

"کچھ لوگوں کے ساتھ تقدیر ہمیشہ بے رحمی سے کیوں کام لیتی ہے۔" وہ آہ بھر کر رہ گیا۔

وانیہ نے چائے کا کپ سامنے رکھا۔ وہ سیدھا ہوا اور کپ اٹھایا۔ "کیوں جاگتے ہو؟" اڑتی بھاپ چہرے کو چھو کے دوست ہوئی۔ راز جاننا چاہا۔

"اسے پتا ہے میں کیوں سو نہیں پاتا' وہ خود پوچھے۔" وہ وہاں تک دیکھتا ہی رہ گیا جہاں سے کوئی گزرا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اس قدر شاپنگ کس خوشی میں کی گئی ہے؟" وہ کل بھی اسپتال سے آیا تو یہاں شاپرز کا انبار تھا۔ آج پھر سامنے وہی منظر تھا۔ وہ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے صوفے پہ گرنے کے سے انداز میں بیٹھا۔

سدرہ بیگم نے غصیلی نگاہ سے گھورا۔

"تمہارے سسرال اور میرے میکے میں شادی ہے شاید۔۔۔" بیٹے کو جی بھر کے گھورنے کے بعد وہ درشتی سے بولیں۔

"اوہ ہاں۔۔۔ ذہن سے ہی نکل گیا۔" وہ کچھ کھسیانا سا ہو کے مسکرایا۔

"تمہارے ذہن و دل میں ایسی کیا چیز سما گئی ہے جو

باقی سب کچھ نکلتا ہی جارہا ہے۔" ماں کا انداز ایسا تھا کہ وہ بمشکل ہنسی روک پایا۔

"آپ کی بھتیجی کے علاوہ اور سب کچھ جو بھی سامنے کے قابل ہے۔" سونی بھائی کے لیے پانی لے کر آئی تو تلخی سے احمر کی ترجمانی کی۔ جس نے ماں کی طرف بہن کی حمایت میں دیکھا کہ سمجھ داری ہو تو آپ کی بیٹی جیسی۔

"جس کا رشتہ طے ہوا ہے اس سے زیادہ تکلیف تو تمہیں ہے۔"

"تکلیف تو آپ کو بھی ہے امی اور مجھ سے زیادہ ہے۔" وہ استہزائیہ ہنسی۔

سدرہ کو کبھی کبھی بیٹی کا منہ پھٹ ہونا بہت کھلتا تھا۔ زخم کھل جاتے تھے۔

"آپ کے میکے سے میرے اکلوتے بھائی کو بھی سوائے لڑکی کے کچھ نہیں ملنے والا۔ تمام عمر ابا نے آپ سے اس بات پہ جھگڑا کیا کہ بڑے اعلا خاندان میں شادی کی تھی کہ بیوی پراپرٹی کی مالک ہوگی مگر بے خبر تھے کہ سسرال میں بیٹیوں کو حصہ دینے کا رواج ہی نہیں۔"

بیٹی کی انتہا درجے کی خشک آواز ان کے اندر گرد اڑانے کے بجائے برسات کرنے لگی تھی۔ وہ اندر سے بھیگ گئیں، انہیں اپنا دکھ ہی نہیں تھا جیسے تیسے زندگی گزر گئی۔ سدرہ کو وہ سنہری رخسار تکلیف دیتے تھے جن پہ ابھرنے والے سورج دوپہر کو ہی غروب ہوگئے تھے۔ انہوں نے دل کو ملکے سے دبایا۔

"جاؤ تم احمر کے لیے چائے لے کر آؤ اور زیادہ بک بک مت کیا کرو۔ اگر میں ڈاکٹر بہو لے آئی تو سارا دن اسپتال میں مغز ماری کرنے کے بعد وہ میری خدمت کیا خاک کرے گی۔ الٹا مجھ بڑھیا کو ان کے بچے پالنے پڑیں گے۔"

احمر ماں کے اندیشوں پہ ہنستا ہوا وہاں سے اٹھا۔

"اب ذہن میں رکھنا کہ ہمارے ساتھ تمہیں لاہور جانا ہے۔" ماں کی یاددہانی پہ وہ بے زار سا ہوا۔

"میں صرف ایک فنکشن اٹینڈ کر سکتا ہوں۔"

انگلی اٹھا کر متنبہ کیا۔

"جانتی ہوں کہ اسلام آباد میں تمہارے علاوہ کوئی قابل ڈاکٹر نہیں۔ (جو نرسوں کو قابو کر سکے)" وہ کلس کر بولیں۔ "جس کی منگیتر کو اس کی شکل بھی بھول چکی ہوگی۔" آج وہ حساب چکانے پہ تلی ہوئی تھیں۔

"تو کس نے کہا تھا کہ اتنی دور رشتہ طے کریں۔" سونی نے اندر آتے ہی پھر لڑائی کا پٹاخہ چھوڑا۔

"تمہیں ننھیال سے اتنا بیر کیوں ہے؟" سدرہ کی برداشت اب ختم ہو رہی تھی۔ "انہوں نے تمہارے لیے گھر میں کانٹے نہیں اگا رکھے اور نہ ہی وہ تمہارے جاتے ہی تم سے جوتے چھین لیتے ہیں۔ ان میں تمہاری ددھیال سے کم ہی عیب ہوں گے۔ تمہارے باپ دادا اور بھائی سمیت سب عیاش اور آوارہ گردی کی حدیں پار کرتے ہیں۔" سدرہ کے لہجے میں تاسف اترا۔

باپ نے جانتے بوجھتے بدکردار، مگر ضرورت مند شخص کے پلے باندھا تھا کہ کبھی گردن سیدھی کر سکے نہ سر اٹھا کر بات کر سکے۔ بس داماد میرے دینے والے ہاتھ پہ ہی نگاہ رکھے۔ پیسہ ہر عیب چھپا لیتا ہے۔

"امی!" سونی نے نخوت سے سر جھٹکا۔ انہوں نے بیٹی کی موہنی صورت نظر بھر کے دیکھی جو ہو بہو خالہ جیسی تھی۔ ماں کے ستے چہرے پہ پتا نہیں کیا کچھ کھو دینے کا ملال رقم تھا کیا کچھ نہ پانے کی حسرت واضح تھی کہ وہ ہلکی آواز میں سوری کہہ کر ان کے کندھے سے سر ٹکا کر مسکرا دی۔

٭ ٭ ٭

"بہن کے سسرال کارڈ خود دے کر آنا۔" بوا نے کوئی چوتھی مرتبہ یہ جملہ کہا ہوگا اور ہر بار عمارہ بیگم کے منہ کا زاویہ بدلا تھا۔

"اگر اس طرح وہ لوگ راہ راست پہ آجائیں گے تو انہیں کارڈ دینے کا کام تمام گھر والے بخوشی انجام دے سکتے ہیں۔" وہ ہر کسی کے معاملے میں بولنا اپنا حق سمجھتی تھیں اور حسب معمول ہی جیسے سعدیہ بیگم بوا

اور سفیر نے انہیں بولتے سنا ہی نہیں تھا۔
"آپ فکر مت کریں۔ میں ضرور جاؤں گا۔" وہ کف موڑتا اطمینان سے بولا پھر پتا نہیں اسے کیا سوجھی۔
"راہ راست کی بات بھی آپ نے خوب کی ہے تائی جی!" اس کے متبسم چہرے پہ اس عنوان کا پورا مضمون تحریر تھا۔ تائی کی رنگت متغیر ہوئی۔
"اتنے بھاری دوپٹے کے لیے منع کرتی تھی نا۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑا لش پش دوپٹا بیٹی کی گود میں پھینکا۔ وہ بے چاری کھسیا کر رہ گئی۔ (کمال ہے خود ہی بنوایا ہے) "دلہن بنو گی تو کیا خاک روپ آئے گا۔ اسے وانیہ کو دے دینا۔" تائی نے کہاں کا غصہ کہاں نکالا۔
سفیر نے جانے کیوں نظر پھیر کے لش پش سوٹ کو دیکھا جو تائی کچھ دیر قبل درزی سے لے کر آئی تھیں۔ اتنا تو وہ جانتا تھا کہ وانیہ اسے چھوئے گی بھی نہیں' وہ بہت عمدہ رنگ اور سادہ لباس استعمال کرتی تھی۔
"سفیر بھی آج کل دوستوں کی خوب مہندیاں اٹینڈ کر رہا ہے' اسے کچھ اندازہ تو ہو چکا ہو گا کہ مہندی مایوں کی دلہن کی کیسی ڈریسنگ ہوتی ہے۔" تائی کی چھوٹی بہو سمیرا نے بھی گفتگو میں حصہ لے کر ایک بے تکی بات کی۔ وہ بالکل اپنی ساس کا پر تو تھی۔
"دلہنوں کا تو پتا نہیں البتہ دولہوں کی سالیوں کی ڈریسنگ ضرور بتا سکتا ہوں۔"
وہ بھی ہر قسم کے موڈ میں سمیرا کو خوب چکر دیتا تھا' مگر یہ بات اس نے انعم کے ساتھ مرکزی دروازے سے داخل ہوتی وانیہ کو دیکھ کر کی تھی۔ (اب اپنی بات پہ قائم رہنا) وہ بڑی ہی بے نیازی سے مسکرائی۔
"کتنی مرتبہ بکواس کر چکا ہوں بے وقت کا بازار جانا مناسب نہیں۔" وہ پورے کا پورا سلوٹ زدہ ہو کر لب کشا ہوا۔
"بات یہ ہے بھائی کہ آج آپ کچھ جلدی گھر تشریف لا چکے ہیں ورنہ وقت ابھی اتنا بھی بے وقت نہیں۔" انعم نے صوفے پہ پھسکڑا مار کر افشاں کو چائے لانے کا کہا۔ اب یہ غصہ روز بروز بڑھے گا' وہ جانتی تھی۔
وہ اسے باور کراتی تھی کہ تمہاری زندگی میں کچھ کا کچھ ہو جائے جب وانیہ مجید کو فرق نہیں پڑتا تو سفیر نوید دنیا جہان کا درد کس بنا پر اپنے سینے میں دبائے پھرتا ہے۔

✡ ✡ ✡

آج کے دن وہ لمحہ لمحہ خود کو مصروف رکھتا تھا۔ آج کے دن۔ نیند' چین اور سکون اس کے لیے ایک ایسی نعمت خداوندی تھے جو اس کا مقدر نہیں تھے۔ اسے میسر نہیں آسکتے تھے۔ وہ آج پھر فیکٹری مزدوروں کے ساتھ شام تک بھاری کرٹن لوڈ کرواتا رہا تھا۔ دن بھر کی مشقت کے بعد اب وہ تھکن سے چور تھا۔
اس نے فیکٹری کے مالک واصل کی آنکھوں میں اپنے لیے ترحم محسوس کیا۔
"مزدوری تو لیتے جاؤ۔" واصل کی پکار پہ وہ ٹھٹک کر رکا۔ وہ مڑ کے دیکھ سکا نہ رک سکا۔ اس کی دھول اڑاتی گاڑی کو دیکھ کر واصل کی آنکھیں بھیگیں۔
"اب تم اس اڑتی دھول کی مانند خود کو کیوں سمجھتے ہو یار؟ خدا کرے آج کی شب تم چین سے سو سکو۔"
آج وہ اپنے دوست کے لیے غم زدہ تھا۔ آج کی تاریخ میں اس کا یہ دوست زندگی کی سب سے بڑی بازی جیتا تھا تو پھر واصل عزیز' عشیر عباس کے لیے۔ جیتنے والے کے لیے۔ آج کی تاریخ میں ہی پُرملال کیوں تھا؟

✡ ✡ ✡

"کیا ہے انعم یار؟ اب اٹھ بھی چکو۔" وانیہ نے کوئی تیسری مرتبہ بوا کے کمرے میں جھانکا تھا جو ہنوز منہ' سر لپیٹ کر پڑی تھی اور اس کی آواز سن کر ہر بار کی طرح کروٹ بدل گئی۔
"وہاں کب سے تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔ میری تمام دوستیں آچکی ہیں۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی بالآخر انعم کو اس پہ ترس آہی گیا۔
"اچھا تم چلو۔ میں ذرا حلیہ درست کر کے آتی ہوں۔" آج کل اسے سردی زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ اس نے کمبل ہٹا کے ایک طرف کیا۔

"بوا جی نماز پڑھ کے آپ بھی عقبی سٹنگ روم میں آجایئے گا۔" اس نے برآمدے میں تاکید کرتی دانیہ کی پرجوش سی آواز بے دلی سے سنی۔ وہ چند منٹوں بعد برآمدے میں آئی تو بوا دعا مانگ رہی تھیں۔ انہوں نے نظر اٹھا کر انعم کا بجھا بجھا مضمحل چہرہ دیکھا بوا کے دل میں شگاف پڑا۔

"اس گھرانے میں بس شادیاں شوق سے کی جاتی ہیں پھر بھلے بیٹیاں بسیں یا اجڑیں بعد میں کوئی سروکار نہیں۔" وہ زہر آلود سی ہو کر بڑبڑائی۔

دعا مانگتی اس عورت کے چہرے پہ تاریک سایہ لہرا کے رہ گیا۔

"بری بات انعم! ایسا نہیں سوچتے۔ والدین تو بیٹیاں ہنستی بستی ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔ باقی تو سب نصیبوں کے ہیر پھیر ہیں۔" ان کی آواز مدھم ہوئی۔

"یہ سچ نہیں۔" سبک روی سے گزرتی ہوا نے جملہ پھینک کر اس عورت کو زخمی نظر سے دیکھا۔

"یہ ہیر پھیر مقیم فیملی میں ہی کیوں ہیں؟" انعم کا لہجہ کانپا۔ بوا کا وجود کانپا۔ ہوا نے سچ اگلنے والی لڑکی کا ماتھا چوما۔

"رمیض سے کب تمہاری بات ہوئی تھی؟" انہوں نے اچانک دھیان آنے پہ پوچھا تھا یا مقصد اسے اس موضوع سے ہٹانا تھا۔

اس نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے اپنی پھوپھی کو شکایتی نظروں سے دیکھا کہ آپ بات بدل چکی ہیں۔

"آج ہی ہوئی تھی۔ کہہ تو رہا تھا میں شادی میں شرکت کروں گا۔ باقیوں کی کوئی گارنٹی نہیں دے سکتا۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" بوا نے اس پر پڑھ کے پھونکا۔

ان کی دعا نے انعم کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

✡ ✡ ✡

شائستہ عباس اپنے چچا کے لیے بہت اہم بہت خاص تھی اور کیوں تھی وہ اس وجہ سے بھی باخبر تھی

مگر جانتی تھی کہ آج کے دن اس شخص کے لیے یہ دنیا ویران ہو جاتی تھی۔ آج وہ سب کو نظر آتے ہوئے بھی غائب رہتا تھا۔ امیر عباس' منزہ عباس' ان کی بہو اقصیٰ فہیم ان کی پانچ سالہ پوتی ایمن اور تین سالہ عباد' شائنہ عباس سمیت گھر میں داخل ہوئے۔

عشیر عباس کو نابیناؤں کی طرح دیکھا۔ وہ اس وقت ان کے لیے ایک ماورائی مخلوق تھا۔ وہ ان کے سامنے سے جیسے غائبانہ ہی گزرا۔ اس کے جوتے مٹی سے اٹے تھے۔ اس کا لباس غبار آلود تھا۔ وہی مٹی اور دھول ایک تیز درد کی صورت امیر عباس کی آنکھوں میں چبھی۔ دل میں اتری۔ شائنہ نے اسے دھندلی آنکھوں سے دیکھا۔ کیا وہ حقیقتاً" انہیں آخری سیڑھی تک نظر آیا تھا یا پھر محض نظر کا دھوکا تھا۔

چار سال بعد ان کے گھر اس تاریخ میں صف ماتم بچھتی تھی وہ کافور اور اگر بتی کی خوشبو کو اپنے گرد لپٹتے دیکھتا تھا وہ ہر چار سال بعد مرتا تھا۔ اس مرنے والے کو اس گھر کے افراد بنا بین ڈالے بے آواز روتے تھے۔

کوئی اپنے پیاروں کو یوں نظر انداز کرتا ہے بھلا؟ آخری سیڑھی پہ شکوہ مجسم ہو کر اس کے مقابل ٹھہرا۔ وہ ہنسا یا وہ رویا۔ اپنے پیاروں پہ اس قدر کوئی ستم بھی کب کرتا ہو گا جس قدر مجھ پہ ہوا تھا۔ ہر بار وہ موم جیسا شکوہ ان سلگتی نگاہوں کی آنچ سے پگھل کر بہہ کر پہلی سیڑھی تک آتا اور اوندھا پڑا سسکتا رہتا تو کیا ان نگاہوں میں قیامت جیسی تپش تھی؟ کیا یہ وہی نگاہیں تھیں جو کچا گلابی رنگ گھول کر جون کی دھوپ کو کیلا کرتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

شادی سے پانچ دن قبل گھر میں پہلی بار ڈھولک رکھی گئی تھی جو کہ ان تمام کزنز میں سے صرف انعم کو بجانا آتی تھی۔ بوا سمیت گھر کی باقی خواتین اسی سٹنگ روم میں موجود تھیں۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ سُر لگائے ہوئے خوب تالیاں بجا رہی تھی۔ موی مرکزی دروازے کا پردہ جھلانے لگی۔

"کب تک چپ بیٹھیں۔ اب تو کچھ ہے بولنا۔"

تب ہی وہ داخلی دروازے سے لاؤنج میں داخل ہوا۔ ڈھولک کی لے پہ گیت کا تال میل خوب اٹھ رہا تھا۔ وہ ایک دم روک سکتی تھی' مگر عین سامنے اس ساکت ہوئے شخص کو دیکھ کر موی کو پردہ چھوڑنے کا اشارہ ضرور کیا۔

"کچھ تم بولو۔ کچھ ہم بولیں او ڈھولنا!"

اس کی آواز اثر پذیر تھی۔ اس نے نظر کا زاویہ بدل لیا۔ موی نے پردہ برابر نہیں کیا تھا۔ اس کی چاند جیسی کلائیوں میں چوڑیاں جھوم رہی تھیں۔ سو میل ناپے جاسکتے تھے' مگر ان کا درمیانی فاصلہ ناپنے کے لیے ہر کوشش بے سود تھی۔

"دو چار قدم پہ تم تھے۔ دو چار قدم پہ ہم تھے۔"

وانیہ نے اسے الٹے قدموں باہر جاتے دیکھا۔ گیت کا تال میل ٹوٹنے لگا۔ انہیں بھی ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہنا تھا۔ وہ کہہ ہی نہیں سکتے تھے۔ انہیں خاموشی جیسی مہلک بیماری کا سامنا کرتے ایک دن یوں ہی جاں سے گزر جانا تھا۔ اب اسے تادیر سڑکیں ناپنی تھیں۔

اندر ڈھولک بجنا بند ہوا چائے کا دور شروع ہوا۔

"مہندی کا فنکشن انتیس کو ہے۔ نہیں میرج ہالز میں تو اب مخصوص ٹائمنگ ہے۔ گھر میں ہی ارینج ہو گا۔" ودیعہ اپنی کسی دوست کو فون پہ بتا رہی تھی۔ "بارات ان شاء اللہ یکم مارچ کو ہے۔" اس نے شرماتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

بوا کی سانسیں تھمنے لگیں۔ انہوں نے چائے کا کپ برق رفتاری سے ہونٹوں سے الگ کیا۔ چائے میں زہر نہیں تھا۔ پھر دو گھونٹ بھرنے کے بعد گلا بند کیوں ہو رہا تھا تو کیا لفظ انتیس زہریلا تھا۔

"شاذر کا تو انتیس کا ہی پلان تھا۔ میں نے ہی رد کر دیا۔ چار سال تک ویڈنگ اینی ورسری کا انتظار جو کرنا پڑتا۔ میں نے کہا ہر سال تمہاری جیب ہلکی کرواؤں گی۔" ودیعہ کا قہقہہ بہار آفریں تھا۔

اس کی شادی اپنے خالہ زاد سے ہو رہی تھی' وہاں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

موجود سب لڑکیوں نے اس کے فیصلے کو داد و تحسین سے نوازا۔

"لوگوں کی یادداشت اتنی اچھی کیوں ہے۔"

وہ دھیرے سے کپ رکھتی وہاں سے اٹھی تھی۔ وہ اتنی خبر رکھتی تھی کہ آج جمعہ ہے۔ وہ کیلنڈر کو دیکھنا کب کا چھوڑ چکی تھی۔ چار سال ایک بڑا عرصہ ہے۔ کچھ سے کچھ ہو سکتا ہے۔ اس کے قدموں نے رفتار پکڑی۔ ودیعہ نے ایک اچھا فیصلہ کیا۔ اپنی ورسری سال بعد ضرور آنی چاہیے ورنہ گلاب شاخوں پہ ہی محو انتظار رہ جاتے ہیں۔ جدائی کی امر بیل محبت کو کھا جاتی ہے۔ دریا کا پل ٹوٹ جائے تو پار اترنا ناممکن ہو جاتا۔ پھر پل بنتے زمانے لگ جاتے ہیں دن تاریخ سال سب گزر جاتے ہیں۔ ودیعہ نے بہت اچھا سوچا۔

اس نے تیز قدموں سے راہداری عبور کی۔

"ابھی تو رات نے پہلے پہر میں قدم رکھا ہے ابھی اتنی رسمیں باقی ہیں کچھ لحاظ دھیان کریں دیور جی۔"

"اف...." اس کا انگوٹھا کسی اینٹ کی نوک سے ٹکرایا۔ "اللہ!" وہ اس کا ہاتھ تھام کر کھڑا ہوا۔ اس نے بہ آواز بلند کہا۔

"باقی رسمیں کل ہو جائیں گی۔" بھابھی نے اس کا کان کھینچا۔ لڑکیاں اور عورتیں کھلکھلائیں۔ ماؤں نے کنواری بیٹیوں کو گھورا۔ برآمدے تک آتے آتے اس کی سانس پھول چکی تھی۔ وہ بے قرار لمس ہوا ہوا پسینے میں بھیگی ہتھیلی خالی تھی۔ اتنی مضبوطی سے پکڑا ہاتھ کیسے چھوٹا۔ کوئی کافر لو.... ایمان محبت کی قبر جانے کب سے کھود رہا تھا۔ وہی غافل تھے بے خبر تھے۔ اس نے قریبی ستون کا سہارا لیا۔

"بہت کنجوس ہو۔" اس نے بیڈروم میں آتے ہی ہاتھ جھٹکے سے چھڑایا۔ وہ حیران ہوا۔

"ہماری اپنی ورسری چار سال بعد آئے گی۔" وہ بسور کر بولی۔

وہ ہنستا ہی چلا گیا۔ پھر اس کے قریب آیا۔

"ایک ایسی جگہ ڈھونڈ آیا ہوں جو انتیس فروری کو چاند کی اوڑھنی ہے۔" ایک مدھر سرگوشی ابھری۔ اس کے گال گلاب ہوئے۔ اس نے انعم کو اسی سمت آتے دیکھا۔ اس نے زرد رخسار صاف کیے اور چوڑے ستون کی اوٹ میں ہوئی۔ وہ انعم کو ایسی تاریخوں کا پتا ضرور دے گی جہاں زمین چاند کی اوڑھنی ہے۔ وہ اسے محبت میں چکور نہیں بننے دے گی۔ اس کا ارادہ ابھی اندر جانے کا نہیں تھا۔ ابھی رات کا قدم پہلے پہر میں تھا۔ ابھی درد نے بہت سی رسمیں نبھانی تھیں۔ ابھی بتیس سالوں کے جمع شدہ آنسو ان رسموں پہ قربان ہونے تھے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر عروسی کمرے میں لے جانے والا کب کا بچھڑ چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

جنون پرانا تھا اور شہر بھی پرانا تھا۔ دل کا ہر زخم تازہ تازہ تھا۔ گزرے بتیس سالوں میں وہ آٹھویں بار جاں کنی کے عالم میں تھا۔ اندر آنے کے بعد اس نے متوحش سا ہو کر وارڈروب کے تمام پٹ کھولے۔ وہ تمام لباس آج بھی سفید تھے۔ اس نے ہینگر میں لگے پژمردہ بے رنگ لباسوں کو ایک طرف کیا۔ تمام لباس ایک دوسرے سے گلے مل کے کرلانے لگے۔ انہیں ایک دوسرے کا حال دل کہنے کا موقع چار سال بعد ملا تھا۔

"ہم نیلے تھے۔ تم آتشی۔ میں سرخ۔ یہ زرد۔" وہ ایک دوسرے سے ہلکی سرگوشیاں کرنے لگے۔

سامنے کھڑے شخص کی نگاہ ایک چوکور فریم میں مقید دولہا دلہن کی تصویر پہ ٹکی۔ اس کی نظر اپنے ہی چہرے پر جم گئی۔ وہاں کیا کچھ نہیں تھا۔ ان آنکھوں کے گلابی جنگلوں میں خوشی مدھ مست پن سے ناچ رہی تھی چہرے کے ہر دلعزیز نقوش پہ شب وصال کا چاند ہر زاویے سے ابھر آیا تھا۔ شہر محبت سے فراق کے زرد پنچھی کوچ کر چکے تھے۔ عشیر عباس یک ٹک اپنا چہرہ دیکھے ہی گیا۔

یہ وہ چہرہ تھا جو اسے محبوب تھا۔ جو اسے محبوب تھی پھر بھلا اپنے چہرے سے وہ کیونکر نظر ہٹا پاتا۔

یہیں محبت کی انتہا تھی۔

یہیں عشق کا عروج تھا۔

اس نے اپنے چہرے سے نظر ہٹا کر قریب ہی پہلو سے جڑی دلہن کا آدھا چہرہ دیکھا۔ سرخ زرتار ماہین' شوخ' شرمیلا آنچل بے خود سا ہو کر آدھے چہرے سے لپٹا تھا۔ وہ مسکراتی جھجکتی ۔ شرماتی آنکھ ذرا سی وا تھی۔ اس کی تیکھی ناک کا نتھ والا رُخ دِکھ رہا تھا۔ جیسے وہ صرف آدھا چہرہ ہی دکھانا چاہتی ہو۔ یہ وہ لمحہ تھا جب سسرال آنے کے بعد دلہن کو پہلی بار اس کے پہلو میں بٹھایا گیا تھا۔ کبھی آنچل' کبھی ہاتھ' کبھی تکیہ۔ کیا ہے یار۔ وہ اکثر جھنجلا کے کہتا۔

"اتنے سال تو مجھ سے بھاگی ہو۔ چھپی ہو۔ اب یہ عادت چھوڑ دو۔"

الماری کے جھولتے پٹ کو اس نے ایک زوردار دھماکے سے بند کیا۔

وہ دونوں چھپ گئے۔ شب وصال کا چاند ہر زاویے سے غروب ہوا۔ اب شہر محبت میں پنچھی فراق کے گیت گاتے تھے۔

اس نے وارڈروب سے ٹیک لگا کر لمبی لمبی سانسیں لیں۔ اندر کیا غضب کا شور برپا تھا۔

"ہم لانگ ڈرائیو پہ جائیں گے۔" وہ پہلی اینی ورسری کی پلاننگ کر رہی تھی۔ "ان راستوں پر سفر کریں گے جو پہلے کسی نے نہیں دیکھے ہوں گے۔"

"ہاں ہم دشت کے بیچ سمندر رکھ کے دیکھیں گے یعنی کہ ہم خشکی پہ کشتیاں دوڑا کر سمندر تک پہنچیں گے۔" وہ اس کے خواب میں گھس کر بے تحاشا ہنسا۔ وہ اسے خائف سی ہو کر گھورنے لگی۔

"اٹس اوکے۔" اس نے کہنی تکیے پہ ٹکا کر ہاتھ پہ سر ٹکایا۔ اب اس کا پورا چہرہ نظر آرہا تھا۔

"ہم صبح تک آوارہ گردی کریں گے۔"

وہ ان نگاہوں کے جامد ارتکاز پہ جیسے بات ختم کر کے جھنجلائی۔ وہ مسکرایا۔

"تم کہو ہم سب کیوں کہ اس وقت تک ہمارے تین چار بچے تو یقیناً" ہوں گے۔" شرارت اس کے لہجے سے اس کی آنکھوں سے لپٹی ہوئی تھی۔

"عشیر آپ بھی ناں... یعنی کہ چار سالوں میں چار..." وہ خفیف سا شرمائی اور اس کی کہنی کے نیچے سے تکیہ کھینچ کے اسے مارا۔ اب خالی کمرے میں ہجر کے گلدانوں سے وہ یادیں سر نکال رہی تھیں۔ وہ یہ شہر' یہ گھر' یہ کمرہ چھوڑ کے دیکھ چکا تھا۔ جگہ بدلنے سے وحشتیں پر سکون نہیں ہوتیں۔

اندر کا شور پر سکون نہیں ہوتا۔ آنکھیں ہوا میں ہجر بتانے سے خشک نہیں ہوتیں۔ رات بھی کسی کا بھی درد گھٹانے کو پل میں ختم نہیں ہوتی۔ کیوں کہ سورج نے وقت پہ طلوع ہونا ہوتا ہے۔ ہر آنکھ دشت کو سمندر کا نظارہ دکھانے کا خواب نہیں دیکھتی۔ یہ خواہش صرف آمنہ مقیم کی تھی جو اسے دشت بنا کر خود سمندر ہو چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

سفر کی تھکن اتارنے کے بعد وہ دونوں ماں بیٹی اب دیگر مہمانوں کے ساتھ لاؤنج میں براجمان تھیں۔ رات کو مہندی کا فنکشن تھا۔ سو وہ دوپہر سے قبل آچکی تھیں۔

"ہمارا خیال تھا کہ احمر تمہارے ساتھ ہی آئے گا۔" عمارہ بیگم نے بظاہر خیال ظاہر کیا تھا' مگر کچھ اس انداز سے کہ اسے آنا چاہیے تھا۔

سدرہ جو کب سے خاموش بیٹھی بہن کو بے دھیانی میں دیکھے جا رہی تھیں۔ وہ پہلے سے بہت کمزور ہو چکی تھیں۔ چونک کے بڑی بھاوج کو دیکھا جس کے ساتھ وہ اس گھر میں دو سال گزار کر گئی تھیں۔ ان کے لیے یہ پوچھ گچھ غیر متوقع نہیں تھی۔

"ایک ڈاکٹر کی زندگی جس قدر مصروف گزرتی ہے اس کا اندازہ ہم سب ہی کر سکتے ہیں۔" انہوں نے بالکل سادہ اور سیدھا جواب دیا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" وہاں کئی سر تائیدی انداز میں ملے تھے۔

"امی جی! انعم' وانیہ یا ودیعہ میں سے کوئی بھی کچن میں موجود نہیں۔ رانی اور افشاں کا تو آپ کو علم ہے۔ اندر ہر الٹا سیدھا کام ہو رہا ہے۔" وہ اپنے مخصوص

انداز میں قدرے درشتی سے گویا ہوا۔

"سفیر! پھوپھی سے تو ملو۔" ماں نے اس کے غیر مہذب انداز پہ اسے خفگی سے گھرکا۔ بلکہ کندھا پکڑ کر اس کا رخ بھی ان کی جانب سیدھا کیا۔ وہ باقی رشتے دار خواتین سے مل چکا تھا۔ اب وہ مؤدب سا ہو کے سدرہ کی جانب بڑھا تب تک وہ بھی پیش قدمی کر چکی تھیں۔ دونوں نے ہی خوب لگاوٹ کا اظہار کیا۔ سوئی اس پر سے نظر ہٹانا بھول چکی تھی۔ وہ سفیر کو چھ سات سال کے وقفے سے دیکھ رہی تھی۔ وہ امتحانوں کی وجہ سے انعم کی شادی بھی اٹینڈ نہیں کر سکی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے سلام کا جواب دیا۔ وہ غیر مہذب یا بداخلاق ہرگز بھی نہیں تھا۔ مگر آج بھی احمر کی فیملی کو دیکھ کر اس کا دل اپنے خالی پن کا حساب کتاب نہایت پر اذیت ہو کر مانگنے لگتا تھا۔ وہ باہر آیا تو وانیہ اوپری پورشن کی سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کلائیوں تک مہندی کے گل بوٹوں سے بھرے تھے۔

"ایک تو تم لڑکیوں کو ان فضول کاموں کا کس قدر شوق ہوتا ہے۔" وہ اس پہ تیکھی نظر ڈالتا بھنا کر بولا۔

(تو کیا لڑکوں کو ہونا چاہیے) اس نے بھی بھنا کر ہی سوچا۔ بے چاری مہندی پہ اس کے غصے کی وجہ سمجھ سے باہر تھی۔

"آپ کو کوئی کام ہے کیا؟" ازلی بے نیازی سے پوچھا۔

"ہاں بھئی۔ کیوں نہیں، رائے ونڈ کی بجلی اچانک بند ہو گئی ہے۔ چیف منسٹر کا فون آیا تھا۔ ہمیں بھلا آپ سے کیا کام ہو سکتا ہے۔"

ایسی قیامت خیز سنجیدگی اور بلا کا طنز۔ یہ یقیناً پھوپھو لوگوں سے مل چکا ہے۔ اس کے پتھریلے چہرے پہ مذاق کا شائبہ تک نہیں تھا۔

"وہ دراصل بیوٹیشن... تو میں نے بھی۔" وہ اس کے سنجیدہ موڈ کے پیش نظر کچھ بے ربطی سے بولی۔

(تف ہے مجھ پر)

"کچن میں آؤ۔" تین لفظ اس کی طرف پھینک کر وہ کچن ایریا کی جانب بڑھا۔ وانیہ کو تقلید کرنا پڑی۔

"اب ذرا ان صاحبہ سے پوچھیں کہ لائٹنگ والوں کے لیے جوشاندہ کیوں بھیجا۔"

اشارہ رانی کی جانب تھا۔ دونوں ہاتھ پہلوؤں پہ رکھ کر خالص تفتیشی انداز (یہ تھانہ نہیں ہے ڈی ایس پی صاحب) وہ صبر کے کئی گھونٹ نگل گئی۔

رانی گڑبڑائی۔ "وہ 'او'" کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ پاؤ بھر کا موتی چور منہ میں پھنسا تھا۔

"ذرا ملاحظہ فرمائیں، خود محترمہ مٹھائیاں کھا رہی ہیں اور..." وہ دانت پیس کر اس کی طرف مڑا۔

"باجی جی! میرا تو کوئی قصور نہیں۔" وہ لڈو نگل چکی تھی۔ "وہ سفیر صاحب نے پوچھا کہ جوشاندہ تیار ہے تو۔" وہ اٹک کر رہ گئی۔

وانیہ کا چہرہ فق ہوا۔ یعنی کہ سچ مچ جوشاندہ۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ منہ پر آیا۔

"کیونکہ جیسی چائے جناب نے مجھے پیش کی تھی تو میں نے طنزاً" کہا تھا۔ پھر جوشاندہ تیار کرو۔" تیور بتا رہے تھے کہ آج رانی پولیس کا تھپڑ کھائے گی۔ "یہ شادی والا گھر ہے غالباً۔" وہ گھوم کے وانیہ کے سامنے رکا۔ "چائے کے ساتھ مٹھائی ہی چلتی ہے ناں؟" عقل مندوں کی طرح تصدیق چاہی۔

اس نے بے وقوفوں کی طرح سر ہلایا۔ (ہنسی دبا کر) پھر بھی چہرے سے ذرا سی مسکراہٹ جھلکی۔ رانی کا کارنامہ مضحکہ خیز جو تھا۔ بے چارے لائٹنگ والے کیا سوچتے ہوں گے۔ آنکھیں تک ہنس رہی تھیں اس کی۔ گہری نظر نے وہ دبی مسکراہٹ دلچسپی کے تمام اہتمام کے ساتھ کھوجی۔

"یہ سارا قصور حکومت کا ہے۔" رانی چولہے پہ چائے کا پانی چڑھاتے ہوئے بڑبڑائی۔ "تو کیا لائٹنگ پہ پابندی لگا دیتے؟" وانیہ دو قدم آگے ہوئی تاکہ چائے کا پانی چیک کر سکے۔

"نہیں جی۔ ہوٹلوں سے ٹائم کی پابندی ہٹا دیتے۔" اس نے منہ بگاڑا۔ "انعم بی بی کی شادی کتنے سکون سے ہوئی تھی۔"

"ہاں! تمہیں بھی بننے سنورنے کا خوب وقت ملا

تھا۔" وہ فریج کا معائنہ کرتے ہوئے بولا۔

"آپ کو یاد ہے جی؟" وہ خوش ہو کر مڑی اور پھر وہاں سے بھاگنے کے لیے راستے کی تمام رکاوٹیں پھلانگتی گئی۔ سفیر کے تاثرات ہی ایسے تھے۔

"سب نے کہا تو میں نے بھی لگوالی۔" اسے واقعتاً" شرمندگی محسوس ہوئی۔ وہ صبح سے کچن سے غائب تھی سو ہلکی آواز میں وضاحت دیتی کھولتے پانی پہ اک نظر ڈال کر سنک کی طرف بڑھی۔ اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے سفیر نے تیزی سے بڑھ کر کلائی گرفت میں لی۔ "اب اسے دھونے کی ضرورت نہیں۔" آواز گہری اور مدھم ہوئی۔ دل کی بدلتی دھک دھک وانیہ کے چہرے پہ دھڑکی۔ وہ متاع جاں تھی۔ وہ نگاہ کا چین تھی مگر اس کی نہیں ہو سکتی تھی۔ گرفت ڈھیلی پڑی۔

"دو تین ہزار اب پانی میں بہادو گی۔" دوسرے پل موڈ بدلا۔ کلائی ہاتھ سے چھوٹی پھر اسے نظر انداز کرتا سنک کی طرف بڑھا۔ اپنی انگلیوں پہ لگی ہلکی گیلی مہندی صاف کی' پلٹ کر برق رفتاری سے باہر نکلا۔

وانیہ نے کھولتے ہوئے پانی میں پتی جھونکی۔

"غصیلا' نخریلا' ہٹیلا' کٹیلا یہ تمام القابات رانی سفیر کے لیے یوں ہی تو نہیں گنواتی۔" چائے کا پانی وانیہ کے جذبات سے کم ہی کھول رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

خشک پتوں کی آواز شائنہ عباس کے قدموں تلے چیخ کر معدوم ہوئی۔ وہ رکی۔

"میں تمہارا یہ خیال رد کرتی ہوں ساحر صاحب!" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتی مضبوط لہجے میں گویا ہوئی۔ "اس کی مرضی کے بغیر اگر پتہ تک نہیں ہلتا تو اتنے بڑے بڑے حادثوں کے پیچھے تقدیر کا ہاتھ کیسے نہیں چھپا ہوتا۔"

اس کی پوری بات سن کر بھی ساحر کے ہونٹوں کی گہری مسکراہٹ کا رنگ نہیں بدلا تھا جو اسے زچ کرتی تھی۔ اس ڈھیٹ مسکراہٹ سے وہ اکثر چڑی رہتی۔ جو پیشگی اعلان کر رہی ہوتی کہ اس بحث میں بھی جیت ساحر کی ہو گی۔

اسے دینی معلومات پہ مکمل عبور تھا۔ وہ ایک نامور سائیکاٹرسٹ ہونے کے ساتھ امیر عباس کا دوست بھی تھا۔ وہ کسی بھی موضوع پہ چھڑنے والی بحث و تکرار اتنے مدلل انداز میں سمیٹتا تھا کہ اس سے مباحثہ کرنے والے اپنی بغلیں جھانکتے رہ جاتے' مگر شائنہ کا کہیں بھی تانکنے جھانکنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ آج بھی وہ اس سے بحث کرتے ہوئے ناک کی سیدھ میں دیکھ رہی تھی۔

وہ شروع سے ہی محسوس کرنے لگی تھی کہ ساحر کو دیکھ کر اس کا دل کچھ ٹیڑھا میڑھا ہو کر دھڑکنے لگتا تھا۔ وہ اکثر اس سے اپنے چچا کا کیس ڈسکس کرتی تھی' جن کی فائل ساحر کے کلینک ٹیبل پہ جب گرد سے اٹنے لگتی تھی تو سالوں بعد عشیر عباس اسے جھڑوانے کے لیے اس کے پاس آجاتا تھا۔ امیر عباس کی اکلوتی بیٹی کس مرض کے تحت اس کے پیچھے بھاگتی تھی۔ ساحر نے بھی اس کو یا خود کو یہ باور کرانے کی کوشش نہیں کی تھی' مگر شائنہ جانتی تھی کہ اسے دیکھ کر اس کے چہرے کی کیفیات بھی کچھ نہ کچھ رنگ ضرور بدلتی تھیں' گو دل کے کواڑ وہ بند کیے رکھتا تھا پھر بھی اسے پچاس سالہ ساحر کا رنگ ڈھنگ اپنی عمر کے ہر دور میں اچھا لگا تھا۔

"جو شکوہ چچا کو اپنے اللہ سے ہے۔ کیا آپ اسے حق بجانب نہیں گردانتے؟" وہ جانتا تھا کہ بحث کا آخری موڑ یہی تھا۔

"جبرا" یا کسی بھی ظالمانہ طریقے سے طلاق دلوائی جاتی ہے یا لی جاتی ہے۔ ایسی صورت حال میں مختلف علماء کرام کی آرا میں ہمیں آسان راستہ اختیار کرنا چاہیے۔"

اس نے شائنہ کی آبدیدہ نگاہوں کو بس اک پل دیکھا۔ "کاش اس رشتے میں پھر ایک دوسرے کو چھوڑنا ناممکن ہوتا۔" اس نے نظر جھکائی تو کئی آنسو سوکھے پتوں پہ گرے۔ "اللہ ہم سے زیادہ بلکہ کہیں زیادہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ ہمیں معاملات

بگاڑنے والے انسانوں کے لیے دعا کرتے رہنا چاہیے۔"

چچا کے ساتھ بھتیجی کا علاج بھی ضروری ہوتا جارہا تھا۔ ساحر نے بنا دیکھے اس ہرنی جیسی آنکھوں والی لڑکی کو دیکھا۔ جو اس شخص کے دکھ پہ آنکھیں نم رکھتی تھی جس کی آنکھوں میں دھول اڑتی تھی۔

٭ ٭ ٭

رات کے فنکشن میں رمیض کے علاوہ انعم کی سسرال میں سے اور کوئی بھی نہیں تھا۔ سدرہ کے پر تفکر استفسار پہ گھر کے تمام افراد نے بے ساختہ ایک دوسرے سے نگاہیں چرائیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وانیہ کی رخصتی تک سدرہ پہ انعم کی سسرالی ڈیمانڈ کا راز عیاں ہو۔ مہندی کا فنکشن کہیں رات ڈھلے اختتام پذیر ہوا تھا اب بمعہ عزیزوں کے تمام اہل خانہ برنچ کررہے تھے۔

سالوں بعد آمنہ کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ مجید کی شادی پہ اسی انداز میں عزیز و اقارب اس کی سسرال کی بابت پوچھ کچھ کرتے تھے۔ اس نے ویران نگاہیں انعم پہ مرکوز کیں۔

"گنو تو شمار میں نہیں، مگر سب کی سب ناکارہ۔ موی کب سے بریڈ کتر رہی ہے جیسے فرائی انڈہ نہیں اونٹ کی کلیجی بھوننے کا کہا ہوا ہے۔"

اس نے انڈہ لاتی رانی سے چھوٹی افشاں کو شعلہ جوالہ بن کر دیکھا۔ انعم اور آمنہ دونوں نے مجید کی بڑی بہو کو داد دیتی نظروں سے دیکھا۔ جس نے خوب صورتی سے موضوع پلٹا تھا۔ لوگ بیٹیوں کو نقش قدم پہ چلاتے ہیں، مگر عمارہ بیگم نے بہوؤں کی تربیت کیا خوب کی تھی۔ آج کل ہر گھر کی یہی صورت حال ہے۔ منہ مانگی تنخواہوں پہ بھی کام حسب منشا نہیں ہوتا، وہاں اب خواتین کا پسندیدہ ٹاپک زیر بحث تھا۔ سدرہ نے غیر مطمئن نگاہوں سے انعم کو بغور دیکھا جو خاموش اور الجھی ہوئی تھی۔

سفیر دو منٹ ملے ہی دسترخوان پہ آیا تھا۔ سونی کی نگاہیں اس کے سنجیدہ چہرے پہ ٹھہر سی گئیں۔ وہ کوشش کے باوجود خود کو وانیہ کی جانب دیکھنے سے روک نہیں سکا۔ چہرے پہ مٹا مٹا سا میک اپ اور نیند کی کمی آنکھوں کے کناروں پہ ٹک سی گئی تھی، مگر نظر ہٹانا بھی لازم تھا۔ انعم نے خالی پلیٹ بھائی کے سامنے رکھی جو آف وائٹ شلوار کرتے میں آلتی پالتی مارے پروقار سا ہو کر بیٹھا تھا۔ اس نے پلیٹ میں آملیٹ رکھا۔

"احمر کتنے بجے تک آئے گا؟" نوید نے بہن کو سوچوں میں الجھا دیکھا تو دھیان ہٹانے کی خاطر سوال داغا۔

"آں.... ہاں.... ہاں کہہ رہا تھا شام تک ان شاءاللہ پہنچ جاؤں گا۔" وہ واقعی کسی گمبھیر دھیان سے چونکی تھیں۔

وانیہ نے برق رفتاری سے سفیر کی جانب دیکھا۔ اسی پل اس نے بھی نظر اٹھائی تھی۔ دونوں کو ہی ایک نام نے بری طرح ڈسٹرب کیا تھا۔ احمر کے ذکر پر وہ اسے کیوں دیکھتا تھا۔ اس کی خود پہ پڑتی بے چین نظر۔ وانیہ کے انتظار اور شوق کے چراغ کبھی جلنے ہی نہیں دیتی تھی۔ بجائے خوشی کے احساس کے وہ ایک لاتعلقی کے دائرے میں سمٹ سی جاتی تھی۔

وہ بے دلی سے ناشتا کرتا کچھ دیر بعد وہاں سے اٹھ گیا۔ وہ بلاوجہ ہی بے قرار ہوئی۔ (کیا بے وجہ ہی)

بے قرار تو سونی بھی ہوئی تھی۔ وہ احمر کی آمد کا سن کر ہمیشہ سے روڈ ہوجاتا تھا۔ عمر کے ساتھ وہ چیزیں توڑنا اور دروازے کھٹاک سے بند کرنا چھوڑ چکا تھا، مگر وہ اپنی ذات کے اندر آج بھی بہت کچھ بے دردی سے توڑتا تھا۔ پھر وانیہ سے بھی بیگانوں کا سا رویہ رکھتا۔

"کیا تھا جو اس شادی پہ بھی احمر نہ آتا۔" وہ اپنی سوچ پہ حیران ہوئی۔ اب اس کی بھوک بھی اڑ چکی تھی۔ وہ چائے بنے کچن میں آئی تو وہ رانی سے چائے بنوا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ٹھٹکا۔ وہ ابھی سے اپنے گرد اجنبیت کا ہالہ سا تانے کھڑا تھا اور اس کا یہ رویہ وانیہ کے لیے ہمیشہ باعث تکلیف ہوتا تھا۔

☆ ☆ ☆

احمر کی نگاہیں اسے کھوج کھوج کے تھک چکی تھیں۔ جب روبرو ہو کر اس نے سرسری سے انداز میں اسے سلام کیا تھا' وہاں سفیر کی موجودگی کے باعث وہ احمر کی پرشوق نگاہوں کے انداز تک نہیں دیکھ سکی تھی۔ احمر کا سامنا ہونے پر اپنے دائیں گال پہ پڑا سفیر کا تھپڑ اس کی یاد میں تازہ ہو جاتا۔ گال سنسنانے لگتا۔

وہ تیرہ سال کی تھی جب اس کا نکاح احمر سے ہوا تھا وہ اور سفیر اس حقیقت کے ساتھ جوان ہوئے تھے، پلے بڑھے تھے۔ پھر سفیر کا دل کیونکر اس کی جانب مائل ہوا۔ (کیا صرف اس کا؟) وہ سمجھتی تھی کہ اس موڑ پہ بھی وہ اسے کھڑا نہیں دیکھ سکتا تھا جس سے آگے کا سفر اسے احمر کے ہمراہ طے کرنا تھا۔ اس کے اس رویے کی بنا پر وانیہ کا لگاؤ یا جھکاؤ کبھی اپنے فیانسی کی طرف ہو ہی نہیں سکا تھا۔ وہ اگلا سفر طے کرتے ہوئے کیا مڑ کے دیکھتی رہ جائے گی۔ وہ کبھی سفیر سے کھل کے بات نہیں کر سکی۔ کیا خبر وہ کیا کہہ دے۔ کیا خبر اپنے جذبات آشکار کر دے۔ مڑ کے دیکھنے کے خوف سے وہ سامنے کے راستے نابیناؤں کی طرح دیکھتی تھی۔ جہاں احمر کا گزر تھا' جہاں وہ کھڑا ہوتا تھا۔ آج کی شام بھی اس نے ایسے نابینا کی طرح گزاری تھی جسے ایک انسان کے سوا باقی سب کچھ نظر آ رہا تھا۔

"کیسے یہ بندہ میری نگاہ مٹھی میں رکھتا ہے۔" وہ سو بار جھنجلائی اور سفیر کو بھی نظر انداز کرنے کی ہر حد پار کر دی۔

"یہ نامعقول شخص کسی اور طرف کیوں نہیں دیکھتا۔" وہ احمر پہ ٹکٹکی باندھ کے ہزار بار تڑپا تھا اور اس پہ رشک کرنے کی ہر حد پار کر دی تھی۔

☆ ☆ ☆

"مجھے کوئی بتاتا کیوں نہیں کہ اصل قصہ کیا ہے۔ سوائے رمیض کے آج بھی کوئی نہیں آیا۔" اس ایک جملے کو اپنے اندیشوں کی ہزار گرہیں لگا کر اپنی بہن سے پوچھا کہ کوئی ایک تو کھولو۔ آمنہ نے اپنی سانس تک روک لی۔

"میرے تو سر میں درد تھا' زیادہ دیر رک نہ سکی۔ وانیہ کو دودھ پلائی کے کتنے پیسے ملے؟" آمنہ کے سوال پہ وہ ششدر رہ گئیں۔ یہاں تو کشمیر کا راستہ پوچھو۔ اشارہ چین کی طرف... والا معاملہ ہے۔ سدرہ سلگ کر رہ گئیں۔

"تم جانتی ہو نا میں ان کے معاملات میں دلچسپی نہیں لیتی۔" یہ کہتے ہوئے ان کے دل کا کچھ حصہ سکڑا ضرور تھا' مگر ان کے چہرے پہ وہی ازلی سرد تاثر قائم رہا۔ سدرہ بھی جانے کیا سوچ کر خاموش رہیں۔ اپنی آپا پہ اک افسردہ سی نظر ڈالی۔ جن کی زندگی سے اڑنے والے رنگ ان کے سفید ملائم چہرے پہ دوبارہ کبھی لمحہ بھر کو ٹھہرنے نہیں آئے۔ وہ بہت کم لاہور آتی تھیں۔ آج بھی ان کا دل بہن کے کمرے میں پھیلی ملگجی روشنی کی طرح ہو جایا کرتا تھا۔ سانسوں سے لپٹتی گھٹن کے ہاتھ سفاک اور لمبے ہو جاتے تھے۔

"احمر کو آج رکنا چاہیے تھا۔ اس قدر قریبی اور دہرے رشتوں میں محض حاضری نہیں لگواتے۔" ان کی مدھم آواز میں شکوہ ابھرا تھا۔ سدرہ جو لحاف میں منہ چھپا چکی تھیں لمحہ بھر کو ہل بھی نہیں سکیں۔ اب وہ اپنی بہن کو کیا بتاتیں کہ ان ماں بیٹی کی غیر موجودگی میں آج ان کا گھر کسی عشرت کدے کو بھی مات دے رہا ہو گا۔

"آج کل کے بچے ہماری سنتے کہاں ہیں آپا۔" وہ ایک نحیف سی آہ بھر کے بولیں۔ وہ اس وقت کوئی بھی بہانہ گھڑنے کے موڈ میں نہیں تھیں۔ "ہر بار کی طرح وہ میری واپسی پہ ضرور الجھے گا کہ سالوں بعد بھی چکر لگاؤں تو وانیہ کترائی سی پھرتی ہے' بات کرنے کا موقع تک نہیں دیتی۔"

اور وہ جو ان سے چائے کا پوچھنے آئی تھی۔ اپنا نام سن کر دروازے کے باہر ہی رک گئی۔ جہاں بات ہمارے اپنوں کی آئے تو ہمارے دونوں ہاتھوں میں نادیدہ پردوں کے تھان تہہ در تہہ کھلنے لگتے ہیں جن کے نیچے تمام کمیاں اور خامیاں ہم چھپا لیتے ہیں۔

"سدرہ!" بوا کا معنی خیز مسکراہٹ سے بھرا لہجہ

شکنوں سے بھرپور تھا کہ "جیسے میں تمہارے بیٹے کو نہیں جانتی۔" سدرہ اب کے دبکی پڑی رہیں۔ جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

"تو کیا وہ یہ گریز محسوس کرتا ہے؟" وانیہ کو اپنی جان پاؤں کے انگوٹھے تک آتی محسوس ہوئی۔

"ویسے بھی ہمارے یہاں منگیتروں کے آگے پیچھے پھرنے کا رواج نہیں۔ لڑکیوں کو ان سے چھپ چھپا کر محبت بگھارنے کی تربیت ان کی پرورش میں شامل نہیں —" وہ یک دم ہی بڑی بہنوں والے رعب سے بولیں تو ان کی پرحدت آواز سے وانیہ کا سرد وجود بھی تمازت آمیز ہوا۔

"اونہہ... یہاں کے رواج..." سدرہ کافی دیر کلستی رہیں۔ آمنہ نے چھوٹی بہن پہ رضائی چھیدنے جیسی نظر ڈالی کہ میں تمہارے اکلوتے سپوت کو الف سے بے تک جانتی ہوں۔

احمر اور اپنے درمیان ہلکے سے دھکے سے ڈھے جانے والی بیگانگی کی دیوار کے ساتھ چپکا ہوا۔ کسی کا مان اور دھیان وہ کسی طور ہٹانے کا خود میں حوصلہ نہیں رکھتی تھی، مگر کب تک؟ یہ سہمہ لفظی آسیب کسی بگولے کی طرح اسے گھیر کر چکرا دیتا تھا' وہ محبت اور تقدیر کے چکر میں بری طرح پھنس چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

"سفیر کے مزاج میں اس قدر بے زاری اور روکھا پن کیوں ہے؟"

سونی کے دلچسپی سے پوچھے گئے سوال پہ انڈے پھینٹتی وانیہ کا دل سہم کے دھڑکا۔ صد شکر کہ اس کی طرف پشت تھی۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" کچھ دیر بعد وہ سنبھل کر محتاط انداز میں گویا ہوئی۔ "دراصل پولیس کی جاب میں ناک پہ غصہ ٹکے رہنا عادت سی بن جاتا ہے۔ ورنہ وہ بندہ اتنا خشک مزاج بھی نہیں ہے۔"

وہ ذرا سا مسکرائی اور پلٹ کر بغور سونی کو دیکھا جو اس کے اس طرح غور سے دیکھنے پہ کچھ جھینپ سی گئی۔

"مجھے تو انعم آپی بھی آدم بے زار ہی لگتی ہیں۔" سونی نے فوراً" بات کا رخ پلٹا۔

"انعم تو واقعی خوش مزاج ہے۔ بس آج کل گھریلو ٹینشن کی وجہ سے سب سے کھنچے رہنا فطری سا ہے۔"

"کیا میں ٹینشن کی بابت پوچھ سکتی ہوں؟" سونی دو قدم آگے بڑھ کر اس کے پہلو میں کھڑی ہوئی۔

"اس صبح کا ناشتا کیا آج ہی ملے گا یا پھر کل تک انتظار کرنا ہوگا؟" اپنے عقب میں ابھرنے والی سفیر کی بشاشت سے بھرپور آواز پہ وہ دونوں کرنٹ کھا کر مڑیں۔ گھر کی دیگر خواتین رانی کے ساتھ ناشتا لے کر ودیعہ کے سسرال گئی ہوئی تھیں۔ رات سے افشاں پاؤں میں موچ کے باعث بیڈ ریسٹ پہ تھی۔ سو گھر میں موجود افراد کا ناشتا وانیہ کے ذمے تھا۔ وہ فل یونیفارم میں انتہائی تروتازگی کے ساتھ کچن ٹیبل کی کرسی کھسکا کر بیٹھا اور وانیہ پہ ایک مسکراتی سیدھی نظر ڈالی۔ "لو... اب کروڑوں دیوں میں لاکھوں من تیل ڈلواؤ کہ تمہارا شہر تمہارے رقیب سے خالی جو ٹھہرا۔"

وہ احمر کے لوٹ جانے پر اسے خوش دیکھ کر ہمیشہ خاموش سی ناراضی کا مبہم اظہار نہ چاہتے ہوئے بھی کر جاتی تھی کہ وہ اس کی منکوحہ تھی جسے دیکھ کر ڈی ایس پی صاحب کا آدھا خون جل جاتا تھا۔ وہ اس خفا نظر کے جلتے' ابلتے انداز بھانپتے ہوئے بہت کچھ سمجھتا ہوا' گھنی مونچھوں تلے مسکراہٹ دبائے چپ کی زباں میں ہی ہم کلام ہوا۔

"کیا میرے وجود کے ہلکے پن سے تمہیں اندازہ نہیں ہو رہا کہ میں کیسے تن من کے دیپوں میں تمہاری خواہش کے مطابق تیل ڈلوا کر ہی سامنے بیٹھا ہوں۔"

احمر کے متعلق اس کی خفگی جان کر وہ جان بوجھ کر اسے زچ کرتا تھا کہ دیکھو میں اب حالت جشن میں ہوں' مگر وانیہ کی بھی اک نظر اٹھا کر یہ جتانے کی دیر تھی۔ (بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی) اگر سونی وہاں موجود نہ ہوتی تو ابھی جشن کے پنڈال میں بھگدڑ

مچ چکی ہوتی۔ وہ اسے بنا دیکھے ناشتے کے لوازمات سرو کرنے لگی۔

"اور سنائیں پھر؟" وہ ان جھکی نظروں پہ نظر جما کر بولا۔ بس وہ لب ولہجہ مسکراتا ہوا تھا۔

"جی!" وہ ایک دم سٹپٹائی۔

"کہ سونی صاحبہ کی ایجوکیشن کہاں تک پہنچی؟" وہ ان خوش رو آنکھوں سے نظر ہٹا تا کسی اور سے مخاطب تھا۔ اس کی جان میں جان آئی۔

"شکر ہے آپ نے ہمیں مخاطب تو کیا۔" توقف سے کیے گئے اس کے شکوے پر سفیر نے بھی مُنا سا قہقہہ لگایا۔

"میری قریب کی نظر دور کی نسبت بہت... زیادہ اچھی ہے۔" لفظ 'بہت' کھینچ کر ادا کیا گیا۔ وانیہ دانت کچکچا کر رہ گئی۔ دل میں عہد باندھا کہ آئندہ احمر آئے تو سہی اس کے ساتھ ڈنر نہ کیا تو پھر کہنا۔

"سونی! آپ بھی یہیں ناشتا کرلیں۔" وہ آداب میزبانی ادا کرتی مسکرائی۔

وانیہ کے کہنے کی دیر تھی۔ اگلے ہی پل وہ سفیر کے سامنے بیٹھی ہنس ہنس کر کچھ یوں باتیں کر رہی تھی کہ میں تمہاری قریب کی نظر کی اچھائی کی قائل ہو چکی ہوں۔ وانیہ نے ان دونوں کو چائے سرو کی۔

اس کے سوجے پپوٹے شب بیداری کی چغلی کھا رہے تھے۔ اکلوتی بہن اس سے دور ہوئی تھی۔ وہ بے چین سا ہوا۔ وہ آہستہ سے مڑ گئی۔ اسے ابا اور چچا کے کمرے میں بھی چائے بھجوانی تھی۔ انعم ابھی تک سو رہی تھی' وہ سب سے پہلے بوا کو ناشتا دے چکی تھی۔

"آپ کا ارادہ کب تک آزاد رہنے کا ہے؟" سونی کی چنچل آواز نے ان دونوں کی خاموشی کے تمام تار جھٹکے سے توڑے۔ وہ دھیرے سے مسکرایا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھا۔

"اصل مسئلہ تو یہی ہے۔" بات کرتے ہوئے وہ سنک کی طرف بڑھا۔ وہ ٹونٹی کھلی چھوڑ کر ذرا پرے ہوئی۔ وہ اس کے برابر کھڑا ہوا۔

"کیا مسئلہ ہے؟" سونی نے خاصی بلند آواز میں پوچھا۔

اس نے رخ ترچھا کر کے وانیہ کے تپے' تپے رخساروں کو دیکھا۔ وہ کلس کر رہ گئی۔ (ہیرو کا چچا)

"آزاد ہی تو نہیں ہوں۔" وہ جملہ وانیہ کے حواسوں پہ برف بن کے گرا۔ وہ سرگوشی صرف اس کی سماعت نے سنی تھی۔ سونی اسے اپنی جانب آتے دیکھ کر دوبارہ گویا ہوئی۔

"بتا بھی دیں۔"

"ابھی تو دیر ہو رہی ہے۔ پھر کبھی ان شاء اللہ!" وہ اس کے سر پہ ہلکی سی چپت لگا کر لاؤنج کی جانب بڑھا۔

"تم سے خدا پوچھے گا سفیر...!" وانیہ کی حالت اس وقت کھسیانی بلی کھمبا نوچے جیسی تھی۔

☼ ☼ ☼

سالوں بعد نظر آنے والا وہ چہرہ پہچاننے میں اسے سیکنڈ بھی نہیں لگا تھا۔ جیسے بیچ میں بیس سال آئے ہی نہیں تھے۔ جیسے وہ اس کے پاس سے اٹھ کر دروازے سے ہی واپس پلٹ آیا تھا' مگر اس کے سفید بالوں میں جھلکتے چند سیاہ بال سالوں گزر جانے کی گواہی دے رہے تھے۔ وہ نقوش دل میں یوں نقش تھے جیسے دو سال نہیں اس نے عشیر عباس کے ساتھ دو صدیاں گزاری تھیں۔

وہ گھر کے بچوں کی شادیوں پہ بس میرج ہال تک جاتی تھی' آج ہی خلاف معمول کچھ ہوا تھا۔ وہ قائل ہو چکی تھی کہ راستہ بدل کر چلیں تو کچھ نہ کچھ انہونی ہو کر رہتی ہے۔

وہ اسے سامنے پا کر پتھر کی ہوئی تھی یا کانچ کی ہوئی تھی' مگر اس لمحے وہ ان دونوں چیزوں کے ٹوٹنے جیسی کیفیت سے گزر رہی تھی۔ اس نے سانس کو پلک جھپکنے کے جتنے پل میں اپنے وجود سے اڑتے محسوس کیا۔ وہ شخص آج بھی ادھر ادھر توجہ نہیں دیتا تھا۔ کبھی وہ اس کی اسی روٹین پہ خوب تلملاتی تھی۔

"عشیر آپ نے ماہرہ کو دیکھا کس قدر موٹی ہو چکی ہے۔" وہ سہیلی کو بائے کہنے کے بعد ایک دم اس کی

طرف گھومی۔

"اچھا کہاں ہے؟" وہ ناک کی سیدھ میں دیکھتا۔

"افوہ۔ ابھی میں نے آپ کے پہلو میں کھڑے ہو کے پورے تین منٹ اس سے بات کی ہے۔" وہ جھنجلا کر کہتی۔

"دراصل میرا دھیان اس طرف نہیں تھا۔" وہ خفیف سا مسکرا کے سوری کہتا۔

آج عرصے بعد اس کی یہی عادت اسے نعمت خداوندی محسوس ہوئی۔۔۔ وہ اس کے عین سامنے بیٹھی دو خواتین سے کچھ پوچھنے لگا۔۔۔ وہ اس وقت شہر کی سب سے مہنگی ترین لیڈی ڈاکٹر کے کلینک کے او۔ پی۔ ڈی میں بیٹھی تھیں۔۔۔ آمنہ کا پیلا پڑتا وجود کپکپایا۔۔۔ یا شاید اس کا وجود نیلا پڑا تھا۔۔۔ یا پھر سیاہ۔۔۔ وہ رنگوں کے بارے میں جانے کب سے اپنی یادداشت کھو چکی تھی۔۔۔ شاید تب سے۔۔۔ جب سے اس کا وارڈروب بند تھا۔۔۔ اور اس کی بھاری خوب صورت آواز یہ کہتے ہوئے سماعت کو روشن نہیں کرتی تھی۔

"آج مسز عشیر کس رنگ کو اوڑھ کے اسے واقعی رنگ زدہ کرے گی۔"

تب ہی اس کے پہلو میں بیٹھی انعم کی نظر اس پر پڑی۔

"بوا جی آپ ٹھیک تو ہیں؟" اس کی پریشان کن آواز خاصی بلند تھی کہ وہ تینوں نفوس ان کی جانب متوجہ ہوئے۔۔۔ وہ نظر اٹھاتے ہی شعلے کی طرح بھڑکا تھا' خود پر مرکوز ان نگاہوں کی سرد بارش سے اگلے ہی پل بچا تھا۔۔۔ انعم نے قریب سے گزرتی نرس کو آواز دی۔

"ان کا بی پی شاید لو ہے' آپ پلیز چیک کریں۔"

اقصیٰ فہیم اور اس کی ماں اپنی نشست چھوڑ کر ان کی طرف لپکیں۔۔۔ کہ آمنہ کے ہونٹ سفید اور چہرہ بے جان ہی تھا۔

عشیر کو سانس لینے میں دقت کا سامنا کرنا پڑا۔

"انکل پلیز' ان کی نبض چیک کریں۔" اقصیٰ نے مڑ کر اسے پکارا وہ ہارٹ سرجن تھا' وہ بے اختیار اسی طرف بڑھا اور اسے بے آواز پکارا پھر اسی تکلیف کو چکھنے کے لیے اس نے دوبارہ سانس سینے کی طرف کھینچی۔ وہ چند قدموں کے فاصلے پہ ٹھہر گیا۔ وہ نامحرم کے ہاتھ میں اپنی کلائی کسی طور نہ دیتی۔

عشیر عباس کے وجود میں کتنے ہی جہان فنا ہوئے تھے اور اس کا اپنا نام و نشان بھی جیسے آج ہی مٹا تھا۔

تیرے بعد کوزہ فروش نے مجھے طاقچے میں سجا دیا
جہاں ٹوٹ جانے کا خوف تھا مجھے رات بھر میرے کوزہ گر

وہ کئی سال پہلے طاق سے گری تھی یا سنبھل گئی تھی۔ یہ وہی جانتی تھی۔۔۔ مگر اب ٹوٹ جانے کا خوف ختم ہو چکا تھا۔

"نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ مم۔۔۔ میں۔۔۔ اب ٹھیک ہوں۔" بے ربطی سے ہی سہی مگر اس نے دل کے اس مسیحا سے نظر ملا کے کہا تھا جو لوگوں کے دل رفو کرتا تھا۔ ان کی دھڑکنیں بحال کرتا تھا۔ دل کی کسی بھی تکلیف کے لیے سرجن عشیر عباس کا نام ہی باعث طمانیت تھا۔

وہ شاید بھی سنبھل گئی تھی مگر اس نے اس نامحرم کو اسی پل بکھرتے دیکھا تھا۔ ملیا میٹ ہوتے محسوس کیا تھا۔ یادوں کے کئی خواب آگئیں پل ان کے جسموں سے خوشبو کی مانند اڑ کر اندھا دھند باہر کو لپکے تھے۔ بھٹکنے کے لیے۔ دربدری کے لیے۔ وہ اچانک کھڑی ہوئی۔

"چلو انعم! رپورٹس پھر لے لیں گے۔۔۔ شکریہ۔"

"وہ اقصیٰ فہیم کو دیکھ کر پھیکا سا مسکرائی۔

"بوا۔۔۔ چیک اپ کروا لیتے ہیں!" انعم نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔" اقصیٰ نے اپنے بیگ سے کارڈ نکال کر آمنہ کو ہی پیش کیا۔ "آپ میرے سسر کے کلینک ہی تشریف لائیے گا۔"

آمنہ کے ہاتھ سے وہ کارڈ پھسلا۔۔۔ وہ جیسے خود زمین بوس ہوئی تھی۔۔۔ اور ان سمندری آنکھوں میں بھاری شکوہ لنگر انداز ہوا۔

اگر زندگی کو رشتوں سے بھر چکے ہو تو محبت آج بھی تمہارے وجود میں ماتم کناں کیوں ہے؟ وہ قریب سے گزر گئی تھی۔۔۔ اور اس دل کے مسیحا کو زمین پہ پڑے کارڈ اور خود میں ذرا فرق محسوس نہیں ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

اختتام فروری سے ہی رخ آفتاب کے تیور بدل چکے تھے' وہ اب نرم نگاہی سے موسم بہار کے بدن چومتا تھا' نیلگوں دن اور سرمئی شامیں کب کی رخصت ہو چکی تھیں۔۔۔ وہ اندر آیا تو خاموشی طاری تھی۔

مومی سینٹر ٹیبل پہ کاپیاں پھیلائے کچھ لکھنے میں محو تھی۔۔۔ اور اس کے پہلو سے جڑی وانیہ۔ انہماک سے ڈائجسٹ پڑھنے میں محو تھی۔

"گھر میں سناٹا کیوں ہے؟" "سب لوگ کہاں ہیں؟" دو سوال ایک ساتھ کرکے وہ صوفے پہ ڈھے سا گیا۔

"ویری' ویری بیڈ چاچو جی!" قبل اس کے کہ وانیہ جواب دیتی' مومی نے منہ بگاڑتے ہوئے اس پہ شہادت کی انگلی سے وار کیا۔

وہ بے اختیار ہنسا۔ "کیوں بھئی۔ ہم اور اس قدر برے؟" کن انکھیوں سے وانیہ کو تاڑا۔

"گھر میں آنے کے بعد سب سے پہلے سلام کیا جاتا ہے۔" مومی ماتھے پہ بل ڈال کے بولی۔

"او' ہاں' سوری۔" وہ کھسیانا سا ہوا۔ "اب پھپھو سے بھی سوری کریں۔" وہ پھر سے استانی بنی۔

دونوں کی نظر بے ساختہ ملی۔

"ان سے تو میں کبھی سوری نہیں کروں گا۔ کیونکہ۔۔۔" وہ مدھم ہو کر مزے سے بولا۔

"امی اور چچی ودیعہ کے ہاں گئی ہوئی ہیں۔ بھابھی اپنی بیڈروم میں ہوں گی۔ بوا انعم کے ساتھ کلینک گئی ہیں۔" وہ اس کا جملہ مکمل ہونے سے قبل ہی روانی سے بولتی چلی گئی۔

وہ جو اس کی معلومات پہ یک ٹک اسے متحیر سا دیکھ رہا تھا۔ ایک دم ہی کھل کے مسکرایا۔ "کہتے ہیں ادھورا جملہ زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔" وہ سر جھٹک کر شریر انداز میں گویا ہوا۔ "یہ اتنا پر بہار کیوں ہے۔"

وانیہ نے زوردار آواز میں رانی کو پکارا۔ سفیر کی پیشانی پہ ایک بھاری بل پڑا۔ اب بہار کا سنگھار غائب ہو گا۔ اس نے دل میں خوب مزہ لیا۔

"اس وقت میرا موڈ رانی صاحبہ کے ہاتھ کی بنی چائے پینے کا قطعا" نہیں۔" وانیہ اس پہ تیز نظر ڈالتی بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے اٹھی۔

"کب سے کمانے والے ہو چکے ہو۔۔۔ شادی کرو۔۔۔ خوب خاطر داریاں کرو۔" ثمیرا عاقل اپنے بیڈروم سے آتے ہی لب کشا ہوئی اور ایک چڑاتی نظر سفیر پہ ڈالی۔

"تو لڑکی ڈھونڈیں۔ میں نے منع کب کیا ہے۔" وہ ہمیشہ کی طرح بنا چڑے اس سے دوستانہ انداز میں گویا ہوا۔

"اب انڈیا جانا ہو گا کیونکہ پاکستان کی تمام لڑکیاں تو آپ ریجیکٹ کر چکے ہیں۔" اب کے ثمیرا خاصا جل بھن کر بولی۔

"تو آپ لوگ بھی تو کوئی ڈھنگ کی گھریلو سی لڑکی ڈھونڈیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"ہمارے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے۔" وہ اس کی سنجیدگی کو دانتوں تلے چبا کر بولی۔ پانچ سال لڑکیاں دیکھتے اور اسے دکھاتے ہلکان ہو چکے تھے۔ مگر وہ ہر تصویر میں سے کوئی نہ کوئی نقص ضرور ہی نکال دیتا۔

انعم اور بوا ایک ساتھ اندر آئیں۔ انعم کی شکل سے پریشانی ٹپک رہی تھی۔ بوا بھی نہایت نڈھال حالت میں تھیں۔

"کیا ہوا؟ سب خیریت ہے؟" وہ حواس باختگی سے اٹھا۔

"کچھ نہیں' بس یوں ہی بلڈ پریشر ذرا سا لو ہو گیا تھا۔" بوا نے اس کا پر تفکر چہرہ مسکرا کے دیکھا۔

"آپ دونوں میں سے کس کی طبیعت خراب تھی؟" ایسے وہ دونوں ہی اپنے حساب سے ٹھیک نہیں لگ رہی تھیں۔

"میں تو بالکل ٹھیک ہوں چندا۔ میں تو اسے لے کر گئی تھی۔" انعم بوا کی بات پہ ایک دم گڑبڑائی۔
"ارے نہیں بھائی.... کلینک میں ان کی طبیعت.... اچانک بگڑ گئی تھی۔"
بہن کا صفائی دیتا لب و لہجہ اسے چونکا گیا.... انعم کے چہرے کی سرخی.... بات 'کچھ' کچھ سفیر کی سمجھ میں آچکی تھی.... وانیہ نے بمشکل مسکراہٹ چھپائی تھی۔ سفیر نے اس کا متبسم چہرہ کسی خوش کن احساس میں گھر کر دیکھا۔ بوا نے ایک نئے رشتے کے احساس کو سفیر کے چہرے پہ بھرپور خوشی کی صورت اترتے پایا۔ وہ دل سے نہیں، بہت گہرائی تک خوش ہوئیں۔
"آج بڑے دنوں بعد پرانی جون میں آئے ہو۔ کیا بات ہے؟" بھائی کے مزید چڑھائی کرنے سے پیشتر وہ گفتگو کا رخ موڑ چکی تھی۔
"آج موسم اچھا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے برجستگی سے جواب دیا۔
"یوں کہو کہ آج تمہاری دل کا موسم اچھا ہے۔ کیوں وانیہ۔ ورنہ موسم بدلے تو کافی دن ہوئے۔"
انعم کی تائید وانیہ کو خواہ مخواہ ہی محسوس ہوئی۔
"میں نے پوری بات سنی ہی نہیں۔" اخبار پھیلا کے جھٹ سے خود کو ان کی محفل سے الگ کیا۔ (اس کے معاملے میں پہلو تہی ہی بہتر ہے) کوئی ایک خبر خوش آئند نہیں۔ پتا نہیں ہمارے ملک کی سیاست پہ ایمان داری کی بہار کب آئے گی۔" سرد آہ۔ بھری۔
"کیونکہ وانیہ بی بی آپ کا ارادہ پوری بات سننے کا کبھی بنتا ہی نہیں۔" اس کے عجب سے لب و لہجے نے اسے ساکت کیا تھا۔
"میرے ادھورے جملے کیا تمہارے گرد روشن صبح نہیں کیے رکھتے؟" یہ بات وہ جانتی تھیں کہ ان کے دونوں بچوں میں بلا کی انڈر اسٹینڈنگ ہے خصوصاً "ماں سے اخلاقی بات پہ وہ شیر و شکر ہونے میں پل کی تاخیر نہیں کرتے تھے' اب بھی انہوں نے اپنے خیالات و نظریات کا جو بم سدرہ بیگم کے سر پر پھوڑا تھا وہ انہیں حالت کوما میں لے جانے کے لیے کافی تھا۔ کتنی ہی دیر سے وہ ان دونوں کو اجنبیوں کی طرح تکے جارہی تھیں۔
"امی پلیز بتادیں' اگر آپ نے ہمیں پہچان لیا ہو' تو مزید کچھ کہنے کی جسارت کروں۔"
احمر نے ان کی آنکھوں کے آگے باقاعدہ ہاتھ ہلا کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا' اور وہ' واقعی جیسے کومے سے جاگی تھیں۔
"ایسا نہیں ہوسکتا۔" وہ بیٹی کی خود پہ گڑی نظروں سے بنا خائف ہوئے سرسراتی آواز میں بولیں' مگر کیوں امی! یہ سونی کی خواہش ہے۔" وہ ایک 'ایک لفظ پہ زور دے کر بولا۔
"یہ ایک فضول خواہش ہے" وہ بھی جواباً" لفظ چبا کر بولیں۔ "تم دونوں بخوبی جانتے ہو کہ اس خاندان میں تمہارا رشتہ بھی تمہارے باپ نے بنا مجھ سے رائے لیے جوڑا تھا اگر یہ محض منگنی ہوتی تو اس کی وفات کے بعد میں انگوٹھی عمارہ بیگم کے منہ پہ مار آتی۔"
ان کی آواز بھیگی "مگر تمہارا باپ میری عمارہ سے یا اس گھرانے سے نفرت اور کدورت جانتا تھا' سمجھتا تھا۔ صرف مجھے اذیت دینے کی خاطر اس نے یہ پکا کام کیا۔ پھر اس سارے قصے میں وانیہ تو بے قصور ہے پھر میں اسے طلاق یافتہ کیوں کہلواؤں۔ اس بچی نے مجھے ہمیشہ انتہائی قدم اٹھانے سے۔"
وہ جملہ مکمل نہیں کرسکیں.... آنسوؤں کا ریلا بے قابو ہوا.... "میں دونوں بچوں کو اس آگ میں نہیں جھونک سکتی احمر۔" کافی دیر بعد ان کی سسکیاں تھمیں' تو وہ التجائیہ سی ہو کر بولی تھیں۔
"وہاں قیام کے دوران چند دن بھی اس گھر کے نوالے جیسے میرے حلق سے اترتے ہیں یہ میں ہی جانتی ہوں۔ وہ رزق میری زبان کو سو بار ڈستا ہے جس کی بنا پہ آمنہ کا گھر برباد ہوا۔ جس کی وجہ سے میرا غرور' میری انا۔ میرا وجود برباد ہوا۔ اور۔۔ اور۔۔ انعم کی آنکھوں کی نمی پہ میں نے اس دسترخوان پہ موجود ہر چیز کو قہقہے لگاتے دیکھا تھا ان بے بس اور خوف زدہ آنکھوں کی نمی نے میرا دل چیر رکھا ہے سونی!" وہ جیسے

اپنے آپ میں نہیں تھیں۔ "تم اس دولت کا کیا کرو گی جو تہ در تہ آنسوؤں اور حسرتوں میں لتھڑی ہوئی ہے۔" وہ پاگلوں کی طرح ہنسیں۔

سونی کو اس لمحے ماں واقعی پاگل خانے سے بھاگی ہوئی محسوس ہوئی تھی اس کا دل پل بھر کو کانپا۔

"میں اس دولت پہ عیش کروں گی امی! جیسے عبید ماموں کی بہوئیں کر رہی ہیں۔" وہ ماں کو دکھ کی کیفیت سے نکالنے کے لیے یوں ہی بلاوجہ منہ پھاڑ کے ہنسی۔

سدرہ نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔

"وہ نوٹ تمہارے بھی کسی کام نہیں آئیں گے سونی۔۔۔ آمنہ کی طرح میری طرح' انعم کی طرح۔ اور اس سے بھی پہلے کئی شراکت داروں کی طرح (کسی کام کے نہیں)"

نرمی سے متحیر ہوئی بیٹی کو خود سے دور کیا۔ اور ہولے سے وہاں سے اٹھیں۔

"امی وہ شراکت دار قبروں میں گہری نیند سو چکے ہیں۔ اب وہ روز قیامت ہی اٹھیں گے' اسی دن حساب کتاب ہوگا۔ اس سے پہلے تو کھلا عیش۔۔۔ جواب مقیم فیملی میں سونی کا بھی مقدر ہوگا۔"

سدرہ کو بیٹی کو قہقہے نے پتھر کر دیا تھا' وہ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکیں اور چہرہ گھما کے اسے دیکھا جو اپنے آنسو پونچھ رہی تھی جو سارے آمنہ کے نام سے روشن تھے۔ آمنہ جو خاک ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

دونوں خواتین کو گھر ڈراپ کرنے کے بعد اس کی گاڑی کا رخ ساحر کے کلینک کی طرف تھا۔ اسے دیکھتے ہی ساحر نے چند اگلے مریض تیزی سے بھگتائے تھے۔

وہ جانتا تھا وہ اب گھنٹوں سامنے بیٹھا تا خود پرچہ حل کرے گا نا اس سے کچھ پوچھے گا۔ ساحر وقتاً" فوقتاً" چائے منگواتا رہا کپ خالی ہوتے رہے' آج ان آنکھوں کی سطح صرف نم نہیں تھی آج ان میں شگاف پڑ رہے تھے وہ سطح آنسو نگل رہی تھی۔

"میں نے اسے اپنی مرضی سے' رضا سے تو نہیں چھوڑا تھا مجھ سے طلاق جبراً" دلوائی گئی تھی۔" وہ اپنے لفظوں پہ زور دیتا زہر آلود ہو رہا تھا۔ اس کا سفید چہرہ گہرا سبز ہوا۔ یوں جیسے گوشت اور ہڈیاں گل گئیں ہوں محض ابھری تنی رگیں رہ گئی ہوں۔ ان تنی رگوں کے ہر بل میں غصہ آکٹوپس کا کام کر رہا تھا۔

"مجھ سے ڈائیورس پیپرز پہ ظالمانہ طریقے سے سائن لیے گئے تھے پھر۔ وہ میری لیے نامحرم ٹھہرائی گئی کیوں؟ تم دیکھنا بلکہ سننا کہ' کہ روز قیامت میری "کیوں؟ بہت بلند آواز میں ہوگی۔"

ساحر کے احساسات بھیگنے لگے۔

عشیر عباس کا سر پر زور انداز میں نفی میں دائیں بائیں ہلنے لگا پھر ہلتا ہی چلا گیا جیسے کسی نے اس کی گردن میں موونگ سسٹم فٹ کر دیا ہو۔

"انہوں نے مجھ سے کہا ان پیپرز پہ سائن کرو۔ کیا تم یقین کرو گے میں نے اپنی گردن کو حرکت تک نہیں دی مگر میں نے دائیں بائیں کتنے ہی جھٹکے کھائے تھے اور اس سے زیادہ جھٹکے میرے دل نے کھائے تھے۔ انہوں نے کہا تو کیا میں تمہارے سامنے خود کو شوٹ کر لوں۔" میرا نفی میں ہلتا وجود تھم گیا تھا۔

"اس پسٹل کی تمام گولیاں آپ کے بعد میرے سینے میں اتریں گی۔" وہ بے یقین ہوئے۔ یعنی باپ کے بعد بیٹا بھی دنیا سے جائے گا۔ انہوں نے لوڈڈ پسٹل بیڈ پہ اچھال دیا۔ اور بیڈ پہ سسکتی میری ماں کو کہنی سے پکڑ کر میرے ساتھ کھڑا کیا۔

"تمہارے پاس تین منٹ ہیں۔ سوچ لو۔ پھر میں سارہ عباس کو طلاق دے دوں گا۔"

میں اندر تک ہلا تھا۔ دو عورتوں میں سے ایک کو اجڑنا تھا۔ میں نے ماں کو بچا لیا۔ اور۔۔۔ اور تو کیا وہ طلاق ہو گئی تھی؟؟" اس نے اچانک کرسی چھوڑی۔ "تم مجھے کسی مفتی' کسی اسکالر کے پاس لے چلو ساحر۔ مجھ پہ ظلم ہوا تھا۔"

ساحر نے خود پہ جھکے عشیر کا ہاتھ پکڑ کے یوں تھپکا جیسے چھوٹے بچے کو پچکارتے ہیں کہ چپ کرو۔ ابھی چلتے ہیں۔

"نہیں خدا سے شکوہ کرتا ہوں کہ میرے جیسے مجبوروں کے لیے کوئی گنجائش کیوں نہیں رکھی گئی۔"

"اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لیے بہت گنجائش رکھی ہے۔ بندہ ہی جلد بازی کرتا ہے۔ تم مان لو عشیر! غلطی تمہاری بھی تھی۔ وہ تمہاری ماں کو طلاق دیتے تو تمہاری ماں کا نقصان نہیں اپنا نقصان کرتے۔ بہرحال اب جو ہو چکا اسے بھول جاؤ۔"

ساحر رندھی آواز میں بولا۔ آج پہلی بار وہ اس پہ کھلا تھا۔

"وہ آنکھیں آج بھی بے یقین تھیں۔ وہ آج بھی آخری لمحوں تک مجھے دیکھتی رہی تھی مگر آج میں اسے نہ پکار سکتا تھا نہ روک سکتا تھا۔ میں اس کے پیچھے بھی نہیں جا سکتا تھا۔ میں یہ تک نہیں کہہ سکتا تھا کہ آمنہ بار کو یار۔ بات تو سنو۔ تمہیں پتا ہے میں نے اس سے یہ الفاظ کتنی بار۔ اور کتنے سال کہے ہوں گے۔ پانچ سالوں میں شاید پانچ ہزار مرتبہ مگر آج میں ایک بار بھی نہیں کہہ سکا۔" وہ زمین پہ گھٹنوں کے بل بیٹھا پھر وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔

"لوگ میرے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں درد ہوتا ہے۔ وہ تکلیف میں تھی پھر اس نے مجھ سے کیوں نہیں کہا کہ درد ہوتا ہے۔ "مجھے بھی درد ہوتا ہے عشیر!" اسے کہنا چاہیے تھا۔ میں اب کس سے کہوں کہ مجھے بھی درد ہوتا ہے۔ آمنہ، میں آج بھی اتنی ہی تکلیف میں ہوں۔" ساحر نے آنکھوں کے گوشے صاف کیے اور اسے یوں ہی رونے دیا۔ وہ پتھر نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اسے سکون آور انجکشن لگا رہا تھا۔ ابھی اس نے شائنہ عباس کو فون پہ اس کے یہاں ہونے کی اطلاع دینی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج کی شب پھر ماہ بہار کی ہوا زخم خوردہ تھی۔ شوریدہ تھی۔ آج کی شب پھر نیند اجڑی آنکھوں سے اجنبیت برت رہی تھی۔ آج کی شب پھر درد نے پرانے قصے چھیڑ رکھے تھے۔ آج یاد کی کھڑکی پھر اس ٹھنڈی قبر جیسی گھور رات میں کھلی تھی۔ قبر کی تازہ کھدی مٹی پہ بھی چھڑکاؤ ہوتا ہے پھر وہ سوندھی خوشبو کیوں نہیں آتی۔ پہلی بارش کی بوندوں کی خوشبو مردے محسوس نہیں کرتے۔ قبر کی کچی مٹی بھی نہیں مہکتی۔ دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ سے کھلا تھا پھر بند بھی ہوا۔ آمنہ نے برق رفتاری سے کروٹ بدل کر اسے اندر آتے دیکھا۔ آج بھی اس کی اپنی التجائیہ ٹوٹی بکھرتی آواز اس کے قبر نما کمرے میں چہار سو ابھری۔ سانس نے قریب آتے وجود کی خوشبو کو محسوسات کی گرہ سے باندھا۔۔۔ وہ اس کی پناہ میں جس قدر سما سکتی تھی سمائی۔

"چلو عشیر! ہم کہیں چھپ جاتے ہیں۔" آج اس مہربان پناہ کی سرگوشیاں کسی بھی حرف تسلی سے خالی تھیں۔ یوں جیسے وہ خود اپنے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ وہ اپنی محبوب بیوی کا چہرہ حفظ کرنے لگا۔ مگر وہ اسے حفظ تھا اب وہ گردان کرنے لگا۔ ان گنت سیاہ بالوں میں ایک لٹ بھوری تھی اس نے بھوری لٹ کو احتیاط سے چھوا۔ اس کی لونگ میں جڑے چاروں ہیرے۔ آج پہننے والی کی قسمت کی طرح بجھ چکے تھے۔ وہ اونچا لمبا مضبوط مرد ایک نحیف سا آسرا بھی رشتے کے اس لرزتے ستون کو نہیں دے سکا تھا۔ ان ہاتھوں کا گرم جوش لمس مردہ تھا۔ وہ تڑپ کر اس پناہ سے دور ہوئی۔ عشیر کی پلکیں پہلی بار جھکی تھیں۔ وہ اس لڑکھڑاتے کپکپاتے وجود کو سہارا نہیں دے سکا تھا۔ وہ آنکھ ندامت سے جھکی تھی۔ رشتہ توڑ دینے کی ندامت سے زیادہ وہ اس شرم سے زمین میں گڑ رہا تھا کہ اس کا وجود اب اس عورت کے لیے نامحرم ہو چکا ہے جو اس کے قریب کھڑی تھی۔ وہ دو قدم پیچھے ہوئی۔ اس کے اندر تابوت اٹھنے جیسا شور اٹھا۔ کوئی رشتہ مر گیا تھا۔ جنازہ گاہ منتظر تھی۔

آمنہ کے جسم نے جھٹکا کھایا۔ سامنے کھڑے شخص

کی خاموشی کلمہ شہادت پڑھ رہی تھی۔ وہ الٹے قدموں الماری کی طرف بڑھی اور چادر اٹھا کر کمرے سے باہر بہ عجلت نکلی۔ وہ روئی نہیں تھی۔

قبر تازہ تھی' چھڑکاؤ تازہ تھا۔ وہ اس قبرستان کی حدود سے نکلتی چلی گئی۔ وہ اپنے بیڈ روم میں مردہ ہو کر آیا تھا۔ وہ کچی مٹی کی خوشبو کیوں کر محسوس کرتا۔ اس کی بے جان نگاہیں کھلے وارڈروب میں الجھیں۔ وہ تمام خوش رنگ لباس سیاہ ہو کر نوحہ کناں تھے۔ کیا وہ کلر بلائنڈ ہو چکا تھا۔ اب وہ تمام لباس سفید ہو گئے تھے' کیا انہیں پہننے والی بیوہ تھی۔ اس نے ذہن پہ زور دیا۔ وہ کس کی بیوہ کے کمرے میں منہ اٹھا کر چلا آیا ہے۔ بھلا وہ کسی نامحرم کے کمرے میں ایسے کیونکر آسکتا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ اس کے سامنے کھڑی تھی' اس کی ایک لٹ بھوری تھی۔ اس کے نچلے ہونٹ کے نیچے بالکل وسط میں ایک سنہری تل تھا۔

تو کیا اس کا شوہر اچانک مر گیا۔ کیا عشیر عباس مر گیا۔ ہاں وہ مر چکا ہے۔ وہ بدن کی پوری قوت لگا کر چیخا۔ وہ ہوش و حواس چھوڑ چکا تھا۔ گھر کے تمام افراد اسے سنبھالنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ اس بیڈ روم میں صرف عباس خان نہیں تھے' آج کی شام وہ جیت گئے اور وہ نہیں جانتے تھے تقدیر جانتی تھی کہ آج کی شام ہی وہ بری طرح ہار چکے تھے۔

☆ ☆ ☆

انہوں نے محسوسات کی ایک 'ایک گرہ کھولی تھی۔ جھٹکی تھی مگر وہ خوشبو وہ نامحرم خوشبو نہیں اڑی تھی۔

"مجھے معاف کرنا میرے اللہ!" وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"بوا..... کیا ہوا ہے۔ آپ نے کوئی خواب دیکھا ہے؟" انعم کی پریشان آواز ان کی سماعت میں اتری۔

"تو کیا وہ درحقیقت روئی تھیں۔ نہ خیال نہ خواب۔ آج دکھ کے ہاتھ سے پھر ضبط کا ہاتھ پھسل گیا تھا۔ انعم نے نرمی سے ان کے رخسار صاف کیے۔ پھر ان کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔

"وہ عشیر عباس تھے؟" انعم نے پوچھا تھا۔ ان کی سماعت نے وہ نام سالوں بعد سنا تھا۔

"آپ کا اس قدر خاموش رہنا سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ مگر کل میں نے جانا۔ کہ اس شخص سے جدا ہو کر قوت گویائی کا چلے جانا ممکن ہے۔ اسے روبرو دیکھ کر احساس ہوا کہ اس زندگی کے ادھورے سفر کا ذکر سننا بھی۔ آپ کے لیے ہمیشہ تکلیف دہ کیوں رہا۔"

آمنہ کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ وہ سسکیاں انعم کو ادھوری کہانی سنانے لگیں جس کے چند باب اس کی نظروں سے گزرے تھے۔

☆ ☆ ☆

"اب تو عبید کی شادی کو بھی نو ماہ ہونے والے ہیں' خیر سے گھر میں خوشی آئے گی پھر لوگوں کا تانتا بندھا رہے گا' اب تو عذر گھڑ گھڑ کے میری زبان گھس چکی ہے۔ میں کہے دیتی ہوں مقیم صاحب! اب آمنہ کا معاملہ مجھ سے مزید نہیں دبایا جاسکتا۔ جو بھی ممکن ہو سکتا ہے وہ کرنا چاہیے بیاہی بیٹی کی عزت اپنے گھر میں بسے رہنے سے ہی ہوتی ہے۔"

زہرہ بیگم نے مناسب الفاظ اور نرم انداز میں اپنے شوہر سے درخواست کی۔ وہ شکر کرتی تھیں کہ آمنہ کے رشتے کے تمام معاملات شوہر نے اپنی مرضی ورائے کو اہمیت دیتے ہوئے اپنے جاننے والوں میں طے کیے تھے ورنہ موجودہ صورت حال کے پیش نظر انہوں نے خود بری الذمہ ہو کر زہرہ کی جان عذاب میں ڈالے رکھنی تھی۔

"عباس خان سے میرا تعلق کئی برسوں کا تھا۔ دیکھنے میں کس قدر خاندانی اور وضع دار گھرانہ تھا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شادی کے بعد اس قدر گھٹیا پن کا مظاہرہ کریں گے۔" مقیم ہاشم کا لہجہ پر تنفر تھا۔

"معاف کرنا مقیم صاحب' مگر ہمارے بارے میں بھی ان کی رائے کچھ ایسی ہی ہے۔" وہ استہزائیہ سی ہو کر بولیں۔ مقیم کا سارا خون اس کے سلوٹ زدہ چہرے پہ چھلکا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" بارعب لب ولہجہ۔
"تمہاری سمدھن کسی جاننے والی سے کہہ رہی تھیں۔ اس قدر خاندانی اور طرح دار لوگوں سے ہمیں یہ توقع نہیں تھی کہ ہندو بنیوں کی طرح بیٹی کو محض جہیز پہ ٹرخادیں گے اور اللہ کے احکام کو خالو جی کی دکان پر لگا پوسٹر سمجھتے ہوں گے۔"

بیوی نے بنا خوف زدہ ہوئے نہایت سکون کے ساتھ شوہر کو مطلب سمجھایا۔ اور وہ خوف زدہ کیوں ہوتیں۔ وہ اپنے ساتھ میکے سے شرعی حصہ لے کر آئی تھیں۔ ان کے چہرے پہ چپکی طنزیہ مسکراہٹ نے نہ صرف مقیم کا تنفس تیز کیا بلکہ دماغ تک گھما ڈالا۔

"تمہیں اس عورت کو بتادینا چاہیے تھا کہ لاکھوں کا جہیز اور بیس تولے سونا کیا شریعت میں نہیں آتا۔"
وہ دبے لفظوں میں ان پہ برسے۔

"میں کوئی دینی عالمہ فاضلہ نہیں کہ شرعی احکام لوگوں کے گوش گزار کرتی پھروں۔" آپ کسی دن پنچایت بٹھا کر قرآن پاک چوم کر پھر آنکھوں کے ساتھ لگا کر کھولیے گا کیونکہ آپ شرع کے احکام و مسائل زیادہ بہتر طریقے سے سمجھا سکتے ہیں۔" زہرہ بیگم نے الفاظ کی صورت مقیم ہاشم پہ جیسے جلتے کوئلے پھینکے تھے۔ مگر وہ مضبوط اعصاب اور روایات کا علم بردار شخص نہ سلگا۔ نہ جلا اور نہ خاک ہوا۔ بلکہ وہیں کوئلے پلکوں پہ رکھ کے بیوی پہ بھسم کرنے والی نگاہ ڈالی جس میں شریعت اور ایمان آنکھ کے آخری کنارے پہ بھی نہیں اٹکے تھے۔

"وہ زیور... وہ جہیز سمجھو کہ ایک رواج ہے ایک تحفہ ہے۔ شرعی حساب سے اس کا جو بھی حصہ ہے دے دلا کر اس کے سسر کی ضد پوری کردیں۔ بیٹی کی عزت و توقیر بھی بڑھ جائے گی اور آپ کل کو خدا کے سامنے جواب دہ بھی نہیں ہونا پڑے گا۔"

ان کا مدھم، نرم لہجہ قائل کرنے کے جیسے رنگوں سے جڑا تھا۔ مگر سننے والے کے کانوں پہ خود غرضی اور روایات کی دبیز پٹی بندھی ہوئی تھی... زیر پٹی وہ آنکھیں ایک مسلمان کی تھیں؟

مقیم ہاشم اور شمیم ہاشم کو سونے کا بزنس وراثت میں ملا تھا وہ لوگ مدت سے یہی کاروبار کررہے تھے۔ دوسری طرف عباس خان کے آباؤ اجداد نے قیام پاکستان کے بعد اپنی فیکٹریاں سکھوں کے حوالے کیں اور تبادلے میں ان کی جیولری شاپس انہوں نے اپنے قبضے میں کرلیں۔ سکھ وہ دکانیں بمعہ زیورات کے ان کے سپرد کرگئے تھے۔ لاہور کے معروف سوہا بازار میں ان کی جیولری کی ایک مارکیٹ تھی۔ جہاں مقیم ہاشم کی اپنی مارکیٹ کا مین آفس جس کی بیسمنٹ میں ان کی سب سے کشادہ ہائی کیرٹ جیولری شاپ تھی۔ جسے دیکھ کر عباس خان کی رال ٹپکتی تھی۔ اس نے اپنے ایک دو قریبی دوستوں سے انہیں کئی بار پیغام بھی بھجوایا کہ انہیں یہ آفس بمعہ دکان منہ مانگی قیمت پہ چاہیے۔

مقیم نے ان کی آفر ایک نرم معذرت کے ساتھ لوٹا دی تھی۔ مگر وہ اس دکان کو حاصل کرنے کے لیے اپنی عقل کے گھوڑے دوڑاتے رہتے تھے۔ وقت تیز رفتاری سے بھاگتا گیا ان کے بچے جوان ہوگئے۔ دونوں میں اچھی خاصی دوستی کا رشتہ استوار ہوگیا۔ یہ الگ بات تھی کہ مقیم اس آفر کو بھول بھال گیا جبکہ عباس کے گلے میں وہ دکان ایک میٹھی پھانس کی طرح اب بھی اٹکی ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

مقیم ہاشم کی سیاہ ہنڈا سٹی لاہور کے ایک پوش علاقے کے ایک جدید طرز تعمیر کے بنگلے کے پورٹیکو میں نرم جھٹکے سے رکی۔ آج وہ عباس خان کے بڑے بیٹے امیر عباس کی منگنی کی تقریب میں بمعہ فیملی شرکت کے لیے آئے تھے۔ ان دونوں کی بیویوں کا اکثر بازار میں ٹکراؤ ہوجاتا تھا مگر کسی بھی گھریلو تقریب میں یہ ان کی پہلی شرکت تھی۔

عشیر نے اپنے بیڈروم کا پردہ سرکا کر بے تابی سے نیچے جھانکا۔ وہ "اتفاقاً" ایک بار ان کی گاڑی کا ٹائر پنکچر ہونے کی صورت ماں کے کہنے پہ آمنہ اور ان کی والدہ

کو لفٹ دے چکے تھے بلکہ ان کے ڈرائنگ روم میں ماں بیٹا ایک پر تکلف چائے بھی پی چکے تھے۔ عشیر تب ایم بی بی ایس کے پہلے سال میں تھا یہ تین سال پہلے کی بات تھی۔ اسے آمنہ پہلی نظر میں بہت اچھی لگی تھی اور وہ چہرہ اسے اب تک یاد تھا۔ تقریب کے اختتام تک عشیر کی نگاہیں اسی چہرے کا طواف کرتی رہی تھیں۔ جنہیں محسوس کر کے وہ وہاں کوفت میں ہی مبتلا رہی۔

ایک ماہ بعد وہ لوگ عشیر کا پرپوزل لے کر آگئے۔ اپنے بڑے بھائی سے مشورہ کرنے کے بعد مقیم نے یہ پرپوزل قبول کر لیا تھا پھر ایک شام نہایت سادگی سے آمنہ کی انگلی میں عشیر کے نام کا سب سے قیمتی ہیرا ڈال دیا گیا۔ ہیرے کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ جس کی وجہ سے اس تک پہنچا تھا' وہ شخصیت' وہ نام دل کے اجلے کشادہ قلعے میں کسی مجذوب کبوتر کی طرح پھیریاں لگانے لگا تھا۔ اس رشتے میں بندھنے کے بعد وہ اس کی یونیورسٹی اس کے ڈپارٹمنٹ تک چلا آتا تھا۔ مگر کبھی آمنہ نے ٹھہر کر اس کی سنی نہ کبھی اپنی سنائی۔ وہ اسے پکارتا ہی رہ جاتا۔

"منگنی کا کیا ہے۔ ٹوٹ بھی سکتی ہے۔" وہ عشیر کو کھری کھری سناتی۔

تب وہ نہیں جانتی تھی کہ دنیا میں صرف منگنی ہی نہیں کچھ بھی پائیدار نہیں۔ آمنہ کی سہیلیاں اسے پروانہ کہتی تھیں۔ اس ڈپارٹمنٹ کے لڑکے اسے رانجھا کہتے تھے مگر وہ رانجھا نہیں تھا اس نے ثابت کر دیا۔

اپنی اسپیشلائزیشن مکمل ہوتے ہی وہ اسے شان و شوکت کے ساتھ دنیاوی نگینوں سے سجا کر انتیس فروری کی ایک خوش رنگ دلفریب شام کو اپنے شاندار گھر میں بیاہ لایا تھا۔ زندگی میں صرف خوشیاں ہوتی ہیں پھر لوگوں کے چہرے اس قدر پژمردہ کیوں ہوتے ہیں۔ دو سال عشیر کی سنگت میں اس کی محبتوں کے' وارفتگیوں کے لعل و جواہرات سمیٹتے سمیٹتے گزر گئے۔

محبت کو اس نے ایسے پنکھ لگا دیے تھے کہ زمین سے وہ بے ٹھکانا تھی۔ ان پروں میں زمانوں اور جہانوں کے رنگ چمکتے تھے۔ کیا کوئی کسی کو پانے کے بعد بھی اس قدر چاہ سکتا ہے۔ وہ اسے ہر دن نئی دلہن لگتی۔ وہ ہر روز اسے اپنے بیڈ روم میں جیسے پہلی مرتبہ دیکھتا تھا۔

آمنہ عشیر کی پیشانی پہ خوش بختی کا دائرہ دن بدن سمٹتا جا رہا تھا۔ یہ تقدیر دیکھ رہی تھی۔ کیا محبت کے پنکھ رنگ جھاڑنے لگے تھے کم ایسا نہیں تھا۔

محبت آج بھی بلندیوں پر تھی مگر ہوا جانتی تھی کہ موسم وصال کو دیمک لگنی شروع ہو چکی ہے۔ گرم دوپہروں میں کھلنے والے تازہ پھول وہ اسی آنگن میں کھلتے دیکھتی تھی۔ وہ محبت کا کرشمہ تھا یا نظر کا دھوکا۔ یہ بھید ان دونوں کی پر تمازت مٹھیوں میں بند تھا۔ اور کیا خبر کتنی صدیوں بند ہی رہتا جو ایک دن عباس خان' مقیم ہاشم کے آگے سالوں پہلے کی عرضی ایک نئے رشتے کے سبب سے اک نئے انداز میں نہیں کھولتا۔ زندگی کا کیا بھروسا۔ بھلا وہ اور کتنا صبر کرتا۔ وقت کم تھا اور وقت تو جون کی دوپہروں میں کچا گلابی رنگ گھول کر زرد دھوپ کو رنگنے والوں کے پاس بھی کم تھا۔ کیوں تھا ایسا؟

☆ ☆ ☆

"اب وقت بدل رہا ہے تو سوچیں بھی ڈیولپ ہو رہی ہیں کچھ دوستوں کا مشورہ ہے کہ دونوں مارکیٹوں کے سینٹر میں جو کھلی دکان ہے کیوں نہ اس کو ایک سہ منزلہ یا پھر اس سے بھی زیادہ ایک پلازہ کی صورت جدید انداز سے تعمیر کیا جائے کچھ عرصہ بعد دونوں مارکیٹوں کی ویلیو اپ ہوگی۔"

انہوں نے مناسب الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے سبھاؤ سے اپنی خواہش ان کے سامنے رکھی۔ یا تو مقیم سمجھے نہیں تھے یا سمجھنا نہیں چاہتے تھے۔ تب ہی ان کی پرسکون نگاہیں اپنے سمدھی کی طرف اٹھیں۔

"جیسا چل رہا ہے یار۔ خوب ہے' مجھے ایسی تبدیلی کچھ خاص پسند نہیں۔" وہ بہت پر تکلف سا ہو کے مسکرائے۔

"مگر میں تبدیلی کا قائل ہوں۔" وہ [illegible]

کھنکارے۔ "بلکہ آپ ایسا کریں کہ آپ کی پراپرٹی میں سے جتنا حصہ بھی آمنہ کو جاتا ہے اگرچہ زیادہ بھی ہو' آپ اس دکان کی صورت دے سکتے ہیں باقی کی ہم قیمت ادا کردیں گے مگر میرا خیال ہے دونوں بیٹوں کا حصہ ایک طرف' بیٹیوں کا اتنا تو بنتا ہی ہو گا۔" وہ بلا تامل سنجیدگی سے ہمکلام ہوئے۔

مقیم کے چہرے پہ نہایت معصوم قسم کی مسکراہٹ ابھری۔

"ہمارے خاندان میں بیٹیوں کو حصہ دینے کا رواج نہیں ہے عباس خان!" مسکراہٹ کی صورت پھیلے اس کے لبوں نے پرغرور ہو کر یہ جملہ ادا کیا۔ عباس ریت کی طرح سرکے۔ وہ کیا کہتے۔ پھر وہ سنبھلے۔ پھر وہ لمحاتی خاموشی کی چٹان سرکا کر گویا ہوئے۔

"بات رواج کی نہیں ہوتی نہ ہو سکتی ہے۔ بیٹیوں کو شرعاً "حصہ" دینا پڑتا ہے۔ یہ اللہ کے اور اس کے نبی کے احکام ہیں' ان پہ بلاچوں وچراں عمل کرنا پڑتا ہے۔ میں نے تو اپنی تین بیٹیوں کو حصے دے دیے ہیں۔ میرے باپ نے ایک بیٹی چھ بہنوں کو حصے دیے تھے۔ اس میں یہ ریت رواج کہاں سے آگیا۔ مقیم صاحب؟" وہ اپنا اندرونی خلفشار اس پہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ سو نہایت ٹھنڈے لب و لہجے میں تحمل سے بات ختم کی۔ اور مقیم ہاشم کا اطمینان تعجب آمیزی سے دیکھا۔

"اتنا کچھ دینے دلانے کے بعد تمہاری اولاد کے پاس تو واقعی کچھ نہیں بچا ہو گا عباس!" انہوں نے چھوٹا سا قہقہہ بڑے طنز کے ساتھ لگایا۔

"کیوں نہیں بچا' ہماری بیویاں اور بہوئیں بھی تو حصے لے کر آئی ہیں۔ امیر عباس کی بیوی کے باپ کی فیکٹری میں تیس فیصد شیئرز ہیں جس کی ماہانہ بھاری رقم منزہ کے اکاؤنٹ میں جاتی ہے۔ اور بھلا یہ کیا بات ہوئی تمہاری اولاد۔ کیا بیٹیاں اولاد میں شامل نہیں ہوتیں۔" وہ حیرانی میں گھر کر بولے۔ "ذرا سوچو تاجدار کائنات کی نام و نسل اپنی بیٹی سے ہی آگے بڑھی تھی۔ اور اللہ جانتا تھا کہ اس کے بندوں کے دل بعض معاملات میں زمانہ جاہلیت میں ہی بھٹکیں گے۔ اس لیے تو اس نے بیٹی کو برابر کا حصے دار نہیں بنایا بلکہ بھائی کے مقابلے میں وہ آدھے حصے کی مالک ہوتی ہے۔"

ملکے سے مسکرائے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ پتھر پہ ضرب لگا رہے ہیں نہ کانچ پہ۔ ان کے سامنے وہ خلا نما شخص ایستادہ تھا پھر بھلا ضرب کہاں پڑتی۔

"کچھ بھی ہو مگر ہم یہ رواج اب ختم نہیں کرسکتے۔" لفظ اب پہ زور دیتے وہ نشست برخاست کر چکے تھے۔ عباس خان کے کانوں سے دھواں نکلا۔ انہوں نے زبان پہ آئی ایک بھاری گالی کو بمشکل روکا۔

✵ ✵ ✵

"کتنے فخر سے بتاتا ہے میں تو تہجد بھی پڑھتا ہوں' مل ملا کے آٹھ نمازیں بن جاتی ہیں الحمدللہ۔ الو کا پٹھا۔" باقی گالیاں انہوں نے زیر لب دی تھیں کہ سامنے بہو' بیوی اور بیٹی بیٹھی تھی۔

"اور کیسے غرور سے بتارہا تھا کہ ہم میں تو حصہ دینے کا سرے سے رواج ہی نہیں۔" ان کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

"چھوڑیں بھی عباس! ہمیں کس چیز کی کمی ہے۔ بس یہ یاد رکھیں کہ اس کی بیٹی میں ہمارے بیٹے کی جان اٹکی ہے۔ اللہ دونوں کو خوش رکھے۔"

"حصہ تو اس کے باپ کو بھی دینا ہو گا۔" وہ پانی کا خالی گلاس ٹیبل پر پٹختے اشتعال میں بھرے اٹھے اور لمبے' لمبے ڈگ بھرتے اندر آتے بیٹے کے سامنے لمحہ بھر کو ٹھہرے۔ انہوں نے عشیر کے سلام کا جواب بھی محض سر کے اشارے سے دیا۔

"کس کے باپ کو حصہ دینا ہو گا؟" اس نے نشست سنبھالتے ہوئے تینوں خواتین کی طرف باری باری دیکھا۔

"تمہارے سسر کے باپ کو۔" بہن نے ہنستے ہوئے بتایا۔

"وہ۔ پھر تو حشر کے دن ہی ملے گا۔" اس نے بھی ہنس کے کندھے اچکائے۔

"حشر کے دن بھی نہیں ملے گا۔" آمنہ کی آتی آواز نے ان سب کی ہنسی کا گلا گھونٹا۔ وہ ابھی سدرہ سے فون پہ بات کرکے آئی تھی اور من وعن ان کے گوش گزار کی۔ معاملے کی گھمبیرتا سے عشیر کا دل بے طرح دھڑکا۔ "یہ چھوٹا سا پورشن گھر سے الگ تھلگ کیوں ہے؟" وہ دونوں واک کرتے ہوئے اس طرف نکل آئے تھے آمنہ کے چہرے کا رنگ اڑا۔ "یہاں ہماری بوا' رہتی تھیں۔"

کچھ دیر کے توقف سے وہ ملال زدہ لہجے میں بولی۔

"کیوں؟" وہ متعجب ہوا۔

"وہ بیوہ ہوگئی تھیں تو دادا نے نقص امن کی وجہ سے انہیں یہ پورشن بنوا دیا تھا۔ دادی بھی جب تک زندہ رہیں بیٹی کے ساتھ یہیں رہائش رکھی۔"

وہاں اب ویرانی اور پرندوں کا ٹھکانہ تھا۔ اس پل عشیر نے آمنہ کے چہرے پہ وہی ویرانی اترتی دیکھی۔

"میں پاپا سے بات کروں گا۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔" اس نے بیوی کو بھرپور تسلی دی۔ اگرچہ وہاں موجود سب نے ان شاء اللہ کہا تھا مگر وہ لمحہ قبولیت کا ہرگز نہیں تھا۔

آنے والے دنوں میں بات بننے کے بجائے بگڑتی ہی چلی گئی۔ ان دونوں "مردوں" کی ضد آسمان کو چھو رہی تھی اور وہ دونوں میاں بیوی اناڑی تیراکوں کی طرح حالات کے بپھرے سمندر میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ عشیر عباس اسے چند گھڑیوں کے لیے بھی مقیم ولا نہیں جانے دے رہا تھا۔

"مجھے بابا سے ایک بار بات تو کرنے دو۔" وہ یہ جملہ دن میں کئی بار دہراتی۔

"کوئی فائدہ نہیں۔" ہر بار اسے یہ جواب ملتا۔ "ہم ویسے ہی پاکستان چھوڑ رہے ہیں میں نے کینیڈا جاب کے لیے اپلائی کردیا ہے۔ چند ہفتوں کی بات ہے بعد میں یہ لوگ چاہے دونوں مارکیٹوں کے بیچ دیوار کھڑی کردیں۔" وہ زہر خندی سے جیسے پھنکارا تھا۔

پھر بھی ایک دن وہ شوہر کی اجازت کے بغیر باپ کے پاس آئی تھی۔ مجید کی شادی میں بھی اس کے سسرال میں سے عشیر کے سوا اور کسی کو شرکت کرنے کی اجازت عباس خان نے نہیں دی تھی۔ اس کی ماں ہی تمام برادری کو کسی نہ کسی طرح مطمئن کرتی رہی تھی۔

"بابا! مجھے عارضی طور پر ہی پراپرٹی میں سے اسی دکان کی صورت حصہ دے دیجیے۔ عشیر کہہ رہے تھے ہم چند سالوں تک واپس کردیں گے' وہ کہہ رہے تھے میں جب امیر بھائی سے پراپرٹی الگ کروں گا تو اپنا حصہ بیچ کر بھی قیمت ادا کروں گا۔ آپ ہم دونوں سے کسی طرح کی بھی قانوناً" گارنٹی لے سکتے ہیں۔" منت اور عاجزی سے بھی کوئی نچلا درجہ تھا تو اس لمحہ وہ اس پر فائز تھی۔

"تمہارے شوہر کو اور تمہیں جائیداد کا لالچ نہیں۔ تم دونوں کو یہ حصہ عباس خان کی ضد پوری کرنے کے لیے چاہیے۔" انہوں نے ایک پر نخوت ہنکارا بھرا۔ تم ابھی اتنی عقلمند نہیں ہو۔ یہ زمینیں جائیدادیں کھلونے نہیں ہوتے کہ وقتی طور پر کسی کو کھیلنے کے لیے دے دی جائیں اور وہ عشیر عباس ایک عورت کے لیے اپنا سب کچھ کیوں بیچے گا۔ دیکھنا سب کچھ ہتھیانے کے بعد وہ تمہیں چھوڑ کر دوسری عورت لے آئے گا۔"

اس کے بارش جیسے آنسو اچانک رکنے والی بارش کی طرح ہی تھمے تھے۔ دونوں باپ بیٹی تادیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ لفظ ہتھیا کر۔ آمنہ کے وجود پہ کاری ضرب کی مانند پڑا۔ "تو کیا واقعی اس پراپرٹی میں میرا حصہ نہیں؟" باپ سے کی گئی آخری التجا آخری خواہش کی طرح کی۔ زمین دل پہ پڑے آنسوؤں کے پانی میں مزید بارش سے نہ دکھ کا کوئی قطرہ ٹپکا۔ نہ درد کا کوئی بلبلہ ابھرا۔

"ہم میں یہ روایت آباؤ اجداد سے چلی آرہی ہے۔" باپ کا لہجہ پہلے آسمان کو چھو کر زمین پہ سنا گیا جسے آمنہ کے علاوہ' زہرہ بیگم اور عمارہ بیگم نے بھی سنا۔" برادری اور لوگ کیا کہیں گے کہ مقیم ہاشم نے اولاد کے منہ سے نوالہ چھین کر پرائے لوگوں کے پیٹ بھرنے شروع کردیے ہیں۔" ان کی آواز اور اونچی

ہوئی۔ زہرہ بیگم کا سر نیچا ہوا۔

بھاوج کے سامنے آمنہ کو اپنا وجود رینگتے کیڑے جیسا لگا۔ وہ آخری آنسو تھے جو اس نے باپ کے سامنے بہائے تھے۔ وہ مضبوطی سے مڑی۔ وہ کیڑے سے انسان ہوئی۔ ابھی وہ جست لگا کر اونچی پرواز کر سکتی تھی۔ ابھی اس کے نام کے آگے عشیر عباس اس پہ اپنا سب کچھ کیونکر قربان کر سکتا ہے۔ اگر وہ ان کی اولاد میں شامل نہیں تھی تو وہ واقعی ایک عورت تھی۔

بیرونی گیٹ عبور کرتے ہوئے اس نے مقیم ولا پہ اپنے تئیں ایک آخری نظر ڈالی تھی۔ مگر اس کی نظر اس مغربی سمت نہیں اٹھی تھی جہاں ایستادہ چھوٹی سی رہائش گاہ اس کی بیوہ پھوپھی سیدہ ہاشم کی زیر رہائش رہی تھی، جس کی سب سے اوپر والی بالکونی میں۔۔۔ بے ٹھکانہ ویرانی نے گرد سے اٹے پرندے اپنے منحوس ہاتھوں میں بھر کے آسمان تک بلند کیے تھے جنہوں نے آمنہ عشیر کو نظروں سے اوجھل ہونے تک دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے تمام دن بے دریغ آنسو بہائے تھے۔ وہ ہاسپٹل سے آنے کے بعد حیران رہ گیا تھا۔

"تمام فضول سوچیں اپنے ذہن سے نکال پھینکو۔ پاپا نے مجھ سے ایک لفظ تک نہیں کہا۔ جب وہ مجھ سے بات کریں گے تو خود ہی ان کی ضد دم توڑ دے گی۔"

مگر آمنہ کے دل میں کچھ ہونے کا خوف کنڈلی مار کے بیٹھا تھا۔ وہ اسے بتا نہیں سکی کہ آج اسے کون سا دکھ رلا رہا ہے۔ کوئی لاکھوں میں پچاس ہوتے ہوں گے جن کی خواہش بیٹی ہوتی ہے، ورنہ تو بیٹے کی خواہش میں پیٹ میں پلنے والی خدا کی مخلوق کو دنیا میں لایا جاتا رہا ہے اور وہ یونہی روز قیامت تک بن چاہے آتی رہیں گی۔ اسے اولاد کے زمرے سے نکال دیا گیا تھا۔ صد شکر کہ اس نے حقیقت کے جہان میں بے حسی کا پہلا قدم رکھ دیا تھا۔ اب اسے یہ دیکھنا تھا کہ اپنی مضبوط پوروں سے اس کے آنسو چننے والا اس پہ کیا کچھ قربان کر سکتا ہے۔

ڈھلتی شام کو باپ کے کمرے سے عشیر کے لیے بلاوا آیا تھا۔ سائڈ ٹیبل پہ شام کی چائے ٹھنڈی پڑی تھی۔ وہ کسی بہت گہرے دھیان سے چونکا۔ ان دونوں نے چائے کیوں نہیں پی۔ اسے دھیان آیا۔ وہ دبے قدموں بیڈ روم سے نکلا۔

آمنہ کو لگا کہ وہ اپنے شوہر کو آخری بار دیکھ رہی ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ بیوی کے رشتے سے بھی برخاست ہو چکی ہو گی۔ محض ایک عورت رہ جائے گی اس کے ذہن میں مغربی سمت پژمردہ رہائش گاہ کی خوشبو انگڑائی لے کر جاگی، وہ بیڈ پہ اوندھے منہ لیٹ کر پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

☆ ☆ ☆

"شکر ہے آپ نے اس موضوع پہ مجھ سے بھی بات کی۔ ورنہ ان نو، دس ماہ میں یہ سارا قصہ زمانے سے ہی سن رہا ہوں۔"

باپ کی پوری بات سننے کے بعد وہ نہایت سنجیدگی سے شکوہ کناں ہوا۔ عباس خان نے اسے جیسے اندر تک دیکھا۔ مگر۔۔۔ کاش وہ اندر تک دیکھ سکتے۔ جس پہ چہار سو ایک بھوری لٹ سایہ فگن تھی۔

"میں یہ ڈائیورس پیپرز لایا ہوں۔ ان پہ سائن کرو۔" انہوں نے جو کہنا تھا، کہہ چکے تھے۔ اب وہ پورے اعتماد سے حکم دے رہے تھے۔ وہ یوں اچھل کر کھڑا ہوا جیسے وہ صوفہ نہیں دلدل تھی۔

"آپ ان پیپرز کے بجائے عزرائیل کو ساتھ لے کر آ جاتے تو اس وقت میری یہ کیفیت نہ ہوتی۔" عشیر نے تحمل سے کہا۔

"چھوڑیں پاپا! یہ کیسا مذاق ہے، یہ اچانک پھندا کیسے تیار کر لیا۔ تختہ دار پہ چڑھانے والوں سے بھی ان کی آخری خواہش پوچھی جاتی ہے۔ کم از کم مجھے اتنا موقع تو دیا جائے۔ اگر میدان جنگ میں اتر ہی آئے ہیں تو اکیلے تلوار زنی مت کریں۔"

وہ گڑگڑا کے خاموش وجود سے لپٹا تھا۔

"آپ جانتے ہیں؟ میں ایسا نہیں کر سکتا۔" وہ نفی میں سر جھٹکتا سابقہ انداز میں گویا ہوا۔
"کیا تم چاہتے ہو کہ تمہاری بیوی کا باپ اب بھی میرا سامنا اسی غرور و تکبر کے ساتھ کیا کرے۔ وہ خود کو سمجھتا کیا ہے خبیث!" وہ مغلظات بکنے لگے۔
"عشیر تم یہاں سے جاؤ۔" سارہ عباس نے پہلی بار لب کھولنے کی ہمت کی۔
"یہ اب اس کمرے سے فیصلہ کر کے ہی جا سکتا ہے۔" وہ کسی شیر کی طرح دھاڑے۔
"مجھے بیوی کی شرعی یا غیر شرعی پراپرٹی میں کوئی دلچسپی نہیں پلیز۔" اس نے اچانک ان کے سامنے ہاتھ جوڑے۔
"مگر میں اب اس شخص کو ہر قیمت پر ہرانا چاہتا ہوں۔" اب کے وہ بھی ٹھنڈے لہجے میں گویا ہوئے۔
"وہ نہیں ہاریں گے پاپا۔ آپ دونوں جیت جائیں گے۔" "اور ہم؟"
"عشیر! ان پیپرز پہ سائن کر دو' ورنہ میں خود کو شوٹ کر لوں گا۔" انہوں نے سائڈ ٹیبل سے اچانک پسٹل نکالا۔
"اور اس کے بعد اس پسٹل کی تمام گولیاں میرے سینے میں اتریں گی۔ اب میں اسی صورت اس کی زندگی سے نکل سکتا ہوں۔" اس نے زندہ رہنے کی آخری کوشش کی۔ عباس خان ششدر رہ گئے۔ ان کے ہاتھ کانپے۔ بیٹے کی آنکھوں میں سچ رقصاں تھا۔ انہوں نے پسٹل ہوا میں اچھالا۔۔۔ اور پھر وہ کیا جو عشیر کے لیے موت سے بڑھ کر تھا۔ وہ روز مرتا' پھر بھی موت ہر طرف ہوتی۔
"کچھ مہلت دیجیے میں استحقاق کی آخری نظر اس پہ ڈال آؤں۔"
اس کی سرخ انگارہ آنکھوں نے التجا کی۔ جو رد کر دی گئی اور وہ مر گیا۔
اسے تو گھر سے کہیں بھاگ جانا چاہیے تھا' پھر وہ اپنے کمرے میں کیوں آیا۔ وہ بیڈ روم کے وسط میں کھڑا بے قراری سے اپنے قریب آتی آمنہ کو بے جان وجود کے ساتھ دیکھتا رہ گیا۔ جس کے گرد ویرانوں میں پلنے والی خوشبو بھٹک رہی تھی۔ اسے دیکھتے دیکھتے وہ آنکھیں اجنبی لوگوں جیسی ہوتی جا رہی تھیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ صرف اس کی تھی اور اب۔۔۔ سوائے اس کے وہ سارے زمانے کی ہو سکتی تھی۔

✡ ✡ ✡

"یہاں تمہارے لیے روٹی اور کپڑے کی کمی نہیں۔ جی بھر کے کھاؤ پیو اور شان کے ساتھ رہو۔"
مقیم نے اس پورشن میں آج سالوں بعد قدم رکھا تھا جہاں اس کی بیوہ بہن بیوگی کے چالیس برس گزار کر آخری سفر پر روانہ ہوئی تھی۔ انہیں آج ہی طلاق نامہ موصول ہوا تھا۔
"بہو کو حصہ نہ ملنے کی صورت میں اپنے رسم و رواج کی پاس داری نبھانے کا ہمارے پاس بھی یہی راستہ بچتا ہے مقیم ہاشم!"
ایک سادہ پیپر پہ یہ مختصر تحریر رقم تھی۔ جسے پڑھ کر ریڑھ کی ہڈی تک برف ہوئی تھی۔ مگر بس لحہ بھر کو' ان کے لیے یہ شکست نہیں تھی۔ بیٹی طلاق یافتہ ہو گئی تھی۔ نصیبوں کا لکھا تھا۔
ہر آنے جانے والا کہہ رہا تھا کہ آمنہ بدنصیب تھی۔ صرف روٹی اور کپڑا سب کے لیے ضروری کیوں نہیں ہوتا۔ اس نے باپ کی بڑی بہو کی طرف نظر بھر کے دیکھا' جس کی گود میں ایک ماہ کا بیٹا تھا' جس کی آنکھوں میں تضحیک تھی کہ بس کچھ عورتیں ہی روشن نصیب ہوتی ہیں۔ "ایسے کم ظرف اور لالچی لوگوں کا ساتھ تمہیں زیب نہیں دیتا تھا۔" جب سے آئے تھے بیٹی رخ موڑ کے کھڑی تھی۔
جواب ایک جھٹکے سے ان کی طرف مڑی۔ اس نے اپنے سخی اور اعلا ظرف باپ کو تعجب آمیزی سے دیکھا۔
"پھر مجھے کہاں رہنا چاہیے؟" یہ اس کا اپنے باپ سے کیا گیا آخری سوال تھا۔ آخری جملہ تھا۔ مقیم ہاشم کا بدن ایک پل کو خون کی گردش سے محروم ہوا۔ وہ بیٹی

کے سر پہ ہاتھ رکھے بنا وہاں سے چلے آئے۔ جوان کی پہلی اولاد تھی اور انہوں نے جسے پیدا ہونے کے ایک ہفتہ بعد دیکھا تھا' کیونکہ انہیں بیٹے کی خواہش تھی۔ اگر آمنہ نے عشیر عباس کو کھو دیا تھا۔ تو مقیم بھی اپنی پہلی اولاد کھو چکے تھے۔ وہ کبھی اس پورشن سے باہر نہیں آئی اور جانے کیوں... جانے کیوں... وہ بھی اس ویرانے میں جانے کی ہمت نہیں پاتے تھے۔ جس کی سیاہ' ہولناکی اس میں رہنے والی کی آنکھوں کا منظر تھی۔

☆ ☆ ☆
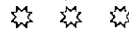
"دو کے آگے ایک' ایک کے پیچھے دو' کتنے ہوئے؟" موی نے ان سب کو باری' باری دیکھا۔

"میں بتاتا ہوں۔" پہل سفیر نے کی۔ "تین" باقاعدہ انگلیاں لہرائیں۔

وہ امپورٹڈ' نرم گھاس پہ آڑھا ترچھا بیٹھا تھا۔ پیر کو کن' من کے ساتھ اچانک چلنے والی ٹھنڈی ہوا نے جاتی ہوئی جولائی کی یہ شام خوش گوار سی کر دی تھی' چونکہ اتوار بھی تھا تو گھر کے دونوں سربراہان ان سب سے قدرے ہٹ کر عدیل اور عاقل کے ساتھ ہفتہ وارانہ حساب کتاب میں مصروف تھے۔

سفیر کا غلط جواب پا کر موی نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔

"اوں... نہ... آپ اتنے بڑے ہو چکے ہیں' پھر بھی پہیلی نہیں بوجھ سکے۔"

واقعی اس دل نے جو پہیلی نما سلوک مجھ سے روا رکھا۔ میں کبھی بوجھ ہی نہیں پایا۔ ورنہ سفیر نوید نہ تو بدنیت تھا اور نہ ہی کمزور ایمان کا مالک تھا کہ کسی اور کی ملکیت پہ نظر رکھتا۔ دل اس کے اپنے ہی جذبات کی مٹھی میں بھنچا۔ وہ بھی بہت زور سے...

آتے ہیں ہم آتے ہیں' ہم ٹھنڈے موسم میں۔

اسی آنگن میں ماضی کی کئی شامیں اور دوپہریں جست بھر کر اس کے سامنے کھڑی ہوئیں۔

"تم کس کو لینے آئے ہو ٹھنڈے موسم میں؟"

وہ تمام کزنز بمعہ ہمسائیوں کے بچوں کے یہ کھیل روز کھیلتے تھے۔ اور وہ اپنی باری پر ہمیشہ وانیہ کا نام لیتا تھا۔ روز وہ اس کی اکلوتی بہن انعم اس سے روٹھ جاتی۔

"آپ کبھی مجھے لینے نہیں آتے؟" وہ بسورتی۔ اسے وہی اچھی لگتی تھی۔ وہ انعم کو بھی نظرانداز کر دیتا' تب ان کے بیچ احمر بھی نہیں تھا۔ جب اچانک احمر ان کے بیچ آیا تھا تو سفیر صرف سترہ برس کا تھا۔

"یہ سب کچھ کس قدر جلد ہو رہا ہے۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھول رہے ہیں۔ سفیر ذرا فون میرے پاس رکھو۔"

وہ ابھی کالج سے آیا تھا۔ اس نے ٹھنڈے پانی کا گلاس ٹیبل پہ رکھتے ہوئے ٹیلی فون ماں کے سامنے رکھا۔ گھر میں ایک ہڑبونگ سی مچی تھی۔

"کیا ہوا... دادا کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

کیونکہ دو دن پہلے سے ہی اس کی چھوٹی پھپھو بمعہ فیملی آئی ہوئی تھیں۔

"وہ تو ٹھیک ہیں' مگر آج شام احمر اور وانیہ کے نکاح کی چھوٹی سی تقریب کی جا رہی ہے۔ اب کچھ قریبی عزیزوں کو تو انوائیٹ کرنا ہی ہوگا۔"

ماں کی اس بات نے اسے ٹھنڈے لاؤنج سے دھکیل کر تارکول کی تپتی سڑک پہ ننگے پاؤں کھڑا کر دیا تھا۔ اس نے بچ پانی کا گرم گھونٹ بہ مشکل حلق میں اتارا۔

"مگر امی! وانیہ تو ابھی بہت چھوٹی ہے۔" وہ کتنی ہی دیر بعد بہ مشکل کہہ سکا۔

"یہ تمہارے دادا ابا کا فیصلہ ہے' ہم سب کیا بڑے کیا چھوٹے... ان ہی کے رحم و کرم پہ ہیں۔" سعدیہ بیگم بھی وہاں سے جھنجلا کر اٹھی تھیں۔ اسے سدرہ کا شوہر ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ یہ سب مشہد کی ایما پہ ہی ہو رہا ہے۔

"ودیعہ اس سے بڑی ہے' پہلے اس کا نکاح ہونا چاہیے۔" اس نے اپنی عمر کے حساب سے انہیں ایک عقل کا نقطہ سمجھانا چاہا۔

"ودیعہ کا رشتہ اپنی خالہ کے ہاں بچپن سے طے ہے۔" ماں نے ٹیلی فون اسٹینڈ پہ پڑی ڈائری اٹھا کر

اپنے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔

"وانیہ سے تو انعم بھی بڑی ہے امی!" وہ ماں کے کچھ قریب ہو کر ہلکی آواز میں بولا۔ "کہہ جیسے احمر کا نکاح بھلے کسی سے کردیں، مگر وانیہ سے نہیں۔"

"شش..." ماں نے تڑپ کر اس کے ہونٹوں پہ انگلی رکھی۔ "کیا بہن سے محبت نہیں؟" دھیمی آواز میں اسے ڈپٹا۔ "میں اس عذاب میں اپنی بیٹی کیوں جھونکوں۔"

وہ کوئی نمبر ملانے لگیں۔

بہن سے تو محبت فطری تھی سو تھی۔ مگر وانیہ... وہ بے چینی سے اٹھا۔

"میں وانیہ کو لینے آتا ہوں۔"

وہ تتلی جیسی لڑکی کیسے ہوا میں اچھل کر اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر بھاگتی تھی۔

کسی کمرے سے نکل کر احمر اچانک اس کے سامنے آیا۔ یہ لڑکا کیسے اسے لینے آ پہنچا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار احمر کو بھرپور ناپسندیدگی سے دیکھا تھا۔ جو اس سے دو تین سال بڑا تھا جو آج بہت خوش تھا۔ اور جس کی مسکراتی نگاہیں جیسے اسے چڑا رہی تھیں کہ تم کس کو لینے آتے ہو ٹھنڈے موسم میں...

حالانکہ احمر بے چارہ تو اس کے جذبات سے بے خبر ہی تھا۔

"چاچو!" مومی نے اس کا کندھا زور سے ہلایا۔

"بتائیں بھی..."

اس نے رخ پھیر کے شاخوں کی کانٹ چھانٹ کرتی وانیہ کو دیکھا۔ جس کے دوپٹے کا کونا ہری گھاس کو چھو کے نیلا کررہا تھا۔

"اچھا یار! بتاتا ہوں۔" اس نے انگلیوں پہ حساب کتاب شروع کیا، بھائی کو گنتی کرتے دیکھ کر انعم نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

سعدیہ نے بیٹی کی ہنسی کو ہمیشگی کی دعا دی۔ جواب آمنہ کے کمرے میں رہ کر اسی کا عکس لگنے لگی تھی۔ اس نے تو کبھی جٹھانی کی طرح خود سے بھاگوں نصیبوں والی ہونے کے غرور کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ پھر وقت نے اس کی بیٹی کو اس دوراہے پہ کیوں کھڑا کیا۔

"میں بتاؤں؟" رانی جو بکھری شاخیں اٹھا کر باسکٹ میں بھرتی جارہی تھی۔ کسی ماہر ریاضی کی طرح چہکی۔

"ہم نے تمہارے افیئر تو نہیں پوچھے جو یوں شرما رہی ہو۔" (آج انداز ایسا تھا کہ تم اتنا جو مسکرا رہے ہو۔) وہ بلاوجہ ہی مسکرائے جارہا تھا۔ رانی کے دانت اندر... اور آنکھیں باہر... دل دھک دھک کرنے لگا۔

"آپ میرا پیچھا کرتے ہیں جی۔" معصومیت سے پوچھا۔

"یعنی کہ سچ مچ کے پانچ افیئر۔"

انعم کے چہرے پہ سراسیمگی اتری۔ سفیر کا ہاتھ اپنے بھاری بوٹ کی طرف بڑھا۔ رانی سرپٹ دوڑی، باہر آتی عمارہ بیگم سے زبردست ٹکر ہوئی۔

"تمہارے پیچھے کون لگا ہے کم بخت؟" انہوں نے کندھا سہلایا۔

"وہ پہیلی... وہ صاحب... اور جوتا... وہ پھر ان کے پہلو سے بھاگی۔

"یہ کیا اوٹلی... بونگی مار رہی تھی۔" ان سب کو مسکراتے دیکھ کر بھی سنجیدگی سے پوچھا۔

"دادی آپ پہیلی بوجھیں گی۔" پوتی ٹانگوں سے لپٹی۔ "اے بچی چھوڑ تو... یہاں تو ہر کوئی پہیلیاں بجھوا رہا ہے۔" وہ مومی کو ایک طرف کرتی اونچی آواز سے برہم سی ہو کر بولیں۔

"ہماری بیگم کو کس نے مشکل میں ڈالا ہے؟" مجید نے عینک اتار کر ہنستے ہوئے انہیں دیکھا۔

"آپ کی بہن کا فون آیا تھا۔ شادی کی تاریخ لینے آرہی ہے پرسوں۔" وہ یہ بتاتے ہوئے قدرے سہولت سے کرسی پہ ٹکیں۔

کب سے ڈھیٹ سا بھنورا ارد گرد منڈلا رہا تھا۔ اچانک اس کے کٹر کی زد میں آیا۔ زخمی بھنورا کرلا کے اڑا۔

"اس میں اتنا برہم ہونے والی کون سی بات ہے؟" مجید کا ہلکا پھلکا لہجہ اطمینان بخش تھا۔

"بات تو بری کی بھی ہے' بات تو مرنے اور مار دینے جیسی بھی ہے۔" وہ خاموش وجود کے ساتھ آہستہ سے اٹھا۔

"سدرہ نے تو ولیمہ کے ساتھ ہی تاریخ مانگی تھی' تب تم نے کہا تھا دو بیٹیوں کی شادی ایک ساتھ نہیں کرنی۔ اس کا بھی ایک ہی بیٹا ہے۔ خود سوچو..... پھر وانیہ کا آخری سمسٹر بھی ہو چکا ہے۔"

انعم نے پلکوں پہ بھاری سل رکھ کے باپ کی طرف دیکھا کہ پہلے کچھ میرے بارے میں سوچیں۔ جو صاف نظر چرا گئے۔ نہ کوئی حکایت' نہ شکایت' آج وہ نگاہ اس کی جانب نہیں اٹھی تھی۔

وانیہ نے اس زخمی بھنورے کو اداس نگاہی سے گیٹ عبور کرتے دیکھا۔ پھر اس نے انعم کی بھیگی آنکھوں کو دیکھا۔ اس کی ماں اور عمارہ بیگم تک سب کے چہروں سے خوشی غائب تھی۔ اس کا باپ چچا اور دونوں بھائی پھر سے حساب کتاب کی کاپیاں کھول رہے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ روز قیامت اللہ نے بھی ہمارے اعمال کی ایسی ہی کاپیاں کھول کر ہمارے سامنے رکھنی ہیں۔ کیا وہ واقعی نہیں جانتے تھے؟

وانیہ نے بھیگی نگاہوں سے مغربی سمت دیکھا' جہاں سورج غروب ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

آج اس کی عباس ہاؤس میں طلبی سمجھ سے باہر تھی۔ وہ بے حد قیمتی اور دیدہ زیب آرائشی سامان سے آراستہ ڈرائنگ روم میں اس وقت بالکل تنہا تھا۔

"آج آپ یہاں اپنی بھابھی کی دی گئی زحمت پہ آئے ہیں۔" کچھ دیر قبل معذرتی اور الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے امیر عباس نے اسے ہنستے ہوئے مطلع کیا تھا۔

دل کچھ حیرانی سے دھڑکا۔ مسز امیر سے اس کی بے تکلفی نہیں تھی اور نہ ہی کبھی اس نے عشیر کا کیس اس سے ڈسکس کیا تھا۔ آج کل وہ بھی ملک سے باہر تھا۔ اے سی فل اسپیڈ سے چل رہا تھا۔ پھر بھی منزہ عباس کی آمد پہ اس کی کشادہ پیشانی نے پسینے کا لمس محسوس کیا۔ وہ احتراماً کھڑا ہوا۔

"جی... تشریف رکھیے۔" وہ نشست کی طرف اشارہ کرتی مبہم سا مسکرائیں۔

ساحر کو وہ اپنی ساڑھی کا درست پلو بار بار درست کرتی الجھی ہوئی اور پریشان حال نظر آ رہی تھیں۔

"ساحر صاحب! کیا آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عباس فیملی میں یہ مینٹلی پرابلمز' یہ دلی الجھنیں موروثی ہیں۔" وہیں ٹھنڈا پسینہ اس کے تلووں پہ رینگا۔ بہرحال انہوں نے اپنا اعتماد بحال رکھتے ہوئے استفسار کیا۔

"کیا عشیر صاحب کے علاوہ بھی؟" انہوں نے دانستہ فقرہ ادھورا چھوڑ کر مسز امیر کو بغور دیکھا۔ جنہوں نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔ جیسے وہ تذبذب کا شکار تھیں کہ بھید کھولیں یا پھر...

"میں مانتی ہوں' آپ ایک قابل ڈاکٹر ہیں' جس طرح آپ نے عشیر کو ہینڈل کیا' آئی تھنک یہ آپ کی طالب علمی کا ہی پہلا کیس تھا' یعنی کہ پہلا تجربہ۔" وہ مسکرائیں۔ "تو کیا عشیر کو دوسری شادی پہ رضامند نہیں کر سکتے۔ کیا آپ کے کیس کی کوئی گرو ڈھیلی نہیں لگتی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ایک اچھے سائیکا ٹرسٹ نہیں اس نے خود ہی اپنا خیال رد کیا۔

ساحر کے چہرے پہ اطمینان کی رمق جھلکی۔

"عشیر صاحب کا دوبارہ شادی کر لینا واقعی ان کی نارمل مینٹلی کو ظاہر کرنا ہی تھا' مگر بقول ان کے وہ اپنے خاندان یا جاننے والے ایسے مردوں کے لیے..... خصوصاً "ان پیرنٹس کے لیے جو جائیداد کے لالچ میں آکر یا کسی بھی ضد میں آکر اپنے بیٹوں کے گھر ان کے دل تباہ کر دیتے ہیں۔ انہیں اجاڑ دیتے ہیں۔ وہ ان والدین کے سامنے خود کو عبرت کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا کہ دولت کے لالچ میں کبھی کبھار ایک اولاد کی نسل سے بھی ہاتھ دھونے پڑ جاتے ہیں' اس کا نام و نشان بھی مٹ سکتا ہے۔ لہٰذا مقیم ہاشم جیسے کسی شخص سے اگر کسی کا بھی واسطہ پڑے تو کوئی بھی عباس خان یا کوئی بھی عشیر..... کسی بھی آمنہ کو بے قصور ہی زندہ

درگور نہ کرے' کوئی بھی آمنہ میکے سے دھتکاری جائے نہ سسرال والے اس کی بے بسی کا جشن منائیں۔"

وہ ایک گہرا سانس بھر کے خاموش ہوئے۔

"خدا میرے دیور کو اپنے مقصد میں کامیابی عطا فرمائے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ وہ اب بھی آمنہ کے ساتھ ہی زندگی جی رہا ہے۔ آپ کو نہیں علم... عشیر کی شادی کے ایک ماہ بعد شائنہ پیدا ہوئی تھی۔"

اطمینان کی لہر ساحر کے چہرے سے غائب ہوئی۔

"یہ میری بہو بنے گی۔" اسے گود میں لیتے ہی آمنہ نے خواہش ظاہر کی تھی اور ہفتے بعد ہی عشیر نے اس کی منی سی کلائی میں سونے کا بھاری کنگن ڈالا جو نسبت طے ہونے کا اشارہ تھا۔

"شائنہ بتیس برس کی ہو چکی ہے۔"

ساحر کے سکون میں دراڑ پڑی۔

"اس کا آیا ہوا ہر پرپوزل رد ہو رہا ہے۔"

دراڑ کچھ وسیع ہوئی۔

"کبھی اس کے باپ نے یا چچا نے اسے قائل کیا' نہ سمجھایا اور نہ ہی وہ ایسا چاہتے ہیں' کیونکہ یہ آمنہ کی خواہش تھی۔"

ساحر کو محسوس ہوا کہ اگر یہ دراڑ یونہی بڑھتی رہی تو وہ اسے پوری طرح نگل بھی سکتی ہے۔

"مسز امیر اس سے یہ سب کیونکر ڈسکس کر رہی تھیں' کیا وہ بیٹی کے احساسات سے واقف تھیں' انہیں ایک تکلیف دہ شرمندگی نے گھیرا۔

"میں نے آپ کی فائل میں شائنہ کا کیس رکھ دیا ہے ڈاکٹر ساحر!" انہوں نے مسز امیر سے نظر چرائی۔

"آپ کو اس کی کلائی سے منگنی کا وہ کنگن اتارنا ہے۔"

وہ نہایت مدھم آواز میں عاجزی سے بولیں۔

ٹھنڈا پسینہ اب ساحر کے دل کو بھگو رہا تھا۔ اس کو یقین ہو چلا تھا کہ عباس فیملی میں یہ دلی الجھنیں موروثی ہیں۔ مگر شائنہ اس نام نہاد منگنی کی آڑ میں زندگی کا خوب صورت دور کیوں برباد کر رہی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ اس محل نما گھر سے نکلتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ امیر عباس کے ڈرائنگ روم کا اے سی بالکل بھی کولنگ نہیں کر رہا تھا۔ کیونکہ انہوں نے منزہ امیر کو بھی پسینہ پونچھتے ہوئے دیکھا تھا' جو نہیں جانتی تھیں کہ شائنہ کا کیس بالکل بھی پیچیدہ نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

شام نے اپنا دھندلا وجود کسمسا کر تیرگی کے سپرد کیا۔ جس نے بخوشی اسے آغوش میں سمیٹا۔ انعم علی آزردہ سی آہ۔ اس کے لبوں سے پھسل کر ہوا میں گھلی۔

اس کی آہ سے وانیہ کا دھیان چٹخا۔ وہ بوا کی جانب آئی' جو مغرب کی نماز کے بعد اب تسبیحات میں مشغول تھیں۔ وہ ان کے عقب میں ہی تخت پہ ذرا سا ٹکی۔

"انعم! ادھر آؤ۔" وہ جو اندر جانے لگی تھی' بوا کی پکار پہ ان کی طرف چلی آئی۔

"میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔" بوا نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ "اس حالت میں اتنی پریشانی اچھی نہیں ہوتی انعم..." انہوں نے پہلے اس پہ دم کیا' پھر دھیرے سے ہم کلام ہوئیں۔

"آپ نے مجھ پہ تو کبھی بھی دم نہیں کیا۔" وانیہ ان کی کمر سے لپٹ کر اٹھلائی۔

"میں بھی اک تنہا چڑیا ادھورے چاند کی طرف جا رہی تھی۔"

بوا جو وانیہ سے کچھ کہنے والی تھیں' انعم کی بات پہ ششدر سی ہوئیں۔ وانیہ نے بھی اس کے تعاقب میں آسمان کی طرف نگاہ کی۔

"افق پہ سفر کرتے پرندے چاند کے تمنائی نہیں ہوتے۔ بس ہمیں انہیں بہت دور دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے' ان کے ٹھکانے کہیں راستوں میں ہوتے ہیں۔"

بوا نے بات ختم کرتے ہوئے ساون کے مہینے میں پتے جھاڑتے درخت کو دیکھا۔ انعم کی اداسی حد سے سوا تھی۔

"ارسل سے کہو تمہیں یہاں سے لے جائے۔"

میں جلد نوید سے بات کروں گی۔ یہ رشتے ناتے بہت ظالم چیز ہوتے ہیں۔ خود تو رتیوں رواجوں' ضد اور انا کے دوزخ میں بھٹکتے ہی ہیں' بعد میں بچوں کو بھی ان کی جنت سے نکال دیتے ہیں۔" آج جانے کیسے ان کی چپ ٹوٹی تھی۔ ان کا حدت آمیز لہجہ تجربے کی گرم دھوپ سے جھلسا ہوا تھا۔

سفیر برآمدے کی پہلی سیڑھی پہ ٹھٹک کر رکا۔

"بوا! آپ کو اپنا گھر یاد تو آتا ہو گا۔" پتا نہیں وہ خود اداس تھی یا وہاں ماحول ایسا تھا۔ وانیہ نے ان سے پہلی بار یہ سوال کیا۔

"ہاں۔۔۔" بوا کا لہجہ برف کے کنویں سے ابھرا تھا۔

"بوا۔۔۔ یاد کرنا آسان ہوتا ہے یا پھر انہیں بھلا دینا آسان ہوتا ہے' جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔" وانیہ کا بھیگا' اداس لہجہ سفیر کے شور مچاتے دل میں دھڑکا۔

انعم وہاں سے جا چکی تھی۔ بوا نے وانیہ کے ٹھنڈے ہاتھ نرمی سے تھامے۔

"انسان جب خالی برتن کی طرح ہو جاتا ہے تو اس میں اللہ سما جاتا ہے اور اللہ کو ہی سمانا چاہیے۔ پھر سب کچھ آسان ہو جاتا ہے۔ یاد کرنا بھی بھلا دینا بھی' دنیا میں کچھ اپنا نہیں۔ کچھ بھی پائیدار نہیں۔ ہر چیز مٹ جانے والی ہے' سوائے اس ذات کے۔"

وانیہ کے دل میں سکون اترا۔ سفیر نے باقی سیڑھیاں عبور کیں اور خاموشی سے تخت کے ساتھ پڑی کرسی سنبھالی۔ وہ بوا کی گود میں آنکھیں موندے لیٹی تھی۔ وہ اس کی آمد سے بے خبر تھی۔

"انعم کے معاملے میں سب خاموش کیوں ہیں۔ سفیر کو تو بولنا چاہیے نا۔ مگر وہ بھی پچھلے چھ ماہ سے منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھا ہے۔" انعم و غصے سے بھرا لہجہ۔

"فکر مت کرو' تمہارا معاملہ نپٹالیں' پھر ساری گھنگنیاں نگل لوں گا یا اگل دوں گا۔" اس نے جیسے مذاق اڑایا۔

وانیہ نے پٹ سے آنکھیں کھولیں۔ وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں خاموش تھیں۔

"اس خاندان کے سارے مرد ظالم ہیں۔" وہ اچانک بپھر کے بولی تھی۔

"آپ کی یہ بات شک و شبے سے بالاتر ہے۔" اس نے ٹانگیں پھیلا کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

وہ مٹھیاں بھینچ کر وہاں سے اٹھی اور تمام راہ داریاں پیر پٹختے ہوئے عبور کیں۔

"میں نے جانے انجانے میں تم پہ واقعی ظلم ڈھایا۔" اس کی بند آنکھوں کے گوشے بھیگے' صد شکر کہ بوا کی بھی آنکھیں بند تھیں۔

☆ ☆ ☆

سدرہ کی آمد کے بعد گھر میں خوش گوار قسم کی ہلچل محسوس ہو رہی تھی۔ احمر اسے مقیم ولا ڈراپ کر کے کسی دوست کے یہاں چلا گیا تھا۔

"آج واقعی بہت خاص اور کمال کا دن ہے کہ عاتکہ بھابی کی شکل دیکھنا کچن کو نصیب ہوئی۔" انعم نے فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے خواہ مخواہ ہی اسے چھیڑا۔

تایا کی یہ چھوٹی بہو انتہائی کام چور' سست الوجود تھی۔

"اب ہمارا کچن روز ہمارا ہی دیدار کرے گا کیونکہ وانیہ کی شادی تک اسے میں ہی سنبھالوں گی۔" وہ غصہ دباتی نارمل سی ہو کر گویا ہوئی۔

"پھر سمیرا بھابی کی ڈلیوری کے بعد وہ جانیں اور یہ کچن۔"

"تو پہلے کون سا وانیہ بے چاری نے بھابیوں پہ پابندی لگا رکھی تھی۔" انعم کو اسے چڑانے میں مزہ آ رہا تھا۔

"جب نند بھاوج ایک جگہ اکٹھی ہو جائیں تو برتنوں سے زیادہ کھٹ پٹ کا خدشہ ہوتا ہے۔ ویسے بھی وانیہ کون سا تیر مارتی تھی' یہاں ملازماؤں کے سر پہ کھڑی ہو کر حکم نامہ جاری کرنا ہوتا ہے' اور یہ کام میں بھی بخوبی کر سکتی ہوں۔" وہ لاپروائی سے کندھے اچکا کر بولی۔

"اس بات کا تو ہمیں شروع دن سے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔" انعم کی بات اور مسکراہٹ اسے تپانے کے لیے

خاصی اثر انگیز ثابت ہوئی۔
"کیونکہ میکے میں فارغ بیٹھ کر سب سے آسان کام اندازے لگانا ہی ہوتا ہے۔" وہ سرسری سا جتا کر یوں ہی روٹیاں پکاتی رانی پہ برسنے لگی۔
"ذرا جو طریقہ آتا ہو ساری روٹی جلا چکی ہو۔"
کچن کا دروازہ عبور کرتا سفیر عاتکہ کی بات بھی سن چکا تھا اور انعم کا سفید پڑتا چہرہ بھی دیکھ چکا تھا۔ اس نے عاتکہ پہ ایک ناگوار نظر ڈالی۔ اس گھر کی مالک صرف وہی نہیں تھی۔ خوش نصیبی سے تائی کو بہوئیں بھی اپنے ہی مزاج و عادات کی نصیب ہوئی تھیں۔ وہ دونوں بہن بھائی متحیر آمیزی سے اس کا برملا اظہار کرتے تھے۔ "رانی فی الحال اسے چھوڑو۔ چار کپ اچھی سی چائے بناؤ' اور فریج بھی ذرا کھنگالو کہ کیا کچھ پڑا ہے۔"
وہ اسے ہدایت دیتا جلدی سے مڑا۔
"گھر آنے کے بعد جس طرح ڈرائنگ روم تمہارے مہمانوں سے آباد رہتا ہے۔ اب اپنی گھر والی لے آؤ۔ کیونکہ وانیہ کے بعد۔ چھوٹے موٹے مسائل سر اٹھانے لگیں گے اور گھر کا ماحول الگ خراب ہوگا۔"
وہ جو کچھ دیر پہلے بڑی پھنے خان بنی کھڑی تھی کچن سنبھالنے کے دعوے آج ہی دھڑام سے گرے۔
اندر آتی وانیہ نے ایک نظر میں ہی صورت حال بھانپ لی۔ دونوں نے ہی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے گریز برتا۔
"بیگم صاحبہ کہہ تو رہی تھیں کہ ایک دو ماہ میں ہی سفیر صاحب کی شادی بھی ہو جائے گی۔" رانی نے چہک کر عاتکہ کو خوش خبری سنائی تھی۔ کچن کے پاس اس کے قدم جیسے جم سے گئے۔
"کوئی دل گردے والی لڑکی نوید چچا کی بہو ہوگی۔"
وانیہ جو فریزر سے کباب نکال رہی تھی۔ اس کی عجیب بات اور استہزائیہ ہنسی پہ وجہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔ اور سفیر بھی عاتکہ کا جواب سننے کے لیے تھم سا گیا۔
"جانتی تو ہو' اس خاندان میں جائیدادیں بانٹی نہیں جاتیں۔ انعم بھی تاعمر بچے سمیت بھابی کے سینے پہ مونگ دلے گی۔"
"خدا نہ کرے" اس کی فضول بات پہ وانیہ نے دہل کر دل پہ ہاتھ رکھا۔ "خدا اسے ہمیشہ اپنے گھر میں شاد و آباد رکھے۔"
عاتکہ کی بات وانیہ کے دل میں چبھی تھی اور عاتکہ کی استہزائیہ ہنسی سفیر کے وجود پہ بوجھ بن کر گری۔
"اب اس خاندان کی بہوئیں ہی خوش قسمتی کی مہریں اپنے وجود پہ ثبت نہیں کریں گی۔" ڈرائنگ روم کی طرف اٹھتے اس کے قدم میں روانی آئی اور عاتکہ کی بات کا بوجھ ہٹا کر ایک عزم اس کے اندر تازہ انگڑائی لے کر جاگا۔
فیصلہ تو وہ بہت پہلے کر چکا تھا مگر اب اسے وہ فیصلہ جلد ہی اپنی فیملی کو سنانا تھا۔

☆ ☆ ☆

اتنے برسوں بعد یہ کیسا اتفاق تھا کہ سدرہ مقیم اسی جگہ بیٹھی تھیں جہاں بیٹھ کر مشہد نیازی کی ماں نے شادی کی تاریخ طے کرنے کی بات کی تھی' اس نے چہرہ گھما کر عقب میں اس کمرے کو دیکھا جو کبھی اس کا ٹھکانا تھا۔
اس کے کینوس پہ لگی ادھوری تصویر نے اسی لمحے رنگ کھونے شروع کر دیے تھے۔ کتابیں جو ٹیبل پہ پھیلی تھیں۔ سست روی سے چلتی ریکس میں اپنا' اپنا ٹھکانہ ڈھونڈنے لگیں۔
"اتنی جلدی کیوں کر رہی ہیں؟ سدرہ تو نوید سے بھی پانچ سال چھوٹی ہے۔" مہمانوں کے جانے کے بعد زہرہ بیگم کی شوہر سے جرح شروع ہوئی۔
"یہ تمام کارروائی میری سمجھ سے باہر ہے۔ نہ ناشتا آیا۔ نہ بات طے ہوئی' اور لڑکے کی ماں منہ اٹھا کر شادی کی تاریخ لینے پہنچ گئی۔" مجھے وہ لوگ خاندانی بھی نہیں لگتے' تم بیٹی کو کس دوزخ میں دھکا دے رہے ہو مقیم ہاشم!" انہوں نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔
ابھی آمنہ کی طلاق کو چھ مہینے ہوئے تھے۔
"جس کو خاندانی' ہم پلہ لوگوں کی جنت میں دھکا دیا

تھا۔ وہ بھی بدنصیب ہی ٹھہری۔ ہو سکتا ہے اس کے نصیب دوزخ میں جا کر چمک جائیں بس تم شادی کی تیاری کرو۔" وہ پورے کروفر کے ساتھ سرد مہر لہجے میں گویا ہوئے۔

مشہد نیازی سے ان کی ملاقات پنڈی میں کسی کیس کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ وہ سرکاری وکیل تھا۔ وہ بہت ہوشیار آنکھوں کا مالک ایک خوبرو مرد تھا۔ انہوں نے جتنا بھی غور کیا۔ ہر لحاظ سے انہیں وہ داماد کے طور پر مناسب لگا تھا۔ وہ کسی بہانے سے اس کا گھربار بھی دیکھ آئے۔

کچھ دنوں بعد چند لاکھ کا چیک مشہد کے ہاتھ پہ رکھا کہ گھر کی حالت ٹھیک کراؤ۔ بعد میں اپنا عندیہ اس پہ ظاہر کیا۔

"تم جیسے جوان زندگی میں خوب ترقی کرتے ہیں۔" اس کا کندھا محبت سے تھپکا۔ "بھئی ہم تو تمہاری ذہین آنکھوں کے گرویدہ ہو چکے ہیں۔"

کچھ عرصہ گزرا کہ ایک اچھی حالت کی گاڑی بھی اسے "تحفتاً" پیش کی۔ مشہد کے خیال میں اس کی نسل سنور سکتی تھی بھلا اسے اس قدر اعلا خاندان کا داماد بننے میں کیا قباحت تھی۔

یوں بیس سالہ سدرہ چپکے سے اس کی زندگی کا حصہ بنی کہ کئی ماہ تک تو یوں اچانک بدلنے والی اپنی زندگی پہ گنگ سی رہی تھی' اس کی ساس بھلی عورت تھی مگر اس کا شوہر...

"بس یار کبھی کبھار ہی پیتا ہوں۔" وہ روز کہتا۔

اکثر راتیں گھر سے باہر گزرتیں' وہ سسر سے ملنے کے لیے ہمہ وقت بے تاب اور تیار رہتا' واپسی پہ اس کی جیب نوٹوں سے بھری ہوتی یا خالی۔ سدرہ نہیں جانتی تھی' کبھی ہوش کھو کر تو کبھی باہوش ہو کر وہ اس کے خاندان کو انتہائی گندی گالیوں سے نوازتا۔ وہ سدرہ کو تکلیف میں مبتلا رکھ کر خوش ہوتا تھا۔ احمر اور وانیہ کا رشتہ بھی اس تکلیف میں اضافے کے لیے ہی اس نے جوڑا تھا۔ اور مقیم نے نہایت سوچ سمجھ کر نکاح جیسے مضبوط' اور نکاح جیسے ہی کچے بندھن میں باندھا تھا۔

"دراصل میں چاہتا ہوں کہ سونی کا فرض بھی اپنے ساتھ ہی ادا کردوں۔" احمر کی بھاری سنجیدہ آواز اسے ماضی سے کھینچ کے لے آئی۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" سب ہی نے اس کے فیصلے کو سراہا اور بھرپور خوشی کا اظہار کیا' وہ شادی کی تاریخ طے کرچکے تھے' سدرہ کا وجود سن ہوا' وہ جانتی تھیں کہ ان کا بیٹا اب کیا دھماکا کرنے والا ہے۔

"میں امی کو اور خود کو رشتے دیکھنے دکھلانے کے جھنجھٹ میں نہیں ڈالنا چاہتا۔" وہ مسکرایا۔

باقی سب نے ناقابل فہم انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا۔

"میری خواہش ہے کہ سونی کی شادی اسی خاندان میں ہو۔" وہ پٹاری کھول چکا تھا۔

وہاں موجود ہر فرد اپنی نگاہیں جھکا کر رہ گیا۔

"اور مجھے یقین ہے کہ میری خواہش کا احترام بھی کیا جائے گا۔" بات ختم کرکے اس نے ماں کو چلنے کا اشارہ کیا۔

"اتنی رات کو جانے کی تک بنتی ہے بھلا۔" یہ آواز آمنہ کی تھی' باقی سب کی قوت گویائی جیسے چھن چکی تھی۔

"صبح بہت کام ہیں خالہ امی۔"

احمر نے نرمی سے آمنہ کو گلے لگایا۔ نوید کو اس رشتے پہ کوئی اعتراض محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ سو وہ بھی جلد حواسوں میں لوٹ آیا اور خندہ پیشانی سے بھانجے اور بہن سے الوداعیہ کلمات کہہ کر دل سے انہیں گلے لگایا۔

سب سے بری حالت عبید اور عمارہ کی تھی۔ نوید کی بہو جو بھی ہوتی۔ عمارہ کی بہوؤں کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا سو ان کے لیے یہ پرپوزل اچھا تھا۔ نہ برا... مگر آمنہ کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ مقیم ولا کی دیواروں کے ساتھ پھر کوئی انہونی چپک کر بیٹھی ہوئی' اندر گھسنے کو بے تاب ہے۔

☆ ☆ ☆

وہ ایک گھنٹے سے ڈاکٹر ساحر کے گھر سے ملحق اس کے کلینک میں اس کا انتظار کر رہی تھی گاڑی رکنے کی آواز سن کر وہ تیزی سے اٹھی اور کھڑکی سے باہر جھانکا' وہ کنزہ منیر کی گاڑی سے اتر رہا تھا پھر اس نے مسکرا کر ڈاکٹر کنزہ کو ہاتھ کے اشارے سے خدا حافظ کہا' اب اس کا رخ کلینک کی طرف تھا وہ جانتا تھا کہ شائنہ وہاں موجود ہے ڈیزی نے اسے بتایا تھا کہ۔

"ڈاکٹر صاحب عین میرے سامنے کسی عورت کے ساتھ لنچ میں مشغول ہیں۔" ڈیزی اس کی واحد رازدار تھی جو اکثر اس کی عقل پہ ماتم کرتی تھی۔ ابھی چالیس منٹ قبل وہ یہ خبر سن کر اس کی کال بیدردی سے کاٹ چکی تھی' اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی اتری۔

"سوری۔ شائنہ! بس اچانک ہی ایک پرانی دوست سے ملاقات ہوئی اور میں اس کی لنچ کی آفر رد نہیں کر سکا۔"

وہ اس پہ نگاہ ڈالے بنا آفس کرسی کے بجائے صوفے پہ ہی بیٹھا' وہ کئی مرتبہ چچا کے ساتھ اس کے گھر کے اندرونی حصے میں جا چکی تھی۔

"ڈاکٹر کنزہ تو یو کے سیٹ ہو گئی تھی۔ پھر وہ اب پاکستان میں کیا کرنے آئی ہے۔" اس کا ڈسٹرب لب و لہجہ ساحر کو اس کی جانب دیکھنے پہ مجبور کر گیا۔ اسے اس کی آنکھیں گیلی محسوس ہوئیں۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" اس نے کندھے اچکائے۔۔۔ وہ اس موضوع کو فی الحال ڈسکس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"تو پورا گھنٹہ آپ لوگ کیا باتیں کرتے رہے ہیں؟" اس کے تفتیشی انداز پہ ساحر کے دل کو زور کا دھکا لگا۔

اس کی اس قدر خبر گیری ایک مہلک علامت تھی۔ وہ اس کے اپ سیٹ حلیے سے نظر نہیں ہٹا سکا۔ آج سے قبل وہ اس کی ذاتیات کے متعلق کسی بھی قسم کا حق نہیں جتاتی تھی۔

"مطلب میں نے یہاں آتے ہی کال کی تھی تو۔" وہ جملہ مکمل بھی نہیں کر سکی' اس کے رخسار آنسوؤں سے تر ہوتے گئے۔ وہ اسے یوں روتا دیکھ کر بری طرح ڈسٹرب ہوا۔ وہ کیا تسلی دے کر اسے چپ کرا سکتا تھا؛ اسے آج بے بسی کے معنی سمجھ میں آئے۔ بہتر ہے اسے رو لینے دیا جائے۔ مگر کافی دیر گزر جانے کے بعد بھی وہ آنسو اب سونامی کو شرمندہ کرنے لگے تھے۔ تب تک وہ مناسب الفاظ ترتیب دے کر چند جملے گھڑنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

"جب امیر عباس مجھ سے پہلی بار ملے تھے تو ایک پلے گروپ میں پڑھنے والی چھوٹی سے بچی بھی ان کے ساتھ تھی۔"

"وہ آپ کے ماموں سے ملنے گئے تھے جو آپ سے کہیں زیادہ قابل ڈاکٹر تھے۔" شائنہ نے سوں سوں کی آواز کے ساتھ اسے وضاحت دینا ضروری سمجھا۔ وہ بے ساختہ مسکرایا۔

"پھر وہ بچی میری آنکھوں کے سامنے بڑی ہوتی گئی۔۔۔ اس نے مجھے سر اٹھا کر چلتے دیکھا۔۔۔ پھر اب وہ کیوں میرا وقار' میری نگاہیں اک زمانے کے سامنے جھکی دیکھنا چاہے گی۔"

وہ دھیمی آواز میں اسے کچھ جتلا گیا تھا۔

"تم بھلے اپنے چچا کا پہنایا ہوا کنگن کلائی میں ڈالے کسی کا بھی آنگن مہکاؤ کوئی بھی وجود خوشبو زدہ کرو۔ مگر وہ آنگن اور وہ وجود ڈاکٹر ساحر کا ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

وہ نظر چرا کر فیصلہ کن' اور دو ٹوک انداز میں اپنا فیصلہ سنا گیا۔ اس نے شائنہ کی بے یقین نگاہیں اپنے چہرے پہ جمی محسوس کیں۔

"اگر آپ میری محبت سے انکاری ہو سکتے ہیں' مجھے ٹھکرا سکتے ہیں' تو پھر میں بھی پورے زمانے کو ٹھکرانے کا حق رکھتی ہوں۔ اور میں ایسا کر کے دکھاؤں گی۔"

وہ ترنت بولی' اور جھٹکے سے اٹھی' ساحر کی نگاہیں ہنوز زمین کریدر ہی تھیں۔

"میری ٹیبل پہ تمہارے نام کی فائل سب سے اوپر پڑی ہے اور میں منزہ امیر سے ایک بھاری فیس وصول کر چکا ہوں۔" زمین جانے کھد رہی تھی یا نہیں مگر ایسا کہتے ہوئے اس کا دل ننھے گڑھوں سے بھرتا چلا

گیا۔

وہ ایک بار پھر بے یقین ہوئی' متحیر ہوئی' جو اس باختہ ہو کر دنیا کا سب سے پتھریلا اور سب سے پرکشش چہرہ دیکھا۔ پھر وہ لب بھینچ کر وہاں سے بھاگی تھی۔

ساحر نے جانے کب کا رکا سانس بحال کیا۔ وہ اتنا مصروف رہتا تھا کہ محبت جیسا مشغلہ وہ افورڈ ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی جانب سے بے دریغ اور ہمہ وقت اٹھتی ان خوش رنگ آنکھوں نے عموں کا حساب کتاب رکھے بنا اس کی خشک آنکھوں میں اپنی محبت کا بیج جانے کب بویا تھا کہ یاد کرنے پہ بھی وہ لمحہ' وہ وقت اور عمر کا وہ حصہ یاد نہیں پڑتا تھا۔ وہ حاصل زیست تھی' وہ روح کو مطلوب تھی مگر وہ یہ بہادری افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ سو دل کو سنبھالنا زیادہ آسان تھا۔ مگر آج دل بھی شائنہ عباس کا کیس اس سے ڈسکس کرنے پہ تلا ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

انعم کی شادی کے بعد وہ اکثر رات کو لیٹ بھی آتا تو وانیہ لاؤنج میں موجود ٹی وی دیکھ رہی ہوتی۔ اس کی ماں کئی سال پہلے ٹخنے میں چوٹ لگنے کے باعث زیادہ دیر کھڑی رہنے سے قاصر تھی۔ پھر جیسے وہ اس کا معمول بنا گیا کہ وہ اس کی آمد سے قبل اپنے کمرے میں نہیں جاتی تھی۔

جس دن سدرہ شادی کی تاریخ لینے آئی تھیں۔ وہ اسی شام کسی ضروری کیس کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا تھا۔ آج دو دن بعد واپسی پہ وانیہ کے بجائے انعم کو اپنا منتظر پا کر اسے حیرانی بالکل بھی نہیں ہوئی۔ مگر وہ اس وقت ضرور حیران ہوا جب انعم اسے اپنی معیت میں امی ابو کے کمرے میں لے آئی۔

"پھر ہی شادی کا تذکرہ ہوگا؟" وہ بڑبڑایا۔

"تو کیا شیخ رشید کا ہمسایہ بننے کا ارادہ ہے؟" انعم ہنسی۔

"حرج بھی کوئی نہیں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔ وہ تھکا ہوا تھا اور اس وقت اس کی پہلی ترجیح نیند تھی۔ مگر کچھ دیر بعد اس کے باپ نے جو بات اس کے گوش

گزار رکھی۔ وہ اس کے آرام سکون کی بنیادیں ہلانے کو کافی تھی۔

"مجھے تو اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ سونی گھر کی بچی ہے ماشاء اللہ تعلیم یافتہ اور خوب صورت ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ سدرہ ایک بچے کا رشتہ سسرال میں ضرور کرے گی۔ سو خیال آیا بھی تو تم سب پہ کبھی ظاہر نہیں کیا۔ اب جبکہ خود احمر نے پروپوزل دیا ہے تو ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ اگر اتنی جلدی فیصلہ نہیں کرنا چاہتے ہو تو وانیہ کی شادی کے بعد آرام سے بات کر لیں گے۔" وہ جیسے بہت کچھ ضبط کر کے بیٹھا تھا۔

"ایسا کبھی سوچیے گا بھی مت۔" وہ اب بھی ضبط سے گویا ہوا۔ "نہ ابھی اور پلیز آپ تینوں میں سے تو کوئی بھی دوبارہ مجھے مجبور نہ کرے پلیز۔"

وہ انہیں حق' دق چھوڑ کر وہاں ٹھہرا نہیں۔ اس قدر غصہ' اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ' وہ تینوں نفوس ایک دوسرے کا منہ حیرت سے تک رہے تھے کہ آخر یہ شادی کے لیے کیوں رضامند نہیں ہوتا۔

دوسری صبح ناشتے کی ٹیبل پر سفیر کا جواب ایک تگڑی اور تازہ خبر تھی۔ بریکنگ نیوز۔ "سدرہ یا احمر کو ایسا سوچنے ہی نہیں چاہیے تھا۔" عمارہ نے جیسے سکھ کا سانس لیا سفیر تو گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ' خواہ مخواہ کو وٹہ سٹہ بن جاتا۔ مگر عبید ضرور الجھے ہوئے تھے۔

"زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں' احمر نے جو ضد باندھ لی تو۔" انہوں نے دبے الفاظ میں بیوی کا قرار غارت کیا۔

"کیسی ضد۔ سفیر ہمارا بیٹا نہیں کہ ہم حیلوں' وسیلوں سے اسے رضامند کریں۔ بلکہ نوید بھائی آپ سدرہ کو فون کریں کہ سفیر نے صاف انکار کر دیا ہے۔" عمارہ کا اطمینان دیدنی تھا۔

"سونی کیوں؟ چاہے کالے چور کی بیٹی آجائے' بھانجی کو یہاں راج کرتا دیکھ کر آمنہ کا سینہ تو کیا خوب ٹھنڈا ہوگا۔" انہوں نے کھول کر سوچا۔

شادی کے شروع دنوں میں بھی عبید بیٹھے بیٹھے کھو

ساجاتا تھا۔

"نہیں آمنہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔" اس کے پوچھنے پہ بار بار ایک ہی جواب۔

"لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ گھر شادی والا ہے۔ ہر وقت ماحول اداسی کا منظر پیش کرتا۔"

سدرہ اور اس کی ساس آمنہ کا ہی ورد کرتی رہتیں۔ بیٹا سوا ماہ کا بھی نہیں تھا کہ اسے طلاق ہو گئی۔ کہاں کے چاؤ۔ اور خوشیاں۔ عقیقہ تک روتے دھوتے ماحول کی نذر ہو گیا۔

"آپ کیوں ایسے بیٹھے ہیں' یہ نصیبوں کے کھیل ہیں۔ یہاں سے حصہ مل بھی جاتا۔ بری تقدیر پھر بھی نہیں ٹلنی تھی۔"

عمارہ کے اپنے شوہر کو تسلی دلاسے پورے گھر میں گونجے جس سے کچھ عرصہ بعد یقین ہو ہی گیا کہ اس میں ان کے باپ یا ان کا تو کوئی قصور ہی نہیں تھا۔ بہن کا مقدر ہی ایسا سیاہ تھا۔ آج سفیر کے انکار پہ خوش ہونے والی عمارہ مجید نہیں جانتی تھیں کہ کل کو۔ اسے اس شادی پہ رضامند کرنے کے لیے انہیں ہاتھ تک جوڑنا پڑ سکتے ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ باپ کی طرح احمر بھی

ان سے وانیہ کے حصے کا تقاضا نہیں کرے گا۔

وہ نہیں جانتی تھی جو لسٹ تقدیر کے ہاتھ میں تھی۔ تقدیر وہاں وانیہ کے نام کے گرد سیاہ حاشیہ کھینچ چکی تھی۔

"کوئی عذر تراش کے بہن کو سمجھاؤ اسے سمجھانا کہ سفیر کسی اور کو پسند کرتا ہے۔" نوید نے بیوی کی بات سن کر بے بس سی آہ بھری۔

وہ جانتا تھا کہ سدرہ نے مشہد کے ساتھ ایک آسان زندگی نہیں گزاری تھی' مگر وہ بیٹے پہ زبردستی فیصلہ تھوپنے کا قائل بھی نہیں تھا۔

آمنہ کے خدشات بے جا نہیں تھے وہی بدرنگ سی انہونی دروازہ کھلا پا کر مقیم ولا میں گھس آئی تھی۔ ادھر سے انکار سنتے ہی احمر غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔ اس نے ان پہ اپنی شرط واضح کر دی کہ اگر سونی کی شادی سفیر سے نہیں ہوئی تو وہ وانیہ کو طلاق بھی دے سکتا ہے۔

عمارہ بیگم کا بی پی بار بار شوٹ کر رہا تھا۔ شادی میں دو ہفتے رہ گئے تھے۔

"ہائے میری بچی' بے قصور طلاق یافتہ کہلائے گی۔ لوگ تو لڑکی میں ہی عیب نکالیں گے۔ ارے کوئی سفیر کو سمجھاتا کیوں نہیں۔ میرے اللہ!" آج انہیں اللہ یاد آ رہا تھا انہیں زہرہ بیگم کیوں یاد نہیں آ رہی تھیں جن کے ہاتھوں سے آمنہ کی خوشیاں پانی کی طرح بہہ گئی تھیں۔ وہ اس پانی کو زمین میں جذب ہوتا دیکھتی رہ گئی تھیں۔

"مجید آپ بڑے ہو۔ آپ کو اپنے باپ کا غلط فیصلہ تسلیم نہیں کرنا۔ انہیں سمجھاؤ کہ ہم نے سونے کے نوالے نہیں کھانے۔ ان سے کہو کہ میں بہن کو اس کا شرعی حصہ دینا چاہتا ہوں۔" مجید کا سر ماں کے سامنے جھک رہا تھا۔

"امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مجھے بابا سے بات کرنا ہو گی۔" وہ اٹھنے لگا۔

"تم کیا سمجھتے ہو۔ تمہارا کہا ان کے لیے حکم ثابت ہو گا۔" عمارہ طنزیہ ہنسی۔ "آمنہ آج خود آئی تھی۔ تمہارے باپ نے اس کی وہ بے عزتی کی کہ بیچاری اس گھر سے بہتے آنسوؤں کے ساتھ گئی ہے۔"

وہ دیوار کی طرح کھڑا رہ گیا۔ اس نے دیر کر دی تھی۔ دو گھنٹوں کے بعد اس کی بہن خشک' ویران' اجاڑ آنکھوں کے ساتھ دوبارہ آ گئی تھی۔ مجید نے اسے خود بوا کے پورشن کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ وہ اب بھی بہن سے نظر ملا کر بات نہیں کر سکتا تھا۔ اسے باپ کے سامنے ڈٹ جانا چاہیے تھا۔ وہ بقول اس کی بیوی کے صرف نصیبوں کا کھیل نہیں تھا۔ اس کہانی کے کافر کرداروں میں وہ بھی شامل تھے۔ مگر یہ کہانی تو بالکل سیدھی سادی تھی پھر اس میں اتنا ظالم موڑ کیوں آ گیا۔

"سفیر میری بچی کی خوشیاں اب تمہارے ہاتھ میں ہیں۔" تائی نے سچ مچ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

اس نے خاموش بیٹھی وانیہ پہ ایک نظر ڈالی۔ اور تائی کے بندھے ہاتھوں سے نظر چرائی۔ کاش اس خاندان کے مرد اتنے ظالم نہ ہوتے۔ اتنے خود غرض نہ

ہوتے۔ کوئی مثال تو میرے لیے بھی اچھی ہوتی تو میں بھی اپنے فیصلے پہ نظرثانی کرتا۔" اس کے چہرے پہ بلا کا دکھ تھا۔ انتہا کی سنجیدگی تھی۔ اس کے تایا اور باپ کا دل کانپا۔

"آمنہ! تم ہی احمر کو سمجھاؤ۔" عمارہ بیگم ان کے قدموں میں بیٹھیں۔

آمنہ تڑپ کے کھڑی ہوئیں اور بڑی بھاوج کو کندھوں سے تھام کے اپنے سامنے کھڑا کیا۔

"کیا میں خاموش بیٹھی رہی ہوں۔ بخدا یہ میرے اپنے بچے ہیں۔ میری گود میں پروان چڑھے ہیں مگر احمر ضد میں بہرا ہو چکا ہے۔ ہم دعا کے علاوہ کیا کر سکتے ہیں۔"

عمارہ سر پکڑ کر بیٹھ گئیں' آج انہیں اپنے سامنے آنسو بہاتی ایک بے بس ماں یاد آرہی تھی۔

"بہن اور بیٹی کی محبت ایک جیسی ہو سکتی ہے مگر تکلیف بہت مختلف ہوتی ہوگی تایا جی!"

سفیر کے الفاظ گرم سیال تھے۔ ایک کڑوا سچ تھا۔ وہ اچانک وانیہ کی طرف بڑھا' پھر اسے کلائی سے کھینچ کر بوا کے ساتھ کھڑا کیا۔ اس کا یہ عمل ان سب کے لیے غیر متوقع تھا۔ عمارہ کا رونا دھونا بند ہو۔

"کیا تم سب کو بوا کے لیے یک آواز ہونا چاہیے تھا کہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔" اس نے اپنے ہی سوال کا خود ہی پرزور آواز میں جواب دیا۔ "وہ پراپرٹی دادا نے اپنے ساتھ قبر میں لے کر نہیں جانی تھی۔ آپ دونوں بھائی بھی اس کے مالک و مختار تھے۔ یوں خاموش رہ کر بہن کا گھر برباد ہوتے دیکھنا اور خود غرض خواہشات جو دولت کے بل بوتے پہ پنپتی ہیں' روایات کی آڑ لے کر انہیں تمام عمر پوری کرتے رہنا' کیا یہی انسانیت کی معراج ہے' اس طرف کھلا لالچ تھا' دوسری طرف ضد تھی' انتقام تھا' اس عورت کا احساس تو کہیں بھی نہیں تھا۔ پھر آج اس لڑکی کے لیے سب کے دل کیوں بند ہوئے جارہے ہیں۔"

اس نے وانیہ کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

"اور تقدیر کا لکھا یہ ہوتا ہے تائی جی۔ آمنہ کی بربادی تو آپ سب کے لالچی پن نے کی تھی اور آپ سب سن لیں۔ خدا کے احکام کے مطابق میں اپنی پراپرٹی میں سے بہن کو حصہ دے رہا ہوں۔ میں نے تمام پیپرز بھی بنوا لیے ہیں۔ میں قیامت تک کی عمر لکھوا کر نہیں لایا۔ اور میں بوا سے یہ وعدہ ضرور لوں گا کہ روز حساب انہیں مقیم ہاشم کا گریبان پکڑنا ہوگا۔"

آمنہ سمیت ان سب کے دل رک کے دھڑکے تھے۔ "میں اب بھی سونی کے لیے انکار کرتا ہوں۔" وہ گردن میں سریا لگا اکڑ اکڑ کر بولا۔ "مگر آمنہ مٹی کی تھی تو آپ کی بیٹی بھی سونے سے نہیں بنی ہوئی۔"

وانیہ کا دل ڈوبا۔ یہ سفیر کا کون سا روپ تھا۔

"میرے آباؤ اجداد ظالم حکمران تھے یہ وصف میرے باپ دادا میں بھی نسلوں سے چلا آرہا ہے۔ پھر مجھ سے رحم دلی کی توقع کیوں کی جارہی ہے۔"

اس نے آخری نظر میں۔ زرد پڑتی وانیہ پہ ہی ڈالی تھی۔ وہاں موجود ہر ذی روح جیسے گہری نیند میں اتر چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"پندرہ سال وہ تمہارے نکاح میں رہی ہے۔ یہ رشتہ توڑتے ہوئے تمہیں کچھ بھی محسوس کیوں نہیں ہو رہا احمر!" سدرہ آج آنسو بہائے بنا رو رہی تھیں۔

"جب وہ لوگ بے حسی کی انتہا کو چھو لیتے ہیں تو ان کے دل کیوں نہیں کانپتے۔" اس نے طلاق کے کاغذات اپنے سامنے کھسکائے۔ اس نے خشک آنکھوں سے ان چند کاغذوں کو دیکھا۔ جن پہ چند دستخط کرنے سے دو خاندان جدا ہو جانے تھے۔ "احمر اس گھر میں میری بہن بھی رہتی ہے۔ کچھ اس کا ہی خیال کرو۔" وہ عاجزی ئے منت سے لب کشا ہوئیں۔

"پہلے تو جیسے آپ ان سے ہر ماہ ملنے جاتی ہیں۔" انداز صاف مذاق اڑانے جیسا تھا۔ "آپ کے بھتیجے کی زندگی میں کوئی اور لڑکی ہے۔ وہ سونی سے شادی نہیں کر سکتا۔ میری زندگی میں بھی کوئی اور لڑکی ہے۔ آپ کو اب تک جان لینا چاہیے تھا امی! اور میں پھر بھی اس لڑکی سے شادی کر لوں گیونکہ میرا اس سے کسی

پرانے زمانے میں نکاح ہوا تھا۔"
اس نے ٹیبل پر پڑا قلم اٹھایا۔ "قسمت نے مجھے ایک موقعہ دیا ہے میں اسے گنوانا نہیں چاہتا۔ زندگی سے ہر آسائش چھیننا میرا بھی حق ہے۔ ورنہ اپنے پیرنٹس کی اکلوتی اولاد ہے اس کا سب کچھ میرا ہی ہوگا۔ ہم سونی کی شادی کسی بہت اچھی فیملی میں کریں گے۔"

اس نے پہلا کاغذ اپنے سامنے کیا' سدرہ کا وجود جامد ہوا۔

"وانیہ میرے ٹائپ کے بندے کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی ۔۔۔ ویسے ہی جیسے سدرہ مقیم دوبارہ کسی مشہد نیازی کے ساتھ زندگی نہیں گزارنا چاہے گی۔"
اس نے کاغذ پہ سائن کیے "بالکل نہیں۔"
اس کے سچ نے ماں کے وجود میں روح پھونکی۔
"آپ یقین کریں اس گھر میں مشہد نیازی کو سوائے مقیم صاحب کے کوئی بھی پسند نہیں کرتا تھا۔"
اس نے تیسرا اور آخری سائن کیا۔
"بالکل بھی نہیں۔" بیٹے کا دوسرا سچ پہلے سے زیادہ حسین تھا۔ "آپ کتنے خواب توڑ کر اس گھر میں آئی

تھیں۔ جگہ جگہ سے اکھڑا پلستر۔" وہ ہنسا "مشہد صاحب کے سسر نے یہاں کافی پیوند لگوائے تھے جو واقعی نظر نہیں آتے ہوں گے۔ مگر بیٹی کو رخصت کرتے وقت اس کے دل کی پیوند کاری کرنا وہ کیوں بھول گئے تھے۔"
اس نے وہ پیپر زلفافے میں ڈالے۔
"ارے نہیں امی' پیوند کاری تو ہوئی تھی' آپ جس گاڑی میں رخصت ہو کر بیٹھی تھیں۔ وہ ابا کو نانا نے ہی تحفے میں دی تھی بلکہ نانا حضور کہنا چاہیے۔"
اس نے ٹائی کی ناٹ کافی ڈھیلی کی' کچھ زیادہ ہی کہ وہ جیسے گود میں گر سی گئی۔
"وہ گاڑی راستے میں دوبار پنکچر ہوئی تھی۔ اور ابا کی گالیاں' اف۔ نئی نویلی دلہن نے یقیناً" انجوائے کیا ہوگا۔" وہ بہکی بہکی باتیں کیوں کر رہا تھا' سدرہ حیران تھی۔

"یہ ساری باتیں ابا نے مجھے بتائی تھیں کیونکہ نانا حضور کو میرے باپ کی شرابی آنکھوں سے محبت ہوگئی تھی۔" احمر کا لہجہ بھیگا۔ ماں کے چہرے پہ ہوائیاں اڑیں' مقیم ہاشم کو عشیر عباس کی آنکھیں کچھ خاص پسند نہیں تھیں۔ اس لیے اس نے آمنہ کو اس سے الگ کر دیا۔ مگر مشہد نیازی کہتا تھا تمہارا نانا میری آنکھوں پہ۔" وہ اپنی جگہ سے برق کی تیزی سے آئیں۔
"آنکھیں تو وانیہ کی بھی اچھی ہی تھیں مگر وہ اپنے ساتھ پراپرٹی لے کر آئے گی امی! ہم سونی کو لاکھوں کا جہیز دیں گے۔" وہ رو رہا تھا۔ اس کی شرٹ آنسوؤں سے تر تھی' سدرہ نے اسے اپنے سینے میں بھینچ لیا' وہ نہیں جانتی تھیں کہ ان کے خوابوں کی قبر پہ ان کا بیٹا آج بھی فاتحہ خوانی کرتا تھا۔

✡ ✡ ✡

چہرے پہ اتری حیرت دیدنی تھی۔
"کیا واقعی بھابی ایسا سمجھتی ہیں۔" اس نے یہ جملہ تیسری بار دہرایا۔ "اوہ نو۔" وہ متحیر تھا۔ وہ شاکڈ تھا۔

آج پھر اس کی گردن میں موونگ سسٹم فٹ تھا۔ "میں نہیں مانتا۔ وجہ کوئی اور ہوگی۔ وجہ کوئی اور ہے۔" وہ خود کلامی کے موڈ میں تھا۔ "میں نے کبھی یہ بات شائنہ سے نہیں کی' اور نہ ہی اس بے تکی خواہش کو میں مٹھی میں بند کر کے بیٹھا ہوں۔ تو۔"
اس نے چہرہ گھما کے ساحر کو دیکھا۔ پھر وہ ٹھٹکا۔ اندر کہیں کچھ منکشف ہوا۔
"یہاں سے گزر ہی رہے ہیں تو آپ کے ڈاکٹر صاحب کی خیریت ہی دریافت کریں۔" شائنہ کی آواز میں کیسے ٹھنڈی سی ہوا چلنے لگی تھی۔
"ایسے ڈاکٹر سے کون علاج کرواتا ہے جو خود اکیلا زندگی بسر کر رہا ہوں۔"
کچھ عرصہ پہلے اقصیٰ کو بارش سے خوف سا آنے لگا تھا تو نعیم عباس نے اسے ڈاکٹر ساحر سے اپائنٹمنٹ کا مشورہ دیا تھا۔ عشیر کی یاد میں اقصی کا استہزا اسے بھرا

لہجہ ابھرا۔ اپنے بے حد قریب بیٹھے ساحر سے اس کی آنکھیں کسی بہت گہرے بھید کا نام پتا دریافت کرنے لگیں۔ اب کچھ بھی چھپانا بے کار تھا۔

"وہ مجھ میں انٹرسٹڈ ہے۔" وہ تمام ہمتیں مجتمع کر کے سرگوشی نما ہوا۔ انداز یوں تھا کہ میں تو بے قصور ہوں۔ مشیر نے اک بھرا بھرا سا سانس لیا۔ مگر اس کے خوش باش چہرے سے نظر نہیں ہٹائی۔ جہاں محبت اپنی ہری پوروں سے اس چہرے کے ہر نقوش پہ لفظ محبت لکھتی جا رہی تھی۔

"میں نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی کی' نہ کبھی اسے احساس ہونے دیا کہ اس کے جذبات سے واقف ہوں۔" اس کا وضاحت دیتا لہجہ ہی کسی بے چینی سے بھیگا ہوا تھا۔ عشیر کے لبوں پہ مبہم مسکراہٹ رینگی۔

"اور تم؟" ان دو لفظوں میں ساری کہانی تھی۔ سارے موسم تھے۔ پورا زمانہ۔ اگر جواب نہیں ملتا تو اس خوش گوار چہرے پہ محبت لکھنے والی محبت تک کھنڈر ہو جاتی۔ صفر ہو جاتی۔

"میں سمجھتا رہا کہ ہم دونوں کے بیچ صرف عشیر عباس ہے۔ ہمارا ہنسنا' ہمارا مسکرانا۔ آنکھیں نم کرنا۔ ساتھ چلنا۔ ساتھ چھوڑ دینا۔ صرف اسی کے سبب سے ہے۔ ہمیں پتا ہی نہیں چلا کہ کب ہمارے بیچ سے اسے ہٹا کر محبت ہمارے ساتھ چلنے لگی تھی۔" وہ ہولے سے ہنسا۔ "بس وہ ہمارے ساتھ چلتی رہی۔ نہ اس نے کبھی کچھ کہا۔ نہ ہم نے کبھی کچھ سنا۔ مگر ہر چیز کو کہیں نہ کہیں تو ٹھہرنا ہوتا ہے یار!"

وہ جیسے سب کچھ کہہ چکا تھا "اور ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ محبت ٹھہر جائے اور ہم بھاگنے لگیں۔ وہ کمبخت تو ہماری ایڑیوں پہ پنجے گاڑ لیتی ہے ڈاکٹر۔"

عشیر کا قہقہہ آج بے ساختہ تھا۔ اور اب لمحاتی توقف کے بعد اس نے پھر دو لفظوں کی کہانی چھیڑی۔ جس میں چاروں موسموں کا حساب کتاب نہیں' زمانوں کی بات تھی۔

"وہ مجھ سے بہت چھوٹی ہے۔ امیر عباس کیا سوچے گا۔ تمہارا خاندان کبھی رضامند نہیں ہو گا۔ میں محبت کا تماشا نہیں لگا سکتا۔"

اس نے صاف بات کی۔ اس کی پیشانی ہر شکن سے آزاد تھی۔

"تمہیں ایک مزے کی بات بتاؤں۔ ڈاکٹر... وہ جیسے محظوظ ہو کر گویا ہوا۔" یہ ہمیں کھینچتی ہے' دھکیلتی ہے کبھی رنگ دیتی ہے کبھی بے رنگ کر دیتی ہے' کوستی ہے' مارتی ہے' چلاتی بھی' اس کی آواز نرم بھی ہے' یہ چٹخارتی بھی ہے یہ سارے تماشے محبت خود لگاتی ہے'
'ہم تو کچھ بھی نہیں کرتے' ہم وہ ہوتے ہیں اور یہ پورا قبیلہ رکھتی ہے۔ اگر یہ تمہارے وجود میں ہے تو پھر تماشا لگے گا۔ آگے بڑھو گے تو تماشا لگے گا۔ یہیں کھڑے رہو گے تو تمہارے ساتھ کھڑی ہو کر بھی پورا قبیلہ اکٹھا کر لے گی۔ آنسو' آہیں' سسکیاں' رتجگے' رونا' دھونا' تڑپنا' مچلنا۔ تم مڑ مڑ کے دیکھو گے تو بہتر یہی ہے کہ آگے بڑھو۔ کہیں روایات' کہیں قبیلے' کہیں ضد کہیں عمروں کا خوف' خاندانوں کی جھجک۔ اس بے چاری محبت کے ساتھ اتنا بدتر سلوک روا رکھنا چاہیے کیا!"

عشیر عباس کی آنکھیں بول رہی تھیں کہ میں تمہارے ساتھ ہوں کیونکہ میں محبت کے ساتھ ہوں۔

☆ ☆ ☆

آج وہ سب ایک کال کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ سب ایک جگہ جمع نہیں تھے مگر ان سب کے اندیشے ایک ہی راستے پہ گامزن تھے۔ سفیر کل سے غائب تھا۔ انعم ابھی کلینک سے ہو کر آئی تھی' وہاں اقصیٰ فہیم بھی آئی ہوئی تھی۔ اس کی سرگوشی سنی گئی۔ آمنہ کے کسیج کرتے لب پیوست رہ گئے۔ ذہن میں سب کچھ گڈمڈ ہوا۔

"وہ عشیر عباس کی بہو نہیں نہیں۔" دل کہیں پاتال میں جا کر دھڑکا۔ انہوں نے دوسری شادی ہی نہیں کی بلکہ ہم انعم خاموش ہوئی۔

آمنہ کی سانس سے پرانا رنگ ذرا' ذرا ابھرنے

لگا" وہ ابھی تک کسی سائیکاٹرسٹ سے کنسلٹڈ ہیں۔"

"اُف!" تسبیح اس کی گود میں گری' ایک ساتھ تمام یادیں اس کے دل پہ اپنا بھاری پاؤں رکھتے ہوئے گزری تھیں۔ اس قدر بوجھ۔ اس نے اپنا سینہ مسلا۔

"انعم باجی' یہ کوریئر سے کچھ آیا ہے۔" افشاں نے انعم کی طرف لفافہ بڑھایا۔

"ڈائیورس پیپرز" اسے کھولتے ہی انعم کی چیخ نما آواز نکلی تھی۔ آمنہ کا سینہ درد سے شق ہوا۔ عمارہ بیگم کی بین ڈالتی آواز وہ جیسے ڈوبتی حسیات کے ساتھ سن رہی تھی۔ اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

"بوا!" وانیہ کی چیخ بہت بلند تھی۔ چند منٹوں کے بعد مقیم ولا کے کشادہ بھاری گیٹ سے ایمبولینس چنگھاڑتی ہوئی نکلی تھی اور اس گھر کی انہونیاں اور سیاہ بختیاں بھی اس کے ساتھ ہی نکلی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اسے آج ایک اہم سیمی نار میں شرکت کرنا تھی گویا کہ اس سیمی نار میں اس کی شرکت ریڑھ کی ہڈی کی مانند تھی۔ اسے مقررہ وقت پہ پہنچنا تھا۔ اسی حساب سے وہ اپنے آفس سے اٹھا۔ آج اسپتال میں رش کم تھا' وہ عجلت بھرے انداز میں کوریڈور عبور کر رہا تھا۔

"سر! ابھی ایک پیشنٹ بہت سیریس حالت میں آیا ہے۔" اس نے عقب میں ڈاکٹر ثریا کی آواز سنی۔ "آپ پلیز ہینڈل کرلیں یا پھر ڈاکٹر فخر کو کال کریں۔"

اس نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی' سیمی نار میں سب منتظر ہوں گے۔ اس نے رفتار ضرور دھیمی رکھی تھی مگر رکا نہیں تھا۔ اس کی اچٹتی سی نگاہ بائیں جانب اٹھی۔ وہ لڑکی بری طرح رو رہی تھی۔ اسے وہ چہرہ دیکھا دیکھا سا لگا تھا۔ وہ بھی شاید اسے دیکھ چکی تھی۔ اسے یاد آیا اس نے اسے کہاں اور کس کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ اچانک رکا۔ تب تک انعم اسے پکار چکی تھی۔

"ڈاکٹر عشیر عباس!" وہ بے قرار لہجہ پہچان سے مزین تھا۔ "آپ انہیں اس کنڈیشن میں چھوڑ کر کیوں جا رہے ہیں۔ آج بھی ان کی یہ حالت آپ کی وجہ سے ہوئی ہے۔"

وہ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں سمجھا تھا۔ اس کے دل میں ہزاروں گرہیں پڑیں۔

"تو اندر۔" اس کا لہجہ بے طرح کپکپایا۔ اگلے پل ہاتھ میں پکڑی کی چین چھنکتے فرش پر گری۔

"آمنہ" اس کے لبوں نے بے آواز جنبش کی۔ انعم نے اسے آئی سی یو کی طرف دیوانوں کی طرح بھاگتے دیکھا۔ وہ بوا کے ساتھ تنہا آئی تھی۔ باقیوں کو کال کرنے کے بعد اب وہ بار' بار سفیر کو کال کر رہی تھی (آپ کا ملایا ہوا نمبر فی الحال بند ہے)

"او شٹ یار!" اس نے بے دردی سے اپنے رخسار رگڑ ڈالے۔ اب وہ رمیض کا نمبر ملا رہی تھی۔ شکر ہے کہ ابھی عشیر عباس اسپتال میں ہی تھا۔ جانے کیوں وہ اب مطمئن ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

مشینوں میں جکڑی آمنہ کو دیکھ کر دل جانے کتنے حصوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہوا تھا۔

"میں نے ڈاکٹر فخر کو کال کی ہے۔"

ڈاکٹر ثریا نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ قریب آیا اس نے اپنا کپکپاتا ہاتھ اس کے ٹھنڈے ہاتھ پہ رکھا۔

"سر! یہ کوئی آپ کی عزیزوں میں سے ہے۔"

"یہ میرا دل ہے اور اسے دھڑکن چاہیے ڈاکٹر!" وہ بے سکون ہو کر بولا۔

"سر! پلیز ان کی حالت بگڑتی جا رہی ہے۔" وہ بدحواس سی ہو کر بولی۔ "آپ خود کو سنبھالیں اور پلیز میری ہیلپ کریں۔" وہ بدحواسی میں بولی تب ہی ڈاکٹر فخر بھی کچھ ڈاکٹرز کی معیت میں اندر آئے۔

آئی سی یو میں داخل ہونے سے پہلے اس نے سیمی نار میں شرکت کرنے والے ہاٹ سرجنز سے یہاں آنے کی درخواست کی تھی۔ وہ خود اسے اک پن تک نہیں چبھو سکتا تھا۔

"ریلیکس یار!" انہوں نے اسے تسلی دی۔ اس کی حالت ہی ایسی تھی۔ "تم باہر جاؤ۔"

"مگر اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے۔"

"اوکے۔" وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھے' بس اتنا کہ وہ جو بھی تھی اس کے لیے سب کچھ تھی۔ آج وہ اندر باہر سے ٹوٹا ہوا بکھرا ہوا لگ رہا تھا۔ اس اسپتال میں ایک دم جیسے ایمرجنسی نافذ ہو چکی تھی۔ شہر کے تمام نامور ہارٹ سرجن آچکے تھے۔ پورا آئی سی یو کا عملہ الرٹ تھا۔ انعم نے انہیں ایک گھنٹے بعد باہر آتے دیکھا۔ امین بھی اس کے ساتھ تھا۔ ایک گھنٹہ قبل تک سک سے تیار سرجن اب اجڑے حال میں آستین کہنیوں تک موڑے کہیں سے بھی نارمل نہیں لگ رہا تھا۔ عدیل اور عاقل بھی آچکے تھے۔ انعم اس کی طرف لپک کر آئی۔

"بوا کی حالت کیسی ہے؟"

"وہ ٹھیک ہو جائے گی۔" اس کے لب ذرا سے ملے تھے۔ مجید اور نوید کو وہاں آتے دیکھ کر وہ اپنے آفس کی طرف بڑھ گیا تھا۔ جنہوں نے اس کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ اسے اک پل چین نہیں تھا اس کی جان آپریشن تھیٹر کے بیڈ پہ بے سدھ پڑے اس وجود میں اٹک کر رہ گئی تھی جس کے دل میں پڑنے والی ہر دراڑ میں وہ تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ چار دنوں کے بعد گھر لوٹا تھا۔ گھر میں ہونے والے دونوں حادثوں کی بابت ماں نے اسے بتا دیا تھا۔ ورنہ وہ شاید اب بھی نہ آتا۔ تائی اپنے کمرے میں بند تھیں' البتہ تایا نے اس سے نارمل انداز میں بات کی تھی۔ وہ پہلے اسپتال گیا تھا۔ گھر کے باقی افراد وہیں تھے۔ اس نے وہاں موی کو بھی دیکھا تھا۔ سوانیہ بھی یقیناً" کہیں ادھر ہی تھی۔ بوا کی حالت سنبھل چکی تھی' مگر ابھی انہیں غنودگی اور بے ہوشی کے زیر اثر رکھنا ضروری تھا۔ ان کے دل کا کچھ حصہ متاثر ہو چکا تھا۔

ابھی گھر سے چینج وغیرہ کر کے اسے پھر اسپتال جانا تھا۔ بھوک تو اڑ چکی تھی۔ وہ کچن میں چائے بنانے کی غرض سے آیا۔ رانی اور افشاں نو بجے اپنے کوارٹر میں چلی جاتی تھیں۔ وہ وانیہ کو کچن میں موجود پا کر دھک سے رہ گیا۔ دوسری طرف بھی وہی کیفیت تھی۔ اس کا تمام چہرہ سوجا ہوا تھا۔ جیسے وہ کتنے دنوں سے بس رو رہی تھی۔ نظر وانیہ نے حیرائی تھی کہ اچھے حالوں میں وہ بھی نہیں تھا۔ بڑھی شیو' الجھے بال' شکن آلود لباس' وہ شاید چائے ہی بنا رہی تھی۔ وہ چیئر کی طرف بڑھا اور جیسے ڈھے سے گیا۔

اس کا خیال تھا کہ وہ اسے ایک کپ چائے تو ضرور ہی دے سکتی ہے' مگر اس کا خیال آدھے منٹ کے وقفے سے چاروں شانے چت ہوا۔ جب وہ اپنا کپ اٹھائے ناک کی سیدھ میں اس کے پاس سے گزر گئی تھی۔ غصے اور بے بسی کی ایک تیز لہر نے اس کے وجود کو چھوا۔

"اسے اتنا صدمہ کیوں ہے؟" وہ کھڑا ہوا اور کرسی کو ٹھوکر سے سامنے سے ہٹایا جی تو چاہ رہا تھا کہ چائے کا کپ اس سے جھپٹ کر زمین بوس کر دے اور شاید وہ دل کی مان بھی لیتا' مگر وہ سب لوگ اسپتال سے واپس آگئے تھے۔ ڈاکٹرز کہہ رہے تھے کہ اگلے دو دن نرسز کے علاوہ ان کے کمرے میں کوئی نہیں جا سکتا۔

"انہیں انجکشن لگائے جا رہے ہیں۔" انعم نے اسے وہاں سے پر تولتے دیکھا تو روکا۔ "اب وہ سیریس کنڈیشن سے باہر آچکی ہیں۔" گھر کا ہر فرد اس سے لیے دیے انداز میں بات کر رہا تھا۔

اسے دکھ ہو رہا تھا۔ وہ کیسے قصور وار ہو گیا۔ اس نے بیگ میں چند جوڑے ٹھونسے اور کچھ ضروری سامان۔ کچھ دیر بعد اس نے گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ پھر جا رہا ہے اور اب وہ سامان سمیت جا رہا تھا۔ اس کے آنسو روانی سے تکیہ بھگونے لگے۔ ٹیبل پہ چائے جوں کی توں پڑی تھی وہ ایک خود غرض انسان نکلا۔ یہ تلخ سوچ اسے چار دنوں سے رلا رہی تھی۔ اس نے احمر کو طلاق دینے پہ مجبور نہیں کیا تھا اول اسے یہ رخ بھی دکھانے کی کوشش میں چار دنوں سے ہلکان ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کی تمام حسیات ایک خنکی محسوس کر رہی تھیں جیسے وہ برف باری میں اڑ رہی تھی۔ پھر اس کا خوابیدہ ذہن بیدار ہونے لگا۔ اسے یاد آیا وہ درد پھر اسے درد دینے والا یاد آیا۔ اس کی آنکھیں کھلیں، وہاں زرد روشنی تھی اس نے ہاتھ کو حرکت دی، مگر یہ کیا وہ اسپتال میں تھی۔ اسے ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ وہ چت لیٹی تھی اس نے آنکھوں کو خفیف جنبش دے کر موڑا۔

وہ کرسی کی بیک سے سر ٹکائے سو رہا تھا۔ دل عجب انداز میں اچھل پتھل ہوا۔ کمرے میں ہلکی ٹوں ٹوں ہوئی۔ تو کیا وہ وینٹی لیٹر پہ تھی اس ہلکی آواز پہ بھی اس نے فوراً" آنکھیں کھولیں، مگر تب تک وہ پلکیں میچ چکی تھی۔ اس نے اس بے حرکت ہاتھ کی پشت پہ اپنا پر حرارت ہاتھ ملائمت سے رکھا۔

"میرے ساتھ اتنا ظلم مت کرو۔ آمنہ!" اس کی بوجھل آواز مدھم تھی۔ اس کے آنسو کنپٹیاں بھگونے لگے۔

جلا دیا ہے شہر جاں کہ سبز بخت نہ تھا
کسی بھی رت میں ہرا ہو یہ وہ درخت نہ تھا

وہ التجا اثر انگیز تھی۔ وہ لب و لہجہ رحم کے قابل تھا۔ اس نے دھیرے سے آنکھیں وا کیں۔

"تم نے کیسے سوچ لیا کہ تمہارے بعد میں خود کو آباد رکھ سکتا ہوں۔" وہ ان الجھی، روئی گیلی پلکوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ ان کا رنگ اب بھی بھورا تھا۔

"ان چار دنوں میں خود پہ ہوئے ظلم کا بدلہ تم مجھ سے لے چکی ہو۔ اب مجھے معاف کردو۔ پلیز۔" وہ مجسم التجا ہوا کہ "ہم دونوں نے ہی ہجر کاٹا ہے۔"
بچھڑنے کے بعد ہم دونوں ہی کے درخت جاں پہ نہ برگ جاگے نہ پھول آئے۔"

وہ پر حرارت لمس زندگی بخشنے جیسا تھا، مگر نامحرم تھا۔ اس نے ہاتھ کھینچنا چاہا۔

"پلیز۔ میں ایک ڈاکٹر بھی ہوں۔ رشتہ ٹوٹ جانے سے محبت ختم نہیں ہوتی۔" وہ کہہ نہ سکا۔ اسے انعم نے بتایا تھا کہ اسے اتنا شدید اٹیک کن وجوہات کی بنا پہ ہوا۔

"تمہیں شک گزرا کہ میں کسی کا ہو چکا ہوں تو کس قدر کاٹ دار نگاہوں سے تم نے مجھے دیکھا۔ میں ان بے اعتبار نگاہوں کے ایک ہی وار سے پاگل ہو گیا تھا اور جب یقین ہوا کہ شہر ہجر میں، میں ہی تنہا تمہیں کھو کر بھٹک رہا ہوں تو میری تکلیف سے دل کا یہ حال کر لیا، کیوں آمنہ۔ اتنے سال خود کو کیوں قید کیے رکھا۔ میں نے مقیم ولا کے راستوں پر برسوں بن باس کاٹا کہ تم ملو تو بیچ کی کوئی راہ ڈھونڈیں، مگر تم کسی طور نظر نہ آئیں اور وقت گزرتا گیا۔" وہ اک آہ بھر کے خاموش ہوا۔

"تمہارے گھر سے آنے کے بعد میں نے مڑ کے دنیا کی طرف، رشتوں کی طرف کبھی دیکھا ہی نہیں۔" وہ دھیمے سروں کے ساتھ ہم کلام ہوئی۔ "اس رات مجھے سدرہ بوا کے پورشن کی گرد نے ایک میٹھی پناہ فراہم کی۔ ان میلے پروں کے پرندوں کی لوریاں سکون آمیز تھیں۔ میں نے اس رات جانا' یہ رشتے' یہ ناتے' یہ حرص و ہوس پہ محل مینار یہ عشق و محبت صرف مٹی ہیں' دھول ہیں۔ کبھی محبت کے پھونک مارنے سے اڑ جاتے ہیں۔ کبھی نفرت کی آہ بھرنے سے اڑ جاتے ہیں۔ میں نے صرف خدا کی طرف دیکھا۔ صرف اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اس نے میرے کھلے ہاتھ پہ اپنی یاد رکھ دی عشیر۔" وہ جیسے ہانپ کر خاموش ہوئی۔

وہ جو اسے بغور سن رہا تھا۔ اک عجب سے سکون سے دوچار ہوا۔ "میں نے سوچا تھا یا نہیں، مگر مجھے میری ماں نے میری دوستوں نے ایک درمیانی راستہ دکھایا تھا۔" اس کی آواز پہ نقاہت غالب آنے لگی۔

"وہ بہت مشکل تھا اس کے بعد بھی تم مجھے نہ مل پاتے تو میرا وجود بھی خالی ہو جاتا اور میری ہتھیلی سے اس کی یاد بھی پھسل جاتی جس نے مجھے اپنی پناہ میں سمیٹ لیا تھا۔" وہ تھک گئی تھی' خاموشی کا وقفہ بہت طویل ہوا۔

وہ سمجھا وہ سو چکی ہے اس کی ڈرپ ختم ہو چکی تھی۔ اس نے دوسری ڈرپ لگائی۔ پھر دوبارہ اسی کرسی پہ بیٹھا۔ "میں نے خدا کی طرف ایک ہاتھ بڑھایا تھا۔" وہ اس آواز پہ چونک کے سیدھا ہوا۔ "میں نے دوسری

مٹھی کبھی کھولی ہی نہیں۔ اس میں پورے طمطراق' پوری شان اور وقار کے ساتھ ہمیشہ تمہاری یاد' تمہاری محبت رہی۔" وہ بولی تھی کہ صرف احساس تھا۔ عشیر کے دل نے انہیں سنا تھا کہ سماعتوں نے۔ وہ سمجھ نہیں پایا۔

"عشیر!" وہ پھر لب کشا ہوئی۔ وینٹی لیٹر پہ آڑی ترچھی لکیروں نے پھر سے شور مچایا۔ وہ حواس باختہ ہوا۔

"تمہارے لیے زیادہ بولنا مناسب نہیں۔ آمنہ!" وہ واقعی ڈاکٹر تھا۔ وہ مسکرائی۔

"مجھے ابھی تک وہ جگہ دیکھنے کی حسرت ہے۔" آواز کپکپا کے رہ گئی۔ عشیر کی سانسیں بھاری ہوئیں۔ اس کا دل پانی ہوا۔ دھڑکنیں فنا ہوئیں' وجود آنسو ہوا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اس نحیف ٹھنڈے ہاتھ پہ ٹکا۔ "میں اکیس فروری کی ایک سیاہ شام کو وہاں گیا تھا' وہ جگہ اڑی تو تھی پھر دوسرے ہی پل میری آنکھوں میں آکر فنا ہو گئی تھی اب کرہ ارض پہ ایسی کوئی بھی جگہ نہیں۔" اس کمرے میں آنسوؤں کی بھیگی خوشبو اڑی تھی' چت لیٹی آمنہ ان آنکھوں کو دیکھے گئی جن میں سارے خواب فنا ہو گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"نام کے حساب سے یہ جادوگری تو مجھے کرنی چاہیے تھی' مگر آپ نے چند ہفتوں میں یہ سارا اہتمام وانتظام کس قدر احسن طریقے سے اور بنا محبت کا تماشا لگائے پروقار انداز میں کیا ہے کہ میں سالوں حیران رہوں گا۔"

وہ ابھی ساحر کے گھر آیا تھا۔ دن بھر وہ دونوں اپنے حلقۂ احباب میں شادی کے دعوت نامے دے دے کر تھکن سے چور تھے۔

"بے شک صدیوں حیران رہنا' مگر ابھی تو مجھے اچھی سی چائے پلاؤ۔" وہ جیسے کراہ کر بولا۔

"میں نے منزہ بھابھی سے بس چار جملے کہے تھے۔" اس نے چائے پیتے ہوئے سچ بتانے کی ٹھان ہی لی کہ

"بے چارا ڈاکٹر باقی زندگی حیرانی کی نذر ہی نہ کردے۔ تمہاری لاڈلی میرے نادیدہ اور بے نام بیٹے سے رشتہ ختم کرنے کو کسی صورت تیار نہیں۔ اس قدر ایب نارمیلٹی بات نکلے گی تو پھر دور تک جائے گی۔ کیوں نہ اسے کسی سائیکاٹرسٹ کے سپرد کیا جائے' باقی عمر علاج ہوتا رہے گا گو عمر میں لڑکی سے اٹھارہ انیس سال بڑا ہے' مگر ڈاکٹر ساحر میری خاطر اور امیر عباس کی خاطر اس قربانی کے لیے تیار ہو جائے گا' بے چارا ساری زندگی بیوی کے ہاتھ میں وہ نادیدہ کنگن کھوجتا رہے گا۔ بات بھلے کی تھی سو انہیں بھلی لگی۔"

عشیر اپنے قہقہے کو کچھ سمیٹ کے بولا کہ جاندار قہقہہ اب دل کے لیے مضر تھا۔

"ویسے بھی منزہ بھابھی جیسے سوشل لوگ خدا سے ڈرتے ہیں نہ کسی بلا سے۔ انہیں ایک ہی خدشہ خوف زدہ رکھتا ہے کہ بات نکلے گی تو پھر......" وہ ایک بار پھر ہنسا۔ "یار یہ دنیا بڑی ٹیڑھی ہے یہاں سے گھی نکالنے کے لیے انگلیاں ٹیڑھی کرنا پڑتی ہیں بس شائنہ نے نہیں' نہیں کا ڈرامہ میرے کہنے پہ چند روز ضرور کیا ہے پھر ماں باپ نے تحمل سے سمجھایا کہ لڑکا پچاس سال کا ضرور ہے' مگر دیکھنے میں چالیس سال کا لگتا ہے۔"

اب کے ڈاکٹر ساحر کا قہقہہ فلک شگاف تھا۔ لفظ لڑکے پہ وہ بہت محظوظ ہوا۔ عشیر نے ایک کارڈ ٹیبل پہ آہستہ سے رکھا۔

"یہ دعوت نامہ تمہیں دینا ہوگا۔" وہ نرم آواز میں لب بھینچ کے بولا۔

"آمنہ" کارڈ پہ یہ نام خوب صورت لائننگ میں رقم تھا۔ آج اکیس فروری تھی۔ ساحر کا ولیمہ انتیس کو تھا۔ "تو کیا؟" اس نے کچھ بھی سوال کرنے کا ارادہ ترک کیا۔ کچھ باتوں کا حسن ان کہی میں ہوتا ہے' جوان کہی عشیر عباس کی آنکھوں میں نئی کہانی بن رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

دانیہ کی طلاق کو پانچ ماہ ہو چکے تھے جیسے تیسے کر کے

وہ سب معمول کی زندگی پہ آ گئے۔ سدرہ آمنہ سے اسپتال ملنے آئی تھی۔ مجید نے بہن کو گلے سے لگا کر قصور واروں کی لسٹ سے خارج کر دیا اور اسے یقین دلایا کہ میرے گھر کے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ دو ماہ پہلے احمر اور سونی کی شادی پہ آمنہ اور نوید نے شرکت کی تھی اور آمنہ وہاں کافی دن رہی تھی۔ یہ سب احمر نے سونی کی ایما پہ کیا تھا۔ آمنہ وہاں جا کر حقیقت سے باخبر ہوئی' ورنہ بہت ملنسار اور بااخلاق تھی۔ آمنہ کا ملال کچھ ڈھل گیا تھا وہ واپس لاہور آئی تو سفیر ہنوز گھر سے فرار تھا۔ اس نے اپنا ٹرانسفر جہلم کروا لیا تھا۔

عمارہ بیگم آج کل وانیہ کے لیے پریشان تھیں۔ ایک دو جگہ اس کے رشتے کی بات چل رہی تھی۔

"سفیر سے کہو گھر واپس آ جائے۔" آج بھی آمنہ نوید سے اسی موضوع پہ بحث کر رہی تھیں۔

"اگر وہ اس گھر میں آیا تو پھر ہم یہاں نہیں رہیں گے۔" عمارہ کی بات سن کر ان دونوں پہ جیسے منوں بوجھ پڑا تھا۔

"تو بچہ کیا یوں ہی دربدر رہے گا؟" آمنہ کی زبان پھسلی۔

"میری بیٹی کی دربدری کا تو کسی کو احساس نہیں۔ ہر جگہ رشتے کی بات خواہ مخواہ بگڑ جاتی ہے یوں ہی تو نہیں۔ وانیہ کی زندگی سفیر نے ہی برباد کی ہے۔"

عمارہ کے واویلوں پہ سعدیہ بیگم اپنی آنکھوں چپکے سے پونچھ لیتیں۔ آنکھیں تو وانیہ کی بھی نم ہوتی تھیں۔ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ دور گیا تھا اور مڑ کے خبر تک نہ لی۔ وہ بہت ضدی اور ہٹ دھرم تو ہو سکتا تھا' مگر وہ اس کی خواہش سے یوں دستبردار ہو گا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

دن یوں ہی سست روی اور بوجھل پن سے سرک رہے تھے۔ انعم اپنے گھر میں اپنے تین ماہ کے بیٹے کے ساتھ خوش تھی۔ آمنہ اب انعم کے کمرے میں رہتیں۔ نوید نے سیدہ بوا کے پورشن کو مقفل کر دیا تھا۔ وہاں سے تمام میلے پرندے کسی اور سمت کوچ کر گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

وہ کارڈ پہ لکھا شائنہ عباس کا نام تادیر دیکھتی رہی۔ دل پہ چوٹ سی پڑی۔

"بوا! چلیں گی ناں؟" انعم نے کوئی چوتھی مرتبہ استفسار کیا تھا۔ "آپ کے ڈاکٹر صاحب فرمارہے تھے دل کو تازہ ہوا چاہیے ہوتی ہے۔" اس نے انعم کو مسکرا کے دیکھا اور اثبات میں سرہلایا۔

"کثر پرانے لوگوں سے ملاقات ہو تو زندگی نئی سی لگنے لگتی ہے۔" اسے عشیر عباس کی بات یاد آئی۔

امیر عباس اور منزہ اس سے مل کے آبدیدہ ہوئے تھے اور شائنہ تو انہیں دیکھتے دیکھتے پھر میں ڈھل جانا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر ساحر کی حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ عشیر عباس کو آج ایک بے قرار سی خوشی نے گھیر رکھا تھا۔ آج کی شب بہار کی ہوا زخموں پہ پھاہے رکھ رہی تھی۔ آج کی شب اک کسمساتی سی نیند پلکوں کے آس پاس بھٹک رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ چار ماہ بعد مقیم ولا آیا تھا۔ وہ سب سے پہلے آمنہ کے کمرے میں گیا وہاں اس کی ماں بھی تھی۔ کل اس نے انعم سے بات کی تو اس نے بتایا کہ وہ ادھر آئی ہوئی ہے کیونکہ وانیہ کا رشتہ طے ہونا تھا۔ اس کا وجود تڑخ کر برف کی مانند ٹوٹا۔ تائی اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ رات اس نے جاگتے ہوئے گزاری تھی۔

عمارہ اور ان کی دونوں بہوئیں کسی ولیمہ کی تقریب میں گئی ہوئی تھیں۔ وانیہ گھر پہ تھی یا نہیں۔ نہ اس نے پوچھا نہ انہوں نے بتایا' مگر نوا کے کمرے سے نکلنے کے بعد اس کے قدموں کا رخ اسی کے کمرے کی جانب تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ اندر ہے یا نہیں۔ اگلے لمحے وہ اس کا دروازہ کھٹکھٹا کر رہا تھا۔

"آجائیں۔" وہ اجازت اس کے لیے تھی یا نہیں' مگر باہر کھڑے شخص نے اندر جانے میں لمحے کی تاخیر نہیں کی تھی۔

اس کی آمد غیر متوقع تھی' وانیہ کی ہراساں اور بے یقین نگاہیں اس پہ جم سی گئیں۔ آج سے کئی سال قبل کی ایک شام بھی جیسے وہ برسوں بعد پھر سے اپنے ہمراہ لے آیا تھا۔ جب وہ صرف اٹھارہ سال کا تھا۔ تب وانیہ کے نکاح کو سال ہو چکا تھا۔

"جب تک احمر یہاں ہے۔ تم اس کمرے سے باہر نہیں آؤ گی۔" وہ اپنے پیچھے یہ دروازہ بند کرتا چبا چبا کر بولا تھا۔

وہ اسے ہونق پن سے دیکھتی رہ گئی تھی۔ اگلے دو دن جھوٹ موٹ کا بخار چڑھا کر وہ دو دن کمبل میں گھسی رہی تھی۔ مئی کے آخری دو دن بغیر پنکھا چلائے اس کا ڈرامہ کامیاب ہوا تھا کہ فلاپ' مگر وہ چاہتی تھی کہ سفیر اس سے ناراض نہ ہو۔

تیسرے دن احمر کمرے میں آ گیا تھا۔ اس میں وانیہ کا کوئی قصور نہیں تھا۔

"وہ یہاں کیا کرنے آیا تھا؟" سفیر سے غصہ کنٹرول نہیں ہو رہا تھا۔

"مجھے نہیں پتا۔" وہ رسان سے بولی۔ وہ اسے گھور گھور کے تن فن کرتا چلا گیا تھا۔

دوسری شام سفیر نے کمرے میں آتے ہی اسے زور دار تھپڑ مارا تھا۔ اس نے حواس باختہ ہو کر گال پہ ہاتھ رکھا۔ اس کے چہرے پہ سراسیمگی پھیلی۔

"جب میں نے باہر آنے سے منع کیا تھا تو پھر اس کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلنے کا کیا جواز بنتا تھا؟" وہ لال بھبھوکا چہرے کے ساتھ اس پہ برس رہا تھا۔

وانیہ کے آنسو آنکھوں کی سطح پہ ہی خشک ہوئے۔

گزرے پانچ مہینوں میں محبت کی ریشم کالا دھاگا بن چکی تھی۔ اس نے زبردستی نظر موڑی اور ہاتھ میں پکڑا ناول سائیڈ ٹیبل پہ رکھا' مگر آنے والے کی نگاہیں بدستور وہی چہرہ چھو رہی تھیں۔

"یہ میں کیا سن رہا ہوں؟" وہ چند قدموں کے فاصلے پہ رکا۔

"اوہ!" وہ شانت ہوئی۔ اسے بڑی کمینی سی خوشی ہوئی (تو محترم خبر سن کے آئے ہیں) اس کی پیشانی کی تمام رگیں تنی ہوئی تھیں۔

"اگر کچھ اور سن کے آئے ہو تو کیا کہہ سکتی ہوں اور اگر خبر میرے بارے میں ہے تو بالکل سچ ہے کہ کل میرا رشتہ نہ صرف طے ہونا ہے بلکہ شادی کی ڈیٹ بھی فائنل ہو گی۔"

اگلے لمحے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کا متبسم چہرہ سرخ کر چکا تھا۔ آج وہ پھر اٹھارہ سال کا سفیر تھا۔ وہی تنفر' وہی غصہ' وہی تاثر۔

"اب ایسا نہیں ہو گا وانیہ مجید!" وہ لفظوں پہ زور دے کر بولا۔ "ہر بار وانیہ مجید' سفیر نوید کے دل سے نہیں کھیل سکتی۔"

وہ سرخ انگارہ آنکھوں کے ساتھ اسے گھورتا رہا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہیں جھکا بھی نہیں سکی۔

"میں اب تمہیں شوٹ کر دوں گا۔ تم اب مجھے شادی تک کمرے سے نکل کے دکھانا۔" وہ تپ کر بولا اور دھم دھم کرتا باہر بھی چلا گیا۔ آج بھی اس کے حیران آنسو اس کی پریشان آنکھوں کی سطح پہ ہی خشک ہو چکے تھے۔

☆ ☆ ☆

تائی کو منانا گو مشکل مرحلہ تھا' مگر بوا نے اسے آسان کر لیا تھا۔ "بھانت بھانت کے لوگوں کے سامنے بیٹی کی نمائش لگانے سے بہتر ہے' غصہ تھوک کر گھر کے بچے کے بارے میں سوچو جو طلاق کی اصل حقیقت سے واقف ہے۔ اگر تمہاری بیٹی اس کی وجہ سے برباد ہوئی ہے تو اب اسی کے ساتھ ہی آباد ہو سکتی ہے۔ احمر' وانیہ کے لائق نہیں تھا۔ وانیہ سفیر کے ساتھ خوش رہے گی۔ جو آ رہے ہیں انہیں منع کر دو عمارہ۔ اگلے ہفتے تک شادی کی تیاری ہو جائے گی۔"

تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد بات ان کی عقل میں سما گئی تھی۔

وہ پورا ہفتہ وانیہ نے کمرے میں بند رہ کر گزارا تھا۔

مہندی پر ان کا نکاح بھی کر دیا گیا۔ وہ تمام وقت سفیر کے پہلو میں لمبا گھونگھٹ نکال کر سوں سوں کرتی رہی کہ میں تو دکھ سے مر رہی ہوں اور وہ اس کے رونے دھونے پہ جز بز ہو کے پہلو بدلتا رہا۔

ہزار کوشش کے باوجود وہ مایوں مہندی کی دلہن کا روپ دیکھنے سے محروم رہا۔ کہیں رات گئے تگڑی رقم لے کر انعم نے اپنے موبائل پہ اسے وانیہ کی تصویریں دکھائی تھیں جنہیں دیکھتے ہوئے اس کا غصہ مزید بڑھا کہ تصویر اس قدر خاموش کیوں ہوتی ہے۔

☼ ☼ ☼

ان کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی' ایک ایک رسم نبھائی گئی وہ کہیں ایک بجے اپنے بیڈ روم میں آیا۔ آج وہ روایتی دلہنوں کی طرح گھونگھٹ نکال کے نہیں بیٹھی تھی۔ وہ اس کے سامنے پورے استحقاق سے پھیل کے بیٹھا اور اس کا اپنے لیے سجا سنورا روپ نگاہوں میں بھرنے لگا۔ وہ پہلے تو کافی دیر تلملاتی رہی پھر

ان نگاہوں کی تپش سے نروس ہونے لگی۔

(جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو ندیدہ) منہ بسور کے سوچا وہ زیر لب مسکرایا۔

"ہزار ہا بار دیکھ چکا ہوں' مگر دلہن تو پہلی بار بنی ہو۔"

"نہیں!" سپٹا کے دیکھا۔ نظر خود بخود جھکی۔ آج ان نگاہوں کا شوق بے باک تھا۔ اس نے ملائمت سے ہاتھ تھاما۔

"اف... اس قدر مہندی... تم لڑکیوں کے شوق کس قدر فضول ہوتے ہیں۔" جان بوجھ کے اسے تنگ کیا۔ اس نے زور دار جھٹکے سے ہاتھ چھڑانا چاہا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" آواز تیز ہوئی (یعنی کہ چند گھنٹوں کی دلہن کے ساتھ یہ رویہ) حیران نگاہیں پھیلیں۔

"مطلب کہ شوہر سے اس طرح ہاتھ چھڑانا غیر مہذب سی حرکت ہے۔" اب کے دھیمی آواز میں وضاحت کی۔

"یہ ہاتھ مجھ پہ دو مرتبہ اٹھ چکا ہے۔" دانت پیس کر کہا اور پھر کھینچا' مگر دوسری طرف بھی گرفت ڈھیلی نہیں تھی۔

"چار مرتبہ مزید اٹھ سکتا ہے' اگر دور جانے کی بات کرو گی۔"

"وانیہ سفیر!" لہجہ محبت کی گرمی سے دہکا۔ اس کی متحیر نگاہ جھکی۔

"میں وہ پنچھی ہوں وانی! جسے اک تیرہ سال کی بے رحم پری نے پتھر کا کر دیا تھا اور پھر وہ سارے اسم بھول گئی۔" اس نے دلہن کا دوسرا ہاتھ بھی تھاما۔ "اس جنگل میں چلنے والی مقدر کی ہوا نے پندرہ سال بعد مجھے انسان کا روپ بخشا ہے۔"

اس کی سانس کی آنچ دیوانہ وار بول رہی تھی۔ وانیہ کا دل عجب لے پہ دھڑکا۔

"تم میری تھیں۔ میں تم کو لینے آتا تھا وانی۔ تقدیر بھی میری محبت کے سامنے ہار گئی۔"

وہ جو سوچ کے بیٹھی تھی اسے بالکل لفٹ نہیں کرائے گی۔ جتنا اس نے ستایا۔ اس سے زیادہ ستائے گی۔ سارے دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

"میری زندگی میں صرف تم رہیں۔" اس نے وانیہ کا تپتا ہاتھ اپنے رخسار پہ رکھا۔ "میں نے دل کے سارے سفر تمہاری طرف ہی کیے۔ نہ کہیں دیکھا نہ کہیں اور بڑھا۔" سفیر نے درمیان کا فاصلہ نرمی سے سمیٹا۔

نہ چھاؤں جیسی کوئی کہانی نہ جلتی دھوپوں کا کوئی قصہ
کہاں کا ذکر سفر کہ پہلے قدم پہ ہم تو رکے ہوئے ہیں

وہ خوش تھا کہ وہ خوش نصیب ثابت ہوا۔ اسے زیست کا دوسرا قدم اسی کے ساتھ آگے بڑھانا تھا جس کے لیے وہ پہلے قدم پہ اک زمانے سے ٹھہرا ہوا تھا۔ اگلے سفر میں انہیں چھاؤں جیسی کوئی کہانی بنی تھی جن میں انہیں جلتی دھوپوں کے سفر کا کوئی تذکرہ نہیں کرنا تھا۔

☼

تہمینہ چودھری

"دروازہ کھول نا مہماہ..."

سورج مانو آگ برسانے کے درپے تھا۔ کچے پکے صحن کے بیچ پیپل کا بڑا سا پیڑ ایستادہ تھا۔ اس کے نیچے چند آڑی ترچھی چارپائیاں اور دوپہر کی روٹیاں لگانے کی نیت سے جلایا ہوا تندور... جواب جل جل کر بجھنے کے قریب تھا۔ تائی میداں کب سے اپنی روٹیاں لگا کر اپنے حصے کی طرف جا چکی تھیں۔

یہ ایک بڑا گھر تھا، جس کے دو حصے تھے۔ چھوٹی سی اینٹوں اور گارے سے بنی دیوار، اس گھر کے مکینوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی تھی۔ دیوار کے بیچوں بیچ چھوٹے سے دروازے کی جگہ تھی جو ان دونوں گھروں کو آپس میں جوڑے رکھتی تھی۔ ان دو گھروں کو پار کر کے ایک طرف بھینسوں کا باڑہ تھا جہاں تایا اکثر پائے جاتے اور وہیں ان کی بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔

"مہماہ میرے پتر..." اماں نے کنڈی کھڑکاتے ہوئے اسے لاڈ سے پچکارا تھا۔ مرنے سے پہلے ابا جی نے اسے بڑے لاڈ سے شہر کے کالج میں داخلہ دلوایا تھا اور وہ گئی بھی بڑی ٹور سے تھی۔ من ہی من میں لاکھ سپنے سجائے۔ ابا جی کا پتر بننے کے سنہری خیال سے۔ مہماہ کا کوئی بھائی تو تھا نہیں، وہ دو ہی بہنیں تھیں، نورماہ

ناولٹ

ذہنی طور پر کسی پانچ سال کی بچی کے برابر ہی تھی۔ دیکھے ان دیکھے ساری ذمہ داریاں اس پر آپڑی تھیں۔ یہ وہ خود محسوس کرتی تھی۔ پر جب سے وہ شہر سے آئی تھی، عجیب سی ہو گئی تھی۔ چپ چپ... سہمی سہمی ڈری ڈری جیسے خود سے ہی ناراض ہو۔

"ابا کیوں مر گئے۔" وہ سو سو بار دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے شکوے کرتی تھی۔ بیٹھے بیٹھے رونے لگ جاتی پھر جانے کیا ہوتا قل قل کر کے کھلکھلا کر ہنسنے لگ جاتی۔

اماں کو اس کی دماغی حالت پر شبہ سا ہونے لگا تھا۔ نور ماہ آکر اماں کے پیچھے دبک کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اسے بھی کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا تھا۔

"پتر! تجھے اللہ کا واسطہ..." وہ تھک گئی تھیں کہ ٹھک سے دروازہ کھل گیا۔ اس نے بچپن سے سیکھا

تھا اگر کوئی اللہ کا واسطہ دے کر کچھ مانگے تو اسے دے دینا چاہیے۔ بے شک اپنی متاع جان ہی کیوں نہ ہو۔ اماں نے یہ تیر جانتے بوجھتے چلایا تھا۔ وہ جانتی تھیں یہی نشانہ تھا۔

روئی روئی سرخ آنکھیں۔ سوں سوں کرتی ناک... بکھرے بال... ملگجا سا حلیہ... واللہ! یہ وہ مہماہ تو نہیں تھی گاؤں کی اکلوتی لڑکی جو شہر کے کالج پڑھنے کے لیے پہنچی تھی۔ اماں نے اسے آگے بڑھ کر اپنی آغوش میں بھینچ لیا تھا۔ وہ کسی بے جان گڑیا کی مانند ان کے سینے سے جا لگی تھی۔ انہیں لگا تھا اپنے باپ کے مرنے کا صدمہ اپنے دل پر لے گئی ہے۔

"تو... تو میری بہادر دھی ہے، میرا سہارا ہے اگر تو ایسے کرے گی تو میرا اور نور ماہ کا کیا ہو گا۔" وہ اسے ساتھ لگائے ہوئے پیپل کی چھاؤں تلے لے آئی تھیں۔ سوں سوں... ابھی جاری تھی البتہ رونا تھم چکا تھا۔

"آج میں اپنی دھی کو بالکل ویسی روٹی پکا کر کھلاؤں گی جیسی تو بچپن میں سفارش کروا کے پکواتی تھی مجھ سے اپنے ابا کی۔" اسے تندور کی مکھن لگی روٹی بڑی

پسند تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ تینوں وقت ویسی ہی روٹیاں پکوا کر کھاتی مگر اماں صرف دوپہر کو بنا کر دیتی تھیں۔ اس لیے جب سر شام وہ تندور سلگاتیں تو وہ کہیں سے بھی ابا کو ڈھونڈ کر لے آتی تھی۔ اپنا سفارشی بنا کر اور بالآخر اماں کو ماننا ہی پڑتی۔ اماں روٹیاں بنا چکی تھیں۔ اس لیے چنگیر اور چھابہ (روٹی رکھنے والی چھوٹی چنگیر) لے کر اس کے پاس آبیٹھی تھیں۔ جیسے ہی روٹی اماں نے اس کے سامنے رکھی، وہ چھوٹے چھوٹے نوالے لے کر کھانے لگ گئی۔ مگر نور نے اپنی روٹی پرے پھینک دی اور اسی تاک میں بیٹھا آوارہ کتا وہ روٹی اپنے منہ میں دبوچ کر بھاگ گیا۔

"اوں... اوں..." نور زور، زور سے سر نفی میں ہلانے لگی۔ یہ عندیہ تھا کہ اسے روٹی نہیں کچھ اور کھانا تھا۔ مہماہ اٹھ کر فریج سے کھیر نکال لائی تھی۔ اسے پتا تھا واحد یہی چیز وہ چپ چاپ خوشی خوشی کھا لے گی۔ کھیر کی پلیٹ پکڑ کر اس نے ہاتھ سے سالن کی کٹوری کی طرف اشارہ کیا تھا۔ مہماہ نے خاموشی سے آلو مٹر کھیر کے اوپر ڈال دیے تھے۔ اب وہ بڑی رغبت سے کھا رہی تھی۔ مہماہ کے گلے میں آنسوؤں کا پھندا سا اٹکا تھا۔

"کھانا؟"

عبدالباری بڑے ہی ادب سے ہاتھ پیچھے باندھے کھڑا تھا۔ اماں نے سلیقے سے دسترخوان میں لپٹی روٹی کی چنگیر اور سالن کی کٹوری اس کی طرف بڑھائی تھی۔

"پانی کا جگ فریج سے نکال لو۔" ساتھ ہی بولیں۔

وہ مڑ کر چلا گیا تھا۔ جانے کون تھا۔ کہاں سے آیا تھا۔ اب تو جیسے ان کے گھر کا ہی فرد تھا۔ ایک دن ابا جی کو خون سے لت پت پگڈنڈی پر پڑا ملا تھا۔ بھوک سے نڈھال... وہ اٹھا کر گھر لے آئے۔ تب سے وہ یہیں تھا۔ بے دام کا غلام...

"بے دام کا غلام...؟" وہ زیر لب بڑبڑائی تھی۔ وہیں آڑی ترچھی چارپائی پر وہ منہ چھپائے، رخ موڑے لیٹ چکی تھی۔

"مہماہ بی بی! اٹھیں' یہ چادر اوڑھیں اور چلیں۔" نیم تاریک کمرے میں ابھرنے والی آواز۔

وہ بے عزتی کی دلدل تھی یا جان چھٹنے کا کفارہ۔

سہارا دیا بھی تھا تو کس نے... اس سوچ سے ہی اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ مردہ سا مردہ جسم... جذبات سے عاری... ہارے ہوئے جواری کی طرح آنکھوں سے ایک قطرہ پھسلا تھا۔ نورماہ گو کہ پانچ سال کے بچے جیسا ذہن رکھتی تھی' مگر عمر کی کتاب میں سترہ لکھا تھا۔ اس کا دماغ اور سر دوسرے بچوں کی نسبت چھوٹا تھا مگر وہ بے حد صابر تھی بچپن سے ہی۔

جدھر بٹھا دو... بیٹھ جاتی... گھنٹوں غیر مرئی نقطوں کو گھورتی رہتی۔ کبھی اوں... اوں... غوں... غوں کی آوازیں نکالنا شروع کر دیتی۔

اماں جھاڑو لگاتیں تو ان کے پیچھے پیچھے... برتن دھوتیں تو سر پر کھڑی ہو جاتی... کبھی کبھی بازو پکڑ کر یا دوپٹا کھینچ کر اپنی طرف متوجہ کرتی۔ جب اماں دیکھتیں تو کھلکھلانے لگتی۔ البتہ مہماہ سے جانے کیوں وہ خوف کھاتی تھی۔ جب وہ زور سے چلاتی تو وہ چونک جاتی۔ چہرے کا رنگ سرخ پڑ جاتا۔ اماں پاس ہوتیں تو ان کی گود میں دبک جاتی۔ حالانکہ وہ اس سے بے حد پیار کرتی تھی' اسے اکیلے نیند نہیں آتی تھی' تو اپنے ساتھ لپٹائے رکھتی۔

اماں' نورماہ کو لے کر برآمدے میں چلی گئی تھیں۔ گھرر... گھرر کی آواز سے پیڈسٹل فین چلنے لگا تھا۔ وہ وہیں چھاؤں تلے لیٹی تھی۔

ذہن عجیب عجیب سی آوازوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

جب اس کا کالج میں داخلہ ہوا تھا۔ وہ کتنی خوش تھی اور اس سے کہیں زیادہ خوش ابا جان تھے۔ اس نے کیسے منٹوں میں اپنا سامان پیک کر لیا تھا۔ لگتا تھا ہواؤں میں اڑ رہی ہے۔

جیسے رنگ برنگی تتلیاں... قطار در قطار بے فکری سے آسمان کا سفر کرتے پرندے۔

"میں بی اے کے بعد ایم اے کروں گی اور اگر ہو سکا تو ایم فل بھی۔" بس میں بیٹھ کر اس نے اپنے ارادے ابا جان کو بتائے تھے۔

"ہاں... ہاں کیوں نہیں۔" وہی ازلی نرم لہجہ... لہجے میں سمایا غرور... اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا تھا۔ وہ دنیا میں سب سے زیادہ پیار مہماہ سے کرتے تھے۔ ان کی صبح مہماہ سے شروع ہوتی تھی اور اس کا چہرہ دیکھے بغیر وہ سو نہیں سکتے تھے۔ وہ ان کی لاڈلی بیٹی تھی... بے حد لاڈلی بیٹی۔

اپنا پیار' جان' محبت' غرور' لاڈ ہر چیز اس پر ہی لٹاتے تھے۔ لوگوں کو نظر آتا تھا کہ مہماہ اپنے ابا کے لیے کیا معنی رکھتی ہے۔ وہ اپنے ابا کی کل کائنات تھی۔ لوگ اس کی قسمت پر رشک کرتے تھے۔ ابا جان کے ہر ہر عمل سے یہ دکھائی دیتا تھا کہ وہ ان کے لیے کتنی اہم ہے۔

"ہاسٹل میں ہر طرح کے کمرے ہیں۔ ان کی قیمتیں بھی مختلف ہیں۔" وارڈن نے تفصیلات سے بھرا فارم اس کی طرف بڑھایا تھا۔ ابا کو کالج کا ہاسٹل پسند نہیں آیا تھا۔ اس لیے وہ اسے لے کر پرائیویٹ ہاسٹل میں آئے تھے۔

"مجھے میری دھی کے لیے بہترین کمرہ چاہیے۔" ان کا لہجہ حتمی تھا۔

"پیسے جیسے آپ چاہیں۔" دادا کے ترکے میں اتنی جائیداد اور زمینیں نہیں تھیں' جتنی ابا جان نے اپنی محنت سے بنائی تھیں۔ پیسے کی فراوانی تھی' اور وہ تھے بھی سدا کے خدا ترس شخص۔ دادا ابا کے ترکے سے جس جس کا جو جو حصہ بنتا تھا' بہنوں سمیت انہیں ساتھ عزت کے دیا تھا۔ حالانکہ بڑے تایا کو بہنوں کو حصہ دینے پر اعتراض بھی تھا۔

"ان سے حصہ معاف کرا لیتے۔" وہ اب بھی ہاتھ ملتے تھے۔ ابا کا من پسند کمرہ مل گیا تھا۔ یوں اپنے پنڈ سے دور اس کی نئی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے سرخ اینٹوں پر پانی کا چھڑکاؤ کیا تھا۔ نورماہ اور اماں باورچی خانے میں تھیں۔ شام کا دھندلکا ہر سو پھیل رہا تھا۔ آسمان کا رنگ سرخی مائل تھا۔ بالکل اس کی آنکھوں کی طرح۔۔۔ اس نے نظر بھر کر آسمان کو دیکھا تھا۔ نینوں کے کٹورے میں تاحد نگاہ لہو رنگ آسمان ہی تھا۔

"چھت پر سوؤں گی۔" باورچی خانے کی چوکھٹ پر کھڑے ہوتے ہوئے اس نے دروازے کو پکڑ رکھا تھا۔ اماں اپلوں کی آگ کو پھکنی سے تیز کر رہی تھیں۔ نورماہ بڑی محویت سے کسی غیر مرئی نقطے کو بغور دیکھنے میں محو تھی۔ وہ ہمیشہ سے چھت پر سونے سے خار کھاتی تھی۔ اماں بہت ضد کرکے اس کے کمرے سے برآمدے اور برآمدے سے صحن تک لانے میں کامیاب ہوتی تھیں کجا کہ چھت۔۔۔ آج جانے سورج کہاں ڈوبا تھا۔ جو وہ کہہ رہی تھی کہ اسے چھت پر سونا تھا۔

"بالکل۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"میں بستر لگادوں؟" وہ سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جب اماں بولی تھیں۔

"نہیں، پہلے جاکر باری سے دودھ کی بالٹی لے آؤ۔" دے تو وہ خود ہی جاتا تھا، پر آج جانے کیسے دیر ہوگئی تھی۔ کئی ثانیے وہ وہیں کھڑی سوچتی ہی رہی تھی کہ جائے یا نہ جائے۔ مگر پھر جیسے کسی نتیجے پر پہنچ کر اس نے گہرا سانس بھرا تھا۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے انسان ایک دوجے سے زیادہ دیر کے لیے لاتعلق نہیں رہ سکتا تھا۔ کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں سامنا تو ہونا ہی تھا۔ تقدیر کے اپنے فیصلے اٹل تھے، پتھر پر لکیر تھے۔ اس نے لاشعوری طور پر دوپٹے کو ٹھیک کیا تھا۔ ایسے دوپٹے کے بغیر اپنا آپ یاد آنے لگتا تو وہ مر مر کر جیتی تھی۔

"دودھ۔۔۔" اس کی آنکھوں میں محض سوال تھا۔ باری بھینسوں کو پانی پلا رہا تھا۔ اس نے کھال کے پاس ہی بھینس کو چھوڑا تھا۔ مصنوعی کھال جو موٹر سے کھلی تک آتا تھا۔ دودھ کی بالٹی لاکر اس نے اس حزن میں ڈوبی لڑکی کے سامنے رکھ دی تھی۔

آنسو ہر وقت جس کی آنکھوں میں تیرتے رہتے تھے۔ گہری کالی آنکھیں اب پانیوں سے بھری رہتی تھیں۔ وہ بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک بڑی مختصر سی نگاہ اس پر ڈالی تھی۔ براؤن سادہ شلوار قمیص کے بازو کہنیوں تک موڑے ہوئے۔ شفاف آنکھیں اور گھنی مونچھوں تلے دبے لب جو جانے بولنا جانتے بھی تھے کہ نہیں۔ مختصر سی بات۔۔۔ باری کی عادت تھی اور اس مختصر سے وار میں بھی وہ مقابل کو چت کرنے کے ہنر سے بخوبی واقف تھا یا شاید وہ اتنا بے نیاز و لاپروا تھا کہ اسے فرق ہی نہ پڑتا تھا کہ کوئی جیت ہوا کہ نہیں۔ بس اپنے کام سے کام۔

"سنیں۔" وہ دودھ کی بالٹی پکڑ کر چلتے چلتے باڑے کی دیوار کے بالکل پاس پہنچی تھی، جب پیچھے سے اس نے پکارا تھا۔ یہ معجزہ جانے ہوا کیسے۔ اتنے سالوں میں پہلی دفعہ وہ لب وا ہوئے تھے۔ وہ رک گئی تھی۔ یہ اشارہ تھا کہ وہ بول سکتا ہے۔

"خوش رہا کریں، آپ اداس اچھی نہیں لگتیں۔"

دھیما لہجہ جسے وہ بہ مشکل سن پائی تھی۔

وہ ایڑیوں پر گھوم گئی تھی مگر تب تک وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے جاچکا تھا۔

پھر سے آنکھوں میں پانی تیرنے لگا تھا۔ پرانی مہر اندر ہی اندر مر گئی تھی اور اس جگہ اب ایک نئی مہر نے جنم لیا تھا۔ چپ چپ، اداس اداس۔۔۔ اپنے آپ سے ہی خفا خفا۔۔۔ ایک جنگ سی تھی جو مسلسل اس کے اندر جاری رہتی تھی۔ اس نے بالٹی لاکر اماں کے قریب رکھ دی تھی۔ اماں کو سو کام تھے۔ وہ توجہ دیے بغیر لگی رہیں۔ وہ پھر سے اپنے خول میں سمٹی سمٹائی برآمدے میں پڑے رنگلے پلنگ پر جالیٹی تھی۔

"ہائے وہ دن۔۔۔" وہ قنوطیت کا شکار ہوتی جارہی تھی۔

ہاسٹل کی وہ مہارانی تھی۔ وجہ اس کے اباجان کی فراخ دلی تھی۔ جو وہ گاؤں سے سوغاتیں بھجواتے تھے۔

نہ صرف مہر کے لیے بلکہ وارڈن سے لے کر چوکیدار تک ہر ایک کے لیے اس کی فرمائش کے حساب سے سامان ہوتا تھا۔ وہ خود بھی کنجوسی نہیں کرتی تھی' نہ اپنی چیزوں میں نہ اپنے الفاظ اور رویے میں۔ وہ سچ مچ کی تھی۔ وہ ہر ایک سے بہت جلدی گھل مل جاتی تھی۔ ایک بھی چھٹی ہوتی تو ابا اس کے کالج سے لوٹنے سے بھی پہلے وزٹنگ روم میں بیٹھے ہوتے تھے۔ زندگی ہر طرح سے آسودہ تھی۔ بس وہ ایک دن تھا جسے اب وہ اماوس کی کالی رات ہی سمجھی تھی۔

اس دن اس کی زندگی کے سارے استعارے بدل گئے تھے۔

"مہر! کوئی تم سے ملنے آیا ہے۔" ماسی نے اسے اطلاع دی تھی۔ اسے یہی گمان گزرا تھا کہ ابا جان ہوں گے اس لیے وہ تیزی سے دوڑتی ہوئی وہاں پہنچی تھی مگر سامنے عزم تھا۔ اس کی پھپھو کا بیٹا۔

"ابا جان کہاں ہیں؟" اس نے ادھر ادھر دیکھا تھا۔ شاید وہ ابا جان کے ساتھ آیا ہو۔

"ماما جی نہیں آئے۔" اس نے بتایا۔ "میں اکیلا ہی ہوں۔ دراصل انہیں گاؤں میں ضروری کام نمٹانے تھے۔ اس لیے میں شہر ہی آرہا تھا تو انہوں نے میرے ہاتھ ہی سامان بھجوادیا۔" اس کی الجھن دور کرنے کی غرض سے وہ تفصیل سے گویا ہوا۔

"کیسے ہیں آپ؟" وہ تکلفاً پوچھ رہی تھی۔ ایسا پہلے تو کبھی نہ ہوا تھا کہ ابا جی خود نہ آئے ہوں۔ اس کے اپنی پھوپھو سے مراسم ذرا یوں ہی رہے تھے ہمیشہ سے۔ ان کی اولاد جوان ہو چکی تھی' وہ ترکے سے ملنے والے اپنے حصے کو لے کر ہضم کر چکی تھیں۔ تب بھی وہ کسی نہ کسی ضرورت کا رونا لے کر ابا جان کے پاس آتی رہتی تھیں۔ ابا جان خندہ پیشانی سے نہ صرف ہر ضرورت پوری کرتے تھے بلکہ ان کا ماہانہ کچھ خرچ مقرر بھی کر رکھا تھا۔ مگر پھر بھی ان کا لالچ تھا کہ کم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔ اس لیے وہ پھپھو کی فیملی سے ذرا لیے دیے ہی رہتی تھی۔ تایا کا حال بھی ان سے کم نہ تھا۔ بس وہ مانگتے نہ تھے' کیونکہ وہ ہر چیز اپنا حق سمجھ کر وصول کرتے تھے۔

"بہت ہینڈسم۔۔۔" وہ اس کی شرارت نہیں سمجھی تھی۔ وہ چند ثانیے اسے گھورتی رہی پھر سر جھٹک گئی۔

"اچھا اب میں چلتا ہوں' پھر آؤں گا۔" اس سے پہلے کہ وہ کسی قسم کی بے مروتی کا عملی مظاہرہ کرتی' وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ کیسے کیسے بے ریا چہرے دکھائی دیتے ہیں' جن کے پیچھے چھپے چہرے انسان کو بے حد قابلیت کے باوجود بھی نظر نہیں آتے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی چہرہ تھا۔ بظاہر بے حد بے ریا مگر اندر سے غلاظت سے لتھڑا ہوا۔

٭ ٭ ٭

وہ سارا دن جلے پیر کی بلی کی طرح پورے گھر میں دوڑتی پھرتی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تو خلا میں گھورتی رہتی۔ کمرے میں بستر پر لیٹی چھت کی کڑیاں گنتی رہتی۔

"پتر تیری پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے بڑا۔" اماں اس کی چپ سے عاجز تھیں۔

"مرنے والوں کے ساتھ مر تھوڑی نہ جاتے ہیں۔

تیرے ابا جی کو کتنا شوق تھا' تجھے اعلا تعلیم دلوانے کا۔ تو چلی جا۔۔۔ جا' جا کر پڑھ۔۔۔ اپنے ابا جی کی خواہش پوری کر۔" وہ اماں کے لہجے کی حلاوت پر حیرت میں ڈوبی رہتی۔

بچپن سے ہی کسی چیز' واقعہ' جگہ یا پھر شخص میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ اماں کی حلیمی' حلاوت اور نرمی بھرے تاثر کو کسی کرختگی میں ڈال سکتا۔ وہ جتنا مرضی تنگ کر لیتی' اماں نہیں اکتاتی تھیں۔ اسے اب بھی یاد تھا جب اس نے نیا نیا اسکول جانا شروع کیا تھا تو کس امتحان سے اماں کو گزرنا پڑتا تھا۔ وہ قمیص پہنا کر شلوار پہناتیں' وہ قمیص اتار دیتی' وہ شلوار سے فارغ ہو کر قمیص پہناتیں' وہ پھر سے شلوار اتار دیتی اور یہ ریہرسل صبح اسکول جاتے سمے جانے کتنی دفعہ دہرائی

جاتی تھی۔
اپنی کتابیں پھینک دیتی، دو چھتی پر یا پیٹیوں کے پیچھے کاپیاں رکھ آتی۔ کبھی کبھی تو کچن کی ڈولی (برتن رکھنے کی چھوٹی الماری) میں اس کی چیزیں ملتی تھیں۔ اسکول جاتے ہوئے ہر چیز پوری ہوتی، مگر واپسی پر ندارد۔ پنسل، ربڑ اور شاپنر تو وہیں کہیں پھینک آتی تھی۔ پانی والی بوتل بھی کبھار ہی سلامت گھر پہنچتی۔ کھانے میں سو سو نقص نکالے جاتے پر وہ اماں کو زچ نہیں کر پاتی تھی۔ ہمیشہ مہربان چہرہ، خوب صورت مسکراہٹ کے ساتھ سجا سجایا اس کے سامنے ہوتا تھا۔
کوئی کپڑا اس کی آنکھوں میں جچتا نہ تھا۔ وہ بہترین ڈیزائن، عمدہ تراش خراش والے کپڑے ہی پہنا کرتی تھی۔ جو پسند نہ آتا وہ آرام سے پھینک دیتی۔ ہر کام میں ہزاروں نخرے کرتی پر اماں نے کبھی پلٹ کر غصے سے کہنا تو کیا گھوری بھی نہ ڈالی تھی۔
"وہاں جا کر کیا کروں گی؟" وہ ایک ہی رٹ سے اکتا سی گئی تھی۔ "ابا بھی مر گئے اور ساتھ اس کی خواہشیں بھی۔ لاشیں نہیں پوچھنے آتیں کبھی بھی، کچھ بھی....." روکھے سے لہجے میں بہت سے سارے دکھ رو رہے تھے۔

گرمی نے ہر چیز کو کملا کر رکھ دیا تھا اور شاید ہر احساس کو بھی۔ ہوا کا نشان تک نہ تھا۔ ان کا گھر گاؤں کے آخری کنارے پر تھا۔ اس وقت وہ دونوں چھت پر پڑی لوہے کی چارپائیوں پر بیٹھی تھیں۔ اس کے بعد تاحد نگاہ دور دور تک ہریالی، سبزہ اور درخت تھے۔
"ابا! آپ کیوں مر گئے۔" اس نے سسکاری سی بھری تھی۔ وہ دانستہ اماں سے رخ موڑ کر ہریالی کو اپنی آنکھوں کے کٹوروں میں بھرے کھڑی تھی۔ مبادا اماں نہ دیکھ لیں۔ سپید چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ کالج کے نام سے کئی بھیانک چہرے یاد کے دریچے میں آ ٹھہرتے تھے۔

اس ایک دن کے بعد سے جب ابا نے عزم کو دانستگی میں ہاسٹل کا راستہ دکھایا تھا۔ اس کے بعد سے تو وہ وقت بے وقت، آجاتا۔ پہلے پہل وہ جھنجلا جاتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ وہ بھی عادی ہوتی چلی گئی۔ بعض اوقات "عادت" انسان کو تباہی کی طرف لے جانے والا پہلا زینہ ہوتی ہے۔ باقی راستہ وہ خود ہی طے کر لیتا ہے۔
"باہر نکل کر دیکھو، دنیا کہاں سے کہاں جا رہی ہے اور تم ہاسٹل سے کالج، وہاں سے ہاسٹل اور پھر گھر، گویا ان تین چیزوں کے علاوہ کوئی زندگی ہی نہیں۔" وہ اسے پتا نہیں کیا سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سر جھکائے اپنے ناخن سے ٹیبل کو کھرچ رہی تھی۔
"اور کیا ہے زندگی؟" اس نے بے خیالی میں استفسار کیا تھا۔
"میں اور تم....." گمبھیر آواز میں برجستہ جواب۔ اس نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ جانے ایسا کیا تھا ان آنکھوں میں کہ وہ دوبارہ دیکھ ہی نہ پائی۔ پر اگر جان لیتی کہ وہ دانہ ڈال رہا تھا تو شاید وہ آنکھیں ہی نوچ لیتی۔
"میں کل تمہیں کالج سے پک کروں گا، تیار رہنا۔" وہ حتمی انداز میں — کہہ کر جا چکا تھا۔ وہ اسے ڈھیل دے رہی تھی یا وہ اسے اپنے بس میں کر چکا تھا، ابھی کچھ بھی واضح نہ تھا۔
ملاقاتوں کا یہ سلسلہ تھما نہیں، بلکہ بڑی شد و مد سے بڑھتا ہی چلا گیا۔ وہ ایک نو عمر لڑکی جس کی پلکوں کی باڑ پر نت نئے سپنے آ کر ٹھہرنے لگے تھے۔ جو ابھی ایک بند کلی تھی۔ وہ بھلا کیسے نہ کسی مہارت سے بچھائے گئے جال میں پھنستی چلی جاتی۔

کوئی داغ ہے میرے نام پر
کوئی سایہ میرے کلام پر
غمِ خاص پر کبھی چپ رہے
کبھی رو دیے غمِ عام پر

"زیادہ سوچ انسان کی بہت ساری خوشیوں کو کھا جاتی ہے۔" اماں نے اسے بھیجا تھا، اوپر چارپائیاں رکھنے کے لیے۔ اسے نہ یہ پتا چلا کہ وہ آیا نہ یہ پتا چلا وہ کب سے اس کے پیچھے کھڑا ہے۔ اس کی زندگی مختص

اپنی ہی سوچوں کے مدار میں حرکت کر رہی تھی۔ وہ بے نیاز ہو چکی تھی ہر چیز سے' ہر خوشی سے' ہر احساس سے۔

"اور جب خوشیاں ہی نہ بچی ہوں انسان کے پاس تب؟" تلخی سے اس کا مخملیں وجود آلودہ تھا۔ ہر سو کڑواہٹ ہی کڑواہٹ تھی۔

"آپ کب تک ایسے سوچتی رہیں گی؟ سب کو جانا ہے' چاچا بھی چلے گئے۔ آپ کو ہمت کرنا ہو گی ورنہ لوگ آپ کو بیچ کر کھا جائیں گے۔" وہ اپنے خود ساختہ غم میں اتنی مگن تھی کہ ارد گرد کے حالات سے یکسر بے نیاز ہو چکی تھی۔ اس نے شتر مرغ کی طرح ریت میں آنکھیں اور منہ چھپا رکھا تھا۔

آنے والے ہر طوفان سے یکسر بے خبر۔

☆ ☆ ☆

صبح صبح کسی ناخوش گوار سے شور سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ جلدی سے دوپٹا سنبھالتی ہوئی چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر منڈیر سے نیچے جھانکا۔ تایا جان اپنے اور ان کے صحن کے درمیان والی دیوار کے اس پار کھڑے تھے۔

بکتے جھکتے' گالیاں دیتے۔ اسے وہ ابا کے بھائی تو قطعاً" نہ لگے۔ پھر وہ اسی طرح مڑ کر اپنے پورشن سے چلے گئے تھے۔

"کیا ہوا اماں؟" وہ بڑی تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے اتری تھی۔

"تمہارے تایا نے کہا ہے کہ ہم کھوہ والے ڈیرے پر جانور لے جائیں۔ وہ اس ڈیرے کو صرف اپنے استعمال میں لانا چاہتے ہیں۔" اماں نے دھیمے سروں میں بتایا تھا۔

"مگر اماں! یہ ڈیرہ' یہ احاطہ تو میرے ابا جان نے بنوایا تھا۔"

"وہ مر چکے ہیں مہر!" اماں نے آہستگی سے کہا۔

"تو کیا ان کے ساتھ رشتے بھی؟" اس نے تلخی سے کہا تھا۔

پھر جانے کیا یاد آیا کہ گلابی ہونٹ آپس میں سختی سے پیوست ہو گئے۔ رشتے تو ان کی زندگی میں بھی کچھ خاص نہ تھے۔ دل ایک دم پھر سے بے زار ہوا تھا۔ پھر چند دن میں ہی انہیں کھوہ والے ڈیرے پر جانا پڑا اور تایا نے صحن کے بیچ والی دیوار کو پکا کر کے اونچا کر دیا تو گویا وہ دو گھر تھے' دو اجنبی گھر۔

وہ جب بھی اس اونچی دیوار کو دیکھتی اسے وہ منحوس دن یاد آنے لگتا۔

کاش وہ دن کبھی اس کی زندگی میں آیا ہی نہ ہوتا تو سب کچھ کتنا اچھا ہوتا۔

کتنا اجلا اجلا سا۔ کتنا صاف شفاف۔ خوب صورت سا۔

عزم اسے بے حد اصرار کے بعد لنچ کے لیے لے کر گیا تھا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ انسان سب سے زیادہ سستا محبت کے نام پر بکتا ہے اور اگر کوئی روز یہ امرت گھول کر کسی کے کانوں میں انڈیلے تو وہ سستا تو کیا مفت ہی خوشی خوشی بک جاتا ہے۔ وہ ملہار کے ملن کے نئے نئے راگ الاپتا تھا اور وہ چندری (پاگل) خود کو ہیر سے کم نہ سمجھتی تھی۔ وہ اسے کسی گمنام سے ہوٹل لے کر گیا تھا' محض یہ بہانہ کر کے اسے یہاں سے تھوڑا سامان لینا ہے کیونکہ وہ یہاں پر ہی رہتا تھا۔

وہ اس کا اپنا تھا۔ اس کی اپنی پھپھو کا بیٹا۔ وہ اس پر یقین کرتی تھی۔

"تمہیں مجھ پر یقین ہے نا؟" اور یہ جملہ اسے چاروں شانے چت کرنے کے لیے کافی تھا۔

وہ اس کے ساتھ اس کے کمرے تک چلی گئی تھی۔

"یہ پکڑو' بیٹھو' میں بس بل کلیئر کر کے آیا۔" اس نے کمرے میں اسے بٹھایا' کولڈ ڈرنک پکڑائی اور یہ جا وہ جا۔ اس کے بعد اسے کچھ ہوش نہیں رہا۔ مندی مندی آنکھوں سے اس نے اس باری کو اپنے مسیحا کے روپ میں دیکھا تھا۔

"یہ لیں چادر اچھی طرح سے اوڑھ لیں۔" وہ اسے چادر اوڑھا کر سب سے چھپتا چھپاتا کسی عطائی ڈاکٹر کے

کلینک میں لے آیا تھا۔ جہاں اسے مختلف دوائیں دے کر ہوش میں لایا گیا تھا۔ ان دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ نہ اس دن' نہ اس کے ہاسٹل چھوڑ کر چلے جانے کے بعد۔ آہ! اتنی ذلت وہ بھی کس کے سامنے؟ اس کے محض چند دن بعد ہی اس کے پاس ہارٹ اٹیک سے ابا جان کے مرنے کی خبر آئی تھی۔

وہ پہلے سے ٹوٹی بکھری تھی۔ اس خبر نے تو جیسے اسے اس دن مار دیا تھا۔ وہ ایک جسم تھا' جس کے احساسات سب مر چکے تھے۔

وچ سکھاں دے ساری دنیا
نیڑے ڈھک ڈھک بہندی

باری صحن میں اپنے ہی کسی کام میں منہمک اردگرد سے بے گانہ لہک لہک کر کلام پڑھنے میں محو تھا۔

پرکھے جان سجن اوس ویلے
حد بازی پھٹی پہلیندی
وچ تھلاں دے جس دم سسی
بیٹھ کھڑے تے روئی
نس گیا کجلا ڑھ پڑھ جانا
ہتھ نہ چھڈیا مہندی

باری نے اچانک ہی مڑ کر دیکھا تھا۔ وہ بت بنی موڑھے پر بیٹھی تھی۔

اسے تاسف تھا اس کے حالات پر وگرنہ مہپاہ زندگی کا دوسرا نام تھا۔ ابا جان کے یوں اچانک حادثے نے اس کی گرتی عمارت کو آخری دھکا دیا تھا' وگرنہ ختم تو وہ عزم کے کارنامے کی وجہ سے ہی ہو چکی تھی۔

وہ ایک عام سا دن تھا جب چاچا نے اسے مہپاہ کو کچھ سامان دینے کے لیے بھیجا تھا۔ وہ ابھی گاڑی سے اتر ہی رہا تھا جو وہ کرائے پر لے کر آیا تھا کہ اسے مہپاہ گیٹ سے نکلتی ہوئی دکھائی دی تھی۔ اس نے سوچا یہاں انتظار کرنے سے بہتر تھا کہ اس کے پیچھے چلا جائے سو وہ اس کے پیچھے ہی چلا گیا۔ تعجب اسے عزم کے ساتھ ہوٹلنگ پر نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کا پھوپھی زاد تھا۔ وہ گاڑی میں ہی بیٹھ کر انتظار کر رہا تھا۔ جب اس نے عزم کو کسی سے بات کرتے سنا تھا۔

''بس یار! میرے مامے کی دھی ہے' اس پر ہاتھ نہیں صاف کر سکتے۔ کچھ تصاویر لینی ہیں۔ سیکسی سی' مامے کو بلیک میل کرنے کے لیے اور اس ہرنی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی مٹھی میں کرنے کے لیے۔''

بے پناہ خباثت اس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔

وہ کسی نہ کسی طرح چھپتا چھپاتا مہپاہ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوا تھا' اور وہ اسے وہاں سے تو صحیح و سلامت نکال لایا تھا مگر زندگی کی بازی جیسے وہ ہار گئی تھی۔

وہ شروع سے ہی اسے اچھی لگتی تھی۔ ''سنو اچھی لڑکی! تم ہنستی ہو تو پربت مسکراتے ہیں' پرندے چہچہاتے ہیں۔ سنو اے انجان دیس کی باسی! تم صرف ہنستی اچھی لگتی ہو۔'' اس کا بس چلتا تو وہ اس سے کہہ دیتا۔۔۔ مگر۔۔۔ نہ اس کے حالات اجازت دیتے تھے۔ نہ اس کی اوقات۔۔۔

محبت جیسی عیاشی ان لوگوں کے لیے نہیں ہوتی۔ انہیں پتا ہوتا ہے کہ وہ کون ہیں؟ کہاں کھڑے ہیں؟ اور قسمت نے ان کے لیے کیا لکھ رکھا ہے۔ کچھ واقعات زندگی کا مفہوم بدل دیتے ہیں اور شاید ترجیحات بھی۔۔۔ برسوں پہلے ایک واقعے نے باری کی زندگی بدلی تھی۔ اب ایک واقعے نے مہپاہ کو بدل کر رکھ دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

بے وقت چلنے والی آندھی نے ہر چیز کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ ہر چیز گرد سے اٹی پڑی تھی۔ پیپل کے پتے جابجا صحن میں بکھرے تھے۔ اماں کو جھاڑو لگانی تھی مگر نور ماہ کو تیز بخار تھا۔ اس لیے وہ جھاڑو سے پتے سمیٹنے میں لگ گئی تھی۔ تب ہی بیرونی دروازہ کھلا تھا اور پھپھو اندر آئی تھیں اور پیچھے پیچھے عزم بھی۔

جھاڑو اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ مگر اس سے ہلا نہ گیا۔ پھپھو نے ہی آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ

پھیرا تھا۔ عزم کے ہاتھ میں دو بڑے بڑے شاپنگ بیگز تھے۔ اس نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔ وہ پھپھو کے ساتھ ہی آگے بڑھ کر جا چکا تھا۔ اماں خوش ہوئی تھیں، تب ہی تو آؤ بھگت میں لگ گئیں۔

وہ اماں کو پھپھو کے پاس بیٹھنے کا کہہ کر خود باورچی خانے میں آ گئی۔ اس کا دل ہی نہ چاہتا تھا کہ وہ ان لوگوں کی شکل دیکھے۔ مگر عزم اس کے پیچھے پیچھے ہی چلا آیا تھا اور عجیب ڈھیٹ پن سے موڑھا گھسیٹ کر اس کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔

"ناراض ہو؟" شاید بات شروع کرنے کا بہانہ چاہیے تھا اسے۔ "میں بہت شرمندہ ہوں، میری مت ماری گئی تھی، اس لیے اب دوبارہ سے اس سلسلے کو عزت کے ساتھ جوڑنے آیا ہوں۔ تم پلیز اپنا دل صاف کرلو۔" وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ یہ اداکاری تھی، وہ جان نہیں پائی۔

وہ اس شخص کو کبھی بھی وہ مقام نہیں دے سکتی تھی دوبارہ۔ وہ گہرا سانس بھرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

باری اب ڈیرے کے بجائے گھر پر رہتا تھا۔ وہ اکثر اسے ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا تھا کہ کیسا شخص تھا۔ وہ اپنے آپ پر غضب کا اختیار رکھتا تھا کہ کچھ بھی ظاہر نہ ہونے دیتا تھا۔ اور کام پہ کام کیے جاتا۔

"تم کیوں میرے حواسوں پر مسلط رہتے ہو؟" وہ جھنجلا اٹھی تھی۔

"بن بلایا مہمان۔" اس نے نخوت سے سوچا تھا، کیونکہ وہ بن بلایا مہمان جیسے ہر سمے اس کے خیالوں کی چوکھٹ پر کھڑا دستک دیے جاتا تھا۔ جیسے جانتا ہو مسلسل دستک سے بند کواڑ اکثر کھل ہی جاتے ہیں۔

وہ دروازے کے پار سے ہش... ہش... اوں... ہوں کی آوازیں نکالتی رہتی، مگر وہ سنتا کب تھا۔ اس کی گھنی مونچھوں تلے مسکراتے لب جیسے اسے اپنا مذاق اڑاتے محسوس ہوتے تھے۔

"کرلیا نا تمہیں مسخر... دیکھو... دیکھو... کرلیا نا؟"

وہ خواہ مخواہ ہی چیزیں اٹھا اٹھا کے پھینکنے لگتی تھی۔

پھپھو تو چلی گئیں مگر جاتے جاتے دھماکا کر گئیں۔ عزم کے لیے اس کا رشتہ مانگ کر۔ بلکہ وہ تو پوری تیاری سے لیس میدان میں اتری تھیں۔ شگن کا سامان بھی لے آئی تھیں۔ مہر نے گلابی سوٹ پر ہاتھ پھیرا تھا، مگر وہ اسے کاٹ کھانے کو دوڑا تھا۔ نہ جانے کیوں اس نے سوٹ اٹھا کر دور پھینک دیا تھا۔

پھر بہت سارے دن گزر گئے۔

اس نے سوچا وہ عزم کو ایک موقع ضرور دے گی، شاید وہ سدھر گیا ہو مگر درپردہ وہ باری کے خیالوں سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ محبت عذاب ہوتی ہے اور یک طرفہ محبت شاید سب سے بڑا عذاب...

اس دن عزم پھر سے آیا تھا۔

وہ اور نورماہ چھت پر بیٹھی تھیں۔ وہ عزم کو نورماہ کے پاس بٹھا کر نیچے کچھ لینے کے لیے آئی تھی مگر اسے آخری سیڑھی پر ہی رکنا پڑا تھا۔ عزم، نورماہ کو بڑی غلیظ نظروں سے گھور رہا تھا۔ پانچ سالہ بچی کا ذہن رکھنے والی جوان اور خوب صورت لڑکی۔ نورماہ تو صرف اسے اور اماں کو نظر آتی تھی۔ باقی سب کو تو "جسم" نظر آتا تھا۔

نہ جانے کیوں اتنے عرصے کی چپ کا روزہ ٹوٹا تھا۔

"کتے... کمینے... ذلیل... تیری اتنی ہمت؟" وہ چیل کی طرح اس پر جھپٹی تھی۔ اپنے ناخنوں سے اس کا منہ کھرچ ڈالا تھا۔ "جا دفع ہو جا میری نظروں کے سامنے سے..." وہ چلا رہی تھی۔ "ورنہ سب کو تیرے بارے میں بتا دوں گی۔"

وہ بنا کچھ کہے چلا گیا تھا۔ اس نے نورماہ کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا تھا۔ اس دن اس نے اپنا روپ بدل لیا تھا۔

ظالم، کٹھور، سخت دل اور بے درد بن گئی تھی۔ اس دن اس نے نورماہ کی بہن سے اس کی ماں بننے کا سفر طے کر لیا تھا۔

"یہ اپنے ہیں؟" اس نے تنفر سے سوچا۔ "اگر یہ اپنے ہیں تو غیر کیسے ہوں گے؟" اس کی نظریں بے

ساختہ باری میں الجھ گئی تھیں۔
اس نے پھپھو کے لائے گئے جوڑے کو چولہے میں پھینک دیا اور باقی ساری چیزوں کو تندور میں۔ وہ محض اس کے لیے ابا کی بہن تھیں، جو ابا کے ساتھ ہی مرگئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

باری نے اسے تندور کے پاس رک رک کر کے ہر چیز پھینکتے دیکھا تھا۔ سانس جیسے دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ چہرہ بے حد سرخ تھا۔ تو گویا وہ غبار جو بڑے عرصے سے دبا ہوا تھا۔ وہ آتش فشاں کا لاوا بن کر نکلنے لگا تھا۔ اب وہ شاید اپنے اس فیز سے نکل پاتی۔ وقت نے اسے وقت دیا تھا۔ جب لاوا بہہ جاتا ہے تو آتش فشاں پھر سے پرسکون ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر کے لاوے کو بھی نکلنے کا راستہ مل گیا تھا۔ وہ اکثر چوری چھپے دم بخود اسے دیکھا کرتا تھا۔ جانے وہ کب اس کے خوابوں میں آن بسی تھی۔

محبت اس پر یوں دبے پاؤں حملہ آور ہوئی تھی کہ باری کی پوری پونجی، پوری متاع حیات ہی لٹ گئی تھی۔ محبت جیسے گھات لگائے بیٹھی تھی۔ بڑا ہی گہرا وار تھا۔ مگر اسے چپ رہنا تھا۔
ایک بے نشان انسان کے لیے چپ ہی بچتی ہے۔
اکثر لوگ اس سے پوچھتے تھے کہ وہ کون تھا تو وہ چپ رہ جاتا تھا۔ کبھی کبھی وہ خود سے بھی یہ سوال پوچھتا تھا کہ کون ہوں میں؟ مگر دوسرے ہی لمحے وہ سر جھٹک کر ہاتھ جھاڑ کر پھر سے اپنے آپ میں مگن ہونے کی سعی کرتا۔ ایک ناتمام سعی۔

"میں کون ہوں؟" اس نے ایک بار پھر سے سوال پوچھا تھا۔ دہرایا تھا اس سوال کو جو وہ اکثر خود سے کرتا تھا۔ دہراتا رہتا تھا۔ مگر اس سوال کا جواب نہ ملتا لیکن اسے یقین تھا کہ کبھی نہ کبھی وقت اسے جواب ضرور دے گا۔

☆ ☆ ☆

وہ اور ماں جی قریبی مارکیٹ سے ہو کر واپس آئے تھے۔ اگر انہیں پتا ہوتا کہ "وہ" اتنی جلدی آجائیں گے تو شاید وہ پچھلے کمرے میں دبک کر بیٹھتے مگر یہ ان کی بدقسمتی تھی کہ وہ آچکے تھے۔ وہ اور ماں جی جب بھی ساتھ ہوتے بے پناہ خوش ہوتے مگر ان کے آتے ہی جیسے ہر خوشی کسی کونے کھدرے میں دبک جاتی تھی۔ سہمے سہمے دو نفوس... کہنے کو تو وہ اس کے ابا تھے، مگر وہ کسی جلاد سے کم نہ تھے۔
مطلق العنان حکمراں... مردانہ حاکمیت کا بھرپور نمونہ... ان دو بد عادات کے ساتھ مرد تب سب سے بدتر ہو جاتا ہے جب وہ شکی اور بدمزاج بھی ہوتا ہے۔
"کہاں سے آرہے ہو تم لوگ؟" لاؤنج میں پڑے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ جمائے وہ کسی جانور کی مانند غرائے تھے۔
وہ ڈر کر ماں کے پیچھے دبک گیا تھا۔ "وہ... وہ... ہم" ماں جی کی آواز بھی اکثر بند ہی ہو جاتی تھی۔ سر جھکائے، ہاتھ باندھے وہ کوئی باندی ہی لگتی تھیں۔ یہ گھر دو کنال پر محیط تھا۔ کسی اچھے وقت میں اس کے دادا نے بنوایا تھا۔ اگر ابا پر چھوڑتے تو شاید گھر بھی نہ بن پاتا۔ وہ اپنی ہر ناکامی کا ذمہ دار اپنی بیوی کو ٹھہراتے تھے۔ زبان سے بول بول کر غصہ ختم نہ ہوتا تو مارنا شروع کر دیتے۔
لاتوں سے... ٹھڈوں سے... ماں جی کا صبر تھا۔ بے حد و حساب صبر... جانے کب اس صبر کی طنابیں ٹوٹنی تھیں۔ ٹوٹنی بھی تھیں کہ نہیں... اللہ بہتر جانتا تھا۔

"بولو! کس کے ساتھ گلچھرے اڑانے گئی تھیں۔" ابو نے ماں جی کی گردن دبوچ لی تھی۔
پھر ایک جھٹکے سے اسے سیدھا لا کھڑا کیا تھا۔ "تو بتا۔ کہاں گئے تھے تم لوگ؟" ان کی آنکھیں اتنی پھیلی ہوئی تھیں کہ اسے لگ رہا تھا کہ ابو کے چہرے پر بس آنکھیں ہی رہ گئی ہیں۔ وہ مزید سہم گیا تھا۔
"مم... مارکیٹ۔" اس کے منہ سے پھسلا تھا۔

"اس کو بھی اپنے جیسا کرلیا ہے۔" ابو نے ماں جی کو تھپڑ رسید کیا تھا۔

"چل دفع ہو جا اب اور کھانا لے کر آ۔" ماں جی چپ چاپ وہاں سے چلی گئی تھیں اور پیچھے پیچھے وہ بھی۔

یہ اس گھر کا روز کا منظر تھا۔ مار کٹائی گالیاں الزام شک اس گھر کے ہی مکین تھے۔ ماں جی جانے کیسی عورت تھیں کہ چپ نہ توڑتی تھیں۔ انہیں محض زائد بتی جلانے پنکھے کی رفتار تیز کرنے پر بھی لعن طعن کیا جاتا۔ مگر وہ ہر چیز خندہ پیشانی سے برداشت کرتی تھیں۔ مگر اس دن.... محض دو منٹ کے لیے وہ دودھ والے کے پاس کھڑی ہوئی تھیں کیونکہ اس کے بیس سال کے جوان بیٹے کو کینسر جیسے موذی مرض نے آگھیرا تھا۔ مگر ابو نے نہ جانے اس بات کا کیا مطلب نکالا تھا۔

"بول کب سے چل رہا ہے یہ چکر؟" انہوں نے بے دردی سے ماں جی کو بالوں سے پکڑ کر اندر گھسیٹا تھا اور پھر وہ انہیں مین گیٹ سے اندر تک گھسیٹتے ہوئے ہی لے کر گئے تھے۔

"بتا.... کر بکواس...." اس وقت کہیں سے بھی پتا نہیں لگ رہا تھا کہ وہ ایک پڑھے لکھے انسان تھے۔ جاہل بے حس.... شکی....

ماں جی تو بول ہی نہیں پا رہی تھیں۔

انہوں نے سب کچھ برداشت کیا تھا.... مگر.... یہ سننا رہ گیا تھا۔ اب وہ بدکردار بھی بن گئی تھیں۔ وہ بالوں سے پکڑے پکڑے ماں جی کو کچن میں لے گئے تھے۔

وہ ساکت کسی بت کی طرح کھڑی تھیں۔ ان کے تو آنسو بھی نہیں نکل رہے تھے۔ ابو نے ان پر پیٹرول

چھڑک دیا تھا۔ ماں جی ابو کی مضبوط گرفت میں پھڑپھڑا رہی تھیں۔

اس سے پہلے کہ ابو ماچس کی تیلی جلاتے اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر انہیں دھکا دیا۔ وہ محض بارہ سال کا تھا تب مگر ماں کو بچانے کے لیے اس نے اپنی

ساری قوتیں یکجا کی تھیں۔ ماں شاید چیز ہی ایسی ہوتی ہے۔ اس کے دھکے کی وہ توقع نہیں کر رہے تھے۔ اس لیے لڑکھڑا کر ان کا سر شیلف سے ٹکرایا تھا۔ وہ بہت برے طریقے سے زخمی ہوئے تھے۔ ماں کے چہرے پر خوف پھیل گیا تھا۔ وہ دھکا آخری دھکا تھا۔

ایک جھٹکے سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ "معید الباری بن عبد السلام" شاید بارہ سالوں بعد اسے اپنا پورا نام یاد آیا تھا، ماں یاد آئی تھی۔ اپنا جرم یاد آیا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

✡ ✡ ✡

مہاہ جیسے نور کی پرچھائیں بن گئی تھی۔ اسے ہر وقت اپنے پروں میں سمیٹ کر رکھتی۔ اماں ادھر ادھر کے کاموں میں مصروف تھیں، جبکہ وہ دونوں بہنیں باورچی خانے میں دبک کر بیٹھی تھیں۔

"اکائی کی طاقت کو مانتی ہیں؟" ابھی کل جب باری سے اس کا سامنا ہوا تھا تو اس نے بے ارادہ ہی پوچھ لیا تھا۔ پھر جیسے خود ہی سر جھٹکتے ہوئے بولا۔

آپ کو پتا ہے 'یہ احاطہ جو آپ کے تایا جان نے اتنی آسانی سے آپ سے چھین لیا ہے' وہ آپ کے ابا کی ملکیت تھا۔ تعلیم باشعور بناتی ہے۔ کیا فائدہ ایسی تعلیم کا جب آپ اپنے حق میں بول ہی نہیں سکتیں۔" وہ خفا خفا سا تھا۔

مہاہ چپ چاپ اسے سنے گئی "آہ۔۔۔ میرے مہرباں۔۔۔" اس نے دل ہی دل میں اسے جی بھر کر دیکھا تھا۔

عزم سراب تھا' محض وقتی کشش مگر باری۔۔۔ وہ مسیحا تھا۔ مہرباں۔۔۔ جانے کب اس کی محبت نے اپنا حصار بنا لیا۔۔۔ وہ سمجھ ہی نہ سکی۔

جب ہوش آیا تو چاروں شانے چت۔

"وقت گواہ ہے اکائی کی طاقت پر سب نے حکمرانی کی ہے۔" وہ گہرا سانس بھرتے ہوئے بولا تھا۔ "اگر آپ اب بھی نہ بولیں تو ایک ایک کر کے آپ سے سب کچھ چھن جائے گا۔" وہ رکا نہیں تھا اور وہ کتنی دیر تک اس کی گمبھیر آواز کے سحر میں گرفتار اس کی چوڑی پشت کو بلا ارادہ ہی دیکھے گئی تھی۔

وہ خود ہی گنگنا رہی تھی۔ دل کسی الوہی چمک سے منور تھا۔ دل پر جیسے نئے نئے موسم دستک دے رہے تھے۔

ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ بڑے تایا عجلت میں آئے تھے۔ انہیں ٹیوب ویل کی چابی چاہیے تھی۔

"اب آپ ہمارے گھر سے کسی قسم کی توقع مت رکھیے گا۔ کسی بھی چیز کی۔" مہر نے دوٹوک انداز میں انکار کر دیا تھا۔ اس کے انکار پر وہ بہت سیخ پا ہوئے تھے مگر وہ اب پہلے والی مہاہ قطعاً "نہیں تھی۔

"یہ جو احاطہ آپ نے اپنے قبضے میں کر رکھا ہے نا۔ یہ میرے ابا جان کی ملکیت ہے اور اس کے کاغذات ہیں میرے پاس۔ اگر آپ نے اب کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی نا تو میں پنچایت بلالوں گی۔" اس نے دھمکی آمیز مگر مضبوط انداز میں کہا تھا۔ "ہماری کسی چیز پر آپ کا حق نہیں ہے اور ہاں۔۔۔ جو میرا ابا جان کا گھوڑا ہے۔ آپ بلا اجازت کھول کر لے گئے تھے 'کل ہمارے ڈیرے پر وا پس بندھا ہونا چاہیے؟"

تایا وہاں رکے نہیں تھے۔ باری نے دور سے ہی وکٹری کا نشان بنایا تھا۔

وہ اپنی پہلی جیت پر بہت خوش تھی۔ شاید ابا بھی اسے اتنا ہی مضبوط دیکھنا چاہتے تھے۔ اماں نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر دست شفقت رکھا تھا۔ اپنے لیے خود ہی جینے کا سامان کرنا پڑتا ہے۔ اس نے بھی کیا۔ اسے کرنا پڑا۔

✡ ✡ ✡

محبت کسی بارش کی مانند ہوتی ہے' جو دل کے آنگن میں جلترنگ بجا دیتی ہے۔ مگر محبت کو بھی مطابقت کا ماحول چاہیے ہوتا ہے۔ اسے بھی پروان چڑھنے کے لیے ایک مکمل موافق جگہ چاہیے ہوتی ہے۔ مگر قدرت نے دو بہت مختلف دنیا کے لوگوں کو اکٹھا کر دیا

تھا۔ ان کے دل میں ایک دوجے کے لیے محبت پیدا کردی تھی۔ وہ تو شاید رسموں سے، رواجوں سے، لوگوں سے زیادہ اپنے دل کی سنتی تھی، مگر باری... باری... وہ تو پتھر کا بت بن گیا تھا۔ جس کے دل میں محبت کا بے کراں سمندر بے چینی سے گردش کر رہا تھا۔ جس کی لہریں زوروں سے اس کے دماغ سے ٹکراتی تھیں مگر ہر طرف چپ کا ڈیرہ تھا۔

"مجھے پتا ہے تم یہیں ہو گے؟" وہ شام ڈھلے نہر کنارے بیٹھا جانے کس گہری سوچ میں گم تھا۔ وہ اسے ڈھونڈتی وہیں جا پہنچی تھی۔

اور اس کے برابر بیٹھ گئی تھی۔ دل بڑی زور سے دھڑکا تھا۔ اس نے محض سر کو جنبش دی تھی۔

"میں آپ کی تلاش نہیں ہوں۔" اس کا لہجہ دھیما سا تھا۔ وہ اس کی ہر بات سے واقف تھا۔ ہر جذبے سے، ہر احساس سے...

"بن گئے ہو نا۔" مہر کے لہجے میں کرب تھا۔

"ابھی بہت دیر نہیں ہوئی ہے۔"

"بہت دیر ہو گئی ہے۔" مہاہ نے دکھ سے اسے دیکھا تھا۔ محبت نے اسے ایک بند گلی میں لا کھڑا کیا تھا۔

"ایک ایسے شخص سے آپ کی شادی نہیں ہو سکتی جو آپ کے ہی ٹکڑوں پر پل رہا ہے۔" اس کے انداز میں خود ترسی تھی۔ "یہ رسموں، رواجوں سے ٹکرانے کا حوصلہ آپ میں نہیں ہے نہ ہی آپ روایت شکن ہیں۔"

"باری محض ایک سراب ہے۔ آپ سے شادی کسی کی بھی خوش بختی ہو گی۔" اندر ہی اندر ایک خواہش روئی تھی۔ وہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔

"میں خود کو بے بس پاتی ہوں۔" وہ رو پڑی تھی۔

اور اسے پتا تھا کہ وہ آنسو اس کی برداشت سے باہر تھے۔ دنیا میں اگر کوئی چیز اس کے لیے ناقابل برداشت تھی، اسے ہرا سکتی تھی تو وہ صرف مہر کے آنسو تھے۔

"ابھی کچھ وقت لگے گا۔" اس نے آہستگی سے کہا تھا۔

"خیر ہے۔" مہر کو یقین تھا کہ اس کی محبت اسے کھینچ لائے گی۔

وہ جیسے خود سے ہی کچھ سوچنے لگا تھا۔

بارہ سال پہلے ماں جی نے سارا الزام اپنے سر لے لیا تھا۔ اسے تھوڑے سے پیسے تھما کر اسے وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ بد حواس سا بھاگتا چلا گیا تھا اسے یاد نہیں تھا کہ وہ بھاگتے بھاگتے کہاں جا پہنچا تھا۔ کیسے گاؤں کی طرف جاتی پگڈنڈی پر بے ہوش ہو کر گرا اور مہر کے ابا جان اسے گھر لے گئے۔

اس نے بارہ سال محض اپنے نام کے ساتھ گزارے تھے۔ مگر اب اسے اپنا ماضی یاد آگیا تھا۔ اسے ماں جی کو تلاش کرنا تھا جو عمر قید پوری کر کے نہ جانے کہاں چلی گئی تھیں۔ اس کا عالی شان گھر جو ٹرسٹ کی ملکیت میں چلا گیا تھا اسے واپس لینا تھا۔

اسے اپنا گھر واپس لینا تھا۔ اسے ماں کو گھر واپس لانا تھا۔ اگر گھر بک جاتا تو وہ چھوٹا گھر لے سکتا تھا اور اس کے ساتھ ہی کوئی چھوٹا موٹا کاروبار بھی... وہ اپنے ہی حساب میں مصروف وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ بغیر کچھ کہے۔

مہاہ کو اس پر یقین تھا۔

تب ہی تو جب اگلی صبح وہ بغیر کچھ بتائے وہاں سے چلا گیا تھا، اسے تب بھی یقین تھا کہ وہ واپس آئے گا۔ اس نے جس سے یقین کرنا سیکھا تھا وہ اس سے بدگمان کیسے ہو سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

ٹھیک ایک سال بعد وہ سب کچھ حاصل کر چکا تھا۔ اپنا گھر، اپنی شناخت اور ماں۔ اب وہ پھر اسی جگہ کھڑا تھا جہاں اس کی زندگی تھی۔ وہ زندگی جو صرف اس کی منتظر تھی۔ وہ سرشاری سے گاؤں کی سمت چلنے لگا تھا۔ چھت پر کاگا کائیں کائیں کر رہا تھا۔ مہاہ خوشی سے سرشار دوڑ کر چوکھٹ پر آگئی تھی۔ نظریں گاؤں کی طرف آنے والے راستے پر تھیں، اسے یقین تھا کہ بے نام مسافر کو منزل مل گئی ہے۔ جہاں سے اس کے مہمان نے آنا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ لمحہ آن پہنچا تھا۔ ☆

کوئی خواہش مگر نہ کی ہم نے
شام یونہی گزار دی ہم نے

اک خانے میں ذکر ہے جس کا
رات دیکھی وہی پری ہم نے

جس سے دُنیا دکھائی دیتی تھی
راہ دیکھی نہیں وہی ہم نے

جاتے والوں سے کچھ گِلہ نہ کیا
آنے والوں کو راہ دی ہم نے

رازِ یکتائی جاننے کے لیے
اپنی تنہائی کُھل کے جی ہم نے

کام لینا تھا مرے سے کچھ آخر
اُس کی دیوار سرخ کی ہم نے

زندگی کی بات کیجیے کامی
آگ دیکھی ہے بھائی جی ہم نے

سیّد کامی شاہ

میکدے سے ایاغ لے آئے
ہم بھی اپنا سراغ لے آئے

کچھ نہیں بس تمہاری محفل سے
بدگمانی کے داغ لے آئے

بات دل کی تھی، دل سے ہو جاتی
بیچ میں تم دماغ لے آئے

خانۂ دل میں روشنی کے لیے
ہم فلک سے چراغ لے آئے

تم حقیقت کے جنگلوں سے بھی
کچھ تخیل کے باغ لے آئے

ہم نکل کر حصارِ جاں سے سحر
زندگی میں فراغ لے آئے

سحر تاب رومانی

پرانا خط

پرانا خط ہے
تمہارا خط ہے
پرانا صندوق کل کھلا تھا
بہت سی چیزیں الٹ پلٹ ہوئی تھیں
کہیں پہ نیچے دبا ہوا تھا
پرانا خط ہے
تمہارا خط ہے
بہت ہی بوسیدہ روشنائی سے پیلے کاغذ
پہ لکھی باتیں
کہیں کہیں سے مٹی ہوئی تھیں
پرانے سوکھے گلاب کی پتیاں رکھی تھیں
تمہاری آنکھوں کی کچھ نمی تھی
لکھا تھا تم نے
ملے نہ ہم تو
زندگی میں باقی کوئی خوشی بھی نہیں رہے گی
نہ چاند میں روشنی رہے گی
نہ چاندنی گفتگو کرے گی
بہت سے موسم گزر چکے ہیں
نہ ہم ملے ہیں
تمہارا خط ہے
پرانا خط ہے

ڈاکٹر عزیزہ انجم

چھٹ گیا ابر، شفق کھل گئی، تارے نکلے
بند کمروں سے تیرے درد کے مارے نکلے

شاخ پر پنکھڑیاں ہوں کہ پلک پر آنسو
تیرے دامن کی جھلک دیکھ کے سارے نکلے

تو اگر پاس نہیں ہے، کہیں موجود تو ہے
تیرے ہونے سے بڑے کام ہمارے نکلے

تیرے ہونٹوں مری آنکھوں سے نہ بدلی دنیا
پھر وہی پھول کھلے پھر وہی تارے نکلے

رہ گئی لاج مری عرضِ وفا کی مشتاق
خامشی سے تیری کیا کیا نہ اشارے نکلے

احمد مشتاق

مہمان نوازی

میزبان خاتون مہمان خاتون سے: "یہ گلاب جامنیں لیں نا، یہ تو آپ نے لی ہی نہیں۔"
مہمان: "نہیں نہیں شکریہ! میں پہلے ہی چار کھا چکی ہوں۔"
میزبان: "خیر کھائی تو آپ نے آٹھ ہیں، مگر یہاں گن کون رہا ہے۔"

پاپا

لڑکی: "میرے پاپا مجھے دن بھر ڈانٹتے رہتے ہیں۔"
لڑکا: "جان! کوئی بات نہیں۔ پاپا ہیں وہ آپ کے۔"
لڑکی: "مگر بلاوجہ ہر وقت کیوں ڈانٹتے رہتے ہیں؟"
لڑکا: "ارے یار! جانے بھی دو۔ پاپا ہیں وہ تمہارے۔"
لڑکی: "کیا! تم بھی ان کی سائیڈ ہو۔ میری تو کوئی قدر ہی نہیں تمہاری نظر میں۔"
لڑکا: "تو کیا ایسی کی تیسی کردوں اس بڈھے کی۔ آج قبر کھود دوں گا۔ پریشان کرتا ہے میری جان کو۔ ملنے دے سالے کو، کبوتر کی اولاد۔"
لڑکی: "ایسے مت بولو جان! پاپا ہیں وہ میرے۔"
لڑکا: "میں بھی ایک گھنٹے سے یہ ہی کہہ رہا تھا بے غیرت! پاپا ہیں وہ تیرے۔"

اتفاق

کلاس ٹیچر بچوں کو سمجھا رہی تھی کہ کن باتوں کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ اتفاقاً ہو گئیں پھر انہوں نے ایک بچے سے کہا کہ وہ اس کی کوئی مثال پیش کرے۔

بچہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ "میرے ابو اور امی کی شادی اتفاقاً ایک ہی دن ہوئی تھی۔"

ہوشیار

ایک صاحب نے اپنے دوست کو بتایا۔ "میرا گھوڑا بھی عجیب ہے۔ ایک دن میری طبیعت خراب ہوگئی۔ گھر میں کوئی فرد موجود نہ تھا۔ میری حالت دیکھتے ہوئے میرا گھوڑا دوڑا دوڑا گیا اور اپنی پیٹھ پر ڈاکٹر کو بٹھا لایا۔"

دوست بولا۔ "یار! تمہارا گھوڑا تو بہت ہوشیار ہے۔"

صاحب نے پوری بات بتاتے ہوئے کہا۔ "اب اتنا بھی ہوشیار نہیں، اپنی پیٹھ پر جانوروں کے ڈاکٹر کو بٹھا لایا تھا۔"

بیوی کہیں جسے

ایک شوہر بیوی کی روز روز کی فرمائشوں سے زچ آکر کہنے لگا۔

"میں خود کشی کرنے جارہا ہوں۔"

بیوی بولی۔ "جانو! کچھ بھی کرنے سے پہلے میرے چار پانچ سوٹ بنا دینا۔ میرے پاس عدت میں پہننے کے لیے کپڑے نہیں ہیں۔"

فقیر کی صدا

ایک فقیر نے کسی سیٹھ کے دروازے پر صدا لگائی۔ نوکر نے اسے دھتکار دیا۔ سیٹھ نے اس کی ڈانٹ ڈپٹ سن لی اور بگڑ کر بولا۔

"تم کو کتنی مرتبہ کہا ہے، بھکاریوں کو جھڑکا نہیں کرتے۔ جاؤ اسے بلا کر لاؤ۔"

فقیر بہت دور نکل گیا تھا۔ نوکر بھاگتا ہوا گیا اور بڑی مشکل سے ڈھونڈ کر اسے واپس لایا۔ سیٹھ نے کہا۔

"بابا! میرا نوکر بہت نالائق ہے' یہ تم سے بدتمیزی سے پیش آیا۔ میں تم سے ادب سے کہتا ہوں کہ جاؤ معاف کرو۔"

روزہ

ایک آدمی نے زندگی میں پہلی بار روزہ رکھ لیا' دوپہر میں نڈھال ہو کر ایف ایم سننے لگا اور ایف ایم پہ کال کردی۔ ہوسٹ بولی۔

"جی کالر! کیا سننا پسند کریں گے۔۔؟"

آدمی نڈھال ہو کر۔ "بس ہم کو مغرب کا اذان سنوا دو۔"

مسرت الطاف احمد۔۔۔ کراچی

کھلا پیسہ

پٹھان بال کٹوا کر گھر آیا۔ بیوی نے پوچھا۔

"اتنے چھوٹے کیوں کروالیے بال۔"

پٹھان نے کہا۔ "بیگم اس کے پاس کھلا پیسہ نہیں تھا' میں نے کہا بیس کے اور کاٹ دو۔"

مدیحہ نورین مہک۔۔۔ برنالی

پرجوش

شہریار (منصور سے): "بارات والے دن گھوڑا اتنا پرجوش کیوں ہوتا ہے؟"

منصور: "اسے اس بات کی حیرانی ہو رہی ہوتی ہے کہ آج اس پر گدھا سوار ہونے جا رہا ہے۔"

صدف ناز انصاری۔۔۔ ملتان

گرم جوشی

بیوی نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا بات ہے کہ آپ کے دوست گھر آتے ہیں تو آپ بہت زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ ان سے گلے ملتے ہیں۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہیں' مگر جب میری سہیلیاں آتی ہیں تو آپ ذرا خوش نہیں ہوتے۔"

شوہر نے کہا۔ "میں اس وقت اور بھی زیادہ خوشی اور گرم جوشی کا مظاہرہ کرسکتا ہوں' مگر آپ مجھے اپنی سہیلیوں سے ملنے کا موقع تو دیں۔"

فوزیہ ثمرہٹ۔۔۔ گجرات

بچے ہمارے عہد کے

پروفیسر (اپنے بیٹے سے): ٹام! کیا تم جانتے ہو' ڈارون نامی سائنسدان کہتا ہے' انسان بندر کی اولاد ہے۔

بیٹا: (حیران ہو کر) "ڈیڈی! کیا میں بھی۔۔۔!"

انیقہ انا۔۔۔ چکوال

سمجھ داری

بیٹے نے باپ سے پوچھا۔ "ابو لڑائیاں کیسے شروع ہوتی ہیں؟"

بیٹا! فرض کرو۔ روس اور امریکہ میں ناراضی ہوجاتی ہے۔" باپ نے بیٹے کو سمجھانا شروع کیا۔ پاس ہی بیوی بیٹھی تھی' فوراً بولی۔

"یہ ناممکن ہے۔ بھلا روس اور امریکہ میں کیوں ناراضی ہونے لگی۔"

"ارے بیگم! میں تو صرف مثال دے رہا ہوں۔" شوہر نے آرام سے کہا۔

"تم بچے کے ذہن میں فضول باتیں مت بٹھاؤ۔" بیوی نے غصے سے کہا۔

"لیکن فرض کرنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔" شوہر بے چارگی سے بولا۔

"حرج ہے۔ اس سے بچے کا ذہن خراب ہوگا۔" بیوی کو پھر اعتراض ہوا۔

"تم ہمیشہ میری بات میں ٹانگ اڑاتی ہو۔" شوہر بھی ایک دم غصے میں آگیا۔

"تم بدتمیز آدمی۔۔۔"

"بس کیجیے ابو' امی! میں سمجھ گیا۔ لڑائی کیسے شروع ہوتی ہے۔ بیٹے نے جواب دیا۔"

(ترنم اعجاز۔ گلستان جوہر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"لوگ اس وقت تک بھلائی پر رہیں گے جب تک روزہ جلدی کھولتے رہیں گے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل:۔

1۔ عبادت میں شریعت کی مقرر کردہ حد سے آگے بڑھنا دنیا اور آخرت کے نقصان کا باعث ہے۔

2۔ روزہ جلدی کھولنے کا مطلب یہ ہے کہ سورج کی ٹکیہ اُفق کے نیچے پہنچ جانے کے بعد احتیاط کے نام پر مزید تاخیر نہ کی جائے بلکہ فوراً روزہ کھول لیا جائے۔

چھوٹی بیماریاں، بڑی بیماریوں سے بچاتی ہیں،

حضرت سلمان فارسیؓ کو شدید زکام ہوا تو وہ سر اور گردن کو چھپائے خدمت امیرالمومنین حضرت علیؓ میں حاضر ہوئے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا۔
"ہر شخص میں چھ رگیں ہوتی ہیں۔ رگ دیوانگی، رگ کوڑھی، رگ برص، رگ جذام، رگ طاعون، رگ بواسیر، جب رگ دیوانگی حرکت کرے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو زکام میں مبتلا فرماتا ہے۔ جب سر کی کثافتیں کثرت سے زکام کے ذریعے خارج ہوتی ہیں تو ایک قسم کے جنون سے نجات ملتی ہے۔

کمزور بینائی اندھا ہونے کا سبب بنتی ہے جبکہ اللہ کی ذات رحیم اپنے بندے کو اندھا ہونے سے بچانے کے لیے آنکھ کے درد میں مبتلا کر دیتی ہے۔

جذام کو روکنے کے لیے جب ناک کے بال بڑھتے ہیں تو قینچی سے ان بالوں کو کاٹ دینا چاہیے، نوچنا نہیں چاہیے۔ اگر کسی کے جسم میں طاعون کے جراثیم پیدا ہو رہے ہیں تو کھانسی کی برکت سے ان کو روکا جاتا ہے۔

برص جیسے موذی مرض سے بچاؤ کے لیے رب کریم اپنے بندے کو پھوڑے پھنسی میں مبتلا کر دیتا ہے کہ فاسد خون نکل جائے۔

جب بدن میں بواسیر کے حالات بنتے ہیں تو پاؤں کے تلوے پھوٹ جاتے ہیں۔ بخارات اس پھوڑے سے نکل جاتے ہیں۔ اور اسی طرح انسان بواسیر سے محفوظ رہتا ہے۔

اسی طرح ایک چھوٹی تکلیف بڑی تکلیف سے بچا لیتی ہے تو کیا یہ رب کریم کی اپنے بندوں پر خاص رحمت نہیں ہے؟ ہمیں جو بھی بیماری، دکھ، پریشانی آتی ہے وہ حکمت سے خالی نہیں ہوتی۔

ایمان جلبانی۔ گاؤں دریا خان جلبانی

اسلام میں علم کی اہمیت،

بدر کی جنگ میں مشرکین کے ستر قیدی مدینہ لائے گئے۔ ان میں سے جو مالدار تھے وہ تو اپنا فدیہ دے کر چھوٹ گئے مگر کتنے ہی لوگ باقی رہ گئے جن کے پاس مال و دولت نہ تھا تاہم ان میں سے کچھ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں پہلی مرتبہ ایک نئی تحریک پیش کی۔ وہ تھی پڑھا لکھا معاشرہ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا۔
"جو لوگ پڑھے لکھے ہیں وہ ہمارے دس بچوں کو یا بڑوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو انہیں رہا کر دیا جائے گا۔"
چنانچہ مدینہ شریف کے کتنے ہی گھر مدارس میں تبدیل ہو گئے اور نہایت مختصر وقت میں صحابہ کرامؓ اور ان کے بچے تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو گئے۔

فراستِ مومن

حضرت عمرو بن عاصؓ نے قیساریہ کو فتح کر کے غزہ کا محاصرہ کیا تو وہاں کے گورنر نے ان کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ گفتگو کے لیے کوئی آدمی میرے پاس بھیجیے۔

حضرت عمروؓ ایک عام آدمی کی حیثیت سے خود تشریف لے گئے اور گفتگو شروع کی۔

غزہ کا گورنر ان کے حکیمانہ انداز گفتگو اور جرأت و بے باکی سے متاثر ہوا۔ اس نے پوچھا۔

"کیا تمہارے ساتھیوں میں تم جیسے کچھ اور لوگ بھی ہیں؟"

حضرت عمروؓ نے فرمایا "یہ بات نہ پوچھیے۔ میں تو ان میں سب سے کم تر آدمی ہوں۔ جبھی تو انہوں نے مجھے یہاں بھیجنے کا خطرہ مول لیا ہے۔"

غزہ کے گورنر نے یہ سن کر انہیں کچھ تحفے دینے کا حکم دیا اور ساتھ ہی دربان کے پاس حکم لکھ کر بھیج دیا کہ جب یہ شخص تمہارے پاس سے گزرے تو اسے قتل کر کے اس کا مال چھین لو۔"

حضرت عمروؓ جب واپس جانے کے لیے مڑے تو راستے میں غسان کا ایک عیسائی ملا۔ اس نے حضرت عمروؓ کو پہچان لیا اور چپکے سے بولا۔

"عمروؓ! تم اس محل میں اچھی طرح داخل ہوئے تھے اچھی طرح سے ہی نکلنا۔"

یہ سن کر حضرت عمروؓ ٹھٹک گئے۔ وہ فوراً مڑے اور واپس گورنر کے پاس پہنچ گئے۔ اس نے پوچھا۔

"کیا بات ہے، واپس کیوں آگئے؟"

حضرت عمروؓ نے جواب دیا "آپ نے مجھے جو تحفے دیے ہیں، میں نے انہیں دیکھا تو اندازہ ہوا کہ یہ میرے چچا زاد بھائیوں کے لیے کافی نہیں ہیں۔ لہٰذا میرے دل میں آیا ہے کہ میں اپنے بھائیوں کو آپ کے پاس لے آؤں تاکہ آپ یہ تحفے ان سب میں تقسیم کر دیں۔ اس طرح آپ کا تحفہ ایک کے بجائے دس آدمیوں کے پاس پہنچ جائے گا۔"

گورنر دل ہی دل میں خوش ہوا کہ اس طرح ایک کے بجائے دس آدمیوں کو قتل کرنے کا موقع ملے گا۔

چنانچہ اس نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ انہیں جلدی سے لے آؤ۔"

اور یہ کہہ کر دربان کو کہلا دیا "اب اس شخص کو جانے دو۔"

حضرت عمروؓ محل سے نکل کر دور تک مڑ مڑ کر دیکھتے رہے اور جب خطرے کی حدود سے باہر نکل گئے تو فرمایا۔

"آئندہ ان جیسے غداروں کے پاس نہیں آؤں گا۔"

چند روز بعد غزہ کے گورنر کو صلح کی درخواست کرنی پڑی۔ اس مقصد کے لیے وہ خود مسلمانوں کے پاس آیا اور جب حضرت عمروؓ کے خیمے میں داخل ہو کر انہیں امیر لشکر کی حیثیت سے بیٹھا دیکھا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

"کیا آپ وہی ہیں؟"

"جی ہاں" حضرت عمروؓ نے جواب دیا۔ "میں تمہاری غداری کے باوجود زندہ ہوں۔"

کردار کے غازی

ایک دفعہ اموی خلیفہ منصور نے اپنے وزیر ربیع کے ذریعے درہموں کا ایک تھیلا امام ابو حنیفہؒ کی خدمت میں ہدیہ کے طور پر بھیجا۔ ہدیہ جب وزیر نے امام صاحب کی خدمت میں آ کر پیش کیا تو فرمایا۔

"میں ہرگز اس مال کو ہاتھ نہ لگاؤں گا خواہ میرا سر ہی کیوں نہ قلم کر دیا جائے۔"

اسی طرح منصور نے ایک بار اپنے اسی وزیر ربیع کو بہت سارے تحفے دے کر حضرت ابن ابی ذئبؒ کے پاس بھیجا۔ جب ربیع پہنچا تو حضرت ابن ابی ذئبؒ نے فرمایا۔

"میں اس عمل کو تو منصور کے لیے بھی جائز نہیں سمجھتا اپنے لیے تو اس کے حلال سمجھنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔"

بچے کی تعلیم کے 9 اصول

٭ بچہ فطرتاً نیک ہوتا ہے۔ سماج میں رہ کر اچھا یا

برا بنتا ہے۔

٭ بچے کو بچہ سمجھ کر تعلیم دینی چاہیے۔

٭ استاد یا اتالیق کو بچے کی فطرت کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

٭ استاد صرف اسی کو بننا چاہیے جس کے دل میں بچے کی محبت اور معلمی کے پیشے کی عزت ہو۔

٭ تعلیم کو مؤثر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ بچے کی فطرت کے مطابق ہو یعنی کتاب پر زور نہ ہو، بچے پر زور ہو۔

٭ بچے کی عزت کی جائے اور اس کے ساتھ محبت اور ہمدردی کا سلوک کیا جائے۔

٭ بچے کی ضرورتوں کو پورا کیا جائے نہ کہ اس کی خواہشوں کو پہلے جسم اور حواس کی تربیت کی جائے اور پھر ذہن اور دل کی۔

٭ جسمانی سزا بالکل نہ دی جائے۔

(مفکرین تعلیم)

اقوال،

• زندگی بذات خود جینے کے قابل نہیں۔ اسے جینے کے قابل بنانا پڑتا ہے۔

(رچرڈ ایچ میک فیلی)

• لوگ پہاڑوں پر سے نہیں اکثر کنکریوں پر سے پھسلتے ہیں۔

(کنفیوسس)

• تکلیفیں انسان کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ سوچنے سے آدمی دانا بنتا ہے اور دانائی زندگی کو جینے کے قابل بناتی ہے۔

(جان پیٹرک)

• سوچنا اور غور و فکر کرنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بہت کم لوگ اس کی زحمت گوارا کرتے ہیں۔

(ہنری فورڈ)

• علم کتابوں سے نہیں ملتا۔ یہ مشاہدے اور مشاہدے کے بعد نتائج اخذ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

(جان لوتھر)

حمزہ، اقرا۔ کراچی

گوہر آبدار،

٭ سانس کا سفر ختم ہو جاتا ہے لیکن آس کا سفر باقی رہتا ہے۔ یہی وہ سفر ہے جو انسان کو متحرک رکھتا ہے۔

٭ جو ٹل جائے وہ مقدر نہیں اندیشہ ہے۔ جو بدل جائے وہ صرف امکان ہے مقدر نہیں۔ جو نہ بدلے وہ مقدر ہے۔ جو اٹل ہو وہی امر الٰہی ہے۔ وہی نصیب ہے، ہمارا نصیب۔

٭ اگر ظرف نہ ہو تو عطا انسان کو مغرور بنا دیتی ہے۔ زیادہ ظرف والا آدمی مرتبہ ملنے پر انکساری سے کام لینے لگتا ہے۔

فوزیہ ثمریٹ۔ گجرات

غریب خانہ،

ہمارے باباجی کا حکم تھا کہ اپنے گھر کے لیے غریب خانے کا لفظ کبھی استعمال نہ کیا کرو۔ یہ بڑی ہی کی بات ہے کہ آپ اپنے گھر کو غریب خانہ کہیں۔ جس گھر میں اللہ کی رحمتیں ہیں، برکتیں ہیں، اولاد ہے، رزق ہے، روشنی ہے، بہت ہے وہ تو رحمت خانہ ہے۔

نجمہ، نادیہ۔ گلستان جوہر

بھول جانا بھی ایک فن ہے،

جس طرح یادداشت کو بہتر بنانا ایک مفید عمل ہے اسی طرح مناسب وقت کے اندر کسی بات کو بھول جانا بھی ایک مفید فن ہے۔ زندگی میں کئی مرتبہ ہمیں دشوار راستوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ان راستوں میں ہمیں آنسو اور دکھ ملتے ہیں۔ اگر ہم انہیں بھول نہ سکیں تو ہمارے لیے زندگی گزارنا مشکل ہو جائے۔

کسی بات کو بھلانے کے لیے قوت ارادی کی ضرورت ہے۔ جتنی زیادہ ہماری قوت ارادی مضبوط ہوگی اتنی ہی آسانی سے ہم ماضی کی تلخ یادوں کو اپنے دماغ سے نکال سکیں گے۔

سحرش مصطفیٰ۔ میانوالی

فائزہ بھٹی ______ پتوکی

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے
نہ گل کھلے ہیں، نہ اُن سے ملے، نہ مے پی ہے
عجب رنگ سے اب کے بہار گزری ہے

گیلانی سسٹرز ______ کہروڑپکا

مخالفت سے میری شخصیت سنورتی ہے
میں دشمنوں کا بڑا احترام کرتا ہوں
میں ڈر گیا ہوں بہت سایہ دار پیڑوں سے
ذرا سی دُھوپ بچھا کر قیام کرتا ہوں

سیدہ نسبت زہرا ______ کہروڑپکا

ستم ہے کہ دُنیا کے کتنے ہی کام ضروری نہیں مگر کرنے ہیں
بہت سخت موسم ہے لیکن کسی طور یہ دن بسر کرنے ہیں

گڑیا شاہ ______ کہروڑپکا

زندگی! تجھے اب سوچیں بھی تو دم گھٹتا ہے
ہم نے چاہا تھا کبھی، تجھ سے وفا کر دیکھیں
رونے والوں کے تو ہمدرد بہت ہیں محسن
ہنستے ہنستے کبھی دُنیا کو رُلا کر دیکھیں

گیلانی سسٹرز ______ کہروڑپکا

کوئی دستک سی ہے روشن جس خواہش کی راہوں میں
ہواؤں کی بات خوشبو سے سن کر خواب بنتے ہیں
بھرم رکھ لیتے ہیں دشواریوں کا اس طرح کہ اب
بچا کر خود کو تیرے دھیان کے ہمراہ چلتے ہیں

عائشہ، تحریم ______ گوجرہ

تو نے کہا نہ تھا کہ میں کشتی پہ بوجھ ہوں
آنکھوں کو اب نہ ڈھانپ مجھے ڈوبتا بھی دیکھ

شازیہ ہاشم ______ میواتی

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

ایمان جلبانی ______ گاؤں دریا خان

اتنے نرم تھے نازک کہ ہاتھوں سے مسلے جاتے
ہم کو عدم بڑی توجہ سے مسارا گیا

نادیہ، نجمہ ______ گلستان جوہر

محسن ہمارے ساتھ بڑا حادثہ ہوا
ہم رہ گئے ہمارا زمانہ گزر گیا

صدف عمران ______ کے ڈی لے

وہ کتنی دُور سے پتھر اُٹھا کے لایا تھا
میں سر کو پیش نہ کرتا تو اور کیا کرتا

توقیر ہاشمی ______ منڈی بہاؤالدین

وہ لوگ میرے بہت پیار کرنے والے تھے
گزر گئے ہیں جو موسم گزرنے والے تھے
نئی رُتوں میں دُکھوں کے سلسلے بھی ہیں نئے
وہ زخم تازہ ہوئے ہیں جو بھرنے والے تھے

خزیمہ ریاض ______ گاؤں سدوکی

اُکتا گیا ہے تنہائی سے جو اک شناسا چاہتا ہے
یہ دل پھر سے کوئی نیا تماشا چاہتا ہے

ثمرہ جاوید ______ بسم اللہ پورہ

تھکن سے کہیں مر ہی نہ جاؤں
سر پہ ماضی اُٹھائے پھرتا ہوں۔

عائشہ جہانگیر مرالی ______ کبیر والا

محبتوں کے اساس لہجے
حقیقتوں کے عکاس لہجے
اے بنت حوا سنبھل کے رہنا
فریب ہیں، یہ مٹھاس لہجے

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع ۔ 37 ۔ اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

آپ کے خط اور ان کے جواب کے ساتھ حاضر ہیں۔
رب کریم آپ پر، ہم پر، ہمارے پیارے وطن پر اپنا فضل، رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے۔ آمین

پہلا خط پسرور سے یاسمین کنول کا ہے۔

پہلی شعاع متاثر کن رہی۔ محبت واقعی ایک قلبی تعلق ہے معراج النبی کے حوالے سے آپ نے بہت اچھا لکھا۔ رقصم میں منال کے بھائی کا کردار آج کل کے بگڑے نوجوان کا کردار لگتا ہے کہانی دلچسپ ہے۔

افسانوں میں منی پلانٹ اور پرانی محبت پسند آئی۔ بیاد محمود ریاض کے حوالے سے مضامین قابل تعریف رہے۔
سب سے زیادہ متاثر کیا شگفتہ بھٹی کے انٹرویو نے جو بندھن کے نام سے شاہین رشید نے کیا۔ واہ مزا آگیا۔
ص، ب نے جب تجھ سے ناتا جوڑا بہت اچھا لکھا۔ تاہم اگر کوئی تصویر ساتھ ہوتی تو زیادہ اچھا ہوتا۔ باقی باتیں آئندہ۔

ج : پیاری یاسمین! خواتین اور باتوں کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے جب تک سانس تب تک باتیں اور باتیں بنانے اور سنانے میں بھی خواتین سب سے آگے نظر آتی ہیں۔ یہ تو آپ نے اچھا کیا کہ باقی باتیں آئندہ پر اٹھا رکھیں مگر یہ اچھی بات نہیں ہے کہ آدھے پرچے پر تبصرہ کیا ہے۔

جویریہ ندیم گوجرانوالہ سے شریک محفل ہیں

میں پچھلے دو دنوں سے کھانسی نزلہ زکام اور بخار کی لپیٹ میں ہوں میرے میاں صاحب نے بیٹے سے کہہ کر شعاع منگوایا کہ شعاع کو دیکھ کر تمہاری ماں کی آنکھیں بھی کھل جائیں گی اور طبیعت بھی ٹھیک ہو جائے گی۔ اور واقعی ایسا ہی ہوا۔

ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ "پیارے نبی کی پیاری باتیں" پڑھ کر ہمیشہ کی طرح دلی سکون ہوا "مسکراہٹیں" خاص پسند نہیں آیا "کوئی عشق وقت غروب" فرزانہ کھرل کا مکمل ناول بہت پسند آیا۔ ویل ڈن۔ افسانے سارے بہت معیاری تھے۔ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کونسا بیسٹ ہے۔

"پارکھی" پڑھتے ہوئے مجھے محسوس ہوا شاید یہ سمیرا جی کی تحریر ہے پڑھنے کے دوران میں نے خاص طور پر رائٹر کا نام دیکھا۔ "کلک" پڑھتے ہوئے مزہ آیا۔ "حقیقتاً" گھر کے بزرگوں کا پورے گھر پر دھیان ہوتا ہے کہ کون کیا کر رہا ہے۔ "منی پلانٹ" بھی بہت پسند آیا۔

"مکڑی اور مکھی کا کھیل" اچھی تحریر تھی۔ آج کل کے دور میں سارہ جیسی لڑکیاں شاید ہی ہوں کیونکہ آج کل کی لڑکیاں زیادہ سمجھ دار اور پریکٹیکل ہیں۔

"شہرزاد" مجھے تو ڈر تھا کہ کہیں درشہوار کا دل ہی نہ ٹوٹ جائے لیکن اس قسط میں تو اس کا امیج ہی ٹوٹ گیا۔ اظہار محبت کر کے اس نے خود کو ہلکا کر لیا۔ "آنچل میں چاند" ہلکی پھلکی سوفٹ اسٹوری۔ "خواب شیشے کا" نمیر کی ماں کی حالت دیکھ کر تو لگتا ہے کہ نمیر نے بھی کچھ غلط نہیں کیا۔ انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔ مہ ماہ بے چاری اپنے بڑوں کا بویا کاٹ رہی ہے۔

ج : پیاری جویریہ! یہ محاورات نجانے کس زمانے کی ایجاد ہیں حالانکہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنہیں بوئے بغیر بھی کاٹا جا سکتا ہے۔ مثلاً "راستہ کاٹا جا سکتا ہے۔ بات کاٹی جا سکتی ہے۔ شعاع کے انتظار میں رات کاٹی جا سکتی ہے۔ جیب کاٹی جا سکتی ہے۔ اور کبھی کبھی تو بندہ پورا کا پورا کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔

آپ کے میاں صاحب آپ کے مزاج آشنا ہیں کہ بیماری میں شعاع کا مطالعہ تجویز کیا اور واقعی آپ کی طبیعت بہتر ہو گئی۔ یہ حسن اتفاق بھی خوب ہے کہ مئی کے مہینے میں آپ کے بیٹے 'بیٹی اور میاں صاحب تینوں کی سالگرہ ہوتی ہے۔

ملائکہ کوثر نے بسم اللہ پور سے لکھا ہے

"پہلی شعاع" نے شب معراج کی فضیلت کو اجاگر کیا۔ "پیارے نبی کی باتیں" بے حد دلنشین! کاش سارے حاکم بھی ان باتوں پر غور کریں۔ "خواب شیشے کا" عفت سحر کی پیاری سی تحریر۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود مہرماہ 'کی اماں کی زبان کی تلخی کم نہیں ہوئی۔ ایمل رضا کی "رقصم" کی پہلی قسط نہیں پڑھ سکی 'اپریل کا شمارہ نہیں ملا تھا۔ مگر اب خلاصہ پڑھ کر سب سمجھ میں آگیا۔ کہانی اچھی لگ رہی ہے زیادہ گنجلک نہیں ہے۔ عطیہ خالد نے کافی ترقی کر لی ہے۔ ان کی "پار بھی" پسند آئی۔ نعیمہ ناز کی "کلک" نے بے اختیار ہونٹوں پر ہنسی کے پھول بکھیرے۔ "رقص بسمل" کی آخری قسط نے ہماری ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

ہک ہاہ۔ زندگی میں بعض دفعہ وہی نہیں ہوتا جو انسان سوچتا ہے۔ یہ تو پھر کہانی ہے۔

نایاب جیلانی کے "شہر خطا" کی آخری قسط اپریل میں پڑھی (مارچ میں شادی پر چلے گئے تھے) سارے کردار ٹھکانے لگے۔ ویسے آپس کی بات ہے نایاب جیلانی خاصا خوب صورت لکھتی ہیں۔ "غلطیوں کی تلافی حوصلوں اور معافی کے خالص جذبوں سے ہوتی ہے۔"

نایاب جیلانی سے ادب کے ساتھ ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔ ان کی کہانیوں کی خوب صورت حسین 'طرح دار لڑکیاں اتنی بے حس 'کٹھور غاصب کیوں ہوتی ہیں۔

"خط آپ کے" بھی بڑا مزہ دیتے ہیں۔ ثمرہ کہہ رہی ہے آپ کے جواب بھی بڑے مزے دار اور چٹ پٹے ہوتے ہیں جیسے بارہ مسالے والی چاٹ 'کوثر خالد کے خطوں میں سادگی اور بے ساختگی کی پرکاری ہوتی ہے۔ فوزیہ ثمر کے نٹ کھٹ سے الفاظ بھی دل کو بے حد لبھاتے ہیں۔ ثمینہ اکرم کی زندہ دلی بیماری کے باوجود بھی کمال کی ہے۔

میری طرف سے امثل جی کو بہت بہت سلام عرض کیجئے گا۔

ج : پیاری ملائکہ! شعاع کی تعریف اور دعاؤں کے لیے شکریہ اور پیاری ثمرہ کا بھی بہت شکریہ جنہیں ہمارے جواب چٹ پٹے مسالے دار لگتے ہیں۔ اس کا کریڈٹ ہماری قارئین کو بھی جاتا ہے 'وہ ہمیں اتنے اچھے خط لکھتی ہیں کہ ہمارا قلم خود بخود رواں ہو جاتا ہے۔ غور حکمرانوں کو نہیں ہمارے عوام کو کرنا چاہیے ۔وہی تو حکمرانوں کو اپنے ووٹ سے ہمارے سر پر بٹھاتے ہیں۔

خلاصہ ہم اسی لیے دیتے ہیں کہ اگر آپ کوئی قسط پڑھ نہ پائی ہوں تو اگلی قسط میں پڑھ سکیں۔

آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں گئی۔ نایاب جیلانی تک آپ کا سوال پہنچا رہے ہیں۔

حافظہ ثناء ناز صدیق نے کمالیہ سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

پہلے میں کمالیہ کو ایک غیر مشہور سا شہر سمجھتی تھی۔ میں سمجھتی تھی "جو کمالیا' وہ کھالیا"۔ مگر پچھلے دنوں ایک پرانا رسالہ ہاتھ لگا۔ خوشی ہوئی کہ کھدر کی وجہ سے ہی سہی۔ کمالیہ کا ذکر اسلام آباد اور "خواتین ڈائجسٹ" تک پہنچ تو گیا۔ یعنی ہم ایسے بھی کوئی گمنام نہیں ہیں۔

آپ کے باقی سلسلوں کی طرح خطوط بھی بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ یا تو آپ خطوط بھی چن کر شائع کرتے ہیں یا پھر سارے ہی بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ جانتی ہوں کہ آپ معیار پر سمجھوتا نہیں کرتے۔ کرنا بھی نہیں چاہیے۔ تب ہی تو ہمارے ساٹھ روپے "حلال" ہوتے ہیں۔

آپ کے رسالوں کی تعریف کیسے کروں۔ روایتی الفاظ میں کرنا نہیں چاہتی اور غیر روایتی الفاظ مل نہیں رہے ہیں۔ کیسے بتاؤں کہ آپ کے رسالے کہاں کہاں اور کیا کیا سکھاتے ہیں۔ آپی اگر میں آپ کے ہاتھ نمرہ احمد کو کوئی پیغام بھجواؤں (کچھ موضوعات پر لکھنے کی فرمائش یا التجا کرنی ہے) تو کیا آپ ان تک پہنچا دیں گی؟

پلیز کوئی ایسا سلسلہ شروع کریں جس میں مختلف قرآنی آیات کے بارے میں اپنا فہم بھیجا جائے۔

دوسری فرمائش یہ ہے کہ ورزشیں 'یوگا وغیرہ اور شخصیت نکھارنے کے طریقے مثلاً" بات کرتے ہوئے ہاتھوں کا کم استعمال اور بات بات پر بحث سے پرہیز کرنا وغیرہ زیادہ دیا کریں۔ (آپ دیتے تو ہیں مگر پلیز اسے باقاعدہ کردیں۔ مہربانی ہوگی)

ج : ثنا! شعاع کی محفل میں خوش آمدید.... ناز تو کسی بات پر بھی نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں اگر اللہ نے کوئی نعمت دی ہے تو شکر ضرور کرنا چاہیے۔ آپ تو ماشاء اللہ حافظہ ہیں۔ بہت بڑی سعادت سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نوازا ہے۔

ہماری قارئین بہت ذہین ہیں سارے ہی خط جو ہمیں موصول ہوتے ہیں، بہت دلچسپ ہوتے ہیں چھننے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ آپ شعاع کے سلسلوں میں شرکت کریں ہمیں خوشی ہوگی۔ نمرہ احمد سے جو فرمائش کرنا چاہتی ہیں ہمیں لکھ بھیجتیں تو اس خط کی اشاعت کے ساتھ وہ بھی شائع ہو جاتی اور خود بخود ان تک پہنچ جاتی۔

قرآن پاک کے فہم کے لیے ہم کسی عالم دین کی تفسیر شائع کر سکتے ہیں۔ ہر شخص قرآن کی تفسیر نہیں لکھ سکتا۔

بات بات پر بحث کرنا واقعی اچھی عادت نہیں ہے اور جہاں تک نصیحت کی بات ہے تو ہمیں خود نصیحتیں اچھی نہیں لگتیں، دوسروں کو کیا کریں۔

نمرہ احمد کو آپ کا پیغام پہنچا دیں گے۔

ثمینہ ناز نے گھارو سے لکھا ہے

جب زندگی کی تلخیوں سے گھبرا کر رونے بیٹھتی ہوں تو بیٹا شہریار موٹر سائیکل پر بٹھا کر رجینا کے پل سے ہوتا ہوا دریائے بھنبھور کے کنارے لے جا کر بڑے سے پتھر پر بٹھا دیتا ہے اور شاپر سے شعاع یا خواتین نکال کر دیتا ہے کہ مما آپ یہ پڑھیں۔ پہلے میں کراچی کیماڑی میں تھی۔ شادی کے بعد گھارو آ گئی ہوں۔ یقین جانیے جب سورج ڈوب رہا ہوتا ہے اتنا خوب صورت منظر اور پھر مطالعہ کرنا مزا دے جاتا ہے۔ 25 سال سے قاری ہوں لیکن خط پہلی بار لکھا ہے۔ خوب صورت سی حمد اور نعت پڑھ کر پیارے نبی کی پیاری باتیں۔ پڑھ کر مصیبت پر صبر کا بیان پڑھا۔ دستک میں سونیا خان کا انٹرویو اچھا لگا جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے' پڑھ کر آگے بڑھے تو شہزاد مختظر تھا صندل کے ساتھ بہت برا ہوا نہ جانے صائمہ اکرم رومیصہ کے ساتھ کیا کرنے والی ہیں۔ بس آئینہ پڑھ کر اپنے دن یاد آ گئے بد قسمتی سے ہماری ساس بھی ساسوں کی اس جماعت سے تعلق رکھتی ہیں۔ جو بہو باندی اور بیٹی شہزادی والی کہاوت کہتی ہیں۔ "حاصل زیست" میں بھی گزشتہ 20 سال سے متین کے ذریعے ہی اپنے جیون ساتھی کا معاشی ذمے داری میں ساتھ دے رہی ہوں لیکن اب گردوں کی وجہ سے مشکل پیش آتی ہے اللہ کا شکر ہے کہ شوہر محنتی ہیں کام سے جی نہیں چراتے "داسی" بھی دل کو چھو گیا' دل کے مکین 'یقین کریں بالکل یہی کردار ہماری زندگی میں بھی ہیں "ایک نہیں چار ملیحہ جیسی جن کو اللہ نوازتا ہی چلا جا رہا ہے اور وہ دوسروں سے خوشیاں چھینتی ہی چلی آ رہی ہیں 'اپنا حق سمجھ کر لیکن اللہ نے ان کی رسی بھی دراز کی ہوئی ہے' دیکھیں اب ہمیں دعا کی طرح صلہ کب ملتا ہے۔ رقصم بہت خوب صورت مکمل ناول ہے - باقی کوثر خالد جڑانوالہ۔ ثمینہ اکرم لیاری۔ مسرت الطاف احمد کراچی۔ حنا سلیم اعوان ہری پور کا تبصرہ بھرپور ہوتا ہے 'ثمینہ جی اپنا ایڈریس سمجھا دیں تاکہ آپ سے ملاقات ہو سکے۔ اقبال بانو اور راحت جبیں۔ ثمرہ بخاری ان سب کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔

ج : پیاری ثمینہ! تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ سمجھ دار اور سلجھی ہوئی شخصیت کی مالک ہیں اور زندگی کے سرد گرم کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ آپ "تجھ سے ناتا جوڑا ہے" کے سلسلے میں شرکت کریں اور قارئین کو شادی شدہ زندگی کے بارے میں اپنے تجربات سے آگاہ کریں۔

آپ کا یہ خط تاخیر سے ملا تھا پھر بھی شامل کر رہے ہیں۔ 25 سال سے آپ شعاع کی قاری ہیں۔ اور یہ پہلا خط۔ اب اگلے خط کے لیے اتنا وقفہ نہ دیجیے گا۔

زینت ماہین گاؤں شاہ گھوڑا جہلم سے لکھتی ہیں

سب سے پہلے تو عمیرہ احمد نے دل توڑا عمر جہانگیر کو مار کے 'پھر فرحت اشتیاق نے عالی کو مار کے۔ اب رہی سہی کسر نبیلہ جی نے پوری کر دی ہے قلم اٹھانے پر مجبور کیا رقص بسمل نے 'سب سے پہلے تو بڑی خوشی سے رقص بسمل پڑھی لیکن یہ کیا کیا نبیلہ جی لے دے کے تیمور کو ہی مار دیا ویسے وجہ تو نہیں تھی بنتی 'مونس مرزا کو مار دیتیں نا۔ میں بہت غصے میں ہوں اور غصے میں باقی شعاع بھی نہیں پڑھا۔

ج : پیاری زینت! اس میں شک نہیں کہ تیمور کے مرنے کا ہمیں بھی افسوس ہے لیکن یہ بھی سوچیں کہ زندگی میں ہمیشہ سب اچھا اور ٹھیک نہیں ہوتا۔ اور یہ کیا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

بات ہوئی کہ غصہ نبیلہ پر اور آپ نے شعاع پر نکالا۔ تھوڑا غصہ ضبط کر لیتیں تو ہمیں اچھا سا تبصرہ پڑھنے کو ملتا۔

سمیعہ سحر قریشی ضلع بھاول نگر سے لکھتی ہیں

وہی ماڈل وہی ڈریس ماڈل جی اگر ڈریس نہیں ہے۔ تو ہم دے دیں۔ میرے بہنوئی کی بوتیک ہے۔ پہلی شعاع حمد نعت اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتیں دل کو اچھی لگیں۔ جب تجھ سے ناتا بہت اچھا لگا پڑھ کر۔ ناول میں خواب شیشے کا بہت ہی زبردست۔ رقص بسمل بھی زبردست رہا ناولٹ میں آنچل میں چاند ہلکی پھلکی رہی۔ افسانوں میں منی پلانٹ پرانی محبت اچھے لگے۔ خط آپ کے۔ واہ جی واہ سوچا کاش ہم بھی شامل ہوتے۔ مسکراہٹیں بھی پسند آئیں۔

ج : پیاری سمیعہ! ہم نے آپ کی پیشکش ماڈل تک پہنچا دی ہے ویسے یہ سوچ لیں کہ آپ کی فراخدلی سے بہنوئی صاحب متفق نہ ہوئے تو آپ کیا کریں گی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

حرا محمود احمد نے میرپور خاص سے لکھا ہے

اگر ہم آپ کو کوئی کہانی یا افسانہ لکھ کر بھیجیں تو ہم نے جو افسانہ لکھا ہے وہ بڑا ہے تو ایک لفافے میں کتنے صفحے ہونے چاہئیں اور کون سے پین سے لکھیں کیا بال پین سے لکھ سکتے ہیں۔

ج : پیاری حرا! آپ افسانہ ایک ہی لفافے میں بھجوائیں۔ آپ ڈاک خانے سے بڑا لفافہ لے لیں یا براؤن کاغذ لے کر افسانہ اس میں پیک کر لیں لفافے پر ایڈریس لکھیں 37۔ اردو بازار کراچی۔ بال پین سے لکھ سکتی ہیں۔

ثانیہ مشعل اشرف حویلی لکھا، تحصیل دیپالپور، ضلع اوکاڑا سے شریک محفل ہیں

کھلا کھلا سا ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ اور یہ کیا؟ نبیلہ جی! اینڈ اچھا نہیں لگا۔ تیمور کو نہیں مارنا تھا۔ جب تک آپ کا کوئی ہیپی اینڈنگ ناول نہیں آئے گا۔ ہماری کٹی....

"شہرزاد" زبردست جا رہا ہے۔ یہ درشہوار تو پوری فتنی ہے اور کہیں یہ ہادی صاحب ہی "ہم زاد" تو نہیں؟ خیر دیکھتے ہیں "رقصم" پڑھتے ہوئے مسکراہٹ جدا ہی نہیں ہوئی۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ "پارکھی" نے تو گویا میلہ ہی لوٹ لیا۔ انداز بیاں بہت خوب تھا۔

"مکڑی اور مکھی کا کھیل" "میرے اللہ" بے ساختہ آہ نکلی۔ سعدیہ حمید چوہدری اور سعدی حمید چوہدری ایک ہی شخصیت ہیں؟

"کوئی عشق وقت غروب" بے حد اچھا لگا۔ تحریر کی روانی قاری کو باندھ لیتی ہے۔ ایک ہی نشست میں پڑھا۔ بہت اچھے فرزانہ جی۔ نعیمہ جی نے اپنے انداز سے ہٹ کر لکھا۔ بولی صاحب کلک کے انتظار میں ہیں اور گھر والے (ہاہاہا)۔

آسیہ رزاقی کہاں ہیں بھئی؟ اور ثمرہ بخاری کیا ہمیں بھول بھال گئی ہیں؟ اور راحت جبیں کو بھی کہیں سے ڈھونڈ لائیں پلیز۔ اور ہاں! پہلے بھی کسی بہن نے فرمائش کی تھی اور میں بھی کر رہی ہوں کہ کوئی مائی کی "لال" شاہین رشید صاحبہ کا انٹرویو لے اور آپ اسے شائع کر دیں۔

ج : ثانیہ! شاہین رشید بہت پیاری شخصیت کی مالک ہیں وہ اتنی خوفناک نہیں کہ ان کے انٹرویو کے لیے کسی مائی کے "لال" کی ضرورت پڑے۔ بس ادھر انہوں نے انٹرویو دیا۔ ادھر ہم نے انٹرویو چھاپا چھاپا کا مطلب شائع کیا.... ہاں سعدیہ حمید چودھری اور سعدی حمید چودھری ایک ہی شخصیت ہیں۔

آسیہ رزاقی کی کمی ہمیں بھی محسوس ہو رہی ہے۔ ہم نے ان سے لکھنے کو کہا ہے۔ راحت جبیں چینل پر مصروف ہیں۔

سانحہ ارتحال

ہماری مصنفہ راؤ سمیرا ایاز کی دادی رضائے الٰہی سے انتقال کر گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون اللہ مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین۔ قارئین سے دعا کی درخواست ہے۔

کشف زارا صادق آباد ضلع رحیم یار خان سے لکھتی ہیں

میری آنٹی نسرین اور امی نجمہ صفدر باقاعدگی سے شعاع پڑھتی ہیں۔ حمد ونعت کے بعد خطوط پڑھے جن میں مجھے میرے سوالات کے جواب مل گئے۔ رقص بسمل میں آخر موت کا رقص ہو ہی گیا۔ نبیلہ عزیز نے رکاوٹوں کے باوجود اس کہانی کا معیار قائم رکھا۔ اگر تیمور کا جنازہ نہ اٹھتا تو میری نظر میں کہانی کا جنازہ اٹھ جاتا۔ نبیلہ جی کو مبارک باد شہزاد...! صائمہ اکرم جی نے صندل کو آخر ٹھکانے لگا دیا۔ بچاری نے اچھا نہیں کیا خود کے ساتھ' حرام موت مر کے۔ خواب شیشے کا...! یہ کہانی بھی اچھی ہے لیکن اب جیسے ایک ہی جگہ پہ ٹھہری گئی ہے اسے جلدی آگے بڑھائیں۔ رقصم میں ایمل رضا ہمیشہ کی طرح بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ فرزانہ کھرل کی تو میں فین ہوتی جا رہی ہوں۔ سعدیہ حمید کی کہانی موجودہ دور کی ایک تلخ حقیقت تھی۔ "کلک" افسانے نے بے حد ہنسایا۔

ج : ہیں...! تیمور کی موت پر نبیلہ کو مبارک باد۔ پیاری کشف! ہماری قارئین تو شدید ناراض ہیں ہم سے بھی اور نبیلہ سے بھی اور اس سے زیادہ دردناک بات یہ ہے کہ اس ناول کے انجام پر انہوں نے شعاع سے بھی خفگی کا اظہار کیا ہے' ویسے آپس کی بات ہے آپ واحد قاری ہیں جنہوں نے تیمور کی موت کو صحیح تسلیم کیا ہے۔

اپنی امی نجمہ صفدر اور آنٹی نسرین کو ہمارا سلام پہنچا دیں۔

ثمینہ اکرم۔ بہار کالونی لیاری کراچی

"یاد محمود ریاض" سائرہ رضا کے قلم سے لفظ لفظ.... موتی بکھرے قطرہ قطرہ.... آنسو بہے' اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین) "تجھ سے ناتا جوڑا ہے" بہن (ص۔ب) قسمت کی مہربانی سے آپ کو بہت اچھا سسرال اور ایک محبت کرنے والا شوہر ملا ہے۔ مگر پھر بھی آپ نے اپنے اصلی نام کے ساتھ اپنا "ناتا" کیوں نہیں لکھا؟ ایمل رضا کا "رقصم" اچھا جا رہا ہے۔ مگر کہانی کے بعض حصوں پر (یونیورسٹی والے قصے میں) مجھے یارم کا گمان ہوتا ہے۔ عجرم اور منال کو پڑھ کر کوئی بہت شدت سے یاد آتا ہے۔ (بھئی یارم کے ہیرو ہیروئین اور بھلا کون....)

"تاریخ کے جھروکوں سے" ہر بار ہی بہت خاص تحقیقاتی مواد کو شائع کرنا اور مختلف تاریخی پہلوؤں کو اجاگر کرنا بہت کمال کی بات ہے اس ماہ تو "شداد کی جنت" کا احوال پڑھ کر میں دنگ رہ گئی۔ "رقص بسمل" آخری قسط میں وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ نبیلہ جی آپ نے بالکل بھی اچھا نہیں کیا۔ تمام نیگیٹو کرداروں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے تیمور کا مرنا کوئی اتنا ضروری بھی نہیں تھا۔ اس ناول نے تو شروع سے آخر تک قارئین کو بس رلایا ہی ہے۔ فرزانہ کھرل کا مکمل ناول "وقت غروب سا" موضوع کی انفرادیت کی وجہ سے دل میں گھر کر گیا۔ "شہرزاد" میں شاید ہادی ہی ہم زاد کا کردار ادا کر رہا ہے۔

پیاری کوثر خالد جی' اللہ آپ کو عافیت والی زندگی عطا فرمائے اپنا خیال رکھا کریں۔ شعاع کی قاری بہن یاسمین اقبال (لاہور) آپ شیر شاہ آئیں اور لیاری نہ آسکیں۔ اگر مجھے آپ کی آمد کی پیشگی اطلاع ہوتی تو خود بہ نفس نفیس آپ کو جا کر لے آتی اور آپ سے ملاقات میرے لیے ایک اعزاز ہوتا۔ محبتوں کی میں ہمیشہ سے قدردان ہوں۔

ج : پیاری ثمینہ! کوثر خالد تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔ زندگی سے محبت نہ بھی کریں' تو بھی بیماری اور محتاجی اپنے لیے بھی تکلیف دہ ہوتی ہے اور دوسروں کے لیے بھی آزار بن جاتی ہے۔ انسان جب تک زندہ رہے کسی بھی لحاظ سے کسی کا محتاج نہ ہو۔

آپ کو پرچا پسند آیا۔ بہت شکریہ۔ مزید شکریہ کہ آپ نے تفصیلی تبصرہ کیا۔ روتی دھوتی کہانیاں تو ہمیں بھی اچھی نہیں لگتیں۔ لیکن یہ بھی زندگی کی حقیقتیں ہیں۔ اس ناول میں جو خامیاں یا کمیاں رہ گئیں اس کا ہمیں بھی افسوس ہے۔ نبیلہ آغاز سے لے کر اختتام تک اس پر توجہ نہ دے سکیں۔

آپ کے بہنوئی یونس صاحب کے لیے دعائے مغفرت۔

اقراء جٹ فرام من چن آباد سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

ٹائٹل زبردست تھا۔ پھر جلدی سے دل کے سارے ٹکڑے اکٹھے کر کے ایلفی سے جوڑ ڈالے (ہاہاہا) کیونکہ بھئی دوبارہ شریک محفل بننا تھا۔ سب سے پہلے "رقصم"

کو پڑھا، ایمل رضا بہت خوب لکھ رہی ہیں آپ۔
"شہرزاد" بہت اچھا جارہا ہے۔ طوبیٰ نے صندل کے راز کو راز ہی رکھ لیا ہے۔ ہادی کو بھی محبت ہے واہ بھئی واہ! "کوئی عشق وقت غروب" فرزانہ کھرل بہت زبردست تھی تحریر آپ کی۔ آئمہ کے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں لاسٹ میں؟
"خواب شیشے کا" آپی عفت سحر آہستہ آہستہ راز افشاں کررہی ہیں۔ مہاہ کے تھپڑ کا بدلہ نمیر کیسے دیتا ہے اب دیکھتے ہیں۔
"رقص بسمل" نبیلہ عزیز ناول کے مکمل ہونے پر مبارک باد وصول کریں۔ لالچ انسان کو اندھا کردیتا ہے اور محبت خود اندھی ہوتی ہے۔ "مکڑا اور مکھی کا کھیل" سعدیہ حمید بہت زبردست تحریر تھی "آنچل میں چاند" سکندر نے بہت اچھے طریقے سے عمارہ کو اپنایا' افسانے تمام ہی اچھے تھے۔ موسم کے پکوان میں چکن کڑاہی کا طریقہ بتائیں؟
ج: پیاری اقراء! اتنا نازک دل رکھیں گی تو دنیا میں گزارا مشکل ہو جائے گا پھر تو ایلفی بھی کارگر نہیں ہوگی۔ شعاع آپ کو اچھا لگا' یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ آئندہ بھی شرکت کرتی رہیے گا۔ افسانوں' ناول کا اعزازیہ دیا جاتا ہے لیکن نظموں غزلوں اور سلسلوں کے لیے لکھنے پر کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا۔

میمونہ رحمت اللہ شرق پور شریف سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

نبیلہ جی! تیمور کو کسی طرح بچالیتیں۔ آفاق کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا۔ "رقصم" ایمل رضا کا شاہکار ناول' منال کا دل ٹوٹنے پر بڑا افسوس ہوا۔ اور "شہرزاد" صائمہ جی ویل ڈن! صندل کی خودکشی کا پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ دل کیا وہاج کا گلا دبادوں۔ "خواب شیشے کا" بھی اچھا جارہا ہے۔ "آنچل میں چاند" کی عبیرہ میں ماہ دولت کو اپنی جھلک نظر آئی۔ آخر میں قارئین سے گزارش ہے کہ میرے رزلٹ کے لیے ضرور دعا کیجیے گا اور مریم (بہن) کے پیپرز کے لیے۔
ج: پیاری میمونہ! اگر آپ کی فرمائشوں کے مطابق سب کو ملا دیا تو پھر کہانیوں میں مزہ کیا رہ جائے گا۔ اور رزلٹ کے لیے اب دعا کا کیا فائدہ۔ اب تو جو کچھ کرے گا' ممتحن ہی کرے گا۔ آپ کی بہن مریم کے لیے دعا کرسکتے ہیں مگر یاد رہے دعا کے ساتھ ساتھ دوا (محنت) بھی ضروری ہے۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

مئی کا شمارہ لاجواب تھا لیکن افسانوں کی بھرمار تھی "رقص بسمل" کی لاسٹ ایپی سوڈ میں تیمور کی ڈیتھ پڑھ کر میں تو دنگ رہ گئی ہماری بہت سی قارئین کو یہ ڈر تھا کہ تیمور کے ساتھ کچھ برا نہ ہو جائے لیکن اتنا برا۔۔۔! یہ تو سوچا ہی نہیں تھا۔ "شہرزاد" کی یہ قسط کافی ڈپریسنگ تھی۔ "خواب شیشے کا" مائی موسٹ فیورٹ ناول یہ ایپی سوڈ بھی آؤٹ اسٹینڈنگ لگی "رقصم" کی یہ دوسری قسط بھی پسند آئی لیکن یہ اسٹوری حقیقت سے کافی دور محسوس ہوتی ہے "آنچل میں چاند" اسٹارٹ تو اچھا لگا لیکن بعد میں فلمی اسٹوری ہی لگی۔ "کوئی عشق وقت غروب" بہت ہی قابل تعریف تحریر تھی۔ موضوع بہت ہی اسٹرونگ اور متاثر کن تحریر تھی "مکڑی اور مکھی کا کھیل" فنٹاسٹک تحریر تھی یہ تحریر حقیقت کے قریب تر محسوس ہوئی۔
افسانوں میں "کلک" نمبرون رہا بہت دلچسپ تحریر تھی۔ "پرانی محبت" بہت ہی اداس کردینے والی تحریر تھی "لیلیٰ مجنوں" میں لیلیٰ نے قیس کو مزا چکھادیا۔
ج: پیاری مسرت! پروردگار آپ کے والد کو کامل صحت عطا فرمائے۔ اور ان کا سایہ آپ کے سروں پر سلامت رکھے۔ آمین
اور عجرم اور منال کو پڑھ کر آپ کو حیرت کیوں ہوئی۔ شاعر نے تو ایک زمانے پہلے کہا تھا۔
"یوں ہی دنیا بدلتی ہے اسی کا نام دنیا ہے۔"
نبیلہ عزیز کے ناول میں اگر سب اچھا ہو جاتا تو پھر قارئین کو شکوہ ہوتا فلمی اسٹوری ہے۔ آپ کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح جامع اور مفصل ہے۔ بہت شکریہ

بریخنا زیب پنج پیر صوابی سے لکھتی ہیں

یہ خط میں نے بہت دل سے لکھا ہے' اس لیے تو ردی کی ٹوکری کی مہمان نوازی سے محفوظ رکھیں کیونکہ میرا دل بہت چھوٹا اور نازک و نرم سا ہے۔ ہمارے گاؤں میں لوڈ شیڈنگ نے ہمارا دماغ خراب کیا ہے۔ رات کو پیچھا نہیں چھوڑتے ایمرجنسی لائٹ پر ڈائجسٹ پڑھتی ہوں! کبھی کبھی تو روشنی اتنی کم ہوتی ہے کہ مما کہتی ہیں کہ یہ تو جگنو کی لائٹ کے برابر ہے تو یہ ہماری محبت ہے جو اتنی کمزور لائٹ میں بھی ڈائجسٹ پڑھتی ہوں کہ صرف ایک لفظ دکھائی دیتا

ہے اب آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ میرے دل میں آپ کے لیے۔اور آپ کی ڈائجسٹ کے لیے کتنی محبت ہے اور ہاں تبصرہ تو کسی بھی رائٹرز وغیرہ کے بارے میں نہیں کیا تو اب یاد آگیا۔ سمیرا حمید یہ کیا چیز ہیں ماشا اللہ اتنی اچھی اچھی کہانیاں لکھتی ہیں کہ دل کرتا ہے کہ ان کے ہاتھ چوم لوں۔فائزہ افتخار اور سائرہ رضا سب اچھے لکھتے ہیں لیکن سمیرا حمید تو کوئی اور چیز ہیں۔

ج: پیاری برخنا! محبت اپنی جگہ مگر آنکھیں پروردگار کی بہت بڑی نعمت ہیں اور نعمتوں کا درست استعمال ہمارا فرض ہے۔دن کی روشنی میں وقت نکال کر پڑھا کریں۔

ریحانہ چوہدری مدو کے سے شریک محفل ہیں

پہلی شعاع کے آخر میں لکھا ہوا ہے ہمیں خط ضرور لکھیے گا۔ بھئی آپ کہیں اور ہم نہ مانیں ایسے تو حالات نہیں۔ تبصرے کی طرف حمد و نعت اور پیارے نبی کی پیاری باتیں ہمیشہ کی طرح بہت خوب صورت انتخاب تھا۔ جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ ص۔ب بہن کی باتیں حقیقت کم اور خواہشات کا فسانہ زیادہ لگا۔ تجربے کی بنا پر بہت دیکھا ہے کہ جو عورتیں خاوندوں کی اتنی تعریف کرتی ہیں معاملہ برعکس ہوتا ہے۔

سائرہ رضا کا ریاض صاحب مرحوم کے لیے سپاس نامہ ایک اچھا اور معیاری مضمون رہا۔ بندھن میں شگفتہ بھٹی کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ شہرزاد صائمہ جی کی بہت اچھی تحریر۔ درشہوار کا خود فون کرنا کچھ اچھا نہیں لگا۔ سعدیہ حمید چوہدری کا ناولٹ مکڑا اور مکھی کا کھیل شروع میں تو سارہ منصور ایک پاور فل کریکٹر لگا نعیمہ ناز کی کلک ایک ہلکی پھلکی تحریر اچھی لگی۔ رقصم کو پڑھتے ہوئے یارم یاد نہ آئے۔ ہو نہیں سکتا۔ پیال سازی کی طرح کی ایک خوب صورت تحریر پڑھتے ہوئے بہت لطف آیا۔ مکالموں میں کمال کی برجستگی' شگفتگی' شازیہ ہاشمی کا فسانہ "پرانی محبت" ایک اچھی معاشرتی اور گھریلو کہانی حقیقت کے قریب تحریر تھی۔ اف فرزانہ کھرل ہمیشہ کی طرح بہت خوب صورت تحریر مگر چھپا کے چھپی کے برعکس انداز کی حامل یہ تحریر کچھ فلسفیانہ' کچھ روحانی' بہت جذباتی تحریر۔ دھنک کے رنگوں والی عفت سحر طاہر نے جانے اس شیشے میں کیسے کیسے خواب مقید کر رکھے ہیں لگتا ہے کہ اسٹوری کوئی نیا ٹوئسٹ لینے جا رہی ہے۔ اسماء فاروق کا ناولٹ میرے آنچل میں ایک مضبوط پلاٹ پہ لکھی گئی بہترین کاوش تھی۔ فرح بخاری کا افسانہ بؤہ سادہ لوح بیویوں کی ترجمان تحریر' صبا نسرین کا افسانہ منی پلانٹ رشتوں کی آبیاری کرتا ہوا نظر آیا۔ آخر کار نبیلہ عزیز کا خوب صورت ناول اختتام پذیر ہو گیا۔ اس کا انجام اچھا نہیں لگا اس وقت آسمان پہ چھائے ہوئے اودے سفید بادلوں کے گھونگھٹ سے جھانکتا ہوا سورج راجا افق مشرق پہ قبضہ کرنے کے لیے برسرپیکار نظر آرہا ہے۔ سامنے کوئل صنوبر کے درخت پہ بیٹھی ہماری توجہ کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے مگر ہمسایوں کی موٹی گائے نے اس کو جواب دینا ضروری سمجھا جس کا شکوہ کوئل ہم سے لگاتار کر رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میرے لان کی کیاریوں میں لگے تمام پودے اس وقت بہت محویت سے مجھے خط لکھتے دیکھ رہے ہیں۔

ج: پیاری ریحانہ! آپ کی منظر نگاری اور تحریر کی روانی سے اندازہ ہو رہا ہے کہ واقعی موسم بہت دل فریب ہے۔ ص۔ب کی باتیں آپ کو افسانہ لگیں۔ آپ انسان سے اتنی مایوس کیوں ہیں۔ یقین کریں' دنیا میں ابھی اچھے لوگ بھی ہیں اور ان کی تعداد زیادہ ہے۔ برے تو کم ہی ہوتے ہیں۔

شعاع آپ کا ہی پرچا ہے اگر شعر یا خط شائع نہ ہو تو بھی اسے اپنا ہی سمجھیں اور بھئی یہ آپ کی کوئل تو بڑی بدذوق ہے' موٹی گائے نے محبت کا جواب محبت سے ہی تو دیا ہے۔ اسے چھیڑا تو نہیں ہے۔ جو اس نے آپ سے شکایت کر دی۔

شعاع جلدی جلدی پڑھ کر تفصیلی تبصرہ کیا' اس میں آپ کے ساتھ ساتھ آپ کی پیاری دختران سارہ اور ارجمند کا بھی حصہ ہے۔ ان دونوں کو ہماری طرف سے ڈھیر سارا پیار۔

تسنیم کوثر نے کراچی سے لکھا ہے

سب سے پہلے رقص بسمل کے اینڈ نے دل دکھا دیا بلکہ رلا دیا۔ کاش نبیلہ عزیز اتنا دردناک اور اتنا زیادہ غم زدہ اختتام نہ کرتیں لیکن بلاشبہ ناول ہٹ گیا۔

شہرزادی کی تو کیا بات ہے نہایت مزیدار ہے۔ خواب شیشے کا عفت سحر طاہر کا ناول بھی اپنی تمام تر دلچسپیوں کی حدود کو چھو رہا ہے۔ سعدیہ حمید چوہدری کا ناولٹ مکڑا اور مکھی کا کھیل عمدہ لگا۔ رقصم اچھا جا رہا ہے مگر پلیز اس کی اسٹوری کو آگے تو بڑھائیں "میرے آنچل میں" اسماء فاروق نے

بہت اچھا لکھا ہے۔ افسانوں میں بٹوہ اور کلک بہت بہت اچھے لگے خاص طور پر نعیمہ ناز کے کلک کا تو جواب ہی نہیں۔

اور پیاری رضیہ جمیل صاحبہ ذرا یہ تو بتادیجئے کہ "سوچ نگر کی رانی" اس ناول کی مصنفہ رضیہ جمیل کیا وہ آپ ہیں؟

ج : پیاری تسنیم! جامع اور خوب صورت تبصرے کے لیے شکریہ۔ نبیلہ عزیز کے ناول کے اختتام پر ہماری "تقریباً" سب ہی قارئین شدید صدمے کا شکار ہیں۔ ہم نے نبیلہ سے کہا ہے کہ اب تلافی کے لیے کوئی اچھا سا ناول لکھیں۔ جی ہاں' یہ ناول ناچیز نے ہی لکھا ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔

اقصیٰ طیب الرحمن گاؤں مونن ضلع ہری پور سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

مجھے شعاع بہت پسند ہے ہر دفعہ کوئی نہ کوئی کہانی جینے کا ڈھب سکھا دیتی ہے۔ اب آتی ہوں ناولز کی طرف شہرزاد! صائمہ جی کیا خوب صورت لکھتی ہیں آپ "خواب شیشے کا" بہت ہی زبردست کہانی ہے۔ "رقص بسمل" واہ آپی جی اتنے انتظار کے بعد کیا خوب صورت تحفہ پیش کیا ہے آپ نے تو! زندگی بھر نہیں بھولے گا ہمیں آپ کا یہ تحفہ۔ جب سے پڑھی ہے یہ کہانی 'اٹھتے' بیٹھتے دماغ میں یہی چل رہا ہے کاش یہ نہ ہوتا' پر اب کچھ نہیں ہو سکتا' کچھ بھی نہیں۔

اس کے علاوہ رقصم میں تھوڑی سی جھلک کارل کی نظر آتی ہے اچھا ناول ہے۔ اور آخری بات یہ ہے کہ آپی مسلسل تین' چار مہینوں سے میں دیکھ رہی ہوں ہری پور سے کوئی خط شامل نہیں ہو رہا۔ اور وہ حنا سلیم اعوان بھی پتا نہیں کہاں غائب ہیں۔

آپی میری پھوپھو ہیں لاہور میں' ان کا اپنا مدرسہ ہے وہ بھی ڈائجسٹ بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔

ج : پیاری اقصیٰ! ہری پور والے ہمیں خط لکھتے تو ضرور شائع کرتے (ہری پور والو! کہاں ہو؟ اقصیٰ آپ لوگوں کو یاد کر رہی ہیں)

اتنی دور سے آپ نے خط لکھا اور ایک ہی ناول پر تبصرہ لگتا ہے رقص بسمل کا انجام آپ کے دل نازک پر زیادہ ہی گراں گزرا ہے۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

سمیعہ نسیم نے سکھر سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

سب سے اچھا "پارکھی" عطیہ خالد کا لگا۔ باقی تمام افسانے بھی اچھے تھے۔ ناولٹ میں "آنچل میں چاند" بے حد زبردست ناولٹ تھا جبکہ "مکڑی اور مکھی کا کھیل" بالکل بھی اچھی کہانی نہ تھی "رقصم" تو بے حد زبردست ناول چل رہا ہے۔ ایمل رضا تو میری فیورٹ رائٹر ہیں۔ وہ خاکہ ہی اتنا زبردست کھینچتی ہیں کہ ان کی ہر اسٹوری دل موہ لیتی ہے۔ "کوئی عشق وقت غروب سا" اتنا خاص ناول نہ تھا۔ سلسلہ وار ناول میں "رقص بسمل" کا اینڈ بڑا ہی بے کار تھا۔ جبکہ "خواب شیشے کا" عفت سحر طاہر سحر پھونکتی محسوس ہو رہی ہیں شہرزاد کی اسٹوری بھی اچھی چل رہی ہے۔ شاہین رشید سے کہیں کہ فیروز خان اور نعمان حبیب کا انٹرویو بھی شائع کریں۔ اس کے علاوہ وان ٹون کی ریسیپی بھی شائع کریں۔

ج : پیاری سمیعہ! شعاع کی تعریف کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔ آپ کی تنقید و تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔

رجاب ہانیہ خان نے لکھا ہے

میرا تعلق خیبر پختونخوا کے ایک چھوٹے سے گاؤں پستون گڑھی سے ہے۔ ہمیں شعاع بہت مشکل سے ملتا ہے اور پھر خط لکھ کر پوسٹ کرنا اور زیادہ دشوار ہے۔ رقص بسمل کا اینڈ پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ ہمیں آخری قسط نے رلا دیا۔

نبیلہ جی! آپ نے قارئین کے جذبات کو یکسر نظر انداز کیا۔ تین ساڑھے تین سال تک ایک صبر آزما مرحلے سے گزر کر ایک المناک خاتمے سے دوچار ہوئے۔ سزا کے حقدار مونس مرزا' قیام مرزا اور رضا حیدر تھے اور تیمور حیدر' وہ اس طرح موت کی سزا کا حقدار نہ تھا۔ مما نے جب بتایا کہ تیمور کی ڈیتھ ہو گئی۔ ہمیں اس کا یقین نہ آیا اور خود پڑھتے ہوئے بھی یقین نہ آیا۔

جب تیمور کا غم کم کرنے کے لیے شہرزاد کھولی تو یہ کیا؟ ادھر تو صائمہ اکرم کو محترمہ صندل کو لٹکانے کی سوجھی۔ ہم تو اب تک حازم کے غم سے نہ نکلے تھے کہ "یک نہ شد دو شد"

ج : پیاری رجاب! خیبر پختون خوا کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے آپ کا خط دیکھ کر ہمیں بے حد خوشی ہوئی ہے۔ تحریر کی روانی اور خوب صورت لکھائی قابل تعریف ہے۔ آپ کے دکھ کا اندازہ ہو رہا ہے مگر کیا ہے کہ یہ دنیا سزا و جزا کی جگہ نہیں [illegible] انصاف کا یہاں گزر [illegible] ہر ظالم طاقتور اور ہر غریب کمزور جو ظلم سہتا ہے اور بغاوت نہیں کرتا' دونوں سے روز آخرت ہی بازپرس ہو گی۔ اس بار تو آپ تیمور کے غم میں تھیں' آئندہ خط لکھیں تو دیگر کہانیوں پر بھی تبصرہ کریں۔

عاصمہ احمد نے واہ کینٹ سے لکھا ہے

شعاع سے تعلق اتنا ہی پرانا ہے جتنا اپنی بڑی ہمشیرہ سے۔ وہ مجھ سے کوئی 21 برس بڑی ہیں۔ "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" ایک بہت عجیب لیکن متاثر کن سلسلہ ہے یہ بیک وقت حالات سے مقابلہ کرنے کی ترغیب بھی دیتا ہے اور آنے والے وقت کی ہولناکیوں سے ڈراتا بھی ہے۔

رقصم کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہو گی بے حد' بے حد خوب صورت انداز تحریر' ویل ڈن ایمل رضا صاحبہ "مکڑا اور مکھی" درحقیقت وہ کہانی ہے جس نے مجھے بتایا کہ عورت اور مرد کے اس کھیل کو جتنے بہترین الفاظ میں کاغذ پر اتارا جا سکتا تھا اتارا جا چکا ہے اور یہ اعزاز "مکڑا اور مکھی" کی لکھاری صاحبہ کو جاتا ہے۔

باقی افسانے سب ہی اچھے تھے۔ سلسلے وار ناولز بھی ایک مناسب رفتار سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ شہرزاد کچھ گنجلک سا ہوتا جا رہا ہے تاہم دلچسپی کا عنصر ابھی بھی برقرار ہے۔

ج : پیاری عاصمہ! آپ کی کہانی پرچے کے مزاج کی نہیں ہے۔ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ کچھ اور لکھیں۔ آپ سے کس نے کہا کہ آپ کی لکھائی اچھی نہیں ہے آپ کی لکھائی تو بہت اچھی اور صاف ہے۔

فائزہ شاہد نے شہدادپور سے لکھا ہے

چودہ سال بعد قلم اٹھایا ہے لیکن ڈرتے ڈرتے۔ موسم کے لحاظ سے ٹائٹل اچھا لگا۔ حمد و ثناء نے دل خوش کیا پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا اور روح کو سکون ملا دھڑکتے دل کے ساتھ رقص بسمل پڑھا اور ماورا کے دکھ نے آنکھیں نم کر دیں۔

ج : پیاری فائزہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ چودہ سال بہت طویل مدت ہے اتنے عرصہ میں آپ نے ہمیں ایک بار بھی یاد نہیں کیا۔

شعاع کی پسندیدگی اور اس کا ساتھ نبھانے کے لیے شکریہ۔

عظمیٰ شفیق نے جڑانوالہ سے لکھا ہے

پہلے میں پوری دل جمعی سے اکیلے بیٹھ کے خط لکھتی تھی جب شائع نہ ہوتا تو غصہ آتا لیکن اس وقت میں چائے اور فروٹ کیک نوش کرتے ہوئے لکھ رہی ہوں تاکہ خط نہ لگنے پر کم غصہ آئے۔ سب سے پہلے منی پلانٹ پڑھا۔ افسانہ اچھا تھا۔ خوہ فرح بخاری کا افسانہ دلچسپ تھا۔ اسماء فاروق کا ناولٹ بالکل فارغ تھا۔ وقت ضائع کرنے والی

تحریریں نہ لگایا کریں تو بہتر ہے نعیمہ ناز کا افسانہ پڑھ کے بہت مزا آیا۔ "لیلیٰ مجنوں" بھی متاثر کرنے میں ناکام رہا۔ بار کھی منفرد افسانہ تھا اس ماہ کی جاندار کہانی فرزانہ کھرل کی تھی۔ شروع سے اینڈ تک محویت قائم رہی۔

شہرزاد' دلچسپ شاندار ناول ہے۔ اگر میں اپنا ناتا جوڑا بھیجوں لیکن جوابات مختصر ہوں گے تو کیا شائع ہو جائے گا؟

ج : پیاری عظمیٰ! جب بھی آپ کا خط ملتا ہے تو لگتا ضرور ہے اور یہ لکھتے وقت چائے کیک کی کیا تک ہے۔ جب یہ شمارہ پڑھیں تب کھائیں نا' تاکہ غصہ نہ آتا۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل	رابیل فضل
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی	موسیٰ رضا

واصفہ سہیل

کہ اس کردار کے لیے کچھ اور فنکار (مثلاً"... نام نہیں لیا... کیا ڈر گئے...؟) بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ (ویسے گوہر! یہ زیادہ نہیں ہو گیا...؟) مگر میں نے نعمان اعجاز کا نام اس لیے فائنل کیا کیوں کہ نعمان ایک بھرپور کریکٹر ایکٹر ہیں۔

اعزاز

لندن میں ایک معتبر رسالے کی جانب سے دنیا کے سو سربراہوں کی مشہور اور بااثر صاحب زادیوں کی فہرست شائع کی گئی ہے۔ جس میں سرفہرست امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی بیٹی ایوانکا ٹرمپ ہیں جو وائٹ ہاؤس میں ٹرمپ انتظامیہ کی اہم رکن بن گئی ہیں۔ دوسرے نمبر پر پاکستانی وزیراعظم کی بیٹی مریم نواز ہیں (نہ... نہ... نہ بخدا یہ فہرست ہم نے نہیں بنوائی ہے۔ اس لیے...) جنہوں نے 2013ء کے الیکشن میں اپنے والد کی انتخابی مہم میں اہم اور بھرپور

زعم

کم وقت میں زیادہ شہرت حاصل کرنے والے گوہر رشید (ارے بھئی ڈائجسٹ رائٹر اور من مائل کے سخت گیر شوہر!) کی اس سال دو فلمیں آرہی ہیں' یلغار اور رنگریزا۔ اس کے ساتھ ہی گوہر رشید نے اپنی ذاتی پروڈکشن (ہیں... ذاتی... بھئی مطلب... پروڈکشن... اور کیا... گوہر رشید...؟ اچھا...) میں بننے والی فلم میدان کی بھی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔ گوہر رشید نے بہانگ دہل یہ اعلان کیا ہے کہ اس فلم کا مرکزی کردار نعمان اعجاز کے علاوہ کسی سے نہیں کروائیں گے (تو اس میں "بہانگ دہل" اعلان کی کیا ضرورت تھی۔ آرام سے کہہ دیتے۔) کیوں کہ "نومی بھائی" کا یہ کردار صرف نعمان اعجاز ہی کرسکتے ہیں (اچھا...! یعنی حمزہ... فیصل اور آپ کے ہمایوں سعید...؟ اتنے قابل اور اچھے اداکار نہیں جو...؟) گوہر رشید کا مزید کہنا ہے

کردار ادا کیا تھا اور اپنے خاندان کے فلاحی منصوبوں (یا خاندان کے لیے فلاحی منصوبے) کی نگرانی بھی وہی کرتی ہیں۔ کوئی سیاسی عہدہ نہ ہونے کے باوجود سیاسی طور پر بااثر سمجھی جاتی ہیں۔ روسی صدر کی بیٹی کیرینا (ارے بھئی کترینا کیف نہیں۔) تیسرے نمبر پر ہیں۔ ترک صدر کی بیٹی سمیعہ اردوان چوتھے نمبر پر اور انگولا کے سربراہ کی صاحب زادی ازابیل پانچویں نمبر پر ہیں (یعنی ہم امریکا کے پیچھے ہیں؟)

اختیار

بھارت کو اپنا ملک کہنے اور بھارتی شہریت لینے والے عدنان سمیع کہتے ہیں کہ

"بھارتی شہریت لینے سے پہلے میرا پاکستانی پاسپورٹ تجدید کے لیے گیا ہوا تھا اور مجھے یہ پاسپورٹ ملنے میں دیر ہو رہی تھی (بھارت میں تو آپ تھے پھر کہاں جانا تھا جو.....) کسی نے مجھے بتایا (کس نے.....؟) کہ یہ اسلام آباد سے ری نیو نہیں ہو سکتا کیوں کہ اس کی معیاد ہی ختم ہو چکی ہے۔ یہ سن کر میں پریشان ہو گیا۔ کیوں کہ میرے پاس تو کوئی پاسپورٹ ہی نہیں تھا۔ بھارت نے مجھے ریذیڈنسی پرمٹ اور ازائلم (پناہ)

دے دی۔ پھر میں نے بھارتی شہریت کی درخواست دی۔ یہ میرا حق ہے کہ میں جہاں چاہے رہوں (بالکل..... لیکن بھارت.....؟) پوری دنیا اللہ نے بنائی ہے اور انسان کو اختیار ہے کہ وہ جہاں چاہے جا کر رہ سکتا ہے۔ (بالکل لیکن بھارت.....؟) میرا فیصلہ اس بنیاد پر نہیں کیا جا سکتا کہ میں کہاں رہتا ہوں کہاں نہیں۔ (پر بھارت ہی کیوں.....؟) دوسری اہم بات یہ کہ میں اس جگہ رہوں گا جہاں میری صلاحیتوں کو پھلنے پھولنے کا موقع ملے گا۔ (صلاحیتوں سے زیادہ.....؟) دنیا بھر کے ڈاکٹر برطانیہ جا کر پریکٹس کرنا چاہتے ہیں۔" اسی طرح میں نے ممبئی کو اپنے کیریر کے حساب سے زیادہ بہتر پایا تو یہاں رہنے لگا۔

(یہ صفائیاں، یہ وضاحتیں آخر کس لیے عدنان سمیع.....؟)

دکان

گلوکار علی عظمت نے بیالیس سال کی عمر میں شادی کی اور اب ان کی دو بیٹیاں ہیں۔ وہ اپنی گھریلو زندگی سے بہت خوش ہیں۔ علی عظمت کا کہنا ہے کہ "اگر میں بتیس سال کی عمر میں شادی کر لیتا تو میری بیٹیاں

میری اوٹ پٹانگ حرکتیں دیکھ کر کہتیں کہ یہ ہمارے بابا کیا کررہے ہیں (یعنی آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی حرکتیں اوٹ پٹانگ تھیں۔) اچھا ہوا' میری شادی لیٹ ہوئی اور میں نے میوزک کی وجہ سے وہ سب کرلیا جو میں کرنا چاہتا تھا۔"

علی عظمت کا کہنا ہے کہ "وہ اگر گلوکار نہ ہوتے تو پھر قصائی یا بھانڈ ہوتے۔" (ہائیں۔۔۔ علی عظمت۔۔۔ قصائی۔۔۔ یا بھانڈ ویسے انداز تو۔۔۔؟) کیوں کہ نوکری تو وہ کرنے والے نہیں تھے۔ ویسے علی عظمت نے ایک میوزک اسکول کھولا ہے جہاں وہ موسیقی کے شوقین لوگوں کو تعلیم دیتے ہیں۔

فلسفہ

حدیقہ کیانی کا کہنا ہے کہ میں نے شہرت کو کبھی سر پر سوار نہیں کیا۔ میری والدہ نے مجھے سمجھایا تھا کہ پاؤں اگر زمین سے لگے رہیں تو زمین سے محبت کا احساس ہوگا' شہرت آنی جانی چیز ہے۔ سورج سے بڑی کوئی چیز نہیں (یہ ہمارا نہیں حدیقہ کا خیال ہے۔) سورج کو بھی غروب ہونا ہوتا ہے۔ پھر وہ طلوع ہوتا ہے۔ یہی زندگی ہے (اف۔۔۔) دنیا کی کوئی چیز ہمیشہ اوپر نہیں رہتی وہ نیچے ضرور آتی ہے (فلسفہ۔۔۔؟) اس لیے میں نے اس سے کبھی پیار نہیں کیا۔ (تو پھر کس سے۔۔۔؟) کائنات' صبح' دوپہر' شام اور رات کے گرد ہے۔ صبح آپ کا بچپن' دوپہر آپ کا لڑکپن' شام آپ کی نوجوانی اور رات آپ کا بڑھاپا ہے۔ یہی سچ اور حقیقت ہے۔

(زندگی کے فلسفے پر اتنی ریسرچ۔۔۔؟)

کچھ ادھر ادھر سے

☆ کل بھوشن کوئی پہلا آدمی نہیں ہے' برسوں قبل بھارتی ایجنسی "را" نے رویندر کوشک نامی تھیٹر کے اداکار کو جاسوسی کے لیے بھرتی کیا تھا' اسے دو سال ٹریننگ دی اور پھر بدامنی پھیلانے کے لیے 1975ء میں صرف 23 سال کی عمر میں پاکستان بھیج دیا۔ ملزم نے نبی احمد شاکر کے نام سے داخلہ لیا اور گریجویشن کرنے کے بعد پاک فوج میں کمیشنڈ آفیسر کے طور پر شمولیت حاصل کی اور ترقی پاکر میجر کے عہدے پر فائز ہوگیا۔ 1979ء سے 1983ء کے دوران ملزم "را" کو حساس معلومات فراہم کرتا رہا' تاہم پاک فوج نے ایک بھارتی جاسوس کو گرفتار کیا جس نے رویندرا کوشک کے عزائم کو بھی بے نقاب کردیا اور پھر 1983ء میں اسے بھی گرفتار کرلیا گیا۔ یہ پاکستانی جیل میں 16 سال قید رہا اور 2001ء میں ٹی بی کے مرض کی وجہ سے ملتان جیل میں مرگیا۔ اسے اردو اور پنجابی سکھا کر اور یہاں کی بود و باش کی بہت اعلا تربیت دے کر بھیجا گیا تھا۔ وہ یہاں سے کافی معلومات بھارت بھیجنے میں کامیاب رہا تھا۔ رویندرا کو موت کی سزا سنائی گئی تھی تاہم بعد میں سپریم کورٹ آف پاکستان نے اسے عمر قید میں تبدیل کردیا تھا۔

(4 اپریل' فرائیڈے اسپیشل کی رپورٹ)

☆ ہاں' یہ دنیا کی زندگی۔۔۔ ہم انسان بہتر انسان بننے اور بنانے اور تربیت و تعمیر کے مراحل سے گزرتے' دکھ اور اذیتیں بھوگتے کیا سے کیا بن جاتے ہیں' اچھے بن کر بھی پوری طرح اچھے نہیں رہتے۔ یہی ہے انسانی زندگی۔۔۔ یہی ہے انسانی تقدیر۔ کسی سے کیا شکوہ۔۔۔ اور کیا کسی کی شخصیت کا تجزیہ۔ رہے نام اللہ کا۔

(ڈاکٹر طاہر مسعود)

☆ مسئلہ سارا یہ ہے کہ اس طرح کے احمقانہ منصوبے اس لیے بنائے جاتے ہیں کہ کوئی بھی دیانت دار' شریف آدمی آنکھ بند کرکے جائز اور ناجائز احکامات کی تعمیل نہیں کرتا سو جرائم پیشہ' فتنہ ساز' چڑی مار' چرب زبان' لنگڑے' ٹیڑھے اور کانے جمع کرکے ایک غول بیابانی تیار کیا جاتا ہے۔

(وقائع نگار خصوصی۔ امت)

خالدہ جیلانی

چائنیز رول

ضروری اشیاء :

چکن	ایک پاؤ (بون لیس)
نمک ' سیاہ مرچ پاؤڈر	حسب ذائقہ
ہری پیاز	ایک پاؤ
بند گوبھی	ایک عدد
لہسن پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	1/4 چائے کا چمچہ
اجوائن	1/4 چائے کا چمچہ
ادرک پیسٹ	1/2 کھانے کا چمچہ
رول پٹیاں	حسب ضرورت
تیل	فرائنگ کے لیے

ترکیب :

پتیلی میں گوشت ' پانی ' لہسن پیسٹ ' ہلدی پاؤڈر ' اجوائن ' ادرک پیسٹ اور نمک ڈال کر ابال لیں۔

ابلے ہوئے گوشت کے ریشے کرلیں۔

بند گوبھی اور ہری پیاز کو باریک چوپ کر کے گوشت میں شامل کریں۔ ضرورت محسوس ہو تو مزید نمک اور سیاہ مرچ پاؤڈر شامل کر کے اس آمیزے کو رول کی پٹیوں میں بھر کر گیلے آٹے سے رول کے کھلے ہوئے کناروں کو سیل کر کے گرم تیل میں درمیانی آنچ پر ڈیپ فرائی کریں۔

گولڈن براؤن ہونے پر سرونگ ڈش میں نکال کر کیچپ یا چٹنی کے ساتھ سرو کریں۔

کھٹے میٹھے کالے چھولے

ضروری اشیاء :

کالے چھولے	ایک پاؤ (ابلے ہوئے)
[illegible]	حسب ضرورت
تیل	تین کھانے کے چمچے
پیاز (سلائس کاٹ لیں)	دو عدد
لال مرچ (کٹی ہوئی)	ایک چائے کا چمچہ
زیرہ (کٹا ہوا)	ایک کھانے کا چمچہ
لہسن (کٹا ہوا)	ایک چائے کا چمچہ
املی کا گودا	حسب پسند
چینی	ایک چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا ' ہری مرچیں	حسب پسند

ترکیب :

ایک پین میں تیل گرم کریں۔ لہسن اور پیاز ساتے فرائی کریں۔ کٹی لال مرچ ' نمک ' زیرہ ' چینی ' چھولے ' املی ' ہرا دھنیا اور ہری مرچ ڈال کر مکس کریں اور 5 منٹ دم پر رکھ دیں۔ پلیٹ میں نکال کر ہرے دھنیے سے گارنش کر کے سرو کریں۔

چیز پوٹیٹو بالز

ضروری اشیاء :

آلو (ابال لیں)	آدھا کلو
کاٹیج چیز	ایک کپ
سیاہ مرچیں (کٹی ہوئی)	آدھا چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا (چوپ کیا ہوا)	آدھا کپ
ہری مرچیں	تین عدد (چوپ کرلیں)
بریڈ کرمبز	1 کپ
انڈا	ایک عدد (پھینٹ لیں)
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

پیالے میں آلو ' کاٹیج چیز ' نمک ' کٹی ہوئی سیاہ مرچیں ہرا دھنیا ' ہری مرچیں ' بریڈ کرمبز اور انڈا ڈال کر مکس

کر کے تھوڑی دیر فریج میں رکھیں پھر اس آمیزے سے بالز بنالیں۔

کڑاہی میں تیل گرم کر کے درمیانی آنچ پر انہیں فرائی کریں، سنہری ہو جائیں تو ٹشو پیپر پر نکال لیں۔
سرونگ پلیٹ میں رکھ کر حسب پسند چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

چکن جنجر کڑاہی

ضروری اشیاء:

مرغی کا گوشت	آدھا کلو
پیاز (باریک چوپ کرلیں)	ایک عدد
ٹماٹو پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
لہسن پیسٹ	1/4 چائے کا چمچہ
ادرک پیسٹ	1/4 چائے کا چمچہ
دہی	دو کھانے کے چمچے
ادرک (سلائس کاٹ لیں)	1 انچ کا ٹکڑا
کڑاہی مسالا	ایک کھانے کا چمچہ
ہری مرچیں (چوپ کرلیں)	سجاوٹ کے لیے
ہرا دھنیا (چوپ کرلیں)	سجاوٹ کے لیے
تیل	حسب ضرورت
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب:

کڑاہی میں تیل گرم کر کے پیاز نرم کرلیں۔ اس میں گوشت ڈال کر فرائی کریں۔ لہسن پیسٹ، ادرک پیسٹ، دہی، ٹماٹو پیسٹ، کڑاہی مسالا اور نمک شامل کر کے ڈھکن ڈھک کر گوشت گلالیں اور بھون لیں۔
تیل اوپر آجائے تو ہرا دھنیا، ہری مرچیں اور ادرک ڈال کر دو منٹ دم پر رکھ دیں اور سرونگ پلیٹ میں نکال کر گارنش کر کے پراٹھے / چپاتی کے ساتھ سرو کریں۔

لاہوری فرائی مچھلی

اشیاء:

سرمئی مچھلی	ایک کلو
بیسن	آدھا کپ
ادرک لہسن کا پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
لال مرچ پاؤڈر	دو چائے کے چمچے
اجوائن	آدھا چائے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
املی کا رس	حسب پسند
میتھی دانہ	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	آدھا چائے کا چمچہ

ترکیب:

مچھلی کو نمک لگا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پھر اچھی طرح دھو کر املی کا رس، اجوائن، میتھی دانہ، ہلدی، نمک، ادرک، لہسن کا پیسٹ اور لال مرچ پاؤڈر ڈال کر مکس کریں اور تقریباً "ایک گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔
کڑاہی میں تیل گرم کر کے مچھلی کے مسالے لگے ٹکڑوں کو گولڈن براؤن ہونے تک فرائی کریں۔

منی چکن پیزا بائٹس

(بغیر اوون کے پیزا بنائیں) اشیاء ڈو کے لیے:

میدہ	آدھا کلو
سوکھا دودھ	دو چمچے
چینی	دو چمچے
نمک	آدھا چائے کا چمچہ
انڈے	دو عدد
گھی	دو چمچے
پانی	حسب ضرورت
خمیر	ایک کھانے کا چمچہ

فلنگ کے لیے اشیاء:

چکن (ابلی، ریشہ کی ہوئی)	ایک کپ
کٹی پیاز	تین کھانے کے چمچے
لہسن کا پیسٹ	آدھا چائے کا چمچہ
کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
بھنا اور پسا زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
کٹی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
ٹماٹو پیوری	دو کھانے کے چمچے

نمک	آدھا چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا	دو کھانے کے چمچے
کٹی ہوئی ہری مرچ	تین عدد
چیڈر موزریلا چیز	حسب پسند

ترکیب :

خمیر کو پندرہ منٹ کے لیے پانی میں پھولنے کے لیے رکھ دیں۔ میدہ ' نمک ' سوکھا دودھ ' گھی ' چینی اور خمیر ملا کر پانی سے گوندھ لیں۔ پھر اسے تین سے چار گھنٹے کے لیے کسی گرم جگہ پر کپڑے سے ڈھانپ کر رکھ دیں۔ اتنا کہ یہ پھول کر دگنا ہو جائے۔

اب فلنگ بنانے کے لیے ایک ساس پین میں گھی گرم کر کے اس میں تین کھانے کے چمچے ' کٹی پیاز ' آدھا چائے کا چمچہ لہسن کا پیسٹ ' ایک چائے کا چمچہ کالی مرچ دو کھانے کے چمچے ٹماٹو پیوری آدھا چائے کا چمچہ ' نمک دو کھانے کے چمچے ہرا دھنیا اور تین عدد کٹی ہوئی ہری مرچ کو ایک کپ ابلی اور ریشہ کی ہوئی چکن کے ساتھ ڈال کر دس منٹ کے لیے پکائیں۔ یہاں تک کہ وہ تیار ہو جائے۔ پھر اسے نکال کر ٹھنڈا کر لیں۔

اب ڈو کو دبا کر اس کے چھوٹے پیڑے بنا لیں۔ ہر ہر پیڑے کو دبا کر اس میں فلنگ بھریں اس کے بعد پنیر ڈالیں اب اسے ڈھک کر رکھ دیں۔ پھر اس پر انڈا برش کریں اور چولہے پر توا گرم کرنے رکھ دیں جب سیدھا توا خوب گرم ہو جائے تو آنچ ہلکی کر دیں اور اس پر اسٹیل کی پلیٹ الٹی کر کے رکھ دیں اور کسی ڈھکن پر یا پلیٹ میں پیزا رکھ کر الٹے توے یا کسی دیگچی سے ڈھک دیں پانچ منٹ بعد نکال لیں۔

آپ اس کو ہلکی آنچ پر ڈیپ فرائی بھی کر سکتی ہیں۔

چکن نگٹس

اشیاء :

چکن (کیوبز میں کٹی ہوئی)	آدھا کلو
سویا ساس	کھانے کے دو چمچے
بریڈ کرمز	ایک پیالی
انڈا	ایک عدد
مسٹرڈ پاؤڈر	چائے کا ایک چمچہ
دکنی مرچ	چائے کا ایک چمچہ
میدہ	ایک پیالی
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

چکن کی بوٹیوں میں نمک ' مسٹرڈ پاؤڈر ' سویا سوس ' دکنی مرچ ملا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ میدہ بیسن کی طرح گھول لیں۔ انڈا پھینٹ لیں۔ مرغی کی بوٹیاں پہلے میدے میں پھر انڈے میں ڈبو دیں۔ آخر میں بریڈ کرمبز (ڈبل روٹی کا چورا) لگا کر تل لیں۔

وان تون

اشیاء :

مرغی (بغیر ہڈی کا گوشت) ایک پاؤ
(ابال کر چھوٹے چوکور ٹکڑے کر لیں)

ہری پیاز	دو ڈنڈیاں
انڈہ	ایک عدد
پسا ہوا لہسن	ایک چائے کا چمچہ
کٹی ہوئی کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
سویا ساس	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب :

پیالے میں میدہ ' انڈے اور نمک ڈال کر سخت آٹا گوندھ کر تھوڑی دیر کے لیے رکھنے کے بعد چوکور روٹی بیلیں اور اس روٹی کے چھوٹے چوکور ٹکڑے کاٹ لیں۔ بلینڈر میں مرغی کے ٹکڑے لہسن ______ نمک ' سویا ساس ' کالی مرچ ____ اور ہری پیاز ڈال کر یکجان کر لیں۔

اس آمیزے کو چوکور پٹیوں کے درمیان رکھیں اور چاروں طرف سے لپیٹ کر پوٹلی بنائیں اور کناروں کو انڈہ لگا کر بند کر لیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کر کے وانٹون اس میں سنہری کر کے پلیٹ میں نکال لیں۔ اور کیچپ کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

امتُ الصبور

1707ء میں اورنگ زیب نے وفات پائی۔ اس کے بتیس برس بعد محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں نادر شاہ افشار شاہِ ایران نے برصغیر پر حملہ کیا اور مغلیہ سلطنت کا عظیم الشان قصر دھڑام سے زمین پر آگرا۔ اودھ میں نواب وزیر' دکن میں نظام الملک اور بنگال' بہار' اڑیسہ میں نواب مرشد قلی خان نے خود مختار حکومتیں قائم کرلیں۔ اس ابتری سے فائدہ اٹھا کر پرتگالیوں' ولندیزیوں' انگریزوں اور فرانیسیوں نے ہندوستان کے ساحلوں پر اپنی تجارتی کوٹھیاں مضبوط بنالیں۔

نواب مرشد قلی خان نے دریائے گنگا کے کنارے مرشد آباد کا شہر آباد کیا اور اسے اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ اس کے بعد علی وردی خاں اس کا جانشین ہوا۔ وہ بڑا بے دار مغز حکمران تھا۔ اس نے مسلمان تاجداروں کی روایتی رواداری کام میں لاتے ہوئے اپنی غیر مسلم رعایا سے کمال مہربانی کا برتاؤ کیا اور انہیں اعلا مناصب عطا کیے۔ نوابان بنگال کے حسن انتظام سے بنگال جنتِ ارضی کہلانے لگا۔

شہر مرشد آباد کی آبادی اس زمانے کے لندن' پیرس اور برلن کی مجموعی آبادی سے بھی زیادہ تھی۔ ان دنوں لندن ایک غلیظ قصبہ تھا جس کی گلیوں میں کیچڑ اور گندا پانی جمع رہتا تھا۔ اندھیری راتوں میں گلی کوچوں میں روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا اور ہر لحہ کسی ڈکیت سے سامنا ہونے کا خطرہ موجود رہتا۔ اس کے برعکس مرشد آباد میں صفائی کا باقاعدہ انتظام تھا اور راتوں کو گلیوں اور بازاروں میں روشنی ہوتی تھی۔ بنگال' بہار' اڑیسہ میں اس کے علاوہ بیسیوں اور شہر اور ہزاروں پر بہار قصبات اور دیہات تھے' جہاں عوام امن' چین سے زندگی بسر کرتے تھے۔ بچوں کی تعلیم کے لیے جابجا باقاعدہ مکتب قائم تھے' جہاں تعلیم مفت دی جاتی اور تمام اخراجات نواب اپنی گرہ سے ادا کرتا۔

بنگال' بہار کی زمین ہمیشہ سے کمال زرخیز اور بار آور ہے۔ تمام زرعی زمین کسانوں کی ملکیت تھی اور وہ اپنی محنت اور جانفشانی کا پورا پورا معاوضہ حاصل کرتے۔ سرکاری لگان پیداوار کے مقابلے میں بہت کم تھا۔ ملک میں جاگیردار بھی تھے اور وہ زمیندار کہلاتے تھے' مگر ان کے علاقوں میں زرعی زمین کسانوں کی ملکیت تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ جاگیروں میں کسان مالیت جاگیردار کو ادا کرتے اور وہ اس میں سے ایک خاص رقم نذرانے کے طور پر نواب کو دیتا۔

نواب مرشد قلی نے اپنی نوابی کے زمانے میں شہر پناہ کے باہر آٹھ دس برس کا ایک خستہ حال لڑکا دیکھا۔ نواب کو اس پر بے حد ترس آیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ صحیح النسب سید زادہ ہے اور یتیم ہے۔ نواب اسے اپنے محل میں لے آیا۔ خاص اہتمام سے اس کی پرورش کی اور تعلیم کا مناسب انتظام کیا۔ اس لڑکے کا نام میر جعفر تھا۔ میر جعفر نے اپنی چرب زبانی اور عیاری سے نواب کے دل میں گھر کرلیا اور نواب نے اس سے اپنی ایک بیٹی کی شادی کردی۔ میر جعفر انجام کار اس خاندان کے لیے خارِ رگ جان ثابت ہوا۔

نواب مرشد قلی کا بیٹا علی وردی خاں اولاد نرینہ سے محروم تھا۔ چار بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے ایک نواب ہیبت جنگ گورنر بہار کی بیوی تھی۔ مرہٹوں نے اس علاقے پر بھرپور حملہ کیا۔ نواب ہیبت جنگ نے انہیں دندان شکن شکست دی' مگر وہ خود بھی میدان جنگ کے رنگین بستر پر ابدی نیند سو گیا۔ علی وردی خاں اپنی بیوہ

بٹی اور خرد سال نواسے محمد مرزا کو مرشد آباد لے آیا اور اپنی غمزدہ بیٹی کی دلجوئی کے لیے اسے اپنا ولی عہد مقرر کردیا۔ راجہ جانکی داس، محمد مرزا کا اتالیق مقرر ہوا اور اس نے ایک قلیل عرصے میں سب مروجہ علوم اور فنون سپہ گری میں کمال حاصل کرلیا۔ ان دنوں محمد ایرج مرزا بنگال کا سب سے بڑا زمیندار تھا جو منصور گنج میں مقیم تھا۔

علی وردی خاں نے محمد مرزا کا مستقبل روشن تر اور محفوظ تر بنانے کے لیے اس کی شادی ایرج مرزا کی بیٹی بہو بیگم سے کردی۔ دولت کی ریل پیل، جاہ و جلال کی نمائش اور بے جا لاڈ پیار نے بہو بیگم کو بد مزاج بنادیا۔ وہ اپنے آپ کو ایک عظیم باپ کی بیٹی سمجھتی، اس لیے میاں بیوی میں نہ بن سکی۔

ایک سال گزر گیا۔ ایک دن سیر و شکار کے سلسلے میں محمد مرزا گنگا کنارے بہت دور چلا گیا۔ شہزادہ تھکن اور پیاس محسوس کررہا تھا۔ دریا کے کنارے ایک وسیع اور خوب صورت باغ تھا۔ موسم بہار کا آغاز تھا اس لیے آموں کے درختوں پر بور آیا ہوا تھا جس کی خوشبو سے ہوا بوجھل ہورہی تھی۔ باغ کے گرد ایک خوب صورت چار دیواری تھی اور پھاٹک پر عشق پیچاں کی بیلیں اپنی بہار دکھا رہی تھیں۔ محمد مرزا باغ میں داخل ہوگیا۔ روشوں کے ارد گرد گلاب، جوہی اور موتیے کے پھول کھلے ہوئے تھے۔

پھاٹک کے قریب اس نے ایک پرشباب لڑکی دیکھی، جو بے خیالی میں پھول چن رہی تھی۔ محمد مرزا نے اسے ایک نظر دیکھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا موسم بہار کی تمام رعنائیوں اور رنگینیوں نے سمٹ کر ایک انسان کی شکل اختیار کرلی ہے۔ صانع ازل کی دلکش صنعت دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ اتنے میں ایک ملازم ادھر آنکلا۔ محمد مرزا نے اس سے تھوڑا سا پانی طلب کیا۔ وہ شہزادے کی وجاہت اور شخصیت سے متاثر ہوچکا تھا، اس لیے فوراً" خوشبودار لذیذ شربت کا ایک جام لے آیا۔

تھوڑی دیر کے بعد محمد مرزا مرشد آباد میں اپنے محل میں واپس پہنچ گیا، مگر اس کا سکون قلب چھن گیا تھا۔ قصہ مختصر محمد مرزا کی والدہ اس باغ والے کے پاس گئیں اور اپنے بیٹے کے لیے اس کی بیٹی کا رشتہ طلب کیا اور چند ماہ کے بعد محمد مرزا اسے باقاعدہ دلہن بنا کر اپنے محل میں لے آیا اور لطف النساء کا خطاب دیا۔

☆ ☆ ☆

1756ء میں نواب علی وردی خاں نے وفات پائی اور محمد مرزا سراج الدولہ کے نام سے مرشد آباد میں تخت نشین ہوا۔ میر جعفر، علی وردی خاں کا پھوپھا تھا۔ خاندان میں سب سے بزرگ تھا اور افیون بکثرت استعمال کرتا۔ دل پھینک اور عیاش تھا، مگر کمال عیار اور مکار بھی۔ خدا جانے کس مصلحت کی بنا پر سراج الدولہ کے مشیروں نے فوج کا محکمہ اس کے سپرد کردیا۔

یہ ایک دلخراش حقیقت ہے کہ مغلوں کے آخری دور میں فوج کا محکمہ نظر انداز کردیا گیا تھا۔ فوج کے پاس کارآمد اور جدید اسلحہ برائے نام تھا۔ سپاہی فرصت کے وقت تیر اندازی کی مشق کرتے۔ بندوقیں اور توپیں اگر تھیں بھی تو افادیت کے لحاظ سے قریباً بے کار۔

میر جعفر کنبے میں سب سے بڑا ہونے کی حیثیت سے اپنے آپ کو تخت شاہی کا حقدار سمجھتا تھا۔ نواب سراج الدولہ کی عمر اس وقت صرف سترہ سال تھی۔ اس کی نوعمری اور ناتجربہ کاری سے فائدہ اٹھا کر میر جعفر نے جوڑ توڑ اور سازشوں کا چکر چلانا شروع کردیا۔

اسی برس یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں جنگ ہفت سالہ چھڑ گئی۔ بنگال میں فورٹ ولیم کلکتہ کے مقام پر انگریزوں کی تجارتی کوٹھیاں تھیں اور قریب ہی چندر نگر میں فرانسیسیوں کی تجارتی نو آبادی تھی۔ انگریزوں نے چندر نگر میں شب خون مار کر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ اس کے بعد دونوں جانب جنگ کی تیاریاں شروع

ہو گئیں۔ انگریزوں نے کلکتے اور فرانسیسیوں نے چندر نگر میں قلعہ بندیاں تعمیر کر کے دمدموں پر توپیں چڑھادیں۔

نواب سراج الدولہ نے حکماً انہیں ایسا کرنے سے منع کیا۔ فرانسیسیوں نے اس کے حکم کی تعمیل کی، مگر انگریزوں نے انکار کر دیا۔ اس پر نواب کی فوج کے ایک دستے نے کلکتے کی طرف پیش قدمی شروع کردی۔ جب فورٹ ولیم کے گورنر کو نواب کی فوج کے آنے کی اطلاع ملی تو وہ دوسرے تمام انگریزوں سمیت ایک بحری جہاز میں بیٹھ کر وہاں سے دور چلا گیا۔ نواب کی فوج نے قلعہ بندیاں توڑ دیں اور واپس چلی آئی۔ نواب کے احکام کے مطابق انگریزوں کے ساز و سامان میں سے تنکا بھر بھی نقصان نہ ہوا۔ نواب کی فوج واپس چلی گئی تو انگریز فورٹ ولیم میں واپس آگئے۔

مرشد آباد میں دیوان کشن چند شاہی ملازمین میں سے تھا۔ اس نے کچھ سرکاری رقم غبن کرلی اور پوشیدہ طور پر انگریزوں کے پاس فورٹ ولیم چلا گیا۔ اس کے کچھ اقرباء حیدر آباد دکن میں با اختیار مناصب پر فائز تھے۔ کلکتے کے انگریز گورنر نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ پوشیدہ طور پر اسے مدراس بھجوادے گا جہاں سے اس کے لیے حیدر آباد جانا ممکن ہوگا۔ کلائیو کلکتے آیا تو اس نے دیوان کشن چند سے ملاقات کی۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ میر جعفر جوڑ توڑ میں مصروف ہے۔

جب سراج الدولہ لطف النساء کو اپنی دلہن بنا کر محل میں لے آیا تو اس نے چند روز میں اپنے حسن صورت اور حسن اخلاق سے سب کے دلوں میں گھر کرلیا۔ اس کی سوکن یعنی ایرج مرزا کی بیٹی، بہو بیگم اس کی مقبولیت دیکھ کر حسد کے مارے جل کر کباب ہوگئی اور منصور گنج چلی گئی۔ ایرج مرزا بظاہر خاموش تھا مگر اس کے دل میں سراج الدولہ کے لیے نفرت اور حقارت کا ایک سمندر موجزن تھا۔ میر جعفر نے پوشیدہ طور پر اس سے ملاقات کی اور اس نے لگی لپٹی رکھے بغیر صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ سراج الدولہ کا کٹا ہوا سر دیکھنے کے لیے کروڑوں روپے خرچ کرنے پر آمادہ ہے۔

دیوان کشن چند نے رابرٹ کلائیو کو ایرج مرزا کے خطرناک ارادوں سے بھی آگاہ کیا۔ کلائیو انتہا درجے کا مکار اور عیار تھا۔ وہ کرناٹک میں نواب محمد علی کو آلہ کار بنا کر برصغیر میں انگریزی سلطنت کی بنیاد رکھ چکا تھا اور بنگال کو بھی سازشوں کے تیر سے شکار کرنا چاہتا تھا۔ میر جعفر اور اس کے حواریوں سے خفیہ طور پر ایک معاہدہ کیا گیا، جنگ کے اخراجات ایرج مرزا نے ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ سازش میں سراج الدولہ کا ایک سالار دورلبھ اور ہندو ساہوکار جگت سیٹھ اور ارمی چند پیش پیش تھے۔

اب کلائیو نے نواب کے دربار میں ایک شکایت نامہ بھیجا۔ اور جواب کا انتظار کیے بغیر ڈھائی ہزار انگریزی فوج نے مرشد آباد کی طرف پیش قدمی شروع کردی اور پلاسی کے مقام پر آموں کے ایک باغ میں مورچہ بندی کرلی۔ نواب نے میر جعفر کو دشمن کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا اور خود بھی اپنے محافظ دستے کے ہمراہ میدان جنگ میں پہنچ گیا۔ انگریزوں کی فوج نے نواب کے محافظ دستے پر حملہ کردیا۔ اس نے میر جعفر کو پیغام بھیجا، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور الگ تھلگ رہ کر تماشا دیکھتا رہا۔ شاہی محافظ دستے کی تعداد چند سو تھی۔ اس کا سالار میر مدن بڑی بہادری سے لڑا مگر مارا گیا۔ اس کے بعد محافظ دستے کے سپاہی پسپا ہونے شروع ہوگئے۔ یہ جنگ 23 جون 1757ء کو لڑی گئی۔

نواب سراج الدولہ، میر جعفر کے ارادے بھانپ چکا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ بنگال کے شمالی اور مغربی اضلاع میں جا کر اپنی نئی فوج بھرتی کرے اور دشمن کے منصوبے خاک میں ملادے، وہ اس جال سے بے خبر تھا جو اس کے دشمنوں نے اس کی گرفتاری کے لیے بچھا رکھا تھا۔

پلاسی کے میدان میں پسپا ہو کر سادہ دل نواب، منصور گنج میں اپنے خسر ایرج مرزا کے پاس چلا گیا اور

ان سے امداد کا طالب ہوا۔ ایرج مرزا نے بظاہر ہم دردی کا اظہار کیا اور باتوں باتوں میں سراج الدولہ کے آئندہ پروگرام کی تفصیلات معلوم کرلیں۔ نواب کا ارادہ تھا کہ وہ پہلے مرشد آباد جائے۔ وہاں سے اپنے کنبے کے افراد ہمراہ لے کر عظیم آباد (پٹنہ) پہنچے اور شمال مغربی اضلاع سے فوج بھرتی کرے۔ ایرج مرزا نے میر جعفر کو نواب کے ارادوں سے آگاہ کردیا اور جب وہ کنبے کے ہمراہ بہرال کے مقام پر پہنچا تو اسے گرفتار کر کے مرشد آباد لایا گیا۔ جائے حیرت ہے کہ علی وردی خان کی فوج نے اس کی اعانت کے لیے انگلی تک نہ ہلائی اور میر جعفر کے پردے میں انگریزوں کی سیادت کو تسلیم کرلیا۔

میر جعفر کے بیٹے میرن نے سراج الدولہ کو زنجیروں سے جکڑ کر دربار میں پیش کیا اور وہاں اسے موت کی سزا کا حکم سنا گیا۔ سراج الدولہ کو ایک تنگ و تاریک کوٹھی میں بند کردیا گیا۔ میر جعفر کے سب ملازموں نے سراج الدولہ کو قتل کرنے سے معذوری کا اظہار کیا مگر محمد بیگ، جو علی وردی خاں کے خوانِ کرم پر پلا تھا، اور سراج الدولہ کا بھی شرمندۂ احسان تھا۔ اسے خاک و خون میں نہلانے کے لیے تیار ہوگیا۔ رات کا وقت تھا۔ محمد بیگ شمشیر بکف قید خانے میں داخل ہوا۔ سراج الدولہ نے تھوڑی سی مہلت طلب کی، وضو کیا اور نماز دوگانہ ادا کی۔ اس کے بعد محمد بیگ نے تلوار کا بھرپور ہاتھ مارا اور سراج الدولہ نے شہادت کی سعادت حاصل کرلی۔

سراج الدولہ کی شہادت کے بعد اس کی لاش ہاتھی پر رکھ کر مرشد آباد کے بازاروں اور گلی کوچوں میں اس کی نمائش کی گئی۔ لاش والا ہاتھی علی وردی خاں کے محلات کے سامنے سے گزرا تو اس خاندان کی تمام پردہ نشین خواتین نوحہ کناں محل سے باہر نکل آئیں۔ البتہ اس روز بہو بیگم کے ہاں جشن منایا گیا اور رات کو چراغاں ہوا۔

جرمِ بے گناہی میں جان دینے والے تاجدار کی لاش بازاروں میں پھرانے کے بعد شہر پناہ سے الٹی لٹکادی گئی۔ ادھر میر جعفر کا بیٹا دیر سے لطف النساء کے بے مثال حسن و جمال کی تعریف سن رہا تھا۔ اس نے اس غم نصیب کو اسی روز شادی کا پیغام بھیج دیا۔ عفت شعار لطف النساء نے کمال بے باکی سے جواب میں کہلا بھیجا۔

”جو سنہری ہودج میں بیٹھ کر ہاتھی کی سواری کا عادی ہو وہ گدھے کی سواری سے انتہائی نفرت کرتا ہے۔“

لطف النساء کے بال اور دانت بے حد حسین تھے۔ اس نے قینچی سے اپنے تمام بال کاٹ دیے اور ایک پتھر لے کر اس سے اپنے تمام آبدار دانت توڑ کر پھینک ڈالے۔ اس نے پھٹے پرانے بدنما کپڑے پہن لیے اور اپنے زر و جواہر کا صندوقچہ لے کر میر جعفر کے دربار میں پہنچی۔ اس کے زیورات اور جواہرات کی قیمت پچاس لاکھ روپے سے زیادہ تھی۔ میر جعفر نے وہ تمام جواہرات اور زیورات لے لیے اور ان کے عوض اس کے شوہر سراج الدولہ کی لاش اسے دے دی۔

لطف النساء نے اپنے شوہر کی لاش اسی باغ میں دفن کی جہاں پہلے پہل ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ اس وقت لطف النساء کی عمر سولہ برس کی تھی۔ اس واقعے کے بعد وہ تینتیس برس تک زندہ رہی، مگر دن رات کسی حصے میں بھی وہ اپنے خاوند کی قبر سے جدا نہ ہوئی۔ رات کو قبر کے تعویز پر سر رکھ کر سوتی۔ 1770ء میں وہ ایک دن حسب معمول اپنے خاوند کی قبر کے پاس بیٹھی تھی کہ اس کے دل کی حرکت بند ہوگئی اور اس کی روح عالم بالا میں اپنے شہید شوہر سے جا ملی۔

میر جعفر راج سنگھاسن کے لیے صرف ایک بوجھ تھا اور بس۔ جب وہ اپنا جمع جتھا اور نوابانِ بنگال کا تمام خزانہ انگریز مرد عورتوں کی نذر کرچکا تو کلائیو نے اسے دودھ کی مکھی کے مانند نکال کر پھینک دیا۔ میر جعفر کا داماد میر قاسم بڑا متمول تھا۔ اس کی دولت پر ہاتھ صاف کرنے کے لیے کلائیو نے اسے نواب کی گدی پر بٹھادیا۔ میر قاسم اپنے خسر کی طرح کاٹھ کا الو نہیں تھا۔

وہ حقیقی اختیارات چاہتا تھا' اس لیے اس کا انگریزوں کے ساتھ ٹکراؤ ہو گیا' مگر گانوں کی منافقت اور بے وفائی اور بے گانوں کی سینہ زوری سے جنگ بکسر میں وہ قید حیات سے چھوٹ گیا۔ بے غیرت میر جعفر پھر نواب بن بیٹھا اور تاریخ نے اسے "کلائیو کا گدھا" قرار دیا۔

1729ء میں کلائیو نے مغل تاجدار شاہ عالم سے بنگال' بہار کی دیوانی لے لی اور یہ صوبے قانونی طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ اقتدار میں آ گئے۔ اس کے بعد کلائیو نے اعلان کیا کہ بنگال' بہار کی تمام زرعی اور غیر زرعی زمین قانون کے مطابق ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملکیت ہے اور کھیتی باڑی کے لیے ٹھیکے پر حاصل ہو سکتی ہے۔ ٹھیکہ سب سے زیادہ بولی پر ایک سال کے لیے دیا جائے گا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ایک ایک کھیت کا ٹھیکہ نیلام کیا جائے۔ اس لیے پندرہ پندرہ' بیس بیس دیہات کا ٹھیکہ بیک وقت نیلام کیا جاتا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس اقدام سے کسانوں کی قسمت سربمہر ہو گئی' کیونکہ ان میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں تھا کہ بولی دینے والوں کے گروہ میں شرکت کر سکے۔ دو تین سو دیہات کی زرعی زمین کا ٹھیکہ حاصل کرنے کے لیے ایک اچھی خاصی معقول رقم کی ضرورت تھی۔ مسلمان امراء اور زمیندار عام طور پر لکھ لٹ تھے اور مستقبل کا سوچنا ان کی فطرت میں نہ تھا۔ اس موقع پر ہندو بنیے اور ساہو کار میدان عمل میں کود پڑے اور انہوں نے بنگال' بہار کی اسی فیصد سے زیادہ زرعی اراضی کا ٹھیکہ لے لیا۔ یوں زمینوں کے مالک محض مزارعے بن کر رہ گئے۔ ٹھیکے دار انہیں کسی بھی وقت بے دخل کر سکتا تھا اور ان کی محنت کا پھل اب اسے مل رہا تھا۔

ابتدا میں ٹھیکہ ایک سال کے لیے ملتا تھا۔ گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز (1778ء تا 1782ء) کے عہد میں بنگال' بہار کی زرعی اور غیر زرعی زمینوں کا ٹھیکہ حسب معمول نیلام کیا گیا تو ہندو ساہو کاروں اور بنیوں نے سینکڑوں دیہات فی ایکڑ بالکل معمولی مالیے کے عوض حاصل کر لیے۔ اس کے بعد کارنوالس نے ایک سرکاری اعلان کی رو سے ٹھیکے داروں کو مالکانہ حقوق دے دیے۔ اس بندوبست کو تاریخ میں بندوبست دوامی کہا جاتا ہے۔ اس سے انگریزوں کو متعدد وفادار ساتھی مل گئے' مگر بنگال کے کسانوں کی روایتی خوش حالی بالکل ختم ہو گئی۔ اب وہ دن رات محنت کرتے اور ان کی جانفشانی کا پھل وہ ساہو کار اور بنیے کھاتے جو اس وقت زمیندار یا راجہ کہلاتے تھے۔

سراج الدولہ کی شہادت کے چالیس سال بعد ایک انگریز سیاح الیشلے بنگال میں آیا۔ وہ لکھتا ہے۔ "بنگال کے ہندو اور مسلمان بوڑھے کسان جب "سراج" کا نام سنتے ہیں تو ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں اور جب وہ "سراج" کے عہد میں کسانوں کی خوشحالی کے واقعات سناتے ہیں تو ان کے بیٹوں اور پوتوں کو یقین نہیں آتا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔"

☼

موسموں کی تبدیلی اور شدت ہماری صحت اور مزاج پر اثر انداز ہوتی ہے۔ خاص طور پر ہماری جلد نازک ہونے کے باعث موسم کے اثرات بہت جلد قبول کرتی ہے۔ لہٰذا موسم کو مدنظر رکھتے ہوئے جلد کی مناسب دیکھ بھال بے حد ضروری ہے۔

موسم گرما میں دھوپ اور گرم ہوائیں جلد کو سنولا دیتی ہیں۔ اس موسم میں سن بلاک کا استعمال لازمی ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ سن بلاک صرف گھر سے باہر نکلتے وقت ہی لگایا جائے۔ تاہم یہ درست نہیں۔ آپ گھر میں ہوں یا باہر، موسم کی حدت جلد پر اثر انداز ہوتی ہے۔ لہٰذا دن کے وقت روزانہ سن بلاک ضرور لگائیں۔ گھریلو خواتین خاص طور پر چولہے کے پاس جانے سے پہلے سن بلاک لازمی لگائیں۔

ذیل میں سن بلاک اور گھر میں آسانی سے تیار ہونے والے چند ماسک بتائے جا رہے ہیں، جن کا استعمال آپ کی جلد کو موسم گرما میں بھی شگفتہ اور تر و تازہ رکھے گا۔

☆ ایک چھوٹے ٹماٹر کا گودا نکال کے چہرے پر لگائیں۔ بیس منٹ بعد سادہ پانی سے دھولیں۔ یہ عمل روزانہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس سے دھوپ اور گرمی سے جھلسی ہوئی جلد نکھر جاتی ہے۔

☆ جو کا آٹا، دہی اور ٹماٹر کا گودا برابر مقدار میں لے کر پیسٹ بنالیں۔ اسے چہرے پر لگائیں اور پھر بیس منٹ بعد ٹھنڈے پانی سے دھولیں۔ یہ ماسک دھوپ سے سنولائی ہوئی جلد کی رنگت بحال کرتا ہے۔

☆ صندل پاؤڈر اور تھوڑے سے عرق گلاب کا ہلکا پیسٹ بنا کر چہرے، گردن اور جلد کے تمام کھلے حصوں پر لگائیں۔ یہ پیسٹ بہترین سن بلاک کا کام دے گا۔

☆ پودینے کی تازہ پتیاں پیس کر چہرے پر لگائیں۔ پندرہ منٹ بعد سادہ پانی سے دھوئیں۔ جلد کی رنگت کھل اٹھے گی۔

☆ پودینے کی تازہ پتیاں چار گلاس پانی میں ابال لیں۔ ٹھنڈا کر کے ایک بڑی اسپرے بوتل میں بھر لیں۔ سارا دن تھوڑی تھوڑی دیر بعد چہرے پر اسپرے کرتی رہیں۔ جلد نکھری نکھری نظر آئے گی۔ چاہیں تو بوتل کو فریج میں رکھ لیں ورنہ کسی بھی ٹھنڈی جگہ رکھ سکتی ہیں۔

☆ کھیرے کا رس، لیموں کا رس، ایلوویرا کا گودا، کھانے کا ایک ایک چمچہ لے کر اس میں چائے کا ایک چمچہ شہد بھی شامل کر دیں۔ تمام چیزیں اچھی طرح ملا کر چہرے پر لگالیں۔ بیس منٹ بعد سادہ پانی سے دھولیں۔ جلد صاف شفاف اور ہموار نظر آئے گی۔

☆ تھوڑی سی ہلدی، لیموں کے رس میں ملا کر چہرے پر لگائیں۔ بیس منٹ بعد ہلکے ہاتھوں سے رگڑ کر اتار لیں اور پھر چہرہ سادے پانی سے دھولیں۔ رنگت نکھر جائے گی۔

☆ پودینے کی پتیاں یا صندل پاؤڈر یا صنوبر یا تھائم کے پتوں میں سے کوئی ایک چیز اپنے غسل کے پانی میں ڈال لیں۔ اس پانی سے غسل آپ کو ایک فرحت بخش احساس عطا کرے گا۔

☆ تھوڑے سے دہی میں ہلدی ملا کر چہرے پر لگالیں۔ خشک ہو جائے تو ہاتھ گیلے کر کے نرمی سے رگڑتے ہوتے اتار لیں۔ پھر سادے پانی سے چہرہ دھولیں۔ یہ عمل جلد کو صاف شفاف کرتا ہے۔